منهاج البراعة
في شرح
نهج البلاغة

منهاج البراعه

فی شرح

نهج البلاغه

جلد اوّل، دوم

تالیف

محقق
علامہ محقق آیۃ اللہ سید حبیب اللہ ہاشمی خوئی قدس سرہ

ترجمہ

حجتہ الاسلام علامہ الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ العالی

ناشر

حق برادرز

8۔ مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

فون:0333-4431382

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف کتاب

نام	منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ
جلد	اول، دوم
مئولف	علامہ محقق آیۃ اللہ سید حبیب اللہ ہاشمی خوئی قدس سرہ
مترجم	حجۃ الاسلام علامہ الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ العالی
ڈیزائننگ وکمپوزنگ	محمد تقی فاضل
ناشر	حق برادرز لاہور
مطبع	معراج دین پرنٹرز لاہور
اشاعت دوئم	2008ء
قیمت	-/450روپے

فہرست مطالب

عرض مترجم:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید کے بعد کائنات کی عظیم ترین کتاب "نہج البلاغہ" جسے کلام امیر المومنین علیہ السلام ہونے کا شرف حاصل ہے، جسے "تحت کَلامِ الْخَالِقِ وَفَوْقَ کَلامِ الْمَخْلُوْقِ" کی سند مل چکی ہے اور "کَلامُ الْاِمامِ اِمامُ الْکَلامِ" کا منہ بولتا ثبوت ہے، جس کے جامع سید شریف رضی علیہ الرحمہ نے اسے چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں جمع فرمایا تھا، اب تک اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں، اور برصغیر پاک و ہند میں بھی مختلف اہلِ قلم کے ذریعے اس کے اردو زبان میں ترجمے کئے جا چکے ہیں، جو بلاشبہ لائق تحسین اور قابلِ رشک کوشش ہے، نہج البلاغہ کے ترجموں کے ساتھ ساتھ اس کی شرحیں بھی مختلف علماء اور دانشوروں کے قلم سے لکھی جا چکی ہیں جن میں سے زیادہ شہرت اہلِ سنت کے عالمِ خبیر علامہ ابن ابی الحدید معتزلی اور مذہب شیعہ کے مایہ ناز محقق بصیر علامہ سید حبیب اللہ موسوی ہاشمی خوئی کو حاصل ہے، اگرچہ شرح بحرانی" بھی اپنی عظمت کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے، لیکن سید حبیب اللہ خوئی کی شرح سب پر فوقیت کی حامل ہے، اور مذکورہ دونوں شرحوں کے بعد تحریر کی گئی ہے، اس کی اکیس جلدیں ہیں جن میں ابن ابی الحدید اور بحرانی کی فروگذاشتوں سے مطلع کر کے حقیقتِ حال کی وضاحت کی گئی ہے۔

یہ شرح قرآنِ مجید کی طرح نہج البلاغہ کی تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے، شارح علیہ الرحمہ نے اس کا تفصیلی تذکرہ اسی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے، بہت سے علماء اور احباب نے اصرار کیا کہ سید حبیب اللہ خوئی مرحوم کی شرح

"منهاج البراعه فی شرح نهج البلاغه"

کا اردو میں ترجمہ کیا جائے، اپنی بے بضاعتی اور کتاب کے حجم کو دیکھ کر ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی، لیکن اصرار بڑھنے لگا تو اللہ کا نام لے کر اس کا آغاز ۱۹۹۷ء میں کر دیا گیا اور ایک ماہ کی مدت میں بحمد اللہ اس کی پہلی جلد کا ترجمہ مکمل کر لیا گیا۔

چنانچہ اب تک اس کی کئی جلدوں کا ترجمہ لکھا جا چکا ہے، لیکن طباعت کا مرحلہ اس سے بھی زیادہ مشکل نظر آیا، کئی اداروں کے سربراہوں سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر کسی کی ہمت نہیں بندھ رہی تھی، بالآخر اپنی مالی بے بضاعتی کے باوجود امیر المومنین علیہ السلام کی ذات سے توسل اور خدا کی ذات پر توکل کر کے اس کی طباعت کا فیصلہ کر لیا، اور کمپوزنگ کا کام اپنے عزیز فرزند مولانا محمد تقی فاضل سلمہ کے سپرد کیا، موصوف نے شبانہ روز کوششوں سے اسے بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ مکمل کر دیا، اس سلسلے میں میں اپنے مہربان دوست اور شفیق بھائی عزت مآب جناب خواجہ اشفاق حسین دام عزہ (ریٹائرڈ) کیپٹن پی آئی اے کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لئے اس کی

طباعت واشاعت کے لئے تعاون فرمایا، خداوند عالم انہیں جزائے خیر سے نوازے اوران کے مرحومین کو مغفرت فرمائے، اس وقت اس کی دوسری اشاعت کا اہتمام ''حق برادرز اردو بازار لاہور'' کے ذریعہ کیا جارہا ہے، خداوند عالم ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، آمین

کتاب کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں،

۱۔ ترجمہ میں سادگی، سلاست اور روانی کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ ہر سطح علم کے قاری کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

۲۔ کتاب میں جہاں غیر ضروری اضافہ تھا اسے نظر انداز کر دیا گیا، اور وہاں پر یہ علامت'' ....'' لگا دی گئی۔

۳۔ آیاتِ قرآنی میں زیادہ تر مولانا فرمان علی مرحوم اور مولانا سید فیاض حسین نقوی کے مرتبہ مولانا سید صفدر حسین نجفی مرحوم کے ترجمہ کو پیش نظر رکھا گیا۔

۴۔ نہج البلاغہ کے خطبات کے ترجمہ میں علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم کے ترجمہ سے رہنمائی لی گئی ہے۔

۵۔ کتاب میں موجود عربی عبارات پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ قاری کو پڑھنے میں آسانی ہو۔

۶۔ کتاب کا زیادہ تر مقدمہ علمی حلقوں کے لئے ہے شاید جو عام قاری کی دلچسپی کا سبب نہ ہو، لہٰذا:

الف: عام قاری کتاب کے صفحہ ۱۵۴ کے بعد کا مطالعہ فرمائیں تو ان کے لئے بہتر ہوگا۔

ب: میری حقیری رائے ہے کہ اگر کتاب کے مقدمہ کو دینی مدارس کے نصاب کا حصہ بنایا جائے تو طلباء کے لئے بھی مفید رہے گا، کیونکہ اس میں منطق، فلسفہ، معانی اور بیان کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جو یقیناً طلباء کرام کی علمی استعداد بڑھانے کے لئے معاون ہوگا، امید ہے کہ دینی مدارس کے سربراہان اس پر غور فرمائیں گے۔

۷۔ کتاب میں موجود اقتباس شدہ قرآنی آیات اور فرامین امیر المومنین علیہ السلام کا حوالہ بھی ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

غرض کوشش تو کی گئی ہے کہ کتاب کسی پہلو سے تشنہ تکمیل نہ رہنے پائے، اس کے باوجود بھی کئی خامیوں اور کوتاہیوں کا امکان ہے، آپ کے مطلع فرمانے پر ممنون بھی ہوں گا اور آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ بھی کیا جائے گا۔

آخر میں اپنی اس چھوٹی سی کاوش کو اس ذات والاصفات، منبر سلونی کے واحد دعویدار سے منسوب کرتا ہوں کہ جس کی ابتدا تک کسی کی رسائی نہیں نہ انتہا تک کسی کی پرواز، جس کے باران رحمت سے سب فیض حاصل کرتے ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الاحقر محمد علی فاضل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِی لاَ شَرِیْكَ لَهُ فِی خَلْقِهِ وَ لاَ شَبِیْهَ لَهُ فِی عَظْمَتِهِ وَ الصَّلاَةُ وَ السَّلاَمُ عَلیٰ مُحَمَّدٍ عَبْدِهِ وَ رَسُوْلِهِ وَ عَلیَ الأَئِمَّةِ الْمَعْصُوْمِیْنَ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ مِنْ آلِهِ وَ عِتْرَتِهِ۔

اَمَّابَعْدُ۔ عالم اسلام کی با عظمت کتاب نہج البلاغہ جسے امام ہمام، علامہ فہامہ، شمس فلک فصاحت، قطب رحی بلاغت، شریف رضی سید ابوالحسن محمد بن حسین موسوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع کیا ہے ایک ایسی کتاب ہے جو اپنی پختگی عمدگی اور عظمت میں قرآن مجید فرقان حمید کے تابع اور اس کی پیرو ہے کیونکہ یہ کتاب ایک ایسی عظیم ہستی کے وصی کے فرامین اور کلام کا مجموعہ ہے جس کی طرف قرآن نازل کیا گیا۔ اسی لئے کسی کی جرأت نہیں کہ اس کے فنون فصاحت اور وجوہ بلاغت، الٰہی حکمتوں اور شافی مواعظ حسنہ کی کماحقہ تعریف کر سکے جیسا کہ خود مؤلف کتاب نہج البلاغہ نے اس کے سبب تالیف کے بارے میں فرمایا ہے۔

"اس یقین کے ساتھ کہ وہ فصاحت وبلاغت کے گرہائے آبدار اور دین ودنیا کے متعلق درخشندہ کلمات پر مشتمل ہوگی جو نہ کسی کلام میں جمع اور نہ کسی کتاب میں یکجا ہیں چونکہ امیر المؤمنینؑ فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخرج ومنبع تھے فصاحت وبلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپؑ ہی سے ظاہر ہوئیں اور آپؑ ہی سے اس کے اصول و قواعد سیکھے گئے اور ہر خطیب ومتکلم کو آپؑ کی مثالوں پر چلنا پڑا اور ہر واعظ و مبلغ نے آپؑ کے کلام سے خوشہ چینی کی پھر بھی وہ آپؑ کے برابر کبھی نہیں آسکے اور سبقت وتقدم کا سرا آپؑ ہی کے سر رہا"۔

بایں ہمہ متقدمین اور متاخرین میں سے علماءِ تبحرین کی ایک جماعت نے نہج البلاغہ کے جملات کی تفسیر، مشکل کلمات کی وضاحت اور پیچیدہ کلام کی توضیح کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے لیکن جہاں تک میں نے دیکھا جس طرح اس کا حق سید سند، حبر معتمد، فقیہِ آل رسول، شرف اولاد بتولؑ، جامع المعقول والمنقول، فخر المحققین، زبدۃ المجتہدین، الحاج میر حبیب اللہ ہاشمی موسوی خوئی طاب ثراہ نے ادا کیا ہے اس طرح کسی اور نے اس کا حق ادا نہیں کیا کیونکہ مرحوم ومغفور نے نجف اشرف سے اپنے وطن مالوف خوئی میں واپس آکر کتاب منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ کی تالیف کیلئے اپنی کمر باندھی اور زندگی کا ایک حصہ اور جوانی کے عمدہ ایام اس کتاب کی تالیف میں صرف کر دیئے اور ایک ایسی کتاب پیش کی جس کا اسلوب کار اور انداز عجیب وغریب تھا، نہ تو میں نے اولین کی کتابوں میں یہ انداز دیکھا نہ ہی آخرین میں سے کسی کے بارے میں ایسے انداز کے متعلق سنا اس سے ہر شخص اپنے علمی مرتبے کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے اور جو شخص اپنی تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اس سے روشنی حاصل کرتا ہے اس لیے کہ موصوف کی زیرِ نظر تالیف اور دوسری غیر مطبوعہ تالیفات اپنے قاری کو ان کے متنوع علوم اور معارف الٰہیہ میں دسترسی سے پوری طرح آگاہ

کرتی ہیں۔

مؤلف کے حالات زندگی

ولادت باسعادت

مؤلف موصوف، علامہ مؤید ومسدد، الحاج حبیب اللہ بن سید محمد ملقب بہ 'امین الرعایا' ابن سید ہاشم ابن سید عبد الحسین رضوان اللہ علیہم اجمعین ایران کے شہر خوئی میں پیدا ہوئے جو صوبہ آذربائیجان کا دارالحکومت ہے اور اسی شہر میں پروان چڑھے اور تربیت حاصل کی اور جو بات اپنے خاندان اور آپ کی اولاد وامجاد میں مشہور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم سید حبیب اللہ خوئی نے اپنے چچازاد بھائی آیۃ اللہ الحاج سید محمد حسین ہاشمی موسوی رضوان اللہ علیہ کے ساتھ نجف اشرف کا سفر کیا اس وقت آپ کی عمر شریف ۲۵ برس تھی آپ کے اس سفر کی تاریخ کو آپ کے والد سید محمد، ملقب بہ ''امین الرعایا'' نے کتاب ''حق الیقین'' کے پہلے صفحہ کی پشت پر یوں تحریر فرمایا ''مشرف شدن نور العیونی آقای میر حبیب اللہ حفظہ اللہ تعالیٰ بعتبات عالیات عرش درجات بعزم تحصیل کہ در دوازدھم شہر جمادی الآخر بہمراھی نور دیدہ جناب آقای میر محمد حسین از خوئی حرکت نمودہ روانہ شد جناب باری بحق مقربانِ درگاہ خود ہر دو را حفظ فرمودہ در غربت ناساز نفرمودہ از شر شیطان جن وانس ومن شر الاعداء نگہ داشتہ بسلامتی وتندرستی بوطن مالوف عالم وفاضل با عمل برگرداند انشاء اللہ ۱۲۸۶ھ'' یعنی میرے نور چشم آقای میر حبیب اللہ حفظہ اللہ تعالیٰ عتبات عالیات عرش درجات کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حصول علم کے لیے بارہ جمادی الآخر کو میرے نور العین جناب آقائے میر محمد حسین کی معیت میں خوئی سے روانہ ہوئے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقربان بارگاہ کے صدقے میں دونوں کی حفاظت فرمائے اور پردیس میں کسی قسم کے ناگوار حادثہ سے دوچار نہ فرمائے اور جن وانس کے شیطانوں اور دشمن کے شر سے محفوظ فرمائے اور صحت وسلامتی کے ساتھ عالم وفاضل اور باعمل بنا کر اپنے وطن مالوف کی طرف پلٹائے انشاء اللہ ۱۲۸۶ھ۔ اس تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت تقریباً ۱۲۶۱ھ میں ہوئی۔

آپ کے اساتذہ کرام

آپکی تدوین کردہ اصول اور فقہ کی کتابوں میں جن میں سے آپ کی کتاب فرائد الاصول کے اول سے حجیۃ اور ظن تک آپ کا حاشیہ بھی ہے جو آپ ہی کے قلم سے تحریر کیا ہوا ہے اس میں زیادہ تر آیۃ اللہ علامہ آقای سید حسین حسینی کوہ کمرہ ای رضوان اللہ علیہ کے دروس ہیں لیکن حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ آقای بزرگ تہرانی دامت برکاتہ نے اپنی کتاب ''الذریعہ'' کی پہلی جلد میں طبقات اعلام الشیعہ کے عنوان سے نقباء البشر فی القرن الرابع عشر کے موضوع کے تحت ص ۳۲۶ اور ص ۲۱ میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ کو دو اساتذہ آیۃ اللہ میرزا حبیب اللہ اور آیۃ اللہ مجدد شیرازی کا بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔

آپ کی تالیفات:

۱۔ ''شرح العوامل فی النحو'' اس کتاب کے تقریباً ۱۲۴ صفحات ہیں اور اسے آپ نے نجف اشرف تشریف لے جانے سے پہلے اپنے عالم شباب میں تالیف فرمائی اور اسے اپنے اس خط کے ساتھ تحریر فرمایا جو دوسری تالیفات میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کی تالیف سے رمضان المبارک ۱۲۸۳ھ میں فارغ ہوئے اور کتاب کے آخر میں ان الفاظ کے

ساتھ یہ تحریر فرمایا ۱۲۸۳ھ کے نویں مہینے کی تیسری رات۔

۲۔ اپنے استاد علامہ آیت اللہ سید حسن حسینی قدس سرہٗ کے دروس کو اپنے ہاتھوں سے "فرائد الاصول" پر حاشیہ کے طور پر اول کتاب سے "حجیت الظن" کے آخر تک نجف اشرف میں تحریر فرمایا اُن کے تاریخ اختتام کے الفاظ یہ ہیں "مؤلف فقیر اپنے غنی رب کی رحمت کے امیدوار حبیب اللہ بن محمد ہاشم موسوی کے ہاتھوں سے اس تحریر سے بروز جمعہ بتاریخ ۱۴ صفر المظفر ۱۲۸۹ھ میں فراغت حاصل ہوئی جبکہ اس کا آغاز بروز اتوار بتاریخ ۸ ا ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ میں ہوا اور انشاء اللہ اس کے بعد مسئلہ برائت کی گفتگو تحریر کی جائے گی اور میری خداوند عالم سے دُعا ہے کہ اسے بھی مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے بہترین شہر نجف اشرف کے قرب اور اپنے نیک بندوں کی صحبت عطا کر کے ہم پر احسان فرمائے۔ اور درود و سلام ہو ہمارے مولا و سید حضرت محمد ﷺ اور اُن کی پاک آل اور نیک اصحاب و احباب پر بہت زیادہ درود و سلام ۱۲۸۹ھ"۔

۳۔ اصول اور فقہ میں بہت سے رسالے اپنے ہاتھوں سے تحریر فرمائے جن پر نہ تو اُن رسالوں کا نام ہے اور نہ ہی تاریخ بلکہ صرف اُن کے اساتیذ کے درسی مباحث کا مجموعہ ہیں۔

۴۔ کتاب تحفۃ الصائمین فی شرح ادعیۃ الثلاثین تقریباً ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اسے آپ نے اس وقت تالیف فرمایا جب نجف اشرف سے خوئی واپس تشریف لے آئے کتاب کے آخر میں ان الفاظ کے ساتھ تاریخ تحریر فرمائی "اس کتاب کی تحریر سے بتاریخ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۹۱ھ میں فراغت حاصل ہوئی"۔

۵۔ صوفیا کی رد میں ایک رسالہ تحریر فرمایا اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے کتاب منہاج البراعہ کی چھٹی جلد میں بھی تحریر فرمایا ہے یہ رسالہ شہر خوئی میں لکھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کی تاریخ اختتام یوں تحریر فرمایا "اس کی تحریر سے شعبان المعظم ۱۳۲۱ھ میں فراغت حاصل ہوئی"۔

۶۔ کتاب منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ اپنے ہاتھوں سے تحریر فرمائی جو سات جلدوں پر مشتمل تھی اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے ۲۱۸ ویں خطبہ تک کی شرح ہے اور اسی خطبہ کے اول سے مختصر جملوں کی شرح لکھی ہے اور یہی اس کتاب کی آخری شرح تھی جیسا کہ طابع نے ساتویں جلد کے آخر میں ان کے خلف الرشید، عالم، فاضل، حجۃ الاسلام والمسلمین، الحاج سید ابو القاسم ہاشمی موسوی ملقب بہ امین الاسلام کے حکم کے مطابق تحریر کیا جو ۱۳۲۸ھ میں طبع ہوئی اور لکھا کہ "مؤلف مرحوم کا یہ قیمتی موتی صرف سات جلدوں میں ہے جس کی طباعت کیلئے مؤلف مرحوم کے فرزند ارجمند خوئی سے تہران تشریف لائے "ابھی کتاب کا کچھ حصہ ہی چھپ چکا تھا کہ موت نے مزید مہلت نہ دی اور انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور راہی خلد بریں ہوئے اور کتاب کا باقی حصہ مرحوم کے فرزند مذکور اور دوسری اولاد نے ۱۳۵۱ھ میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ باوجودیکہ طباعت کے لحاظ سے کتاب کا پہلا ایڈیشن حسب دلخواہ نہیں تھا لیکن اس کے معانی اور مطالب اس قدر اہم تھے کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی جس کی وجہ سے ہمارے بعض دوستوں اور مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند سید نعمت اللہ ہاشمی اور عالم و فاضل پوتے حجۃ الاسلام السید عبد الحمید ہاشمی موسوی ساکن تہران نے

ہمیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم اس کتاب کی جدید انداز میں از سر نو طباعت واشاعت کریں۔ چنانچہ ہم نے اس بات کا اظہار دینی اور اسلامی کتابوں کی اشاعت میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کے سامنے کیا اور خداوند عالم کے فضل وکرم سے تہران شارع بوذر جمہری میں مکتبہ اسلامیہ اور قم میں ادارہ مطبوعات دینیہ کے مدیر جلیل القدر السید اسماعیل مد ظلہ العالی نے ہمارے ساتھ اس اشاعت کی ہامی بھر لی کیونکہ موصوف سید اسماعیل اور ادارے کے دوسرے اصحاب اسلامی کتابوں کی نشر واشاعت کیلئے ہمیشہ کمربستہ رہتے اور مقدور بھر کی اپنی کوششیں اس بارے میں صرف کرتے رہتے ہیں خداوند عالم اُن کو جزائے خیر عطا کرے اور اجر عظیم عطا فرمائے۔ چنانچہ یہ یادگار کتاب خداوند عالم کے فضل وکرم سے انہی حضرات کی کوششوں سے نئے انداز میں عمدہ کاغذ اور جدید قسم کے حروف کے ساتھ چھپ کر منظر عام پر آگئی ہے مرحوم کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی اصل کتاب کے ساتھ اس کتاب کی مطابقت کا کام مرحوم کے مذکورالذکر عالم پوتے نے سرانجام دیا جن کے پاس مرحوم کی مکمل کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

آپ کی وفات: مرحوم مصنف اعلیٰ اللہ مقامہ، نے صفر ۱۳۲۴ھ میں ایران کے دارالحکومت تہران میں داعی اجل کو لبیک کہا اور آپ کا جنازہ قبرستان سید عبدالعظیم حسنیؑ میں صحن مبارک کے مغربی حصے کے آخری حجرہ میں لایا گیا اور وہیں پر اس درنایاب کو سپرد خاک کر دیا گیا اس بات کے راوی آپ کے پوتے علامہ سید عبدالحمید زید توفیقاتہ ہیں۔ یہ تھا مؤلف کی پاکیزہ زندگی اور ان کی تالیفات کا ایک مختصر جائزہ امید ہے کہ برادران ایمانی مجھے ہر وقت اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی۔

والسلامُ علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپنے رب کریم وغفور کی مغفرت

اور اپنے اجداد طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کی شفاعت کا امیدوار

علی اصغر بن مجتبیٰ صادق حسینی خوئی

۲۲ صفر ۱۳۷۸ھ

خطبہ کتاب منہاج البراعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ نستعین

تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں، شعور جس کے ادراک سے اور آنکھیں جس کے دیکھنے سے عاجز، جس کی معرفت ضمیر و قلوب ایمان کی پختہ حقیقتوں کے ساتھ قائم اور برقرار ہیں جو اپنی عظمت و جلالت کے پیش نظر کون و مکان کی پابندیوں سے بالاتر ہے اور جو اپنے کمال کی بلندیوں کی وجہ سے زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔

اس ذات کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں گوناگوں عجیب و غریب نعمتوں اور احسانات سے نوازا اور معانی کی حقیقتوں اور بیان کی باریکیوں کو سمجھنے کے ذریعے ہمیں دوسری مخلوقات پر ترجیح دی ہے۔ ایسی حمد اور ایسا شکر جو اعضاء و جوارح اور دل کی گہرائیوں سے ادا ہو اور سب ثناء اس کیلئے ہے کہ اس نے عروۃ الوثقیٰ اور حبل متین کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی وجہ سے ہمارے لئے کمال کے مدارج اور یقین کے معارج تک پہنچنے کیلئے راہیں ہموار کیں اور ولی امین کے کلام کے مینارہ، نہج البلاغہ کے نور کی وجہ سے بلاغت کے واضح طریقوں اور منہاج البراعہ (علم و فضیلت کے کشادہ راستوں) کو ہمارے لئے روشن کیا۔

درود و سلام ہو اس کے بندے اور رسول پر جو شجرہ انبیاء سے منتخب وادی بطحاء کے درمیان سے برگزیدہ اور روشنی کی پسندیدہ قندیل ہیں جنہیں اللہ نے راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی پھر وہاں سے بلند آسمانوں تک کی معراج کرائی اور وہ سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے پھر قریب ہوئے اور قریب تر ہوئے یہاں تک کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا وہاں پر اللہ نے اپنے ولی کے بارے میں ان کی طرف وحی بھیجی اور ان کی ان آل پاک پر درود و سلام ہو جو تقویٰ کے بلند نشانات، ہدایت کے ستون اور خدا کی مضبوط رسی ہیں خصوصاً آنحضرتؐ کے وصی، وزیر اور آپؐ کی شریعت کے محافظ اور دین کے حامی اور آپ کے رازوں کا خزانہ اور امور کی جائے پناہ ہیں جنہیں پیمبرؐ نے علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے اور انہوں نے کسی سے کچھ حاصل کئے بغیر ہر باب سے ہزار ہزار دروازے اور کھولے جو کہ فیاض ازل کا خصوصی عطیہ تھا اسی وجہ سے آنجنابؑ کا کلام اس حد تک جامع ہے کہ تعجب کی حد سے بھی آگے بڑھ گیا ہے وہ نہ صرف ایسے کوہ بلند ہیں جس پر سے سیلاب کے چڑھاؤ کا پانی گذر کر نیچے گر جاتا ہے بلکہ ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور بحر زخار ہیں۔ آپکی شان بہت عظیم، آپکی عظمت بہت بلند، آپکی قدر و منزلت بالاترین اور ذات اقدس اس سے زیادہ گہری ہے کہ وہاں تک اذہان کی رسائی ہو سکے یا عقلیں اور وہم و خیال وہاں تک پہنچ سکیں یہ بات بڑی دور ہے کہ آپ کی کسی ایک شان کو کوئی بیان کر سکے اس لئے کہ آپ کی شان بیان کرنے یا فضائل میں سے کسی ایک فضیلت کو ذکر کرنے کیلئے عقلوں کو راہ نہیں ملتی، اذہان

حیران و پریشان ہیں، خطباء کی زبانوں میں لکنت ہے، ادباء عاجز ہیں، فصحاء گنگ ہیں، بلغاء ناتوان ہیں، حکماء حیران ہیں، بڑے بڑے صاحبان عظمت عجز کے معترف ہیں۔ خداوند عالم مجھے آپؐ پر قربان کرے اور آپؐ کے نقش قدم پر چلنے اور ہدایت کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے اور آپؐ کا کلام اور منشاء و مقصود سمجھنے کیلئے میرا سینہ کشادہ کرے یہی میری آخرت اور دنیا کا منتہائے مقصود ہے اور خداوند عالم تو ہر چیز پر قادر اور دعاؤں کو قبول کرنے کیلئے زیادہ لائق ہے۔

بعد از حمد و صلوٰۃ :۔ یہ بندہ جو اپنے بے نیاز رب کی رحمت کا امیدوار ہے یعنی حبیب اللہ بن محمد بن ہاشم ہاشمی علوی موسوی خوئی آذربائیجانی اللہ تعالی ان سب کے گناہوں کو ان کے اجداد و امجاد کے صدقے معاف کرے اور اولین و آخرین کے محشور ہونے کے دن ان کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھوں میں عطا کرے۔ عرض گذار ہے کہ جس چیز میں زندگی کا نقد سرمایہ خرچ کیا جانا چاہئے اور آنکھوں کی بیداری کو صرف کیا جانا چاہئے اور افکار کے خزانوں کو لٹوا دینا چاہئے وہ ایسا علم ہو جو سعادت ابدی تک پہنچاتا ہے اور عنایت سرمدی کے حصول کا موجب ہوتا ہے اور وہ ہے ان احادیث اور اخبار کا علم جو پیغمبر اکرمؐ اور اُن کی پاک و پاکیزہ عترت سے منقول و ماثور ہیں کیونکہ اسی علم ہی کے ذریعہ دارین کی سعادت حاصل ہوتی ہے، ہر قسم کی برائیوں اور عیوب سے چھٹکارہ ملتا ہے، رب کی معرفت اور توحید پر ایمان پختہ ہوتا ہے، خدا کی اطاعت اور عبادت ہوتی ہے، صلہ رحمی کی جاتی ہے اور حلال و حرام کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ علم تنہائی میں مونس اور وحشت میں ساتھی ہوتا ہے ہر قسم کے سقم و عیوب سے دلوں کی شفاء ہے اس کے ذریعہ سیاست مدنی کا قیام جسمانی اور مالی اطاعت کا انتظام ہوتا ہے خدا کی خوشنودی کے لیے اس کا حصول نیکی ہے اس کی طلب عبادت، مذاکرہ تسبیح ہے اور اس کی تعلیم دینا صدقہ ہے، اس پر عمل کرنا جہاد ہے، اسے خرچ کرنا قرب خداوندی ہے اور اس علم کا ان اوصاف سے متصف ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان صاحبان شرف سادات سے حاصل کیا گیا ہے جو عبد مناف کی اولاد ہیں جن کی روح القدس کے ساتھ تائید اور تصدیق کی گئی ہے جو خدا کی طرف سے ہر قسم کی میل و نجاست سے منزہ اور مبرا ہیں، جو اسرار قندیل کے خزینہ دار، انوار تاویل کے مینار، کتاب مبین قرآن حکیم کے محافظ، علوم انبیاء کے وارث، خطاء و نسیان سے محفوظ، سہو و نقص سے مبرا، خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ اور اس کے مقرب اور معزز و محترم بندے ہیں۔ کسی بات میں بھی اس سے سبقت نہیں کرتے بلکہ اسی کے امر پر کاربند ہیں وہ ایسے اہل ذکر ہیں جن سے سؤال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور خدا ان الفاظ میں ان سے سؤال کرنے کا حکم دیتا ہے: "فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ" "اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر لوگوں سے پوچھ لو (سورۃ النحل/۴۳)

لہذا جو شخص ان کے علمی چشموں سے سیراب ہوتا ہے گویا وہ لبریز جام سے سیراب ہوتا ہے اور جو شخص ان کے آثار کی نورانیت سے فیض حاصل کرتا ہے وہ ہر مقابلہ میں بازی لے جاتا ہے اس لئے کہ یہ ذوات قدسیہ اپنی مرضی سے تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں جو کچھ ان سے منقول ہے وہ وحی الہی ہے، ان کی زبانیں آب وحی سے دھلی ہوئی ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

مُطَهَّرُونَ نَقِيَّاتٌ ثِيَابُهُمْ — تَجْرِى الصَّلَاةُ عَلَيْهِمْ أَيْنَمَا ذُكِرُوا
أَللّٰهُ لَمَّا بَرىٰ خَلْقاً وَ أَتْقَنَهُ — صَفَّيكُمْ وَ اصْطَفيكُمْ أَيُّهَا الْبَشَرُ
فَأَنْتُمُ الْمَلَاءُ الْاَعْلىٰ وَ عِنْدَكُمْ — عِلْمُ الْكِتَابِ وَ مَا جَائَتْ بِهِ السُّوَرُ

یہ پاک وپاکیزہ ہستیاں ہیں کہ ان کے لباس ہر گندگی سے منزہ ہیں جہاں پر بھی ان کا ذکر ہوتا ہے درود اور صلوات کی ان پر بارش ہو جاتی ہے۔ اے نورانی بشر! جب اللہ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اور اس کی تخلیق کو مستحکم کیا تو تمہیں اپنی مخلوق میں سے چن لیا اور برگزیدہ قرار دیا، پس تم ہی ملاء اعلیٰ ہو اور تمہارے پاس ہی کتاب کا اور جو کچھ قرآنی سورتوں میں بیان ہوا ہے سب کچھ کا علم موجود ہے۔ اور خدا بھلا کرے ایک اور شاعر کا جو کہتا ہے :

إذَا شِئْتَ أنْ تَرْضىٰ لِنَفسِكَ مَذْهَباً — يُنَجِّيكَ يَوْمَ الْبَعْثِ مِنْ لَهَبِ النَّارِ

فَدَعْ عَنْكَ قَوْلَ الشَّافِعِيِّ وَ مَالِكٍ — وَ أحْمَدَ وَالْمَرْوِيَّ عَنْ كَعْبِ أحْبَارِ

وَ وَالِ أُنَاساً قَوْلُهُمْ وَ حَدِيثُهُمْ — رَوىٰ جَدُّنَا عَنْ جِبْرَئِيلَ عَنِ الْبَارِي

اگر تم چاہتے ہو کہ کسی ایسے مذہب کو اختیار کرو جو تمہیں قیامت کے دن جہنم کی آگ کے شعلوں سے نجات دلائے تو پھر...... سب کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں سے ولاء اور دوستی اختیار کرو جو یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ یہ بات اور حدیث ہمیں ہمارے نانا پیغمبر خدا سے انہوں نے جبرئیل سے اور جبرئیل نے حق تعالیٰ سے لی ہے۔

پھر نشر شدہ روایات میں سے سب سے احسن اور موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے کلمات میں سے سب سے روشن وہ کلمات اور روایات ہیں جنہیں سید سند، رکن معتمد، شریف رضی ابوالحسن محمد ابن ابی احمد حسین موسوی قدس اللہ سرہ ونور اللہ ضریحہ نے نہج البلاغہ میں مرتب اور مدون کیا ہے جس میں اشرف کلام اور خطبے، لطیف وصیتیں، خطوط اور ادب موجود ہے جو باب مدینۃ العلم والحکمت سے بیان شدہ اور قطب دائرہ عصمت وطہارت کے پیش کردہ ہیں ایسا باب مدینۃ العلم جو اللہ کے بندوں میں اس کی حجت اور خدا کے شہروں میں اس کے خلیفہ ہیں یعنی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام۔

مجھے اپنی جان کی قسم! نہج البلاغہ ایسی کتاب ہے جس نے عبادت گذاروں کیلئے عبادت کی راہیں متعین کی ہیں اور راہ حق کے راہرووں کیلئے رستے واضح کر دیئے ہیں، اسی سے ہلاکتوں میں گھر جانے والوں کیلئے راہ نجات ہے ہر بھوکے حاجت مند کیلئے جائے امن اور ڈر کر پناہ لینے والے ہر شخص کیلئے جائے پناہ ہے حاجت روائی کا شہر اور طلبگاروں کیلئے باعث تونگری ہے کیونکہ جو کلام اس میں بیان کیا گیا ہے اس پر کلام الٰہی کا اثر ہے اور کلام نبی کی مہک ہے اس کا ظاہر خوبصورت اور باطن بہت گہرا ہے۔ جو مشتمل ہے امر و نہی، وعد و وعید، ترغیب وترہیب، جدل و مثل اور قصص پر جس کے عجائبات کو فنا نہیں اور غرائبات کی کوئی انتہا نہیں۔ جنت کے طلبگار کیلئے اس کی رہنما اور جہنم سے بھاگنے والوں کیلئے نجات دہندہ ہے عاجز کر دینے والی بیماریوں سے شفا، گمراہی کی تاریکیوں سے نجات، ہر بیماری کی دوا، ہر پیاسے کی سیرابی اور امیدوار کیلئے مایۂ امید ہے۔ ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں، ایسا خزانہ ہے جو انواع واقسام کے زروجواہر سے بھرپور ہے اور جس کی سانسوں سے عنبر اور کستوری خوشبو حاصل کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بلاغت کی ایسی حقیقتوں اور فصاحت کی ایسی باریکیوں پر مشتمل ہے جس کی گہرائیوں تک فکر انسانی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور معانی کے تمام فنون اور بیان کی تمام اقسام کی جامع ہے کہ جس کی گہرائیوں تک نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ اس میں عربی نکات، ادبی اسرار اور علم بدیع کی ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کے بیان کرنے سے انسان کی زبان عاجز ہے، کیا خوب کہا ہے شاعر نے :

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ نَهْجُ الْعِلْمِ وَ الْعَمَلِ — فَاسْلُكْهُ يَاصَاحِ تَبْلُغْ غَايَةَ الأَمَلِ
كَمْ فِيهِ مِنْ حِكَمٍ بِالْحَقِّ مُحْكَمَةٍ — تُحْيِي الْقُلُوبَ وَ مِنْ حُكْمٍ وَ مِنْ مَثَلٍ
أَلْفَاظُهُ دُرَرٌ أَغْنَتْ بِحُلْيَتِهَا — أَهْلَ الْفَضَائِلِ عَنْ حَلْيٍ وَ عَنْ حُلَلِ
وَمِنْ مَعَانِيهِ أَنْوَارُالْهُدىٰ سَطَعَتْ — فَانْجَابَ عَنْهَا ظَلاَمُ الزَّيْغِ وَ الزَّلَلِ
وَ كَيْفَ لاَ وَ هُوَ نَهْجٌ طَابَ مُنْهِجُهُ — أَهْدىٰ إِلَيْهِ أَمِيرُالْمُؤْمِنِينَ عَلِيٌّ

یعنی نہج البلاغہ علم و عمل کا راستہ ہے اے میرے ساتھی تم اسے اختیار کرو تا کہ مقصدِ عمل تک پہنچ جاؤ اس میں کس قدر حکمت کی باتیں ہیں جنہیں حق کے ساتھ مضبوط و محکم کر دیا گیا ہے اور حکمتیں بھی اس میں ہیں اور مثالیں بھی۔ اس کے الفاظ ایسے موتی ہیں کہ جنہوں نے اپنے زیورات سے صاحبان فضیلت کو دوسرے ہر قسم کے زیورات اور لباس سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کے معانی سے ہدایت کے نور ساطع ہیں کہ جن سے کجی اور لغزش کی تاریکیوں کے بادل چھٹ گئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ ایک ایسا واضح راستہ ہے جس کو طے کرنے والے پاکیزہ لوگ ہوتے ہیں جس کی طرف امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے راہنمائی فرمائی ہے۔

نہج البلاغہ کی شرحیں

یہ کتاب ہر شہر و دیار کے علماء اور ہر دور کے فضلاء کے درمیان آفتاب عالمتاب کی طرح شہرت اختیار کر چکی ہے اس کی کتاب کی شرح صاحبان عقل کی ایک جماعت نے کی لیکن انہوں نے ظاہر و باطن کی تمیز نہیں کی اور اس بارے میں ان کی کیفیت رات کو کارآمد اور ناکارہ کی تمیز کئے بغیر لکڑیاں جمع کرنے والے کی سی یا سواروں یا پیادہ کو اکٹھے کرنے والے جیسی ہے۔

ان میں سے :

۱۔ شیخ سعید الدین ہبۃ اللہ قطب راوندی قدس سرہ ہیں۔ میں نے اب تک ان کی شرح کو نہیں دیکھا البتہ شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی نے کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے اس سے بہت کم مواد لیا ہے اور وہ بھی اپنی شرح کے دوران کسی قسم کی تحقیق اور تفصیل کے بغیر ہے۔

شرح ابن ابی الحدید پر تبصرہ

۲۔ فاضل بارع، ادیب عزالدین عبدالحمید بن ابی الحدید معتزلی بغدادی ہیں جنہوں نے اس کی شرح تقریباً ۶۴۰ھ میں لکھی ہے اور یہ ایک مفصل شرح ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شرح ایک صاحب بصیرت نقاد اور باخبر محقق کیلئے ایک بے جان ساڈھانچہ ہے کیونکہ انہوں نے اس میں وہ چیزیں تو بیان کی ہیں جس سے ان کی خواہشات کو تقویت ملتی ہے اور جن چیزوں کی انہیں معرفت نہیں تھی اور ان کی ہمت بھی کوتاہ تھی انہیں چھوڑ دیا کیونکہ انہوں نے اچھوتے الفاظ اور بزعم خویش صرف و نحو اور مشتقات کے مشکل مسائل کی تشریح پر ہی اکتفا کیا گویا مغز کو چھوڑ کر سارا زور چھلکے پر ہی لگا دیا اور قصے کہانیاں ذکر کر کے اور امثال و انساب اور مناسبات کو

بیان کر کے طوالت سے کام لیا حالانکہ ایسی چیزوں کا کتاب کی شرح کے لیے کوئی زیادہ فائدہ نہیں تھا اور نہ ہی عقلمندوں کے نزدیک اسکا کوئی معقول ثمر تھا بلکہ یہ کام تو صاحبان سیر و تواریخ کا تھا نا کہ درایت و روایت سے تعلق رکھنے والوں کا۔ اے کاش کہ وہ اسی پر ہی اکتفا کرتے اور خدا کی ذات پر اس قدر جرأت نہ کرتے اور ولی اللہ (علی ابن ابی طالبؑ) کے ظاہر کلام کی اپنی فاسد رائے اور کھوٹی نگاہوں سے اپنی مرضی کی تاویلیں نہ کرتے ان کا یہ اقدام ان کے فاسد عقیدے اور راہ ہدایت سے بھٹکنے کی وجہ سے ہے کیونکہ وہ راہ راست سے منحرف ہو کر تعصب اور عناد کی راہوں پر چل نکلے، اور جن خطبات میں (امیر المؤمنینؑ کا) احتجاج تھا ان کی شرح میں بہت حد تک ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا، اور غاصبین...... کے بارے میں علی علیہ السلام نے جس ظلم اور شکایت کا اظہار کیا، اس کلام کے کلمات کی ایسی ایسی بعید از عقل تاویلیں کیں جس سے طبیعتوں کو کراہت ہوتی ہے اور کانوں کو نفرت، اس شارح معتزلی نے بہت سے لوگوں راہ راست سے گمراہ کیا اور خود بھی گمراہ ہو گئے جیسا کہ تحقیق اور تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے خطبہ شقشقیة اور اس طرح کے خطبات میں کسی دلیل کے بغیر حضرتؑ کے کلام کو ظاہر سے ہٹا دیا۔

شرح بحرانی پر تبصرہ

۳۔ شیخ فقیہ حکیم متکلم میثم بن علی بن میثم بحرانی قدس اللہ روحہ ان کی شرح ۶۷۷ھ میں مکمل ہوئی۔ ان کی یہ شرح دوسری تمام شرحوں سے بہتر ہے، یہ ہر قسم کے حشو و زوائد اور غیر ضروری اضافوں سے خالی ہے مفید اور بہتر کلام سے بھی آراستہ ہے۔ لیکن چونکہ مرحوم کی زیادہ تر توجہ حکمت کے مطالب اور کلام کے مسائل کی طرف رہی لہٰذا انہوں نے شرح لکھنے میں اہل معقولات کا رستہ اپنایا جس سے منقولات کے فوائد مفقود نظر آتے ہیں۔ اور پھر جہاں پر حوالہ اور مقام کے تقاضوں کے مطابق کسی روایت کی ضرورت پڑی ہے تو وہاں پر انہوں نے عامہ (اہل سنت) کی اسناد و روایت کو ذکر کیا ہے جو نا قابل اعتبار ہیں اور ان کا ہاتھ آئمہ اطہار علیہم السلام کی اخبار و روایات کے دامان کے تمسک سے کوتاہ رہا ہے۔ اور پھر لغات میں صرف کلمات کے "مادوں" پر ہی اکتفا کیا گیا ہے "ہیئات" کی تحقیق کو چھوڑ دیا ہے۔

منہاج البراعہ کا سبب تالیف

پس چونکہ کوئی ایسی شرح جو اس کتاب (نہج البلاغہ) کے شایان شان ہو۔ میں نے رب العالمین کی ذات سے مدد چاہتے ہوئے اور عروة الوثقیٰ اور حبل المتین (امیر المؤمنین علیہ السلام) سے تمسک کرتے ہوئے اور اپنے اجداد طیبین (ائمہ طاہرین) علیہم السلام کے دامان عصمت سے تعلق پیدا کرتے ہوئے ایک ایسی شرح کو مرتب کرنے کا عزم کر لیا ہے جو شائقین کے مشکل مسائل کو آسان کر دے اور رغبت رکھنے والوں کے لیے اس کے پردوں کو ہٹا دے اور نئے نویلے مطالب کے چہروں سے نقاب کو الٹ دے۔ اس کی لغت، ترجمہ اور اعراب کو تفصیل وار بیان کرے اور جہاں پر دقیق معانی اور بیان کی حقیقتوں کو واضح کرنے کی ضرورت ہے انہیں فصاحت کے ساتھ واضح کرے۔ اس کے مشکل معانی کو احسن طریقے سے بیان کرے، اس کی بیان کی پیچیدگیوں کی پختہ انداز میں تفسیر کرے۔ اس کے اصولوں کو محکم کتاب (قرآن مجید) کی آیات سے آبیاری کرے اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی روایات سے اسے

مزین کرے۔ جس میں کثیر فضائل ہوں اور بہت سارے فوائد ہوں کہ جن سے دوسری شرحیں خالی ہیں۔

کتاب کا اسلوب کار

کتاب کو مندرجہ ذیل انداز میں حیطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔

اوّل: میں نے شرح میں بھی وہی اعداد تحریر کئے ہیں جو متن میں منتخب خطبات اور منتخب کلام وغیرہ میں ہیں۔ اس طرح کا انداز اختیار کرنے کی وجہ شائقین اور حوالہ تلاش کرنے والوں کے لئے سہولت پیدا کرنا ہے، کیونکہ بعض اوقات آپؑ کے کلام کی تشریح کیلئے آیات شریفہ، لطیف روایات، گہری تحقیق اور خوبصورت نکات پیش کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے پھر اس کے بعد آپؑ کا کلام اسی سابق انداز میں آجاتا ہے جسے استشہاد کے طور پر ذکر کرنا ہوتا ہے، بعض اوقات آپؑ کے دو کلاموں میں سے ایک، دوسرے کلام کی تفسیر ہوتا ہے یا دونوں کلام ایک جیسے ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں کبھی تو گذشتہ کلام کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض اوقات کلام کے آئندہ حصے کی طرف اشارہ کرنے کی۔ کیونکہ گذشتہ یا آئندہ کلام کو اسی جگہ پر ذکر کرنے سے بے جا تکرار اور طول پیدا ہو جاتا ہے جو سمجھدار لوگوں کیلئے اچھی بات نہیں ہے۔

دوّم: میں نے آپؑ کے تفصیلی خطبوں اور مفصل کلام کو چند فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور بعض اوقات مقتضائے حال کے مطابق اس کے ذیل میں دلچسپ اور عجیب باتوں کو بھی ذکر کیا ہے اور ان کے فصلوں میں تقسیم کرنے کا مقصد یہ ہے تاکہ شرح اگر طویل ہو جائے تو اس کو ذہن میں رکھنا آسان ہو اور آپؑ کا کلام بھی آسانی کے ساتھ یاد رہے اور شرح کے طولانی ہونے کی وجہ سے آپؑ کا کلام بعید العہد ہو کر ذہن سے نہ نکل جائے اور پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ حوالہ تلاش کرنے کی بھی آسانی ہو۔

سوم: میں نے لغت، معنی اور اعراب کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے۔ اور چھلکے اور مغز کو جدا کر دیا اور لغات میں مادوں اور شکل و بینات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے تاکہ کلمات کی اصل بجا و واضح ہو جائے اور اعراب میں عربی نکتے اور ادبی لطائف کو بھی ذکر کیا ہے جس سے ذہنوں کو جلا اور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور ہر ایک جملہ کے معانی کو ذکر کرتے وقت سند اور دلیل کے طور پر یا پھر مناسبت اور ربط کی وجہ سے موقع کی مناسبت سے آیات اور احادیث و روایات کو بھی لکھ دیا ہے۔ اور اس کی وجہ علم فرات کے پانی کو ان جملات اور آیات و روایات کی ندیوں کے ذریعہ پاکیزہ دلوں کی سرزمین تک پہنچانا ہے تاکہ اس سے ایسے ثمرے حاصل ہوں جو روح اور دل کی غذائیں اور صاحبان عقل و خرد کے لیے میوؤں کا کام کرے تُسْقىٰ بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ(۱) ترجمہ "جو سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور پھل کے لحاظ سے بعض کو بعض پر برتری حاصل ہوتی ہے" کیونکہ کلام الٰہی اور کلام پیغمبرؐ و آئمہ اطہارؑ کا منبع ایک ہی ہے جو ایک دوسرے کے لیے ممد و معاون اور ایک دوسرے کی حقیقتوں کو واضح کرتے ہیں۔

چہارم: معانی اور مقاصد کی وضاحت کے لیے میں نے متن کلام امیر المؤمنینؑ کے ساتھ اپنی شرح کو احسن انداز میں ملا کر پیش کیا ہے اور دونوں کلام (متن اور شرح) ایک کلام کی مانند ہو گئے ہیں، لیکن کہاں میں اور میرے جیسے لوگ کہ اپنے کلام کو امام کے کلام کے ساتھ نسبت دے سکیں، اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ لاغر کو فربہ کے ساتھ ملا دیا جائے یا کٹے ہوئے پتوں کے چارے کو

(۱) موصوف کا یہ اشارہ سورۂ رعد آیت نمبر ۴ کی طرف ہے

خالص چاندی کے ساتھ ؟ کجا سہیل (ستارے) کا مقام طلوع اور کجا سیلاب کی گذرگاہ ؟ اور پھر در کو کنکر سے اور تلوار کو عصا سے کیا نسبت ؟ اور سونے کو تانبے سے اور چاندی کو قلعی سے کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے ؟ اور ایک قطرے کی سیلاب کے چڑھتے منہ زور پانی کے ساتھ یا سراب کی مشروبات کے ساتھ کیسے برابری ہو سکتی ہے ؟۔

پنجم : جس فصل میں شارح معتزلی کے قلم سے لغزش ہوئی ہے یا اس کے پاؤں پھسلے ہیں اور اس کی بدعقیدگی نے اسے سیدھے راستے اور صراط مستقیم سے ہٹادیا ہے وہاں پر میں نے اس کے پورے کلام کو ذکر کرنے کے بعد اس کی لغزشوں اور گناہ پر اسے تنبیہ کی ہے۔

ششم : جس کلام میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے کسی سانحہ، واقعہ یا حادثہ کی طرف اشارہ کیا ہے تو وہاں پر میں نے اس واقعہ کی تشریح کی ہے اور مضبوط حوالوں کے ساتھ حادثہ کو بیان کیا ہے البتہ تفصیل ایسی ہے جس کیلئے درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے کہ نہ تو بالکل ہی اختصار سے کام لیا ہے اور نہ ہی کلام کو بے جا طول دیا ہے۔

ہفتم : سید رضی علیہ الرحمہ نے آپؑ کے کلام کو اس کتاب میں بطور " کلام مرسل " کے ذکر کیا ہے اور اسناد و رجال کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور چونکہ بزعم خود ان کا مقصد صرف خاص خاص نکات اور چیدہ چیدہ جملات کو ذکر کرنا اور مسلسل سارے کلام کو اول سے آخر تک نقل کرنا نہیں تھا لہذا طویل کلام یا خطبہ سے ایک یا چند فقرے منتخب کر لئے اور اس میں اختصار کا رستہ اختیار کیا اور کلام کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا یعنی کہیں پر ایسا ہے کہ کسی خطبہ کے ایک حصہ کو کتاب کے اول میں اور اسی کی ایک سطر کو کتاب کے آخر میں درج کیا ہے یہ چیز معنی اور اعراب کے سمجھنے کیلئے ہمارے لئے قلق و اضطراب کا باعث بنی، لہذا میں نے شرح میں سلسلہ سند اور تمام روایات کو ذکر کیا اور یہ مجھے کتب اخبار یعنی "کافی"، "من لا یحضرہ الفقیہ"، "بحار الانوار"، "وسائل الشیعہ"، "التوحید" اور "الارشاد" جیسی معتبر کتابوں میں سے جہاں سے بھی حاصل ہوئیں اور بہت سے مقامات ایسے بھی ہیں کہ جہاں روایت کو اس طرح نہیں لکھا گیا جس طرح کہ سید رضیؒ نے تحریر فرمایا ہے، اس لئے کہ دونوں روایات کے طریق جداگانہ ہیں، جن میں فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اس میں میری غرض یہ تھی کہ میں صدف کا سینہ چاک کر کے اپنے صالح بھائیوں اور راہ حق کے سالک دوستوں کے لیے بے بہا دُر نکالوں۔ اور اگر سوءِ ادب مانع نہ ہوتا تو میں سید رضیؒ مرحوم سے عرض کرتا کہ آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ کلام امامؑ کے فقروں میں فرق پیدا کریں ؟ جبکہ کلام الامام ہوتا ہی سارے کا سارا امام الکلام ہے اور آپ کو دوسرے فقرات کے حذف و ساقط کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی ؟ اور ایسے کلام کو ٹکڑوں میں کیونکر تقسیم کر دیا جو ملک علام ذات ذوالجلال والاکرام کے کلام اور سید الانام علیہ الصلوۃ والسلام کے کلام کے پیچھے پیچھے ہیں ؟ آیا امام علیہ السلام کا باب خطابہ میں کوئی ایسا کلام ہے جو فصیح نہ ہو ؟ جب کہ تمام فصحاء آپ کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں اور آیا کوئی خطبہ غیر فصیح ہے ؟ جبکہ تمام بلغاء آپ کے دامانِ عصمت سے متمسک ہیں۔

اس کے باوجود مجھے اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا بھی اعتراف ہے اور میر اشمار اس بنیاد کے بانیوں میں سے نہیں ہوتا یا اس میدان میں سبقت کا بھی مجھے دعویٰ نہیں ہے، ہاں البتہ کریم کے عمومی کرم کو اور فیاض ازل کے وسیع فیض کو نہ تو روکا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کمی آسکتی ہے پس بعید نہیں ہے کہ اس کے فیض عام کے نور کی شعاعیں ایسے شخص پر بھی آن پڑیں جو اس عزت و تکریم کے لائق

نہیں ہے کیونکہ نہج البلاغہ جو ایسی کتاب ہے کہ بحمد اللہ مبتدی کے لئے قوتِ بازو اور منتہی کے لئے سبب نجات ہے، فصیح کے لئے مفتاح اور بلیغ کے لئے مصباح ہے۔ رہروانِ حقیقت کے لئے بصیرت اور زاہدوں کیلئے ذخیرہ آخرت ہے۔ شریعت کیلئے واضح راستہ اور شیعوں کیلئے دلیل و حجت ہے، مناظر کیلئے راہنماء اور واعظ کیلئے ذریعہ وعظ ہے اور میں نے اپنی اس کتاب کا نام **"منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ"** رکھا ہے اور اسے ہدیہ کیا ہے اس ذات کے حضور جس کے آنگن میں آرزوؤں کی سواریاں اترتی ہیں اور جس کے دروازے کو سوالیوں کے ہاتھ کھٹکھٹاتے ہیں جو عالمین کے لئے خدا کی حجت اور زمین میں خدا کی آیت ہے جسے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" (بقرہ / ۲۰۷ اور کچھ لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کیلئے بیچ دیتے ہیں) کی منقبت سے نوزا گیا ہے اور "اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ" (توبہ / ۱۹ "کیا حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کو آباد کرنے کا عمل اس شخص کے عمل کی طرح قرار دیتے ہو...... ؟") کے شرف سے جو ابرار (نیک لوگوں) کے لئے خدا کی نعمت اور فجار (بدکرداروں) کیلئے عذاب الٰہی ہے۔ جو میدان افتخار میں تازیانہ سبقت کے حامل اور درخشندہ فخر کیلئے گوناگوں اور محیّر العقول فضیلت کی جامع ہے، تابندہ عطیات کی مالک اور روشن مناقب کی حامل ہے۔ اور وہ ذات گرامی میرے سردار، میرے کونین کے مولا، رسول الثقلینؐ کے وصی، حسنین شریفینؑ کے والد، دین کے سردار ور ہنماء، مومنین کے امیر، اسد اللہ الغالب یعنی علی ابن ابی طالبؑ ہیں، خدا کے درود و سلام و تحیات ہوں ان پر اور ان کی پاک اولاد پر، اور میرے دل و جان عالمین کی روحوں کے ساتھ ان کے اوپر قربان جائیں (بقول شاعر) :

أَهْدَتْ سُلَيْمَانَ يَوْمَ الْعَرْضِ نَمْلَةٌ — رِجْلَ الْجَرَادِ الَّتِي قَدْ كَانَ فِي فِيهَا

تَرَنَّمَتْ بِفَصِيحِ الْقَوْلِ وَاعْتَذَرَتْ — اَنَّ الْهَدَايَا عَلَىٰ مِقْدَارِ مُهْدِيهَا

ایک دن چیونٹی حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے منہ میں ٹڈی کا پاؤں لے کر فصیح الفاظ میں گنگناتے ہوئے معذرت کے انداز میں کہنے لگی "ہدیئے ہمیشہ دینے والوں کی حیثیت کے مطابق ہوتے ہیں"

میں حضور امیر المؤمنین کے عظیم فضل اور عمیم کرم سے امید رکھتا ہوں کہ میرے اس ہدیئے کا صلہ یہ دیں گے کہ اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں میرے ان گناہوں کی معافی کی سفارش کریں گے جو دعاؤں کو (مقام اجابت تک پہنچنے سے) روک دیتے ہیں، نعمتوں کو بدل دیتے ہیں، اور میرے ان معاصی کی شفاعت کریں گے جو عصمتوں کے دریدہ ہونے کا سبب بنتے ہیں اور عذاب کے نازل ہونے کا موجب ہوتے ہیں، (میری دعا ہے کہ مجھے) اللہ تعالیٰ دارین کی سعادت اور دونوں جہانوں میں توفیق عطا فرمائے یقیناوہ احسان، کرم اور بخشش کا مالک ہے۔

اپنا اصل مقصد شروع کرنے سے پہلے ایک مقدمہ اور چند اہم مطالب کو بیان کرنا ضروری ہے جو شرح میں مذکور مطالب کو سمجھنے کیلئے معاون اور آنے والے مباحث کیلئے بصیرت کے اضافہ کا موجب ہیں۔ تو سب سے پہلے :

مقدمہ

یہ مقدمہ معنی کے لحاظ سے لفظ کی تقسیم میں ہے اور اس میں کئی طرح کی بحثیں ہوں گی۔

پہلی بحث

لفظ کی تقسیم: لفظ اور معنی یا تو دونوں متحد ہونگے یا دونوں مختلف، یا لفظ ایک ہوگا اور اس کے معانی کئی ہونگے یا معنی ایک ہوگا اور اس کیلئے الفاظ کئی ہوں گے۔ تو اس تقسیم کے پیش نظر چار قسمیں بنتی ہیں۔

پہلی قسم: یہ ہے کہ جب لفظ اور معنی دونوں ایک ہوں، تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کیلئے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ اگرچہ علامہ حلیؒ نے اپنی کتاب "النہایہ" میں اس کا ذکر کیا ہے اور اکثر لوگوں نے اس مقام پر ان کی پیروی کی ہے، اور انہوں نے اس کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے؛ ایک جزئی ہے جیسے عَلَم، مضمرات اور مبہمات ہیں۔ اور دوسرے کُلی ہیں جیسے کلی متواطی اور کلی مشکک۔ اور اس طرح کہ اگر ان کی تقسیم شدہ معنی سے مراد خصوصی طور پر حقیقی معنی ہو، پھر ایسی صورت میں آئندہ اقسام میں ان کی تقسیم باطل ہو جائے گی۔ اور اگر ان کی مراد حقیقی اور مجازی معنی ہو تو پھر اس قسم کی تقسیم میں بھی مشکل پیش آئے گی، اس لئے کہ ہر ایک حقیقت کیلئے ایک مجاز ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہمارے پاس بظاہر کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو متحد المعنی ہو۔ (غور کیجئے گا)

دوسری قسم: یہ کہ لفظ اور معنی دونوں کثیر اور متعدد ہوں، یعنی الفاظ بھی کئی ہوں اور معانی بھی بہت ہوں تو ایسی صورت میں الفاظ جدا جدا ہوں لیکن پھر اس کا مفہوم کلی طور پر ایک ہوگا جیسے انسان اور ضاحک یا جزئی طور پر ایک ہوگا مثلاً ان دو لفظوں کے درمیان عام خاص مطلق کی نسبت ہوگی یا عام خاص من وجہ کی۔ یا پھر ان کا مفہوم مختلف ہوگا جس طرح متقابلین ہیں کہ ان کے درمیان یا تضاد اور تضایف کی نسبت ہوگی یا ایجاب اور سلب کی یا پھر عدم اور ملکہ کی۔

تیسری قسم: لفظ کئی ہوں لیکن ان سب کا معنی ایک ہو۔ تو ان الفاظ کو مترادف کہا جائے گا خواہ ایک ہی لغت کے الفاظ ہوں جیسے "لیث" اور "اسد" ہے یا دو لغات کے۔

چوتھی قسم: لفظ ایک ہو لیکن اس کے معانی زیادہ ہوں تو پھر اس کی کئی قسمیں ہیں، اور وہ یوں کہ یا تو وہ لفظ دو معنوں میں سے کسی ایک کیلئے وضع کیا گیا ہوگا یا دونوں ہی کیلئے۔ اب پہلی صورت میں اگر ایک معنی کیلئے وضع کیا گیا ہے لیکن استعمال دوسرے معنی میں ہونے لگ جائے لیکن اس دوسرے معنی اور معنی موضوع لہ کے درمیان کوئی تعلق بھی ہو اور ایسا قرینہ بھی ہو جو اسے پہلے معنی سے ہٹا کر دوسرے معنی کیلئے استعمال کا سبب بن رہا ہو تو ایسی صورت میں پہلے معنی کی نسبت اسے "حقیقت" اور دوسرے معنی کی نسبت "مجاز مرسل" کہیں گے، اگر وہ تعلق اور مشابہت نہ رکھتا ہو اور اگر مشابہت رکھتا ہو تو "استعارہ" کہیں گے۔ اور اگر لفظ وضع تو کیا گیا تھا کسی ایک معنی کیلئے لیکن وہ منتقل ہو کر کسی دوسرے معنی میں استعمال ہونے لگا اور یہ نقل کسی تعلق کے بغیر تھی تو اسے "مرتجل" کہتے ہیں(۱) جیسے لفظ "جعفر" ہے جو کہ عَلَم ہے جبکہ اس کو "چھوٹی نہر" کے معنی کیلئے وضع کیا گیا تھا اور اگر "نقل" دونوں

(۱) مرتجل کی یہ تفسیر اصولیین کے نزدیک ہے جو نحویوں کی تفسیر کے مخالف ہے کیونکہ نحویوں کے نزدیک مرتجل وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کیلئے ہی بنایا گیا ہو اور کسی بھی لحاظ سے منقول نہ ہو یہ الفاظ دیگر وہ وضع ہی اس کیلئے کیا گیا ہو۔

معنوں میں کسی تعلق اور مناسبت کی وجہ سے ہو تو لفظ کو دوسرے معنی کی نسبت سے "منقول" کہیں گیا ور اگر نقل کرنے والے اہل لغت ہوں تو "منقول لغوی" کہلائے گا، جیسے لفظ "غائط" ہے جو انسانی فضلہ کیلئے استعمال ہوتا ہے جبکہ اسے وضع کیا گیا تھا "زمین کی نشیبی جگہ" کیلئے اور اگر "ناقل" عرف عام ہو تو اسے "منقول عرفی" کہیں گے جیسے لفظ 'دابہ' ہے جو گھوڑے کیلئے بولا جاتا ہے جبکہ اسے وضع کیا گیا تھا ہر اس چیز کیلئے جو زمین پر چلتی ہے۔ اور اگر "ناقل" عرف خاص ہو تو اسے "عرفیہ خاصہ" کہتے ہیں جیسے نحویوں کی اصطلاح میں اسم، فعل اور حرف جیسے الفاظ ہیں، جبکہ اہل منطق کے نزدیک یہ موضوع اور محمول کہلاتے ہیں۔ اور اگر "ناقل" شارع ہو تو پھر یہ لفظ "منقول شرعی" کہلائے گا جیسے صلواۃ، زکواۃ، اور حج وغیرہ ہیں۔ اور پھر نقل یا تو "تخصیص اور تعیین" کے ساتھ ہوگی یا "تخصص اور تعین" کے ساتھ۔ یعنی لفظ کا استعمال دوسرے معنی میں قرینہ کے ساتھ مجازاً ہوگا اور اسی معنی میں اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہوگا کہ دوسرے معنی میں اس قدر مشہور ہو جائے کہ اب قرینہ کی بھی ضرورت نہ رہے گویا اپنے پہلے معنی کو چھوڑ چکا ہے اور ظاہر ہے کہ عرف عام میں تمام منقول الفاظ کا تعلق اسی قبیل سے ہے جس طرح بعض عرفیہ خاصہ کے منقول الفاظ اسی طرح ہیں (تو یہ تو تھی تخصیص اور تعیین کی بات) اب رہی "تخصص اور تعین" کی بات، تو وہ یوں ہے کہ ایک لفظ دو یا دو سے زیادہ معانی کیلئے اکٹھا وضع کیا گیا ہو تو ان ہی معانی کے لحاظ سے اسے "مشترک" کہیں گے اور ان میں سے صرف ایک کی نسبت اسے مجمل کہیں گے۔

اور متعدد قسم کی وضع اپنے واضع کے اعتبار سے ہوتی ہے، یعنی بعض اوقات ایک لفظ کو وضع کرنے والے متعدد ہوتے ہیں اور ایک کی وضع کی خبر دوسرے کو نہیں ہوتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی واضع ہوتا ہے اور کسی لفظ کو ایک مرتبہ تو کسی معنی کیلئے وضع کرتا ہے اور دوسری مرتبہ کسی اور معنی کیلئے اور دوسری مرتبہ وضع کرتے وقت پہلا معنی اسے یاد نہیں ہوتا یا بھولے یاد تو ہوتا ہے لیکن پہلے اور دوسرے معنی میں کسی مناسبت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا تو اب ایسی صورت میں اس کے اور مرتجل کے درمیان فرق پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا، مگر یہ کہ اس دوسرے معنی میں "ارتجال" کیلئے "شہرت" کی شرط لگا دی جائے۔ اور حق بات بھی یہی ہے۔ اب یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو گئی کہ "فاضل قمی" نے صاحب "قسطاس" کی مانند "مرتجل" کو "مشترک" میں شامل کرکے بے جا کیا ہے۔ البتہ بات سمجھنے کی ہے۔

دوسری بحث

دلالت کی قسمیں: لفظ کی دلالت اپنے معنی پر یا تو اس معنی کیلئے وضع کئے جانے والے کی وجہ سے ہوگی، تو ایسی دلالت کو "دلالت مطابقی" کہیں گے۔ جیسے انسان کا لفظ "حیوان ناطق" کیلئے مجموعی طور پر دلالت کرتا ہے۔ یا اس کی دلالت، معنی موضوع لہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ہوگی تو اسے دلالت تضمنی کہتے ہیں، جیسے لفظ انسان کی دلالت صرف "حیوان" پر یا صرف "ناطق" پر، یا پھر اس کی دلالت اس وجہ سے ہوگی کہ وہ معنی موضوع لہ کیلئے لازم ہے تو اس صورت میں اسے "دلالت التزامی" کہیں گے۔ جیسے لفظ انسان کی دلالت "قابل العلم" اور "صنعت کتابت" پر۔

علم بیان والوں کے نزدیک پہلی دلالت یعنی لفظ کی اپنے تمام معنی موضوع لہ پر دلالت "دلالت وضعیہ" کہلاتی ہے اور باقی

دونوں قسموں کی دلالتوں کو "دلالت عقلیہ" کہا جاتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں میں عقل ہی کا تعلق ہوتا ہے کیونکہ عقل ہی معنی موضوع لہ کو دلالت کا جزء یا اس کیلئے لازم قرار دیتی ہے لیکن اہل منطق ان تینوں دلالتوں کو "دلالت وضعیہ" کا نام دیتے ہیں اس لئے کہ ان میں وضع کو عمل دخل حاصل ہے اور "دلالت عقلیہ" کو "عقلیہ صرفہ" کا نام دیتے ہیں جو وضعیہ اور طبعیہ کے مقابل میں ہے۔ مثلاً دھوئیں کی دلالت آگ پر اور پس دیوار سے سنی جانے والی آواز کی دلالت بولنے والے کے وجود پر اور اس میں کسی قسم کا جھگڑا اور کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب یہ بات معلوم ہو چکی تو اب ہم کہتے ہیں کہ "مطابقت" کے تحت دلالت کرنے والا لفظ یا تو مفرد ہو گا یا مرکب کیونکہ اگر لفظ کی جزء سے معنی کی جزء پر دلالت مقصود نہ ہو تو مفرد ہے ورنہ مرکب، اور پھر مفرد کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ جس کی بالکل ہی جزء نہ ہو جیسے "ن" اور "ع" ہیں جب ان کو کسی کا عَلَم (نام) بنا دیا جائے۔

۲۔ لفظ کی جزء تو ہو لیکن معنی کی جزء نہ ہو جیسے لفظ "اللہ" ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کا نام ہے۔

۳۔ لفظ کی جزء بھی ہو اور معنی کی جزء بھی ہو لیکن اس پر اس کی دلالت نہ ہو جیسے محمد علی، حسن علی وغیرہ جو ترکیب مزجی کے ساتھ نام ہوتے ہیں۔

۴۔ لفظ کی جزء بھی ہو اور معنی کی جزء بھی ہو اور لفظ کی جزء معنی کی جزء پر دلالت بھی کرے۔ لیکن دلالت مقصود نہ ہو جیسے "حیوان ناطق" جب کسی انسان کا نام رکھ دیا جائے۔

لے دے کر صرف ایک قسم رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ کی جزء معنی کی جزء پر دلالت اور وہ دلالت مقصود بھی ہو اور یہ ترکیب خواہ قید کی صورت میں ہو یعنی "ترکیب تقییدی" ہو جیسے "غُلَامُ زَيْدٍ" یا "اَلْحَيْوَانُ النَّاطِقُ" ہے۔ یا ترکیب غیر تقییدی ہو جیسے "خَمْسَةَ عَشَرَةَ" ہے اور "مرکب تام" ہو یعنی جس پر سکوت صحیح ہو جیسے "ضَرَبَ زَيْدٌ" یا "زَيْدٌ قَائِمٌ" ہے۔ یا "مرکب غیر تام" ہو جیسا کہ اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، اور یہاں ہر مرکب میں جزء سے مراد عام ہے خواہ وہ جزء "محقق" ہو یا "مقدر" ہو تو اس میں "قُمْ" (یعنی تو کھڑا ہو) جیسے الفاظ داخل ہو جائیں گے جبکہ وہ امر ہوں، کیونکہ ان میں ایک جزء مقدر ہوتی ہے اور وہ ہے "أَنْتَ" (یعنی تو)۔

اسی طرح اس سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ کلمہ جو کسی اور لفظ سے مل کر اپنے استقلال سے نہ نکل جائے مثلاً "مُسلِمَانِ" "مُسلِمُونَ" اور "لِيَضْرِبَ" اور اس قسم کے دوسرے افعال مضارعہ ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک لفظ کی ہر ایک جزء اپنے اپنے معنی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ "مسلمان" میں "الف اور نون" تثنیہ ہونے پر اور "مُسْلِمُوْنَ" میں "واؤ اور نون" جمع ہونے پر اور حرف مضارع کے معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اس طرح لام تعریف، تنوین، تنکیر اور تاء تانیث وغیرہ وغیرہ جیسی چیزیں جو کلمہ پر داخل ہوں یا اس سے ملحق ہوں تو ایک علیحدہ معنی پر دلالت کرتی ہیں، البتہ یہ اور بات ہے کہ جن کلمات پر یہ چیزیں داخل ہوتی ہیں یا ملحق ہوتی ہیں وہ شدت امتزاج کی وجہ سے ایک کلمہ کی مانند ہو چکے ہیں اور اعرابی حرکات میں ان کے ساتھ لفظ مفرد کا جیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔

ہاں البتہ ایک اشکال فعل ماضی میں باقی رہ جاتا ہے، کیونکہ وہ "مادّہ" کے لحاظ سے تو حدث پر دلالت کرتا ہے لیکن "ہیئت" کے لحاظ سے زمانہ ماضی میں حدث کے حصول پر۔ اور ہیئت، لفظ کی جزء ہوتی ہے، کیونکہ وہ عبارت ہے حروف کی تعداد اور تمام حرکات و سکنات کے ساتھ جو اس کے "وضع معین" کے طور پر وضع کی گئی ہیں، اور حرکات ہی وہ چیز ہوتی ہیں جن سے کلمہ کا تلفظ ہوتا ہے، اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ یہاں پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر طاری ہونے والی ہیئت کلمہ کا جزء بن چکی ہو، لہذا اسے مرکب کے زمرہ میں داخل ہونا چاہئے۔ حالانکہ حضرات اسے مفرد میں شمار کرتے ہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ مرکب کی تعریف یوں کی جائے کہ "دونوں اجزاء سے مراد وہ اجزاء ہیں جن میں سے ایک جزء دوسرے کے ساتھ ساتھ آئے" اور فعل ماضی میں دونوں اجزاء ایک ہی ساتھ سنے جاتے ہیں۔

تیسری بحث

کلی اور جزئی: اگر لفظ مفرد کے مفہوم کا فقط تصور (کثیرین کی) شرکت سے مانع ہو تو اس لفظ کو جزئی کہتے ہیں، "مدلول" کا نام "دال" کو دیا گیا ہے جیسے "زید" جب عَلَم (کسی کا نام) ہو، اور اگر مانع نہ ہو تو "کلی" کہلاتا ہے، خواہ اس میں شرکت کا واقع ہونا ممتنع ہو اس کی اپنی وجہ سے نہیں بلکہ کسی خارجی دلیل کی وجہ سے جیسے "واجب الوجود" ہے، یا ممتنع نہ ہو جیسے "انسان" ہے کہ اس میں زید، عمرو اور خالد وغیرہ سب شریک ہیں۔ اور خواہ خارج میں اس کے افراد متعدد ہوں جیسے "انسان" ہے یا افراد متعدد نہ ہوں جیسے "سورج" ہے۔ اور کبھی جزئی کا اطلاق ایسے اخص پر ہوتا ہے جو کسی "اعم" کے تحت ہو خواہ وہ فی نفسہٖ اعم ہو اور وہ جزئی سے اس کے معنی اول کے ساتھ اعم ہوتا ہے اور "جزئی اضافی" کے نام کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے جبکہ پہلے معنی کے لحاظ سے اسے "جزئی حقیقی" کہا جاتا ہے۔ اور اگر کلی کا صدق اپنے تمام افراد پر مساوی ہو تو اسے "کلی متواطی" کہتے ہیں جیسے "انسان" کیونکہ اس کا اطلاق اپنے تمام افراد پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ اور اگر اس کا صدق اپنے تمام افراد پر ایک جیسا نہ ہو بلکہ یا تو بعض پر دوسرے بعض سے اولیٰ ہو، جیسے "وجود" کا صدق جوہر اور عرض پر ہوتا ہے لیکن جوہر، عرض سے "اولیٰ" ہوتا ہے۔ یا بعض کیلئے "اقدم" ہو، جیسے وجود کا اطلاق "علت" اور "معلول" کیلئے۔ یا "اشد" ہو "بیاض" (سفیدی) کا اطلاق "برف" اور "عاج" (ہاتھی دانت) پر۔ غرض، وجود کا اطلاق جوہر پر اولیٰ ہوتا ہے، علت پر اقدم ہوتا ہے اور بیاض کا اطلاق برف پر اشد ہوتا ہے۔ تو ان تمام صورتوں میں کلی کو "کلی مشکک" کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے افراد کے لحاظ سے اصل معنی میں تو مشترک ہیں لیکن اولویت، اقدمیت، اور اشدیت کے لحاظ سے مختلف ہیں جو کہ دیکھنے والے کے تشکیک کا باعث ہوتا ہے۔ جب کوئی اسے اشتراک کے لحاظ سے دیکھتا ہے تو اسے گمان ہوتا ہے کہ وہ متواطی ہے، اس لئے کہ اس کا اپنے تمام افراد پر ایک جیسا اطلاق ہو رہا ہے لیکن جب اسے اختلاف کے لحاظ سے دیکھتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ وہ "مشترک لفظی" ہے، کیونکہ ایک ہی لفظ مختلف معانی کیلئے وضع کیا گیا ہے اور مشترک کی بھی تو یہی تعریف ہے۔

فاضل قمیؒ اپنی کتاب "قوانین الاصول" میں فرماتے ہیں کہ "لفظ کی کلی، جزئی، تواطی اور تشکیک میں تقسیم تو واضح ہے، لیکن فعل اور حرف اصطلاحی طور پر کلی اور جزئی کے ساتھ موصوف نہیں ہو سکتے"۔

(از مترجم : یہاں پر فاضل قمیؒ اور مصنفؒ کی گفتگو بڑی مفصل ہے جو ہمارے مقصد اور مدعا سے خارج ہے لہذا اس طولانی بحث کو درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

چوتھی بحث

مرکب تام کی اقسام لفظ "مرکب تام" یعنی جس پر سکوت صحیح ہوتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ : ایک، نسبت تامہ ہو جو طرفین کے درمیان پائی جائے اور نفس متکلم کے ساتھ قائم ہو۔ اگر اس نسبت کا تعلق تین زمانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو تو اس کلام کو "خبر" کہتے ہیں جیسے " زَیْدٌ قَائِمٌ "(زید کھڑا ہے) اور " سَیَقُومُ زَیْدٌ "(زید عنقریب کھڑا ہوگا)۔ اور نسبت کا کسی زمانے سے تعلق نہ ہو تو اس کلام کو "انشاء" کہتے ہیں، جیسے امر، نہی، التماس، سوال، تمنی، ترجی، استفہام، قسم، ندا اور تعجب ہے۔ اسی طرح دو، "جملے خبریۓ" سے مراد "انشاء" ہوتی ہے اور انشاء یا تو نقل کے ذریعہ ہوتی ہے جیسے افعال مدح وذم ہیں مثلاً " نِعْمَ زَیْدٌ "(زید اچھا ہے) یا " بِئْسَ زَیْدٌ "(زید برا ہے) یا جیسے "عقود" کے صیغے ہیں، جیسے " بِعْتُ "(میں نے بیچا)، " إِشْتَرَیْتُ "(میں نے خریدا)، " أَنْکَحْتُ "(میں نے نکاح میں دیا) یا " زَوَّجْتُ "(میں نے تزویج میں دیا) وغیرہ۔ یا نقل کے ذریعہ نہ ہو جیسے خداوند عالم کا فرمان ہے : " وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ "(آل عمران / ۹۷) لوگوں پر خدا کی طرف سے ہے بیت اللہ کا حج، یا " وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ "(بقرہ / ۲۳۳) یعنی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ اور اس طرح کی کئی دوسری آیات ہیں۔ اور خبر اور انشاء میں فرق یہ ہوتا ہے کہ : نسبت جزئیہ کا وجود لفظ میں بھی ہوتا ہے، ذہن میں بھی ہوتا ہے اور خارج میں بھی ہوتا ہے۔ جبکہ نسبت انشائیہ کا وجود لفظ اور ذہن میں تو ہوتا ہے لیکن خارج میں نہیں ہوتا۔ اور پھر خبر کی نسبت لفظیہ اگر اس کی نسبت خارجیہ کے مطابق ہو یعنی دونوں نسبتیں ثبوتی ہوں یا دونوں سلبی ہوں تو اس خبر کو "صدق" کہتے ہیں اس لیے کہ یہ واقعہ کے مطابق ہے اور "حق" کہتے ہیں اس لیے کہ واقعہ اس کے مطابق ہے۔

اس کی نسبت " لفظیہ "نسبت" خارجیہ " کے مطابق نہ ہو تو اس خبر کو "کذب" کہتے ہیں اس لیے کہ واقعہ کے مطابق نہیں ہے اور " باطل " کہتے ہیں اس لیے کہ واقعہ اس کے مطابق نہیں ہوتا، پس صدق اور حق، مثل کذب وباطل کے ہیں کیونکہ دونوں ذات کے لحاظ سے متحد ہوتے ہیں اور اعتبار کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

پھر مخبر (خبر دینے والے) کا اس خبر سے قصد مخاطب کو کوئی فائدہ پہنچانا ہوتا ہے یا تو "حکم" ہوگا، یعنی حکم سے مراد نسبت کا "وقوع" ہوتا ہے یا "لا وقوع" ہوتا ہے یا جسے خبر دی جارہی ہے اس لیے عالم ہوتا ہے وقوع نسبت کی مثال جیسے " زیدٌ قائم " ہے اس شخص سے کہا جائے جو اس کے قیام سے باخبر ہے۔ دوسرے کی مثال " زیدٌ قائم ہے "اس شخص سے کہا جائے جو اس کے قیام سے بے خبر ہے پہلی قسم کو "فائدہ خبر " کہتے ہیں اور دوسری کو " لازم خبر " کہا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خبر کے وقوع یا لاوقوع کو جاننے والا مخاطب بمنزلہ جاہل کے ہوتا ہے اور اسے خبر پہنچائی جاتی ہے خواہ وہ ان دونوں فائدوں کو جانتا ہو لیکن اپنے علم کے مطابق اس پر عمل نہیں کرتا، چنانچہ جو شخص اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے وہ اور

جاہل برابر ہوتے ہیں، مثلاً آپ کسی ایسے شخص سے "اَلصَّلٰوۃُ وَاجِبَۃٌ" (نماز واجب ہے) کہتے ہیں جو نماز کے واجبات کو جانتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا اور یہ معنی یعنی عالم کو جاہل کے مرتبہ تک لے آنا، خطاب کی غرض سے ہوتا ہے اور یہ خبر امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام میں بہت زیادہ ملتی ہے مثلاً آپؑ خطبہ ۲۹ میں اہل عراق کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جب وہ شامیوں کے ساتھ جہاد کرنے کی بجائے بیٹھ گئے تھے آپؑ فرماتے ہیں "اَلْقَوْمُ رِجَالٌ اَمْثَالُکُمْ" (وہ لوگ تمہاری ہی کی طرح کے مرد ہیں)۔ یا ایک اور خطبہ ۶۲ میں فرماتے ہیں "فَاسْتَعِدُّوا لِلْمَوْتِ قَدْ اَظَلَّکُمْ" (پس اس موت کیلئے تیار ہو جاؤ جو تم پر سایہ فگن ہو چکی ہے)۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جن سے آنجنابؑ کے انداز کلام کو اچھی طرح جاننے والا شخص باخبر ہے۔

جب خبر دینے والے کا قصد، مخاطب کو فائدہ پہنچانا نہیں ہوتا تو اس طرح خبر دینے میں صرف بقدر ضرورت پر اکتفا کرنا ہوتا ہے لہذا اگر مخاطب حکم اور اس کے بارے میں تردد کی وجہ سے خالی الذہن ہو تو حکم میں تاکید پیدا کرنے والے کلمات کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر وہ حکم میں تردد کر رہا ہوتا ہے جبکہ حکم کا طالب بھی ہو تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ خبر کو تاکید کے ساتھ تقویت پہنچائی جائے اور اگر حکم کا بالکل ہی منکر ہوتا ہے تو اس کے انکار کے مطابق تاکید کو لانا واجب ہو جاتا ہے اور اسباب (کلمات) تاکید یہ ہیں: اِنَّ، لام، جملہ کا اسمیہ لانا، جملہ کی تکرار، نون تاکید، حرف صلہ، اِمّا شرطیہ، حرف تنبیہ اور قسم۔ اور پہلی قسم یعنی مخاطب کا خالی الذہن ہونے کی صورت میں کلام کو بھی تاکید سے خالی بیان کیا جاتا ہے تو اس قسم کو "ابتدائی" کہا جاتا ہے جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام خطبہ اول میں فرماتے ہیں؛ "وَفَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ، الَّذِي جَعَلَهُ قِبْلَةً لِلْاَنَامِ" (اور اس نے تم پر اپنے گھر کا حج لازم قرار دیا ہے کہ جس گھر کو اس نے انسانوں کیلئے قبلہ بنایا ہے)۔ اور دوسری قسم کہ جہاں پر مخاطب کیلئے کلام میں اچھے انداز میں تاکید کی ضرورت ہوتی ہے اسے "طلبی" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپؑ اپنے خطبہ ۷۰ میں ارشاد فرماتے ہیں "اَمَا وَ اللّٰهِ مَا اَتَيْتُكُمْ اِخْتِيَاراً وَ لٰكِنْ جِئْتُ اِلَيْكُمْ سَوْقاً" (یعنی: خدا جان لو کہ میں تمہارے پاس اپنے اختیار کے ساتھ نہیں آیا ہوں بلکہ حالات سے مجبور ہو کر آ گیا ہوں)۔

تیسری قسم "انکاری" کہلاتی ہے کہ جہاں پر مخاطب انکار پر اتر آتا ہے جیسے آپ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں؛ "وَ اِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ" (یعنی لوگوں کیلئے ایک حکمران ضروری ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد خطبہ ۴۰)۔ اور جوں جوں انکار بڑھتا جائے گا تاکید میں بھی اس قدر اضافہ ہوتا جائے گا جیسا کہ سورہ یس / ۱۴۔۱۶ میں اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام کے فرستادگان کی زبانی ذکر فرمایا ہے کہ جب پہلی مرتبہ ان لوگوں کی بات نہ مانی گئی تو انہوں نے کہا "اِنَّا اِلَيْكُمْ مُرْسَلُوْنَ" (یقیناً ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں) اور دوسری مرتبہ تکذیب کے موقع پر کہا "اِنَّا اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ" (یقین جانو کہ ہم ضرور تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں)۔

تو ان تینوں مذکورہ صورتوں میں اظہار کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں کلام تاکید سے خالی ہے، دوسری صورت میں استحسان کے طور پر تاکید کو لایا گیا ہے اور تیسری صورت میں انکار کے مطابق تاکید میں اضافہ ہوتا گیا ہے گویا

ظاہر کلام کے تقاضوں کے مطابق ہی اس کا استعمال ہو گا۔اور کافی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کلام میں مذکورہ صورتوں کے خلاف بھی تاکید کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے اور وہ اس وقت ہوتا ہے مخاطب بظاہر کسی چیز کا انکار نہیں کرتا لیکن اس سے انکار کی علامت ظاہر ہوتی ہے تو اسے منکر کی مانند سمجھ لیا جاتا ہے اور وہاں پر تاکید کا استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ آپؑ اپنے خطبہ ۲۸ میں ارشاد فرماتے ہیں " أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ الدُّنْيَا قَدْ أَدْبَرَتْ وَ آذَنَتْ بِوَدَاعٍ ، وَ إِنَّ الآخِرَةَ قَدْ أَقْبَلَتْ وَ أَشْرَفَتْ بِاطِّلَاعٍ "(بہر حال یقیناً دنیا پیٹھ پھیر چکی ہے اور بچھڑنے کا اعلان کر چکی ہے اور آخرت تو یقیناً آچکی ہے اور آنے کی اطلاع دے چکی ہے)۔ایسے موقع پر لوگ دنیا کے پشت پھیرنے اور آخرت کے رخ کرنے کے منکر نہیں تھے لیکن وہ دنیاوی دھندوں میں اس قدر مست اور آخرت سے اس حد تک غافل ہو چکے تھے کہ گویا وہ ان باتوں کے منکر ہو گئے ہوں اس لئے امامؑ نے انہیں منکرین کی فہرست میں اس وجہ سے شمار کیا کہ ان سے منکرین کی جیسی علامتیں نمایاں تھیں اور خطبہ کے آخر تک کلام کو تاکید کے ساتھ بیان کیا اور آپ کے بہت سے خطبات میں اس طرح کا کلام ہے کہ جس میں دنیا سے نفرت اور آخرت کیلئے رغبت دلائی گئی ہے اور اس بارے میں آپ کو امام علیہ السلام کے مندرجہ ذیل قول کی تشریح میں بہت کچھ ملے گا۔" فَإِنَّهُ وَاللهِ الْجِدُّ لاَ اللَّعِبُ وَالْحَقُّ لاَ الْكَذِبُ وَ مَا هُوَ إِلاَّ الْمَوْتُ "(کیونکہ یہ چیز خدا کی قسم یقیناً سنجیدہ ہے کوئی مذاق نہیں اور حق بات ہے کوئی جھوٹی بات نہیں ہے اور وہ صرف موت ہے، خطبہ ۱۳۱)خطبہ ۱۳۱ میں تاکید کی دس اقسام ذکر کی گئی ہیں اور یہ صرف امامؑ کے کلام ہی کا خلاصہ ہے اور کبھی منکر کو غیر منکر سمجھ لیا جاتا ہے جب اس کے پاس ایسے دلائل اور شواہد ہوں کہ اگر ان میں غور و فکر کرے تو انکار سے باز آجائے جیسے خداوند عالم فرماتا ہے " لاَ رَيْبَ فِيهِ "(اس کتاب میں شک نہیں ہے۔بقرہ/۲)کیونکہ قرآن مجید سے عیب و شک کی نفی اس معنی کے لحاظ سے نہیں ہے کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کرتا بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ اس میں چونکہ شک کی گنجائش نہیں لہذا شک نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ قرآن اپنے واضح اور ساطع براہین کی وجہ سے شک کرنے کا مقام نہیں ہے تو گویا لاَ رَيْبَ فِيهِ کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے بارے میں اس بابت شک نہیں کیا جانا چاہئے کہ وہ خدا کی کتاب ہے اور یہ ایک صحیح حکم ہے لیکن بہت سے بدبخت لوگ اس کا انکار کرتے ہیں لہذا اس کیلئے تاکید لانی چاہئے مگر یہاں پر تاکید کے اظہار کو ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ انہیں غیر منکر سمجھا گیا ہے کیونکہ ان کے پاس ایسے دلائل ہیں کہ اگر وہ ان پر غور کریں تو سارے انکار زائل ہو جائیں گے اور وہ یہ کہ قرآن ایک معجزاتی کلام ہے ایسے کلام ہی کے واضح معجزات کے ذریعہ آنحضرتؐ کی نبوت پر استدلال کیا جاتا ہے۔اسی طرح کا ایک کلام امامؑ کے خطبہ ۲ میں ہے " وَلَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلاَيَةِ وَفِيهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ "(ولایت کا حق ان اہل بیتؑ کیلئے مخصوص ہے اور جانشینی اور وراثت بھی انہی کے اندر ہے)یہاں پر تاکید کے اظہار کو ترک کر دیا گیا ہے حالانکہ اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو آل محمد علیہم السلام کے حق ولایت، وصایت اور وراثت کے منکر ہیں لیکن امامؑ نے انہیں غیر منکر کی مانند سمجھ کر تاکید کا استعمال نہیں کیا جیسا کہ ہم اوپر والی آیت کے بارے میں ذکر کر چکے ہیں۔

تین مطالب

پہلا مطلب : حقیقت، مجاز اور اشتراک کے بارے میں ہے اور اس کی چند فصلیں ہیں۔

☆ پہلی فصل : حقیقت کی تشریح میں ہے اور اس میں چند مسائل بیان ہونگے۔

پہلا مسئلہ : لفظ "حقیقت" کے مشتق ہونے میں ہے۔ چنانچہ یہ لفظ "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے۔ حَقَّ الشَّئُ۔ يَحِقُّ فعل سے ہے، جس کا معنی کسی چیز کا ثابت ہونا ہے، یا پھر "حَقَّقْتُ۔ الشَّئَ۔" (یعنی کسی چیز کو ثابت کرنا ہے) کے وزن پر ہے۔ پس اگر پہلا معنی مراد لیا جائے تو "فَعِيْلٌ" بمعنی فاعل کے ہوگا جیسے "عَلِيْمٌ" اور "رَحِيْمٌ" ہیں اور اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے تو بمعنی مفعول کے ہوگا جیسے "جَرِيْحٌ" اور "قَتِيْلٌ" ہیں، اور پھر اسے اپنے اصل مقام میں "ثَابِتٌ" یا "مُثْبَتٌ" کلمہ کے معنی میں منتقل کیا گیا ہے۔ اور اس میں "تا" وصفیت سے اسمیت کی منتقل کرنے کی وجہ سے لگائی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ حلیؒ نے "نہایۃ الاصول" میں اور تفتازانی نے "شرح تلخیص" میں اس بات کی صراحت کی ہے۔ اور بعض شارحین کا کہنا ہے کہ نقل کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی لفظ پہلے وصف تھا پھر کثرت استعمال کی وجہ سے اسم بن گیا تو اس کی اسمیت اس کی وصفیت کی فرع ہوگی لہذا اس وقت وہ مؤنث کے مشابہ ہو جائے گا جو مذکر کی فرع ہوتی ہے، لہذا اس پر فرع ہونے کی علامت کے طور پر "تأ" لگا دیں گے جس طرح کہ "رَجُلٌ عَلاَّمَةٌ" پر "تأ" اس کے کثرت علم کی وجہ سے لگائی گئی ہے، کیونکہ چیز کی کثرت اپنی حقیقت کی فرع ہوتی ہے۔

دوسرا مسئلہ : یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیئے کہ حقیقت کے ساتھ کبھی تو مفرد کو موصوف کیا جاتا ہے تو اس صورت میں "حقیقت لفظیہ" کہلائے گی اور کبھی جملہ کو موصوف کیا جاتا ہے تو اس وقت وہ "حقیقت عقلیہ" کہلائے گی۔ اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ تعریف ہے، اس وقت میں "حقیقت فی المفرد" کی تعریف شروع کر رہا ہوں۔ چنانچہ عرض ہے کہ شیخ عبدالقاہرؒ کہتے ہیں کہ ہر وہ کلمہ جو کسی معنی کیلئے وضع کرنے والے کی طرف سے۔ اس طرح وضع کیا گیا ہو کہ وہ صرف اس میں ہی واقع ہو اور اس کے غیر کی طرف اس کا اسناد نہ کیا جائے تو وہ حقیقت ہوگا جیسے لفظ "اسد" ہے جو جانور کے لیے وضع کیا گیا ہے اور لفظ "مِنْ" ہے جو مکان کی ابتدائے غایت کے لیے واضع کیا گیا ہے اور ہر وہ کلمہ جو وضع کرنے والے کی طرف سے تو کسی ایک معنی کیلئے وضع کیا جائے لیکن دوسرے معنی میں بھی مراد لیا جائے البتہ پہلے اور دوسرے معنی کے درمیان مناسبت ہو تو وہ "مجاز" کہلائے گا جیسے "شجاع" کیلئے "اسد" اور "نعمت" کے لیے "ید" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تعریف میں اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تعریف کے تحت "حقیقت عرفیہ" اور "حقیقت شرعیہ" خارج ہو جائیں گی، جس کی وضع ثابت ہے کہ وہ نقل کے ذریعہ حقیقت سے مجاز میں داخل ہو چکی ہیں، کیونکہ یہ حقیقتیں معانی ثانویہ کے لئے وضع کی گئی ہیں البتہ معانی اولیہ اور معانی ثانویہ کے درمیان مناسبت کی وجہ سے۔ پس موصوف کی بیان کردہ حقیقت اور مجاز کی تعریفیں باطل ہو جائیں گی۔ لہذا بہتر تھا کہ ان کی تعریف یوں کی جاتی کہ : "حقیقت وہ کلمہ ہے جو اپنے معنی موضوع لہ میں اسی طرح استعمال ہو جس حیثیت میں وہ ہے"۔ لہذا "کلمہ" بمنزلہ جنس کے ہے اور "استعمال" کی صفت سے وہ کلمہ خارج ہو جائے گا جو ابھی تک استعمال ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ اسے نہ تو حقیقت کہا جاتا

ہے اور نہ ہی مجاز البتہ اس بارے میں مزید تفصیل بعد میں آئے گی اور معنی "موضوع لہ" کے کہنے سے وہ کلمہ خارج ہو جائے گا جو معنی غیر موضوع لہ میں استعمال ہوتا ہے خواہ اس کا استعمال کسی صحیح طریقے پر اور کسی صحیح تعلق کی بنا پر ہو جیسے تمام مجاز ہیں یا غیر صحیح طریقے پر استعمال ہو جیسے غلط استعمال کیا جائے مثلاً آپ اپنے سامنے رکھی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ "خُذْ هٰذا الفَرَسَ" (یہ گھوڑا لے لو) تو اس مقام پر لفظ "فرس" کا استعمال اپنے معنی موضوع لہ کے غیر میں ہوا ہے، لہٰذا نہ تو یہ حقیقت ہے اور نہ ہی مجاز اور "حیثیت" کی قید سے "صلوٰۃ" کا لفظ خارج ہو جائے گا جبکہ اسے "متشرع" دعا کے معنی کیلئے استعمال کرے۔ یا اس قسم کے دوسرے الفاظ کہ اگر چہ ان پر یہ بات تو صادق آتی ہے کہ یہ الفاظ لغت عرب کے لحاظ سے تو اپنے معانی موضوع لہ کیلئے استعمال ہو رہے ہیں لیکن ان کا استعمال اس معنی کی حیثیت سے نہیں ہوا جس کیلئے وضع کئے گئے ہیں، بلکہ اس حیثیت سے استعمال ہوا ہے کہ ان کے اور معانی شرعی کے درمیان ایک مناسبت اور تعلق ہے۔ اسی طرح اگر ان جیسے الفاظ کو کوئی لغوی 'ارکان مخصوصہ میں استعمال کرے، یا جس طرح کوئی لغوی 'لفظ "دابّہ" کو چوپائے کے معنی میں استعمال کرے اور اہل عرف اسے زمین پر چلنے والی چیز کے معنی میں استعمال کریں، کیونکہ یہ تمام قسمیں "مجاز" ہیں، (تفصیل کے اختصار کے ساتھ)

تیسرا مسئلہ: "حقیقت عقلیہ" میں ہے جس کی تعریف عبد القاہر نے ان الفاظ میں کی ہے، حقیقت عقلیہ ہر وہ جملہ ہے جو اس بات کیلئے وضع کیا گیا ہو کہ اس کے ذریعہ جو حکم لگایا جائے وہ عقل اور واقعہ کے مطابق ہو مثلاً "خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ وَ اَنْشَأَ الْعَالَمَ" (یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور عالم کو ایجاد کیا)۔ لیکن اس تعریف پر اس کے عدم انعکاس کی وجہ سے اعتراض کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس سے دہریہ کا یہ قول خارج ہو جاتا ہے کہ "اَنْبَتَ الرَّبِیعُ الْبَقْلَ" (یعنی بہار نے سبزی ترکاری اگائی ہے)، یا بے سمجھ شخص کا یہ قول بھی کہ "شَفَی الطَّبِیبُ الْمَرِیضَ" (یعنی طبیب نے بیمار کو شفا دی)، کیونکہ یہاں پر جو حکم لگایا گیا ہے وہ اس طرح نہیں ہے جو عقل میں ہے۔ اس اعتراض کا ان الفاظ میں جواب دیا گیا ہے کہ: تعریف میں جو کہا گیا ہے کہ "واقع کے مطابق ہو"، تو ظاہر ہے کہ مذکورہ دونوں مثالوں میں قائل کی سمجھ کے مطابق اس کی یہ بات واقعہ سے مطابقت رکھتی ہے۔

لیکن سب سے بہتر وہ تعریف ہے جو "تلخیص" میں بیان کی گئی ہے کہ؛ حقیقت عقلیہ یہ ہے کہ: "فعل یا معنی فعل کو اس چیز کی طرف نسبت دی جائے جو ظاہری طور پر متکلم کے نزدیک ہے"۔ تفتازانی کہتے ہیں کہ: "معنی فعل سے مراد مصدر، اسم فاعل، اسم مفعول، صفت مشبہ، اسم تفضیل اور ظرف ہے، اور "اس چیز" سے مراد وہ چیز ہے جس کیلئے فعل یا معنی فعل ہوتا ہے۔ جیسے فعل مبنی للفاعل کیلئے فاعل ہوتا ہے اور مبنی للمفعول کیلئے مفعول ہوتا ہے مثلاً "ضَرَبَ زَیْدٌ عَمْرواً" ہے یا "ضُرِبَ عَمْروٌ"۔ تو یہاں پر دونوں صورتوں میں "ضاربیت" زید کیلئے ہے اور "مضروبیت" عمرو کیلئے۔ یہ جو کہا کہ "متکلم کے نزدیک" تو اس سے مراد ہو گا کہ جو چیز متکلم کے اعتقاد کے مطابق ہو ضروری نہیں کہ واقعہ کے بھی مطابق ہو۔

"ظاہر میں" کے کہنے سے وہ چیز بھی داخل ہو جائے گی جو اعتقاد کے برخلاف ہو خواہ واقعہ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ اس سے مراد یا معنی فعل کی نسبت اس چیز کی طرف ہو جو متکلم کے نزدیک ہو کہ جسے وہ ظاہری کلام سے سمجھ سکتا ہے اور وہ اپنے عقیدہ کے

خلاف قرینہ نصب نہ کرے۔

پس اس اعتبار سے تعریف میں وہ چیز بھی داخل ہو جائے گی جو واقعہ اور اعتقاد کے مطابق ہو جیسے مؤمن کہتا ہے "اَنْبَتَ اللّٰهُ الْبَقْلَ" (اللہ تعالی نے سبزی کو اگایا) اور وہ چیز بھی جو صرف اعتقاد کے مطابق ہوتی ہے، جیسے دہریہ کہتا ہے "اَنْبَتَ الرَّبِيْعُ الْبَقْلَ" (موسم بہار نے سبزی کو اگایا) اور وہ چیز بھی جو اعتقاد کے خلاف ہوتی ہے لیکن قول کے مطابق ہوتی ہے جیسے کوئی دہریہ اس شخص کے سامنے کہے جو اس کی حقیقت حال سے واقف نہیں ہوتا اور اپنے عقیدہ کو چھپائے ہوئے کہتا ہے "اَنْبَتَ اللّٰهُ الْبَقْلَ" (خدا نے سبزی کو اگایا) اور وہ چیز بھی داخل ہو جاتی ہے جو واقعہ اور اعتقاد دونوں کے مخالف ہوتی ہے، جیسے آپ کہتے ہیں "جَاءَ زَيْدٌ" (زید آیا) جبکہ آپ جانتے ہوں کہ وہ نہیں آیا، لیکن مخاطب کو اس کا علم نہیں ہوتا، کیونکہ اگر مخاطب کو بھی اس کے نہ آنے کا علم ہو تو اس کی حقیقت کا تعین نہیں ہوگا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ متکلم نے مخاطب کے علم کے نہ ہونے کو اپنے ظاہری ارادہ کے نہ ہونے پر قرینہ قرار دیا ہو، اس لئے ظاہر میں جو کچھ متکلم کے نزدیک ہے اس کی طرف نسبت نہیں ہوگی۔

چوتھا مسئلہ : یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ حقیقت اور مجاز کے معانی کی معرفت اور ان کے درمیان فرق اہل لغت کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی کئی وجوہ بنتی ہیں۔

۱۔ اہل لغت کہیں کہ یہ لفظ فلاں معنی کیلئے حقیقت ہے اور فلاں کیلئے مجاز ہے۔

۲۔ اہل لغت کہیں کہ فلاں لفظ فلاں معنی کیلئے وضع کیا گیا ہے اور اسے دوسرے معنی میں استعمال کرنا وضع کے خلاف ہوگا۔

۳۔ اہل لغت کہیں کہ یہ معنی اس لفظ سے متبادر ہے یا اس سے اس کا سلب صحیح نہیں ہے یا وہ معنی غیر متبادر ہے یا اس کا سلب صحیح ہے وغیرہ۔

پھر جن لغویوں کی طرف اس طرح کی تشخیص کیلئے رجوع کیا جاتا ہے یا تو وہ صرف ایک ہی ہے تو کیا ہی بہتر! اور اگر دو ہیں تو پھر دیکھا جائے گا یا ان کا قول ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے تو بھی بہت ہی خوب! لیکن اگر دونوں کے اقوال مختلف ہیں تو پھر دیکھا جائے گا کہ قابل ترجیح کون ہے، اس کی بات مانی جائے گی۔ مثلاً اگر "صحاح" اور "قاموس" کے درمیان اختلاف ہو تو "صحاح" کو مانا جائے گا کیونکہ وہ اہل زبان کی لکھی ہوئی ہے اور اگر کوئی بھی قابل ترجیح نہ ہو تو پھر دیکھا جائے گا کہ ان کے اقوال کے درمیان "تباین" کی نسبت ہے تو پھر ایسی صورت میں اسے "شراکت لفظی" پر محمول کیا جائے گا۔ مثلاً ان میں سے ایک کہتا ہے کہ "عین" کا لفظ "ذھب" (سونے) کیلئے وضع کیا گیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں "فضہ" (چاندی) کیلئے ہے۔ اس طرح اگر ان کے اقوال کے درمیان "عموم من وجہ" کی نسبت ہے مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ "غنا"، "خوش الحانی" کا نام ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ "حلق میں آواز گھمانے" کو کہتے ہیں تو بھی اسے اشتراک لفظی پر محمول کیا جائے گا۔ اور اگر ان اقوال کے درمیان "عموم مطلق" کی نسبت ہے، مثلاً "صعید" کے بارے میں ایک کہتا ہے کہ اسکا معنی ہے "وجہ الارض" اور دوسرا کہتا ہے "تراب خالص" تو اس وقت "مطلق" کو اختیار کرنا لازم ہوگا۔ بر خلاف اس کے کہ علم اصول میں اس مقام پر "مقید" کو اختیار کرنا ثابت ہے۔ اس لئے کہ ان کے درمیان "تعارض ادری" اور "لا

اوری" پایا جاتا ہے اس بارے میں پہلے قول کو اختیار کرنا مقدم ہوگا۔

یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب بنا اس بات پر ہو کہ اہل لغت کا قول حجت ہوتا ہے، اور ظاہر بھی یہی ہے کہ ان کا قول حجت ہوتا ہے اور اس میں شک بھی نہیں ہے کہ لغوی "اہلِ خبرہ" میں شامل ہیں، بلکہ اس بارے میں کوئی اختلافِ ظاہر بھی نہیں ہے۔ اور علمائے اصول کی ایک جماعت کی عباتوں میں تو اجماع کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔ البتہ ہمارے بعض مشائخ نے اس بارے میں تردد سے کام لیا ہے، جبکہ فقہ میں ان کی بنا بھی اس بات پر ہے۔

<u>پانچواں مسئلہ</u> : جب حقیقی معنی، مجازی معنی سے جدا ہو چکا ہو اور کوئی لفظ ایسے قرینے سے خالی ہو جو دونوں میں سے کسی ایک کے ارادے پر دلالت کرے، تو ضروری ہو جائے گا کہ اس لفظ کو حقیقت پر محمول کر کے اس کا حقیقی معنی مراد لیا جائے۔ اور یہی مقصد ہے علمائے علمِ اصول کا کہ "اصل، لفظ کے مقابلے میں حقیقت ہے" اور اس کی کئی وجوہات ہیں :۔

۱۔ پہلی دلیل اجماع ہے جسے علمائے اصول کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے، جن میں علامہ حلیؒ (کتابِ نہایہ میں) سید صدر (کتاب شرح الوافیہ میں) اور فاضل قمیؒ بھی شامل ہیں، بلکہ مؤخر الذکر نے تو اس بارے میں کسی قسم کے اختلاف کی بھی نفی کی ہے۔

۲۔ دوسری دلیل، خود اہلِ زبان روز مرہ کے استعمال میں اس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔

۳۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ بطورِ مطلق کسی لفظ کا استعمال معنی حقیقی میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کے غیر کیلئے ارادے کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خصوصاً حکیم اور دانا کے کلام میں تو اس کی رعایت زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کسی لفظ کا اطلاق کسی معنی پر ظاہر ہو لیکن اسے کسی قرینہ کے قائم کئے بغیر ارادۃً کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنا، "اغراءِ بالجہل" اور "تکلیف مالا یطاق" کا موجب بن جائے گا۔ اور یہ بات قبیح ہے۔ اور اگر ظاہر کا اردہ نہ کیا جائے تو انبیاء کا بھیجنا اور کتب آسمانی کا نازل کرنا بے سود اور بے مقصد ٹھہرے گا، کیونکہ تبلیغ احکام کا سب سے بڑا فائدہ تو خطابات اور سمجھانے پر موقوف ہے۔

۴۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ لفظ جب قرینہ سے خالی ہو (جب کہ ہم نے فرض بھی کیا ہے) تو پھر ایسی صورت میں یا تو اسے حقیقت پر محمول کیا جائے یا مجاز پر یا دونوں پر اور یا کسی پر بھی نہیں۔ گویا اس طرح اس کی چار صورتیں بن جائیں گی۔ اور چوتھی صورت سے لازم آئے گا کہ لفظ کا استعمال حقیقت میں بھی حقیقت ہے اور مجاز میں بھی یا دونوں کیلئے مشترک ہے اور یہ فرض بھی باطل ہو جائے گا۔ دوسری صورت بھی ناممکن ہے کیونکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مجاز کیلئے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اس میں قرینہ نہیں ہوتا، لے دے کے پہلی صورت باقی رہ جاتی ہے اور یہی ہمارا مطلوب ہے، یعنی جب لفظ قرینہ سے خالی ہو تو حقیقت پر دلالت کرے گا۔

۵۔ پانچویں دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اسے حقیقت پر محمول نہ کریں تو پھر یا تو توقف سے کام لیں گے (یعنی حقیقت اور مجاز میں سے کسی پر اس کا اطلاق نہیں کریں گے) یا اسے مجاز پر محمول کریں گے۔ لیکن یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ پہلی (توقف کی) صورت اس لئے باطل ہے کیونکہ توقف اس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی لفظ مجمل ہو اور اہل عرف کو اس کی مراد متعین کرنے میں تردد ہو اور اس بات کا حکم کہ تمام الفاظ مجمل ہیں اور ہمیشہ کیلئے ان کا حقیقت اور مجاز کیلئے استعمال میں تردد ہے۔ اور یہ ایک ایسا حکم ہے کہ

انسان کا وجدان اور ضمیر اسے صحیح سمجھنے کیلئے ہی تیار نہیں، جھٹلاتا بھی ہے۔

اب رہی دوسری صورت یعنی اگر اسے مجاز پر محمول کیا جائے تو لازم آئے گا کہ مجاز "اصل" ہے، اور اس کی خرابی بھی واضح ہے۔ کیونکہ یہ بات ہرگز نہیں ہو سکتی کہ واضع تو کسی لفظ کو ایک خاص معنی کیلئے وضع کرے لیکن اس کا استعمال ایسے معنی میں ہونے لگے کہ اصلاً اس لغت میں وہ وضع ہی نہیں کیا گیا۔

گویا ہماری اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ :اس بات میں نہ تو کوئی اشکال ہے اور نہ ہی کسی قسم کا اختلاف کہ شک کے وقت کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر ہی حمل کیا جائے گا مراد اس کا حقیقی معنی ہے۔ اور یہی اصول آپ کے ذہن میں رہے کیونکہ اس شرح کے دوران آپ کو فائدہ دے گا۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ شارح معتزلی اور شارح بحرانی بہت سے مقامات پر توہمات کا شکار ہو گئے ہیں اور انہوں نے امامؑ کے کلام کو بہت سے مواقع پر کسی دلیل کے بغیر ظاہر پر دلالت کرنے سے منصرف کر دیا ہے اور اپنی طرف سے تاویلیں کی ہیں اور سیدھے راستے سے منحرف ہو گئے ہیں۔

☆**دوسری فصل** : مجاز میں ہے اور اس میں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ :"مجاز" کا لفظ اصل میں "مَفعَل" کے وزن پر ہے جس کا معنی ہے گذرنا اور عبور کرنا اور یہ دونوں کام اجسام کی صفات میں سے ہیں جن کا استعمال جسم کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کیلئے صحیح ہوتا ہے۔ اور "لفظی مجاز" پر اس کا استعمال مشابہت کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ لفظ بھی اپنے حقیقی معنی سے گذر کر اور اسے عبور کر کے اپنے دوسرے معنی تک جا پہنچتا ہے۔ تو گویا وہ اپنے مقام سے تجاوز کر کے دوسری جگہ تک پہنچ جاتا ہے۔

شیخ عبدالقاہر کا کلام "اسرار البلاغہ" میں یوں نقل کیا گیا ہے کہ لفظ "مجاز"، "مفعل" کے وزن پر ہے اس کا فعل "جَازَ۔ یَجُوزُ" ہے جب کوئی کسی جگہ سے آگے بڑھ جائے اور اس پر تعدی کرے پھر اسے ایک ایسے کلمہ کی طرف منتقل کیا گیا ہے جو اپنے اصل مقام سے ہٹ کر اور تعدی کر کے دوسری جگہ پر استعمال ہونے لگا ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ ایسا کلمہ جس کے ذریعہ اصل معنی سے تجاوز کیا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لفظ "مجاز" مصدر رہے جو یا تو فاعل کے معنی میں ہے یا مفعول کے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اسم مکان کے معنی میں لیا جائے یعنی گزرگاہ، اس لفظ سے ایسے مخصوص کلمہ کو موسوم کیا گیا ہے جو ذہن کے انتقال اور عبور کی گزرگاہ ہے جس کے ذریعہ حقیقی معنی سے مجازی تک رسائی ہوتی ہے۔ (غور کیجئے گا)

دوسرا مسئلہ :اصطلاح میں مجاز کی تعریف، خود حقیقت کی تعریف سے سمجھی جاتی ہے۔ یعنی "مجاز وہ کلمہ ہے جو کسی تعلق اور رابطے کی بنا پر ایسے معنی کیلئے استعمال ہو جس کیلئے وہ خاص طور پر وضع نہیں کیا گیا"۔ تو "استعمال" کی قید سے وہ کلمہ نکل جائے گا جو ابھی تک استعمال ہی نہیں ہوا، کیونکہ اسے نہ تو مجاز کہیں گے اور نہ ہی حقیقت، اور "جس کیلئے وضع نہیں کیا گیا" کی قید سے "حقیقت" خارج ہو جائے گی کیونکہ حقیقت وہ ہوتی ہے کہ جس کیلئے لفظ وضع کیا جائے اور "خاص طور" کی حیثیت کی قید سے "صلوٰة"

جیسا لفظ خارج ہو جائے گا جب اسے متشرع ارکان مخصوصہ کے معنی میں استعمال کریں کیونکہ اگرچہ اس پر یہ صادق آتا ہے کہ یہ ایسا لفظ ہے جو لغوی طور پر غیر موضوع لہ معنی کیلئے استعمال ہو رہا ہے لیکن اسے خاص طور پر اس کیلئے وضع نہیں کیا گیا۔ اور "تعلق اور رابطے" کی قید سے "غلط" بھی خارج ہو جائے گا کیونکہ اگرچہ وہ استعمال تو ہو رہا ہے غیر موضوع لہ معنی میں لیکن اس کے پہلے اور دوسرے معنی میں کوئی تعلق اور رابطہ نہیں ہے۔

بعض اوقات "حیثیت" کی قید سے "صلوٰۃ" جیسے الفاظ کے نکالنے کا مقصد حاصل کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا استعمال وضعی ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے تعلق اور رابطے کی وجہ سے نہیں، اسی لئے مجاز کی تعریف میں بعض لوگوں نے "حیثیت" کی قید کو ساقط کر دیا

تیسرا مسئلہ :اگر مجاز کے ساتھ لفظ مفرد موصوف ہو تو اسے "مجاز لغوی" کہتے ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، اور اگر اس کے ساتھ جملہ موصوف ہو تو اسے "مجاز عقلی" کہیں گے اور اس کے ساتھ چونکہ جملہ حکم اور اسناد کے اعتبار سے موصوف ہوتا ہے اسی لئے اسے "مجاز حکمی" بھی کہتے ہیں اور "اسناد مجازی" بھی۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسناد اور حکم، حقیقت اور مجاز کے ساتھ بالذات اور بلاواسطہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ جملہ کا تعلق بالواسطہ ہوتا ہے اسی بنا پر "مجاز عقلی" کی تعریف میں مختلف نظریات ہیں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ "حقیقت عقلیہ" کی تعریف میں بھی اختلاف ہے۔

اسی بنا پر شیخ عبد القاہر کہتے ہیں کہ جو جملہ عقلی طور پر حکم کو اس کے موضوع سے خارج کر دے تو اس کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا" (ابراہیم / ۲۵) یعنی وہ (شجرہ طیبہ) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے۔ یا جیسا کہ فرماتا ہے "أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا" (زلزال / ۲) یعنی زمین اپنے تمام بوجھ نکال کر باہر کر دے گی۔

"تلخیص" میں کہتے ہیں کہ یہاں پر فعل یا معنی فعل کا اسناد اس کے متعلقات کی طرف اس کے علاوہ ہے جہاں پر ایسا قرینہ قائم کیا جاتا ہے جو اسناد کو اس کے لفظی یا معنوی ہونے سے منصرف کر دیتا ہے مثلاً مذکورہ فعل کے ساتھ مسند کا قیام عقلی طور پر محال ہے، کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ زمین، بوجھ نکالنے سے متصف نہیں ہو سکتی بلکہ یہ کام تو قادر مختار کا ہے لہذا اس کا مسند الیہ در حقیقت اللہ سبحانہ ہی ہے۔ اور اگر اسے زمین کی طرف اسناد کیا گیا ہے تو یہ اس کا محل ہے اور اس بات کا حکم عقل لگا رہی ہے (قدرے اختصار کے ساتھ)۔

جب یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو گئی پھر ہماری یہ بات بھی پلے باندھ لیں کہ کلام امیر المؤمنینؑ میں "مجاز عقلی" اور "تجوز فی الاسناد" بہت کثیر تعداد میں موجود ہے جس طرح قرآن مجید میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً کلام مجید میں ہے: "عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ" (الحاقہ / ۲۱) یعنی پسندیدہ زندگی۔ یا جیسا کہ "يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا" (اعراف / ۲۷) یعنی شیطان نے ان (آدم و حوا) کے جسموں سے لباس اتار دیا۔ یا جیسا کہ "يَوْمَ يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا" (مزمل / ۱۷) یعنی جو دن بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ یا جیسا کہ "جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ" (کہف / ۷۷) یعنی دیوار جو گرا چاہتی تھی۔ یا جیسا کہ "إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا" (انفال / ۲) یعنی جب ان پر خدا کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو زیادہ کر دیتی ہیں۔ یا جیسا کہ "فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ"

(بقرہ / ۱۶) یعنی ان کی تجارت نے منافع نہیں اٹھایا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دوسری آیات ہیں تو ان آیات میں اسناد در حقیقت جس کی طرف ہونا تھا نہیں ہے۔ آیا آپ نے غور نہیں کیا "رَاضِيَةٌ" اسم فاعل کا صیغہ ہے لیکن اس کا اسناد مفعول کی طرف ہے کیونکہ زندگی "راضیہ" (یعنی پسند کرنے والی) نہیں بلکہ "مرضیہ" (یعنی پسندیدہ) ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں لباس کا اتارنا خدا کا کام ہے لیکن اس کی نسبت شیطان ملعون کی طرف دی گئی ہے کیونکہ وہ درخت سے کھانے کا سبب بنا اور تیسری آیت میں "جعل" (یعنی بنا دینے) کی نسبت یوم (دن) کی طرف دی گئی ہے حالانکہ یہ خدا کا فعل ہے اور یہ نسبت زمانے کی طرف نسبت کے باب سے ہے۔ چوتھی آیت میں ارادے کی نسبت دیوار کی طرف دی گئی ہے اور یہ فاعل "مرید" (ارادہ کرنے والے) کے ساتھ تشبیہ ہے۔ پانچویں آیت میں ایمان کے زیادہ کرنے کی نسبت آیات کی طرف دی گئی ہے حالانکہ یہ حق تعالی کا فعل ہے لیکن اس اعتبار سے ان کی طرف نسبت ہے کہ وہ ایمان کی زیادتی کا سبب ہیں۔ اور آخری آیت میں "ربح" (منافع) کی نسبت تجارت کی طرف دی گئی ہے چونکہ تجارت محل ربح ہے جبکہ منافع اٹھانے والے تاجر ہوتے ہیں تجارت نہیں۔

یہ تو تھیں نمونہ کی چند آیات، اب ہم کلام امیر المؤمنین علیہ السلام کی بات کرتے ہیں۔ تو مذکورہ انداز میں کلام امیر المؤمنین میں یہ چیز بکثرت ملتی ہے، جیسا کہ خطبہ ۳ میں ارشاد فرماتے ہیں: "وَأَجْهَزَ عَلَيْهِ عَمَلُهُ وَكَبَتْ بِهِ بِطْنَتُهُ" اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور شکم پری نے اسے منہ کے بل گرا دیا اور کلام ۱۷ میں فرماتے ہیں: "تَصْرُخُ مِنْ جَوْرِ قَضَائِهِ الدِّمَاءُ وَ تَعِجُّ مِنْهُ الْمَوَارِيثُ" ناحق بہائے ہوئے خون اس کے ناروا فیصلوں کی وجہ سے چیخ رہے ہیں اور غیر مستحق افراد کو پہنچی ہوئی میراثیں چلا رہی ہیں اور کلام ۱۹ میں فرماتے ہیں: "لَقَدْ أَسَرَكَ الْكُفْرُ مَرَّةً وَالإِسْلَامُ أُخْرَىٰ، فَمَا فَدَاكَ مِنْ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا مَالُكَ وَلَا حَسَبُكَ" تو ایک دفعہ کافروں کے ہاتھوں میں اور ایک دفعہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اسیر ہوا لیکن تجھ کو تیرا مال اور حسب اس عار سے نہ بچا سکا اسی طرح خطبہ ۳۲ میں فرماتے ہیں: "إِنَّا قَدْ أَصْبَحْنَا فِي دَهْرٍ عَنُودٍ وَزَمَنٍ كَنُودٍ" اے لوگو! ہم ایک ایسے کج رفتار زمانہ اور ناشکر گزار دنیا میں پیدا ہوئے اور خطبہ ۸۱ میں فرماتے ہیں: "أَرْهَقَتْهُمُ الْمَنَايَا دُونَ الآمَالِ وَ شَذَّبَهُمْ عَنْهَا تَخَرُّمُ الآجَالِ" کس طرح امیدوں کے بر آنے سے پہلے موت نے انہیں جا لیا اور عمر کے ہاتھ نے انہیں ان امیدوں سے دور کر دیا۔ اور اسی خطبہ ہی میں ہے: "وَ أَنْصَبَ الْخَوْفُ بَدَنَهُ وَ أَسْهَرَ التَّهَجُّدُ غِرَارَ نَوْمِهِ وَ أَظْمَأَ الرَّجَاءُ هَوَاجِرَ يَوْمِهِ وَ أَظْلَفَ الزُّهْدُ شَهَوَاتِهِ" خوف نے اس کے بدن کو تعب و کلفت میں ڈال دیا ہو اور نماز شب نے اس کی تھوڑی بہت نیند کو بھی بیداری سے بدل دیا ہو، امید ثواب میں اس کے دن کی تپتی ہوئی دوپہریں پیاس میں گزرتی ہوں اور زہد و ورع نے اس کی خواہشوں کو روک دیا ہو۔ اس کے علاوہ ایک محقق اور سمجھدار انسان کو اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سے دوسرے مقامات بھی مل جائیں گے کہ جن میں مجاز عقلی اور تجوز فی الاسناد کی مثالیں موجود ہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح "مجاز عقلی"، "نسبت اسنادیہ" میں پایا جاتا ہے اسی طرح "نسبت اضافیہ" اور "نسبت ایقاعیہ" میں بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا" (نساء / ۳۵) اگر تم ان (زن و مرد)

کے درمیان علیحدگی سے ڈرو۔ یا جیسے : " وَمَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ " (سباء / ۳۳) رات اور دن کے مکر نے ...... یا جیسے : " وَلاَ تُطِيْعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ " (شعراء / ۱۵۱) اسراف کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دوسری آیات ہیں۔

اسی طرح کہا جاتا ہے " أَجْرَيْتُ النَّهْرَ " میں نے نہر جاری کی یا جیسے " نَوَّمْتُ الَّيْلَ " میں نے رات کو سلایا، حالانکہ نہر جاری نہیں کی جاتی بلکہ پانی جاری ہوتا ہے اور رات کو نہیں سلایا جاتا بلکہ خود رات کو نیند کی جاتی ہے۔

چوتھا مسئلہ : اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا مجاز کیلئے ضروری ہے کہ اس میں " آحاد " کو نقل کیا جائے یا صرف ربط و تعلق کا وجود ہی کافی ہے ؟۔ بہ الفاظ دیگر آیا ضروری ہے کہ مجاز میں اس کی تمام خصوصیات کو عربوں سے نقل کیا جائے یا صرف ان کے کلام سے اس بات کا علم یا ظن ہی کافی ہے کہ اگر حقیقی معنی کیلئے لفظ کے استعمال میں کسی قسم کا بھی تعلق ہو جو اس سے مناسبت رکھتا ہو اور پھر جب بھی کوئی مجاز ملے تو اسی پر قیاس کر لیا جائے اور نقل کی ضرورت نہیں ہے ؟۔ اس بارے میں دو آراء ہیں کچھ لوگوں نے پہلے موقف کو اختیار کیا ہے یعنی تمام خصوصیات اور جزئیات کو نقل کرنا ضروری ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں فخر الدین رازی اور اسفرائینی بھی شامل ہیں، جبکہ اکثر افراد دوسرے نظریہ کے قائل ہیں جن میں علامہ حلی قدس سرہ کا یہ موقف " التہذیب " اور " النہایہ " میں ہے اور عمیدی، تفتازانی اور مرتضٰی کا " الذریعہ " میں اور شیخ بہائی، ان کے شاگرد شارح جواد، حاجبی، عضدی اور فاضل قمی رحمہم اللہ اس زمرہ میں شامل ہیں۔

(از مترجم : فریقین نے اس مقام پر اپنے اپنے موقف کے بارے میں بڑے زوردار دلائل پیش کئے ہیں اور ایک دوسرے پر کافی اعتراضات بھی کئے اور ان اعتراضات کے مفصل اور مدلل جوابات بھی دیئے ہیں اس جگہ پر بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آخر میں مصنف نے اپنا تحقیقی فیصلہ یہی دیا ہے کہ مجاز میں آحاد یعنی تمام خصوصیات اور جزئیات کو نقل کرنا ضروری نہیں صرف ربط و تعلق کا ہونا ہی کافی ہے لیکن وہ ربط یا تعلق نہیں جو ذکر کیا گیا ہے بلکہ ایسا ربط و تعلق جسے طبع اور ذوق سلیم گوارا سمجھیں اور فہم مستقیم اسے قبول کرے)۔

پانچواں مسئلہ : ہم نے سابقہ مسئلہ میں جو تحقیقی فیصلہ دیا ہے اس میں غور و فکر کرنے سے آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ مجاز کا سبب بننے والے روابط اور تعلقات بہت زیادہ ہین جن کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ کیونکہ جب فیصلہ ہی اس بات پر ٹھہرا ہے کہ مجاز کا دارومدار عرفی " مناسبت " اور " استحسان " پر ہے یعنی ایسا تعلق جو اس سے مناسبت بھی رکھتا ہو اور اسے اچھا بھی سمجھا جائے لہذا " مناسبت " کی وجوہ کم ہیں اور نہ ہی " حسن " کی جہات کوئی ایک دو ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ البتہ کچھ لوگوں نت انہیں حدو حصر میں لانے کی کوشش کی ہے جن میں سے بعض نے استقراء کے طور پر ان کے محدود و محصور کرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے لیکن وہ اپنے اس دعویٰ کے باوجود اصل نوع کے متعین کرنے میں اختلاف رکھتے ہیں اور کچھ لوگ تعداد میں ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ بعض نے ان کی تعداد کم بتائی ہے تو بعض نے زیادہ، آخر کار جو تعداد بتائی گئی ہے وہ پچیس ہے۔

شارح " مفتاح " کہتے ہیں کہ : معلوم ہونا چاہئے کہ علماء نے مجاز میں معتبر تعلقات کا ذکر کیا ہے اور استقراء کے طور پر ان

کی تعداد پچیس بتائی ہے ؛

۱۔ سبب کا اطلاق مسبب پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امیر المؤمنینؑ کا فرمان ہے : "بَلُّوا اَرْحَامَکُمْ وَ لَوْ بِالسَّلَامِ" اپنی رشتہ داری کو قائم رکھو خواہ سلام کے ساتھ ہی ہو، یہاں پر لفظ "بل" استعارہ ہے "وصل" سے۔

۲۔ مسبب کا اطلاق سبب پر کیا جاتا ہے، جیسے حضرتؑ ہی کا ارشاد ہے : "بِالْعَطِیَّۃِ مَنٌّ لِاَنَّ مَنْ اَعْطیٰ فَقَدْ مَنَّ" عطیہ کے ساتھ احسان ہے کیونکہ جس شخص نے عطا کیا یقیناً اس نے احسان کیا۔

۳۔ اسم جزء کا اطلاق کل پر ہوتا ہے، جیسے ارشاد الٰہی ہے : "کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (قصص / ۸۸) ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے مگر اس کا چہرہ یعنی اس کی ذات۔

۴۔ کل کا اطلاق جزء پر ہوتا ہے جیسے ارشاد باری ہے : "یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْ آذَانِهِمْ" (بقرہ / ۱۹) وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ حالانکہ انگلیوں کی بجائے پورے ہوتے ہیں۔

۵۔ اسم ملزوم کا اطلاق لازم پر ہوتا ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے : "اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوْا بِهٖ یُشْرِکُوْنَ" (روم / ۳۵) کیا ہم نے ان پر کوئی محکم دلیل نازل کی ہے جو انہیں شرک کرنا سکھاتی ہے۔ چنانچہ یہاں دلالت کو کلام کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ دلالت کلام کا لازمہ ہے۔

۶۔ لازم کا اطلاق ملزوم پر ہوتا ہے، جیسے شاعر کہتا ہے :

قَوْمٌ اِذَا حَارَبُوْا شَدُّوْا اِزَارَهُمْ   دُوْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ طَالَ بِآمِلِهَا

یعنی وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب جنگ کرنے لگتے ہیں تو عورتوں سے ہٹ کر اپنے تہبند کس لیتے ہیں خواہ کافی مدت گزر جائے۔ تو یہاں پر "تہبند کس لینے" سے مراد عورتوں سے دور رہنا ہے، کیونکہ تہبند کس لینا عورتوں سے دوری کیلئے لازم ہوتا ہے۔

۷۔ دو متشابہ (ہم شکلوں) کا ایک دوسرے پر اطلاق، جیسے تصویر پر انسان کا اطلاق، کیونکہ یہ دونوں شکل و صورت میں ملتے جلتے ہیں۔

۸۔ مطلق کا مقید پر اطلاق، جیسے شاعر کا قول ہے :

وَ یَا لَیْتَ کُلَّ اثْنَیْنِ بَیْنَهُمَا هَوًی   مِنَ النَّاسِ قَبْلَ الْیَوْمِ یَلْتَقِیَانِ

اے کاش کہ !لوگوں میں سے جن جن دو افراد کے درمیان پیار و محبت ہے اس دن سے پہلے ہی ان کی آپس میں ملاقات ہو جاتی۔ اور یہاں پر "یوم" سے مراد یوم القیامت ہے۔

۹۔ مقید کا اطلاق مطلق پر، جیسے شریح (قاضی) کا قول ہے : "اَصْبَحْتُ وَ نِصْفُ الْخَلْقِ عَلَیَّ غَضْبَانُ" میں نے اس حالت میں صبح کی ہے کہ نصف مخلوق مجھ پر ناراض ہے۔ اس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میرا فیصلہ کسی کے حق میں ہوتا ہے اور کسی کے خلاف، تو جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ ناراض ہوتا ہے تاکہ ساری دنیا کی نصف مخلوق۔

۱۰۔ اسم خاص کا اطلاق اسم عام پر، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ حَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا" (نساء / ۶۹) وہ بہترین رفیق ہیں۔

۱۱۔ اسم عام کا اطلاق اسم خاص پر، جیسے قرآن مجید پیغمبر خداؐ کی زبانی کہتا ہے: "وَ أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ" (انعام / ۱۶۳) اور میں پہلا مسلمان ہوں۔ یہاں پر کل مسلمان مراد نہیں ہیں کیونکہ آپ سے پہلے انبیاء بھی مسلمان تھے۔

۱۲۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنایا جائے، جیسے خداوند تعالی فرماتا ہے: "وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ" (یوسف / ۸۲) یعنی بستی سے پوچھو مقصد یہ ہے کہ بستی والوں سے سوال کرو۔ یا مضاف کو تو حذف کر دیا جائے لیکن مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام نہ بنایا جائے، جیسے ابو داؤد کا ایک شعر ہے:

أَ كُلَّ امْرِءٍ تَحْسَبِيْنَ امْرَئًا وَ نُورًا تُوقَدُ بِاللَّيْلِ نَارًا

آیا تو ہر شخص کو مرد سمجھتی ہے اور رات کو جلائی جانے والی آگ کو نور خیال کرتی ہے۔

اس مجاز کو "مجاز بالنقصان" کہتے ہیں۔ اسی طرح کی مثال قرآن مجید میں ہے کہ: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (شوریٰ / ۱۱) اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ اس قسم کو "مجاز بالزیادہ" کہتے ہیں۔

۱۳۔ مضاف الیہ کو حذف کر کے مضاف کو اس کا قائم مقام بنا دیتے ہیں، جیسے شاعر کہتا ہے:

أَنَا ابْنُ جَلاَ وَ طَلاَعِ الثَّنَايَا مَتىٰ أَضَعُ الْعَمَامَةَ تَعْرِفُونِي

میں جلاء کا بیٹا ہوں اور گھاٹیوں پر چڑھنے والا جب میں عمامہ اتاروں گا تم مجھے پہچانو گے۔ دراصل "انا ابن رجل جلا" ہے۔

۱۴۔ شئے کو اس اسم کا نام دیا جائے جس کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہوتا ہے، جیسے "غَائِط" جو دراصل اس نشیبی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پر قضائے حاجت کی جاتی ہے لیکن اب قضائے حاجت یعنی پاخانہ ہی کو کہتے ہیں۔

۱۵۔ شئے کو اس اسم کا نام دیا جائے جس تک اس کا انجام ہوتا ہے، جیسے قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے زندان کے ایک ساتھی کی زبانی کہا جا رہا ہے: "إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا" (یوسف / ۳۶) میں خود کو دیکھ رہا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں۔ حالانکہ انگور نچوڑے جاتے ہیں۔

۱۶۔ شئے کو اس اسم کا نام دیا جائے جس کے ساتھ اس کا پہلے تعلق تھا، جیسے ہم کسی انسان کو "ضرب" (مارنے) کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد بھی کہتے ہیں "إِنَّهُ ضَارِبٌ" (وہ مارنے والا ہے)۔

۱۷۔ محل کو حال کا نام دیا جائے، جیسے حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "لَا يُفْضُضِ اللّٰهُ فَاكَ" خدا تمہارے منہ کو نہ توڑے یعنی دانتوں کو نہ توڑے کیونکہ منہ دانتوں کیلئے محل ہے اور دانت حال۔

ابن حاجب کہتے ہیں "یہ اور اس کے بعد آنے والی مثالیں 'مجاورت' (قرب) کے زمرے میں آتی ہیں"۔

۱۸۔ حال کو محل کا نام دیا جائے، جیسے خداوند عالم کا ارشاد ہے: "فَأَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي

رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ "(آل عمران / ۱۰۷) تو وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہونگے وہ خدا کی رحمت میں ہونگے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جنت میں ہونگے اس لئے کہ جنت رحمت کا محل ہے۔

۱۹۔ شئے کے آلے کا نام خود اسی پر بولا جائے، جیسے خداوند عالم حضرت ابراہیمؑ کی زبانی فرماتا ہے: "وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ" (شعراء / ۸۴) خدایا میرے لئے آنے والی امتوں میں سچی زبان قرار دے یعنی ذکر خیر قرار دے، کیونکہ زبان ذکر کا آلہ ہوتا ہے اس لئے انہوں نے "لسان" بول کر ذکر خیر مراد لیا ہے۔

۲۰۔ شئے کا نام لے کر اس کا بدل مراد لیا جائے، مثلاً کہا جاتا ہے: "فُلاَنٌ اَكَلَ الدَّمَ" فلاں شخص خون کھا گیا حالانکہ "خون" مراد نہیں ہوتا بلکہ "خون بہا" مراد ہوتا ہے۔

۲۱۔ نکرہ، عموم کی یاد دلائے؛ جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ" (تکویر / ۱۴) اس وقت نفس (انسان) جان لے گا کہ اس نے کیا کیا؟۔ یہاں پر "نفس" سے مراد "کل نفس" یعنی ہر انسان جان لے گا۔ اس طرح کی روز مرہ کی ایک مثال ہے "دَعِ امْرَءً اوَ نَفْسَهُ" یعنی "کل امرءٍ" مراد ہے۔

۲۲۔ کسی اسم کی دو ضدوں میں سے ایک کا دوسرے پر اطلاق ہو، جیسے خدا فرماتا ہے: "وَ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا" (شوریٰ / ۴۰) برائی کا بدلہ اس جیسی سزا ہے۔

۲۳۔ معرف باللام کا اطلاق کیا جائے اور مراد صرف ایک فرد ہو، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا" (بقرہ / ۵۸) دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اندر جاؤ یعنی دروازوں میں سے کسی دروازے سے۔ (منقول از ائمہ تفسیر)۔

۲۴۔ حذف، جیسے قرآن میں ہے: "يُبَيِّنُ اللّٰهُ اَنْ تَضِلُّوا" (نساء / ۱۷۶) خدا تمہارے لئے (احکام) بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ یعنی "ان لا تضلوا" ہے، اور "لا" کو حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۵۔ اضافہ (زیادتی)، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (شوریٰ / ۱۱) اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ اس میں "ک" اضافہ کے طور پر ہے۔

تو یہ ہیں وہ پچیس قسمیں جنہیں چھان پھٹک کر جمع کیا گیا ہے اور معلوم ہے کہ ان میں سے بعض کا ایک دوسرے میں تداخل بھی ہے۔

قول مصنفؒ :۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ صرف انہی میں تداخل نہیں بلکہ بہت ساری مثالوں میں شدید قسم کا اختلاف بھی ہے لیکن جیسا کہ مشہور محاورہ ہے کہ "لَا مُنَاقَشَةَ فِي الْمِثَالِ" لہٰذا اسی چیز کو پیش نظر رکھ کر

غواص کو مطلب ہے گہر سے، نہ صدف سے　　الفاظ کے چکر میں الجھتے نہیں دانا

چھٹا مسئلہ: "سبک مجاز فی المجاز" (مجاز در مجاز کی روش) کے بارے میں بھی اختلاف ہے اور "مجاز در مجاز" یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ کسی تعلق اور رابطے کی وجہ سے حقیقی کی بجائے مجازی معنی میں استعمال ہو کر پھر کسی اور رابطے کی وجہ سے جو اس مجاز اور

کسی دوسرے معنی میں پایا جائے اسی دو سے مجازی معنی میں استعمال ہونے لگے

مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کسی نے اس مسئلہ پر مستقل بحث کی ہو اور نہ ہی میں نے متقدمین کے کلام میں اس بارے میں کوئی مستقل عنوان دیکھا ہے۔ البتہ ان کے کلام میں اس بات کی طرف اشارہ ضرور ملتا ہے اور بقدر ضرورت اس کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن مستقل طور پر اس کے چہرہ سے نقاب نہیں الٹی اور پوری طرح تفصیل سے بیان نہیں کیا۔

حق بات یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور اس پر بعض حضرات کا اتفاق ہے جن میں سے علامہ حلیؒ (نہایہ میں)، عمیدی (منیہ میں) اور فاضل قمیؒ (قوانین میں) اس بات کے حامی ہیں، جبکہ صاحب فصول اور صاحب مصابیح نے اس کے خلاف موقف اختیار کیا ہے۔ پہلے گروہ کا کہنا ہے کہ معروف تعلق اور رابطہ اس وقت معتبر ہوگا جب مجازی معنی اور معنی موضوع لہ کے درمیان ہو اور اگر مجازی معنی اور دوسرے مجازی معنی کے درمیان ہوگا تو اسے قابل اعتبار نہیں سمجھا جائے گا، لیکن اگر اس حیثیت سے ہو کہ اس کے اور حقیقی معنی کے درمیان تعلق کا موجب بن رہا ہو تو پھر اس حیثیت سے قابل اعتبار ہوگا۔ بنابر ایں جو لوگ "سبک مجاز در مجاز" کے مخالف ہیں وہ ایسا کرنے سے روکتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کی طبیعت اجازت نہیں دیتی اور یہ کہ اس قسم کے تعلق پیدا کر کے جرات کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے کیونکہ ایسے تعلقات اعتبار سے بعید ہیں۔..........

....

اہل لغت کی ایک جماعت نے صراحت کے ساتھ اس قسم کے مجاز کو جائز قرار دیا ہے، ان میں سے فیروز آبادی نے "البصائر" میں۔ جیسا کہ کتاب "الاقیانوس" میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے۔ زمخشری نے کتاب "اساس البلاغہ" میں "نطح" کے مادہ میں اور ان میں شارح "القاموس" بھی شامل ہیں جنہوں نے "رکع" کے سلسلے میں اس کو جائز قرار دیا ہے۔..........

....

(از مترجم: مذکورہ حضرات کے مدلل بیانات تحریر کرنے کے بعد "ابوالمظفر مطرزی" کے استدلال کو زیادہ واضح قرار دیا گیا ہے جو انہوں نے "مقامات حریری" کی شرح کے سلسلے میں لفظ "مقامہ" کی تشریح کی ہے اور آخر میں "ابوالبقاء" کی "حقیقت اور مجاز" کے سلسلہ میں تشریح کو لکھا اور اس مسئلہ کو "فافہم واغتنم" کے الفاظ پر ختم کیا ہے)

<u>ساتواں مسئلہ</u> : معلوم ہونا چاہئے کہ "مجاز بالذات" صرف اسمائے اجناس پر ہی داخل ہوتا ہے یعنی وہ اسماء جو غیر واضح مفہوم کیلئے وضع کئے جائیں اور ان کے معنی کا ان کے غیر کے ساتھ تعلق نہ ہو خواہ وہ عین کے اسماء ہوں جیسے "اسد" اور "رجل" یا معنی کے، جیسے "قتل، قیام اور قعود" وغیرہ۔ لہذا اسمائے اجناس کے علاوہ کوئی اور چیز "مجاز بالذات" سے متصف نہیں ہوتی اعلام شخصیہ (اشخاص کے نام) اس لئے مجاز نہیں بن سکتے کیونکہ مجاز کیلئے شرط ہے کہ اس کا اصل اور فرع کے ساتھ تعلق ہو اور یہ چیز ان اعلام میں نہیں پائی جاتی۔ اسی لئے تو "باب استعارہ" میں کہتے ہیں کہ استعارہ علم نہیں ہو سکتا کیونکہ استعارہ مشبہ کو مشبہ بہ کی جنس میں داخل کرنے کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور اس کے افراد کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے ا۔ متعارف ۲۔ غیر متعارف۔ اور یہ

بات علَم میں ممکن نہیں ہوتی اسلیئے کہ علَم، تشخص اور منع اشتراک کا خواہاں ہوتا ہے جو استعارہ میں معتبر جنس ہونے کے منافی ہے۔

ہاں البتہ اگر علَم میں جنسیت کی کوئی صورت نکل آئے خواہ وہ کسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی شہرت کی صورت میں ہی ہو تو اس وقت استعارہ جائز ہوگا۔ جیسا کہ "حاتم" ہے اور یہ نام جود وسخا کے وصف سے متصف ہے لہذا اس صورت میں جائز ہوگا کہ کسی شخص کو حاتم کے ساتھ اس کی سخاوت میں تشبیہ دی جائے۔ اور اس وقت "حاتم" کی یوں تاویل کی جائے گی کہ یہ قرار دیا جائے گا کہ یہ لفظ موضوع ہی "جواد مطلق" کیلیئے ہے، خواہ وہ فرد معروف ہو یا غیر معروف۔ لہذا اس کا اطلاق فرد متعارف پر حقیقت ہوگا اور غیر متعارف پر مجاز ہوگا، جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ: "رَاَیْتُ الْیَومَ حَاتِمًا" میں نے آج حاتم کو دیکھا۔

رہے اسمائے مشتقہ، جیسے فاعل، مفعول، صفت مشبہ، اسم زمان، اسم مکان اور اسم آلہ وغیرہ تو باوجہ ان کے مشتق ہونے کے ان میں مجاز ہوگا اور یہی حال افعال کا ہے۔ اور اسی بنا پر کہتے ہیں کہ افعال اور دیگر مشتقات میں استعارہ تابع کی صورت میں ہوتا ہے جیسا کہ کہتے ہیں: "نَطَقَتُ الْحَالَ بِکَذَا" تو یہاں پر "نطق" کو پہلے مرحلہ میں استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ مشابہت کی وجہ سے دلالت کر رہا ہے معانی کی وضاحت اور ذہن تک پہنچانے پر! یا پھر مجاز ایسا کہا گیا ہے کہ جس میں لزوم کا تعلق پایا جاتا ہے اس لئے کہ دلالت "نطق" کیلیئے لازمی ہوتی ہے لہذا "مجاز مرسل" ہوگا پھر اس سے نطقتُ کو مشتق کیا گیا ہے جو دلالت کے معنی میں ہے لہذا استعارہ اور مجاز مصدر میں اصلی ہوگا اور فعل میں اس کے تابع کی حیثیت سے، کیونکہ فعل میں بالذات جائز نہیں ہوتا اس لئے کہ نسبت اپنے حال پر باقی رہتی ہے اور مجاز کا قرینہ فاعل ہوتا ہے۔ کیونکہ حال کی شان نطق نہیں بلکہ دلالت کرنا ہوتی ہے اور یہی ساری مذکورہ صورتحال ہمارے اس قول میں بھی ہوگی "اَلْحَالُ نَاطِقَةٌ بِکَذَا" اور یہی کیفیت باقی مشتقات کی ہوگی۔

اب آتے ہیں حروف کی طرف تو اس بارے میں یہی کہا جائے گا چونکہ مفہوم کے اعتبار سے ان کے معانی مستقل نہیں ہوتے لہذا یہ بالذات نہ تو حقیقت بن سکتے ہیں اور نہ ہی مجاز کیونکہ حقیقت اور مجاز کا تعلق مستقل اور ان کے عوارض معانی کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ (حقیقت اور مجاز) اگر حروف کیلیئے آتے بھی ہیں تو ان کے متعلقات کے اعتبار سے، اور متعلقات سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ساتھ حروف کا معانی کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔

صاحب مفتاح فرماتے ہیں کہ: "معانی حروف کے متعلقات سے مراد وہ چیز ہے جس سے ان حروف کے معانی کی تفسیر کرتے وقت انہیں معتبر کیا جائے، مثلاً ہم کہتے ہیں "مِن" تو اس کا معنی ہے "ابتداء غایت" اور "في" اس کا معنی ہے "ظرفیت" اور "کَيْ" اس کا معنی ہے "غرض" تو یہ ان حروف کے معانی نہیں بلکہ ان کی تعبیریں ہیں ورنہ یہ حروف نہ ہوتے بلکہ اسماء ہوتے۔ کیونکہ اسم ہونا یا حرف ہونا معنی کے اعتبار سے ہے اور یہ ان کے معانی کے متعلقات ہیں یعنی جب یہ حروف ان معانی کا فائدہ دیں گے تو وہ معانی "استلزام" کی وجہ سے یہ کیفیت اختیار کریں گے۔

مقصود یہ ہے کہ حروف حقیقت اور مجاز کی صفت سے متصف ہو سکتے ہیں لیکن اپنے معانی کے متعلقات کے تابع ہو کر، جیسے ہم کہتے ہیں "زَیْدٌفِي الدَّارِ" تو یہ جملہ حقیقت ہوگا اور کہتے ہیں کہ "زَیْدٌفِي نِعْمَةٍ" تو یہ مجاز ہوگا۔ اسی طرح "ضَرَبْتُهُ لِلتَّادِیْبِ"

حقیقت ہے اور خداوند عالم کا یہ قول مجاز ہے "فَالْتَقَطَهٗ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا" (قصص / ۸) فرعون والوں نے موسیٰ کو (دریا سے) اٹھالیا تا کہ انجام کار وہ ان کا دشمن اور باعث اندوہ ہو جائے۔

حقیقت اور مجاز کی بحث کا خاتمہ

معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح ہم پہلے حقیقت اور مجاز کی تعریف میں بتا چکے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے اس لئے کہ یہ دونوں وجودی امر ہیں جو ایک جہت کے لحاظ سے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان میں "تضایف" ہوتا ہے بلکہ ان کے درمیان "تقابل تضاد" کی نسبت ہوتی ہے کہ جس کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ ایک محل دو ضدوں سے خالی ہو سکتا ہے لہذا یہ بات بلا اشکال کہی جا سکتی ہے کہ ایک لفظ بیک وقت حقیقت اور مجاز کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتا بہ الفاظ دیگر جائز ہے کہ ایک لفظ ایک ہی وقت میں نہ حقیقت ہو اور نہ ہی مجاز اور یہ بات علم الاصول میں یوں مشہور ہے کہ "کوئی لفظ اپنے معنی موضوع لہ میں استعمال ہونے سے پہلے نہ تو حقیقت ہوتا ہے اور نہ ہی مجاز اس لئے کہ اس کا دونوں چیزوں میں استعمال ظاہر ہے"۔

بعض محققین کا قول ہے اس سے مراد یہ ہے کہ لفظ وضع کے وقت اور استعمال سے پہلے نہ تو حقیقت ہوتا ہے اور نہ ہی مجاز۔ اس لئے نہیں کہ استعمال ہونے والا لفظ عدم استعمال کے وقت ان دونوں صورتوں سے خارج ہوتا ہے، بلکہ وہ اس وقت حقیقت بھی ہوتا ہے اور مجاز بھی۔ حقیقت ہوتا ہے اپنے معنی موضوع لہ مستعمل فیہ کی نسبت اور مجاز ہوتا ہے اپنے معنی مستعمل فیہ لیکن غیر موضوع لہ کی نسبت۔ چنانچہ آپ "اسد" (شیر) کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ "حیوان مفترس" (درندہ جانور) کیلئے حقیقت ہے اور "رجل شجاع" (بہادر انسان) کیلئے مجاز ہے۔ اسی طرح آپ کسی بھی لفظ کو لے لیں، بنا بر ایں کوئی حقیقت اور مجاز ایسا نہیں ہے مگر استعمال سے پہلے ان کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں بول کر ان کی ذات مراد لی جاتی ہے نا کہ ان کے موضوع لہ معانی۔ مثلاً کہا جاتا ہے ضَرَبَ فعل ماضی ہے مِن حرف جر ہے اور اَیْنَ حرف استفہام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تمام الفاظ نہ تو حقیقت ہیں اور نہ ہی مجاز کیونکہ ان میں وضع اور تاویل مفقود ہے بلکہ ان کا اس لئے اطلاق ہوا ہے کہ سامع کے ذہن میں وہ حاضر ہو جائیں پھر ان کے لوازمات کا حکم لگایا جائے۔

سید محقق کاظمیؒ شرح وافیہ میں فرماتے ہیں کہ لفظ اپنے اس قسم کے استعمال سے نہ تو اسم ہونے کے ساتھ موصوف ہو سکتا ہے اور نہ فعل ہونے کے ساتھ، نہ اسے مفرد کہا جا سکتا ہے اور نہ مرکب، نہ ہی حقیقت اور نہ ہی مجاز، کیونکہ اس میں سارے معانی پائے جاتے ہیں۔

اسی زمرے میں اعلام شخصیہ کا شمار بھی ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ حلیؒ نے "نہایہ" میں، محقق کاظمی اور آمدی نے انہیں شمار کیا ہے بلکہ رازی اور بیضاوی وغیرہ کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے اور انہوں نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ "حقیقت" وہ ہوتی ہے جس میں لفظ کو پہلی مرتبہ اپنے معنی موضوع لہ میں استعمال کیا جائے اور "مجاز" وہ ہوتا ہے کہ جس میں لفظ کو پہلی مرتبہ اپنے معنی غیر موضوع لہ میں استعمال کیا جائے۔ اور یہ بات اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اسم خواہ حقیقی ہو خواہ مجازی اس قسم کے استعمال سے پہلے

لغت میں موضوع ہوں جبکہ اسمائے اعلام اسی طرح نہیں ہیں اس لئے کہ ان کے استعمال کرنے والے نے انہیں سب سے پہلے وہاں پر استعمال نہیں کیا جہاں کیلئے اہل لغت نے انہیں وضع کیا ہے نہ وہاں پر اور نہ ہی کسی اور جگہ۔ اس لئے کہ ان کیلئے وضع سابق ہی نہیں، اور پھر یہ بھی کہ ان کے استعمال کرنے والے نے ان کے مسمی میں ان کے لغوی معنی کے لحاظ سے مسمی ہونے کا لحاظ بھی نہیں کیا۔ لہذا انہیں نہ تو حقیقت کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی مجاز۔

قول مصنف: انصاف کی بات یہ ہے کہ ان کا یہ استدلال اشکال سے خالی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے حقیقت کی اقسام کو تین ہی قسموں میں محصور کر دیا ہے۔ یعنی لغویہ، شرعیہ اور عرفیہ میں اور جو ان تینوں قسموں سے خارج ہو وہ گویا مجاز سے بھی خارج ہو جائے گا۔ حقیقت شرعیہ کا حال تو واضح ہے۔ رہی بات حقیقت لغویہ کی تو چونکہ اس کا واضع وہی ہے جو لغت کا واضع ہے۔ اور یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اعلام کو واضع لغت نے وضع نہیں کیا اسلئے کہ ان میں سے ہر ایک علم کا ایک مخصوص واضع ہے، جبکہ حقیقت لغویہ یہ ہے کہ اسے واضع لغت نے اہل لغت کے محاورات کی تالیف کیلئے وضع کیا ہے۔ اور یہ کسی ایک قسم کے لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہے جبکہ یہ اسماء اس طرح نہیں ہیں۔ اور پھر یہ کہ یہ اسماء کسی ایک لغت کے ساتھ بھی خاص نہیں بلکہ ہمیشہ جدت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر عرفیہ عامہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا تعلق شہرت اور تعین سے ہوتا ہے جبکہ اعلام کا تعلق تشخص اور تعین کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور عرفیہ کے لئے کوئی معین واضع نہیں ہیں جبکہ اعلام کیلئے معین واضع ہیں۔

رہی بات عرفیہ خاصہ کی، تو اس کے بارے میں صراحت ہو چکی ہے کہ اس میں کسی قوم یا فریق کی وضع ہوتی ہے جو کسی فن اور صنعت میں شریک ہوتے ہیں جبکہ اعلام کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی وضع عام طور پر ایک شخص کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر عرفیہ خاصہ کا استعمال کرنے والا اسی اصطلاح سے تعلق رکھتا ہو تو وہ حقیقت ہوتی ہے، مثلاً فعل ہی کو لیجئے، جب اسے غیر نحوی اسم اور حرف کے مقابلے میں استعمال کریں گے تو وہ مجاز ہو گا۔ کیونکہ وہ ایک ایسے معنی میں استعمال ہو رہا ہے جس کیلئے وضع نہیں کیا گیا، جبکہ اعلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ ان کا کسی خاص اصطلاح کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن اس سارے معاملے کے باوجود یہ قول بعید نہیں ہے کہ یہ حقیقت ہیں کیونکہ ان پر حقیقت کی تعریف صادق آتی ہے۔ لہذا ضروری ہو جاتا ہے کہ حقیقت کیلئے ایک چوتھی قسم بنائی جائے جس کا نام "حقیقت علمیہ" رکھا جائے۔

اسی لئے عمیدی نے شرح تہذیب میں ان لوگوں پر اعتراض کیا ہے جو ان کے حقیقت سے خارج ہونے کے قائل ہیں اور کہا ہے کہ اکثر اعلام اپنے ان معانی سے منقول ہیں جن کیلئے انہیں اہل لغت نے وضع کیا ہے، اس کیلئے انہوں نے مثال دی ہے کہ مثلاً زید اور عمرو ہیں۔ اور یہ لغوی لحاظ سے وضع کئے گئے ہیں۔ کیونکہ "زید" مصدر ہے "زاد" کا اور "عمرو" مصدر ہے "عمر" کا۔ لیکن وہ استعمال ہو رہے ہیں ان معانی میں جن کیلئے انہیں اہل لغت نے وضع نہیں کیا اور نہ ہی دوسرے معنی میں۔ اور یہ محال ہے اس لئے کہ ان دونوں قسموں کے درمیان واسطہ کا ثبوت محال ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ اعلام اپنے استعمال کے بعد حقیقت بن جاتے ہیں اس لئے کہ وہ نئی وضع اختیار کر لیتے

ہیں۔ لیکن اگر انہیں لغوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ نہ حقیقت ہیں اور نہ ہی مجاز، اگر چہ کہ اپنے ان معانی سے منقول ہو چکے ہیں جن کیلئے انہیں اہل لغت نے وضع کیا تھا۔ کیونکہ انہیں "اعلام" وضع کرنے والے نے ان کے لغوی معنی میں استعمال نہیں کیا اور ان کے مسمی میں بھی "مسمیات لغویہ" کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اور اپنے استعمال سے پہلے یہ تو حقیقت تھے اور نہ ہی مجاز، بس وہ صرف اعلام تھے اور بس!

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ممکن ہے کہ انہیں عرفیہ خاصہ میں شامل کیا جائے۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ اس میں وضع کا صدور کسی قوم یا گروہ سے ضروری نہیں ہے جس طرح کہ بعض لوگوں کا وہم ہے بلکہ اس کا صدور ہی کافی ہے خواہ کسی ایک شخص سے ہی کیوں نہ ہو اور "حقیقت شرعیہ" اس قول کی بنا پر جو اس کے ثبوت کا قائل ہے اس کا تعلق بھی "عرفیہ خاصہ" سے ہے۔ جبکہ اس کا واضع صرف ایک شخص ہی ہے، اور وہ ہے "شارع"۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عرفیہ خاصہ کا استعمال اگر اہل اصطلاح کی طرف سے ہو تو حقیقت ہوتا ہے، نا قابل قبول ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ جب اسے اہل اصطلاح کے کلام میں ان کے علاوہ دوسرے لوگ ان کی اتباع میں استعمال کریں گے تو حقیقت ہوگی۔ جیساکہ تمام حقیقتوں کی یہی شان ہے اور اس میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے۔

یہ ساری گفتگو "اعلام شخصیہ" کے بارے میں تھی۔ لیکن عرف عام میں "اعلام مغلبہ" مثلاً "البیت" یا "النجم" یا عرف خاص میں "سیبویہ" کی کتاب "الکتاب" ہے۔ ان کا تعلق بلاشک و تردید عرفیہ عامہ یا عرفیہ خاصہ سے ہوگا، جیساکہ "اعلام جنسیہ" مثلاً "اسامہ" اور "ثعالہ" ہیں کا کسی قسم کی تردید اور شک کے بغیر ان کا تعلق "حقیقت لغویہ" سے ہے۔

☆ تیسری فصل: مشترک میں ہے اور اس میں چند مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ: مشترک کی تعریف میں ہے۔ چنانچہ اس کی مختلف انداز میں تعریف کی گئی ہے، لیکن سب سے بہتر تعریف وہی ہے جو کتاب "النہایہ" میں ہے کہ "مشترک وہ لفظ ہے جو کئی معانی کو حقیقت کے طور پر یکساں طریقہ سے شامل ہو، لفظ ہونے کی حیثیت سے"۔ تو اس طرح کی تعریف سے الفاظ متباینہ، علم، کلی متواطی اور وہ الفاظ خارج ہو جائیں گے جو کچھ تو حقیقت ہیں اور کچھ مجاز ہیں۔ چنانچہ مصنف کی طرف سے اس تعریف پر جامع اور مانع نہ ہونے کے اعتراضات کئے گئے ہیں اور کہا ہے کہ اگر اس کی تعریف یوں کی جاتی تو بہتر تھا: "مشترک وہ لفظ واحد ہے جو متعدد معانی کیلئے وضع کیا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ وضع ثانی کی وضع اول کے ساتھ کیا نسبت ہے اور نہ ہی پہلی وضع کو چھوڑ کر دوسری میں اس کی شہرت کو دیکھا جائے" تو اس طرح کی تعریف میں الفاظ متباینہ، علم، کلی متواطی اور وہ الفاظ خارج ہو جائیں گے جو ایک معنی میں حقیقت ہیں اور ایک لحاظ سے دوسرے میں مجاز ہیں، منقول اور مرتجل بھی (اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں)۔

دوسرا مسئلہ: علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا اشتراک ممکن ہے؟ حق بات یہ ہے کہ ممکن ہے کیونکہ یہ واقع ہوا ہے لہذا ممکن ہے چونکہ کبریٰ ظاہر ہے اور صغریٰ کے بارے میں ہم آئندہ مسئلہ میں بیان کریں گے۔

اس طرح اس بات میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ ایک گروہ کسی لفظ کو کسی معنی کیلئے وضع کرے اور دوسرا گروہ اسی لفظ کو کسی اور معنی کیلئے۔ تو اس کی دونوں طرح کی وضع شائع ہو جائیں گی جن سے اشتراک حاصل ہوگا۔ یہ تو اس قوت ہے جب واضع مختلف اور متعدد ہوں۔ لیکن اگر واضع ایک ہی ہو تو اس سے مخاطب کی غرض، مخاطب کو اجمالی طور پر اس کے ضمیر سے باخبر کرنا ہوتا ہے جس طرح کہ اس کی غرض تفصیلی طور پر باخبر کرنا بھی ہوتا ہے، لہذا حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ مشترک کو وضع کیا جائے تاکہ اس سے علم اجمالی کا فائدہ حاصل ہو جس طرح کہ مفرد کی وضع سے علم تفصیلی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ....

ہاں البتہ کبھی وجوب اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ اشتراک کسی حکمت کا متقاضی ہوتا ہے جسے پورا کرنے کیلئے لغوی مجملات کا ہونا ضروری ہوتا ہے کیونکہ بعض حالات میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اس نظریہ کے تحت اس کے کئی دوسرے لفظی اور معنوی فوائد بھی ہیں لہذا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ: جو لوگ اشتراک کے قائل ہیں ان میں اختلاف ہے کہ آیا یہ واقع بھی ہوا ہے یا نہیں؟ تو حق یہ ہے کہ واقع ہوا ہے اور اس کی مثال یوں سمجھئے کہ لفظ "قرء" ہے جو "حیض" اور "طہر" (حیض سے پاکیزگی کی مدت) کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح لفظ "جَون" ہے "ابیض" (سفید) اور "اسود" (سیاہ) کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ ان معانی پر ان الفاظ کا اطلاق یکساں اور بغیر کسی ترجیح کے ہوتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ جب مخاطب ان الفاظ کو سنتا ہے تو وہ تردد میں پڑ جاتا ہے اور اس کا ذہن فوراً نہ کسی ایک معنی کی طرف جاتا ہے اور نہ ہی بیک وقت دونوں کی طرف۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مشترک واقع ہوا ہے کیونکہ اگر کسی ایک معنی کیلئے حقیقت اور دوسرے کیلئے مجاز ہوتا یا متواطی ہوتا تو یہ تردد نہ ہوتا۔

لیکن جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مانع افراد یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس طرح سے سمجھنے اور سمجھانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس قسم کے الفاظ یا تو متواطی ہیں یا پھر حقیقت اور مجاز! مثلاً لفظ "عَین" ہے یہ پہلے تو "آنکھ" کیلئے وضع کیا گیا، پھر مجاز کے طور پر اس کا اطلاق "دینار" پر ہوا۔ اس کا اور آنکھ کا رابطہ اور تعلق "شفافیت" اور "عزت" ہے۔ پھر اس کا اطلاق "سورج" پر ہوا وجہ وہی "شفافیت" ہے پھر "پانی" پر ہوا تعلق وہی "شفافیت" والا تھا۔

تو اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس کا جواب پہلے دے چکے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ انہوں نے اپنا مدعا ثابت کرنے کیلئے بے سود کوشش کی ہے اس لئے کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور اکثر مواقع پر تو کوئی معتبر تعلق بھی واضح نہیں کر پائے اور اگر مذکورہ مثال میں معتبر تعلق کو تسلیم کر بھی لیں تو اس سے "مجاز در مجاز کی روش" ثابت ہوتی ہے۔ جبکہ آپ جان چکے ہیں کہ اکثر لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ مشترک کے واقع ہونے کے قائل ہیں وہ بھی اس حد تک اسے جائز قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ جو لوگ اس طرز پر ایک لفظ کے ستر "مجاز در مجاز در مجاز" کے قائل ہیں ان کے اس قول سے طبیعت میں

اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ انتہائی طور پر جو چیز ثابت ہے وہ صرف ایک ہی مرتبہ مجاز در مجاز کی صورت ہے۔ لیکن مجاز در مجاز در مجاز......... پر کوئی دلیل نہیں ملتی اور اس کے معدوم ہونے سے کئی مجاز در مجاز کے معدوم ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ اس لئے کہ ان الفاظ کا شمار "توقیفیة اللغات" میں ہوتا ہے جن کے استعمال کیلئے صاحب لغت کی طرف سے اجازت اور رخصت کی ضرورت ہوتی ہے۔

چوتھا مسئلہ: جب ہم اشتراک لغوی کے قائل ہو چکے تو کیا یہ قرآن سے بھی ثابت ہے؟۔ حق بات یہ ہے کہ یہ قرآن سے ثابت ہے۔ اس کی دلیل قرآن مجید میں ہے ارشاد ہوتا ہے: "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ" (بقرہ / ۲۲۸) طلاق یافتہ عورتیں تین قروؤ کا انتظار کریں۔ (یہاں پر قرؤ کا معنی "طہر اور حیض" ہے)۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے "وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ" (تکویر / ۱۷) یعنی قسم ہے رات کی جب وہ آئے اور جائے۔ (یہاں پر "عَسْعَسَ" کا معنی "أَقْبَلَ وَ أَدْبَرَ" ہے)۔

اس موقف کی مخالفت شاذ لوگوں نے کی ہے۔ ان کی دلیل وہی ہے جو گزر چکی ہے کہ لفظ سے مقصود تو کسی چیز کا سمجھانا ہوتا ہے تو پھر اس کیلئے یا تو کوئی قرینہ ہوگا جو مراد کو متعین کرے یا نہیں ہوگا۔ اگر ہوگا تو پھر بے فائدہ طوالت ہو جائے گی کیونکہ مقصود کی ادائیگی اور اس کی تعبیر کیلئے انفرادی صورت ہی کافی ہے اور اگر قرینہ نہیں ہوگا تو پھر تکلیف مالا یطاق ہوگی کیونکہ لفظ سے ایسا معنی طلب کیا جارہا ہے جس پر اس لفظ کی دلالت ہو رہی ہو اور ساتھ ہی دوسرے معانی پر بھی یکساں دلالت ہو رہی ہے۔ اور یہ بات تکلیف محال کے زمرے میں آجائے گی۔ اور اگر اس سے مراد عدم افہام ہے تو یہ بات بھی حکیم متعال کیلئے عبث اور قبیح ہے۔

جواب: پہلی شق کو اختیار کرتے ہوئے اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ اس سے تطویل لا طائل یا بے مقصد طوالت لازم نہیں آتی کیونکہ اگر پہلے کوئی چیز مجمل بیان کی جائے اور بعد میں تفصیل کے ساتھ تو یہ علم بلاغت کے لحاظ سے زیادہ وقیع ہے۔ اور اگر دوسری شق کو اختیار کیا جائے تو تکلیف مالا یطاق اس لئے لازم نہیں آتی کہ یہ تو اس وقت لازم آتی ہے کہ جب کوئی تفصیلی معرفت کیلئے مکلف ہو نا کہ مطلق معرفت کیلئے، جیساکہ اسمائے اجناس میں ہے۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب مشترک مبین نہ ہو اور احکام کے ساتھ بھی اس کا تعلق نہ ہو اور اگر اس کا تعلق احکام کے ساتھ ہو تو اس وقت مکلف کو احکام کی بجا آوری کیلئے استعداد کا فائدہ دے گا۔ کیونکہ کچھ مکلف ایسے ہیں جو اطاعت کیلئے احکام کی بجا آوری کا عزم رکھتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نافرمانی کے طور پر اس کے خلاف کا عزم رکھتے ہیں، جیساکہ کہا گیا ہے۔

البتہ اس کی تفصیل خطبہ شقشقیہ کی شرح میں آئے گی۔

پانچواں مسئلہ: لفظ مشترک کا استعمال۔

علماء اصول کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا لفظ مشترک کو ایک سے زیادہ میں استعمال کرنا جائز ہے؟۔ بالفاظ دیگر آیا یہ جائز ہے کہ لفظ مشترک کے ایک اطلاق میں ایک سے زائد معانی کا قصد کیا جائے؟۔ مثلاً جب لفظ "عَيْنٌ" بولا جائے تو بیک وقت اس

سے آنکھ اور چشمہ مراد لیا جائے یا لفظ "قُرْء" جو کہ عورتوں کی صفات سے ہے بول کر یہ مراد لیا جائے کہ "طہر" اور "حیض" عورتوں کی صفات سے ہیں۔ تو اس بارے میں کچھ حضرات کا موقف ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، ان میں علامہ حلیؒ، شارح بحرانی، صاحب معالم اور سلطان العلماء رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ جبکہ بیضاوی، عبری، اور صاحب جمع الجوامع کے بارے میں بھی یہی بتایا گیا ہے اور علامہ حلیؒ نے "النہایہ" میں اسی بات کی نسبت امام شافعی، قاضی ابو بکر، جبائی، قاضی عبد الجبار اور سید مرتضیٰ رضوان اللہ علیہ کی طرف بھی دی ہے۔ دوسرا فریق اس کے جواز کا مطلقاً قائل نہیں ہے خواہ مفرد ہو یا تثنیہ اور جمع، مثبت ہو یا منفی اور حقیقت ہو یا مجاز اور حق بھی یہی ہے۔ اور اس موقف کے حامی بہت سے محققین ہیں جن میں فاضل قمی، صاحب الفصول، شریف العلماء، سید ابراہیم قزوینی اور ہمارے استاد بزرگوار سید حسین قدس سرہ شامل ہیں۔ جبکہ ابو ہاشم، کرخی، ابو حنیفہ، ابو الحسین بصری، ابو عبد اللہ بصری اور فخر الدین رازی کے بارے میں بھی اسی موقف کی حمایت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو اس کے جواز کے قائل ہیں ان میں پھر اختلاف ہے وہ کہتے ہیں:

۱۔ اس کا اطلاق حقیقت کے طور پر ہے اور یہی اکثر علماء کے اطلاق سے معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اس کا اطلاق مجاز کی صورت میں ہے اور یہ موقف علامہ حلیؒ کا "التہذیب" میں ہے اور شارح بحرانی بھی اسی کے قائل ہیں۔

۳۔ اس کا اطلاق مفرد میں مجاز کے طور پر ہے اور تثنیہ اور جمع میں حقیقت کے طور پر۔ اور یہ موقف صاحب معالم کا ہے البتہ کتاب "النہایہ" میں علامہ حلیؒ کے بھی اسی موقف کی طرف رجحان کے اشارے ملتے ہیں، جیسا کہ انشاء اللہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا۔ رہی نفی اور اثبات کے درمیان تفصیل تو نفی میں جائز اور اثبات میں ممنوع سمجھتے ہیں اور یہ بات کتاب "النہایہ" میں ذکر کی گئی ہے اور بعض دوسرے علماء اصول کا بھی یہی موقف ہے۔

(قول مترجم: اس مقام پر شارح علام رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا موضوعات پر کھل کر بحث کی ہے اور ان موضوعات کے مجوزین اور مانعین کے دلائل کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد اپنی رائے بھی پیش کی ہے اور آخر میں فرماتے ہیں): "میں نے اس مسئلہ میں کلام کو اتنا طول دیا ہے حالانکہ اس کا تعلق کتب اصول سے ہے جہاں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، میرے طول دینے کی وجہ شارح بحرانیؒ کی غلطیوں کی طرف توجہ دلانا ہے اور اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ موصوف نے اس مسئلہ کو اپنی شرح کے مقدمات میں ذکر کیا ہے اور لفظ مشترک کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہوئے شرح کے بہت سے مقامات پر اسی بنیاد پر اپنی رائے قائم کی ہے۔ اور اسی اساس پر امامؑ کے کلام کی تشریح کی ہے اور حضرتؑ کے خطبہ ۱۰۸ میں جو تشریح کی ہے بہت سے مواقع پر لغزش کا شکار ہوئے ہیں جس کا آغاز "كُلُّ شَيْءٍ خَاضِعٌ لَهُ" سے ہوتا ہے۔ اور یہ تو صرف ایک مقام کی طرف اشارہ ہے ورنہ اس طرح کی غلطیاں بہت سے مقامات پر بھی ہیں اور ہم انشاء اللہ ہر موقع پر ان کی اس قسم کی گفتگو سے آپ کو باخبر کریں گے۔

دوسرا مطلب: بلاغت کے چند فنون میں ہے جو امامؑ کے کلام میں عام طور پر کافی حد تک اور اکثر مقامات پر دکھائی دیتی ہے اور بلاغت کے تین فنون ہیں ۱۔ تشبیہ ۲۔ استعارہ ۳۔ کنایہ اور اس کی تفصیل تین فصلوں میں بیان ہوگی۔

پہلی فصل

تشبیہ میں ہے

مطرزی کہتے ہیں کہ : " تشبیہ ارکان بلاغت کا ایک اہم رکن ہے اور یہ خفی کو جلی کی طرف نکال لاتی ہے اور دور کو نزدیک کر دکھاتی ہے اور جو شخص اشارہ و تمثیل کی راہ پر چلنا چاہتا ہے اس کیلئے راہ ہموار کرتی ہے اس لئے کہ یہ استعارہ اور تمثیل کیلئے اصل کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ دونوں اِس کیلئے فرع ہیں "۔

مبرد کہتے ہیں کہ : "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تشبیہ، کلام عرب کا اکثر حصہ ہے تو اس نے غلط نہیں کہا"۔

تشبیہ کی تعریف : علماء نے اس کی مختلف انداز میں تعریفیں کی ہیں لیکن سب سے بہتر اور مناسب تعریف وہ ہے جو صاحب تلخیص اور کچھ دوسرے افراد نے کی ہے اور وہ یہ ہے " تشبیہ وہ ہے کہ جو اس امر پر دلالت کرے کہ یہ امر معنی میں ایک اور امر کے شریک ہے "۔ اور اس بارے میں چار ارکان کے تحت بحث کی جائے گی۔

☆ **رکن اول :** تشبیہ کے دونوں اطراف یعنی مشبّہ اور مشبّہ بہ کے بیان میں ہے۔

تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دونوں یا تو محسوس ہوں گے یا معقول۔ یا مشبّہ معقول اور مشبّہ بہ محسوس ہو گا یا بالعکس یعنی مشبّہ محسوس اور مشبّہ بہ معقول ہو گا۔

پہلی قسم کی مثال حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ کلام ہے : "كَأَنِّيْ بِمَسْجِدِكُمْ كَجُؤْجُؤِ السَّفِيْنَةِ" (خطبہ ۱۳) گویا میری نظروں میں پھر رہا ہے کہ تمہاری (اہل بصرہ کی) مسجد یوں نمایاں ہو گی جیسے کشتی کا سینہ ہے۔ یا جیسے آپؑ کا ایک اور فرمان ہے "فُطِرْتُ بِعِنَانِهَا وَاسْتَبْدَدْتُ بِرِهَانِهَا كَالْجَبَلِ لَاتُحَرِّكُهُ الْقَوَاصِفُ" (خطبہ ۳۷) میر ا اس تحریک کی باگ تھامنا تھا کہ وہ اُڑ سی گئی اور میں صاف تھا جو اس میدان میں بازی لے گیا، معلوم ہو تا تھا جیسے پہاڑ جسے نہ تند ہوائیں جنبش دے سکتی ہیں.........

محسوس سے مراد وہ ہے جسے حواس خمسہ یعنی حس بصر (دیکھنے کی حس)، حس سمع (سننے کی حس)، حس شم (سونگھنے کی حس)، حس ذوق (چکھنے کی حس) اور حس لمس (چھونے کی حس) سے ادراک کیا جائے۔

دوسری قسم کی مثال جیسے امامؑ کا فرمان ہے : "حَتّٰى تَكُوْنَ نُصْرَةُ أَحَدِكُمْ مِنْ أَحَدِهِمْ كَنُصْرَةِ الْعَبْدِ مِنْ سَيِّدِهِ" (خطبہ ۹۶) یہاں تک کہ تم میں سے کسی ایک سے داد خواہی کرنا ایسا ہی ہو گا جیسے غلام کا اپنے آقا سے، کہ وہ سامنے اطاعت کرتا ہے۔

یہاں پر دو چیزوں میں جو تشبیہ پائی جاتی ہے وہ بنی امیہ سے ان کا انتقام اور غلام کا اپنے آقا سے انتقام ہے۔ اور انتقام ایک معقول معنی ہے اور وجہ شبہ ان کی اور غلام کی ذلت ہے

تیسری قسم کی مثال جیسے آپؑ ہی کا فرمان ہے "فَإِنَّ الْأَمْرَ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ كَقَطْرِ الْمَطَرِ" (خطبہ ۲۳) فرمان قضا آسمان سے زمین پر اس طرح اترتے ہیں جس طرح بارش کے قطرات۔ یہاں پر امور کا نازل ہونا معقول ہے اور بارش کا

نزول محسوس ہے۔

اسی طرح آپؑ کا ایک اور ارشاد ہے : "فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا اِلاَّ صُبَابَةٌ كَصُبَابَةِ الإِنَاءِ " (خطبہ ۴۲) اس میں سے کچھ باقی نہیں رہ گیا مگر اتنا ہے کہ جیسے کوئی انڈیلنے والا برتن کو انڈیلے تو اس میں کچھ تری باقی رہ جاتی ہے۔ تو یہاں پر دنیا کا بقیہ معقول ہے اور برتن کا بچا ہوا محسوس ہے۔

چوتھی قسم کی مثال، شاعر کا قول ہے :

كَأَنَّ انْبِضَاضَ الْبَدْرِ مِن بَعْدِ غَيْمِهِ   نِجَاةٌ مِنَ الْبَاسَآءِ بَعْدَ وُقُوعٍ

بادل (کے چھٹ جانے) کے بعد چودھویں کے چاند کی چمک ایسی ہے جیسے مصیبتوں کے واقع ہونے کے بعد نجات ہوتی ہے۔ تو یہاں پر چودھویں کے چاند کی چمک حسی ہے اور مصیبتوں سے نجات عقلی ہے۔

بعض حضرات نے اس قسم کے جواز کو ممنوع قرار دیا ہے اس لئے کہ علوم عقلیہ، حواس ہی کے ذریعہ سے ہی حاصل ہو کر عقل تک پہنچتے ہیں۔ تو گویا محسوس، معقول کیلئے اصل قرار پائیں گے۔ اگر محسوس کے ذریعہ معقول کو تشبیہ دی گئی تو یہ اصل کے فرع اور فرع کے اصل ہو جانے کا موجب ہو گا جو کہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص گفتگو کرتے ہوئے ظہور میں سورج کی تعریف میں اور خوشبو میں مشک کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کہے کہ "اَلشَّمْسُ كَالْحُجَّةِ "سورج اپنے ظاہر ہونے میں حجت کی مثل ہے یا "اَلْمِسْكُ كَخُلْقِ فُلاَنٍ "مشک اپنی خوشبو کے لحاظ سے فلاں کے اخلاق کے مشابہ ہے، تو ایسے کلام کو احمقانہ گفتگو سمجھا جاتا ہے۔

اس دلیل کو یوں رد کیا گیا ہے کہ حواس اگرچہ علم کا ذریعہ ہیں لیکن اس کا مکمل ذریعہ نہیں ہیں البتہ جو بات ممنوع اور ناجائز ہے وہ یہ ہے کہ اس فرع کو اصل بنایا جائے جس کی وہ فرع ہے نہ کہ مطلقاً ہر فرع کو اصل اور ہر اصل کو فرع بنانا ناجائز، تشبیہات اور ملاحظات ذہنیہ میں ایسا کرنا جائز ہے۔

علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ محسوس کو معقول کے ساتھ تشبیہ دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ معقول کو محسوس مقدر مان کر مبالغہ کے طور پر اسے اس محسوس کی اصل کی مانند قرار دیا جائے۔

<u>ایک فرعی مسئلہ</u> : جب مشبّہ اور مشبّہ بہ ایسی چیزیں ہوں جو نہ تو محسوسات یعنی ظاہری حواس سے ادراک ہو سکتی ہوں اور نہ ہی معقولات سے یعنی جن چیزوں کا تعلق قوت عاقلہ کے ذریعہ ادراک سے ہوتا ہے، جیسے خیالیات، وہمیات اور وجدانیات ہیں تو علماء کو مجبوراً محسوس اور معقول کے دامن کو وسیع کرنا پڑ گیا۔ اور اس کیلئے وسعت کی راہیں تلاش کرنا پڑیں تاکہ خارج کی چیزوں کو بھی ان میں لایا جا سکے چنانچہ انہوں نے کہا : "حسی سے مراد ایسی چیز ہے جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک کے ذریعہ خود ادراک میں آئے یا اس کا مادہ"۔ تو اس تعریف سے خیالی چیز بھی اس میں داخل ہو گئی حالانکہ یہ ایک ایسا معدوم ہے جو فرض کر کے ان امور کے مجموعہ میں داخل کر لیا گیا جن کا حس کے ذریعہ ادراک ہوتا ہے، جیسے "گل لالہ" کے پودوں کو یاقوت کے ایسے جھنڈوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی

ہے جو زمرد کے نیزوں پر لہرائے گئے ہوں۔ حالانکہ یاقوت کے جھنڈے کہ جنہیں زمرد کے نیزوں پر لہرایا گیا ہو ایسی چیزیں ہیں جن کا حس کے ذریعہ ادراک نہیں ہو پاتا کیونکہ ان کا وجود ہی نہیں ہے حالانکہ حس اس چیز کا ادراک کرتی ہے جو ایک ہیئت مخصوصہ کے ساتھ مادی صورت میں موجود ہو اور ادراک کرنے والے کے سامنے ہو، لیکن جس مادہ سے یہ چیزیں مرکب ہیں، جیسے جھنڈے، یاقوت، نیزے اور زبرجد تو یہ ساری چیزیں حس بصر کے ذریعہ محسوس ہونے والی ہیں۔

اسی طرح انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "عقلی سے مراد وہ چیز ہے جس کا مذکورہ حواس میں سے کسی ایک حس کے ذریعہ نہ تو اس کا اپنا ادراک ہو سکتا ہو اور نہ ہی اس کے مادہ کا"۔ چنانچہ اس تعریف سے وہمی چیزیں بھی اس میں داخل ہو گئیں اور یہ وہ ہے کہ جس کا حواس مذکورہ سے ادراک نہیں ہوتا، لیکن اگر اسے ادراک میں لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں جیسے چھوٹے چھوٹے تیز تیروں کو ڈائن کے دانتوں سے تشبیہ دی جائے کیونکہ ڈائن کے دانت ایسی چیز ہیں جس کا ادراک حس نہیں کر سکتی اس لئے کہ یہ ہیں ہی نہیں لیکن اگر ان کا ادراک کیا بھی جائے تو صرف حس بصر ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی قبیل سے ہے خداوند عالم کا قول "طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُؤُسُ الشَّيَاطِيْنِ" (صافات / ٦٥) اس (زقوم) کے درخت کا شگوفہ شیاطین کے سروں کی مانند ہے۔ اسی طرح اس زمرے میں وجدانی امور بھی شامل ہو جائیں گے جیسے بھوک، پیاس، غضب، سرور اور رنج والم ہیں۔

پھر تشبیہ اپنے طرفین کے اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

پہلی قسم : مفرد کو مفرد کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور اس کی بھی چار قسمیں ہیں :

۱۔ مفرد کو مفرد کے ساتھ تشبیہ دی جائے جبکہ دونوں غیر مقید ہوں، جیسے رخسارے کو گلاب کے پھول سے تشبیہ دی جائے اس قسم کی تشبیہ حضرت امیرؑ کے کلام میں ہے جیسے :"اَلْمُنَجِّمُ كَالْكَاهِنِ وَ الْكَاهِنُ كَالسَّاحِرِ وَ السَّاحِرُ كَالْكَافِرِ" (خطبہ / ۷۷) منجم حکم میں مثل کاہن کے ہے اور کاہن مثل ساحر کے ہے اور ساحر مثل کافر کے ہے۔

۲۔ مفرد کو مفرد کے ساتھ تشبیہ دی جائے جبکہ دونوں مقید ہوں، جیسے کوئی شخص لایعنی کلام کہتا ہے تو اس کیلئے کہتے ہیں "كَالرَّاقِمِ عَلَى الْمَاءِ" پانی پر تحریر کرنے والا۔ چنانچہ مشبّہ فاعل مقید ہے کہ جس کے فعل سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور مشبّہ بہ وہ لکھنے والا ہے جو مقید ہے کہ پانی پر لکھتا ہے اور وجہ شبہ فعل اور عدم فعل میں یکسانیت ہے اور وہ موقوف ہے ان دونوں قیدوں کے اعتبار پر۔ اس کی مثال حضرت امیرؑ کے کلام میں یوں موجود ہے "فَإِنَّ الْعَالِمَ الْعَامِلَ بِغَيْرِ عِلْمِهِ كَالْجَاهِلِ الَّذِيْ لَا يَسْتَفِيْقُ مِنْ جَهْلِهِ" (خطبہ / ۱۹) وہ عالم جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا اس سرگردان جاہل کی مانند ہے جو جہالت کی سرمستیوں سے ہوش میں نہیں آتا۔ قید کبھی وصف کے ساتھ ہوتی ہے کبھی اضافت کے ساتھ کبھی مفعول کے ساتھ کبھی حال کے ساتھ اور کبھی ان کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ۔

۳۔ مفرد غیر مقید کی مفرد مقید کے ساتھ تشبیہ، جیسے عربوں کا قول ہے "وَالشَّمْسُ كَالْمِرْآةِ فِي كَفِّ الْأَشَلِّ" سورج ایسے ہے جیسے کسی شل ہاتھ میں آئینہ ہوتا ہے۔ تو یہاں پر مشبّہ سورج ہے اور مشبّہ بہ آئینہ ہے جو شل ہاتھ میں ہوتا،

ہے۔اسے حضرت امیرؑ کا قول ہے: "وَاللّٰهِ لاَ اَكُونُ كَالضَّبُعِ تَنَامُ عَلىٰ طُولِ اللَّدْمِ يَصِلُ اِلَيهَا طَالِبُهَا "(خطبہ / ۶) خدا کی قسم میں اس بجو کی طرح نہ ہوں گا جو مسلسل کھٹکھٹائے جانے سے سوتا بن جائے یہاں تک کہ اس کا طلبگار (شکاری) اس تک پہنچ جاتا ہے۔

۴۔ مفرد مقید کی مفرد غیر مقید کے ساتھ تشبیہ، جیسے آئینہ کی شکل ہاتھ میں تشبیہ سورج کے ساتھ

دوسری قسم : مفرد کی تشبیہ مرکب کے ساتھ جیسے گل لالہ کے پودوں کی تشبیہ یاقوت کے جھنڈوں کے ساتھ جو زمرد کے نیزوں پر لہرا رہے ہوں، اسی طرح کی تشبیہ حضرتؑ کے کلام میں بھی ہے "يَا اَهْلَ الْعِرَاقِ فَاِنَّمَا اَنْتُمْ كَالْمَرْاَةِ الْحَامِلِ حَمَلَتْ فَلَمَّا اَتَمَّتْ اَمْلَصَتْ وَمَاتَ قَيِّمُهَا وَطَالَ تَاَيُّمُهَا وَوَرِثَهَا اَبْعَدُهَا "(خطبہ / ۷۰) اواہل عراق! تم اس عورت کی مانند ہو جو حاملہ ہونے کے بعد حمل کے دن پورے کر کے مرا ہوا بچہ گرا دے، اس کا شوہر بھی مر چکا ہو، رنڈاپے کی مدت بھی دراز ہو چکی ہو اور دور ہی کے عزیز اس کے وارث ہوں۔

تیسری قسم : مرکب کی تشبیہ مفرد کے ساتھ، جیسے ابو تمام کا قول ہے:

يَا صَاحِبَيَّ تَقَصَّيَا نَظَرَيْكُمَا تَرَيَا وُجُوهَ الاَرْضِ كَيْفَ تُصَوَّرُ

تَرَيَا نَهَارًا مُشْمِسًا قَدْ شَابَهُ زَهْرَ الرُّبَا فَكَاَنَّمَا هُوَ مُقْمِرٌ

اے میرے دونوں ساتھیو! اپنی نگاہیں ذرا دور تک ڈالو دیکھو گے کہ روئے زمین کیسا پیارا منظر پیش کر رہا ہے، دیکھو گے کہ دن کی سنہری دھوپ کے ساتھ ٹیلے کی جنگلی بیلوں کے پھول مل کر ایسا منظر پیدا کر رہے ہیں گویا چاندنی رات ہو۔

اس شعر میں دن کی سنہری دھوپ کو رات کی چاندنی سے تشبیہ دی ہے کیونکہ اس دھوپ کے ساتھ ٹیلے کی جنگلی بیلوں کے پھول مل گئے ہیں جنہوں نے اپنی تازگی اور سبزے سے سورج کی روشنی میں کمی کر دی ہے اور وہ سیاہی مائل ہو کر چاندنی رات کا منظر پیش کر رہی ہے۔ چنانچہ یہاں پر مشبّہ مرکب ہے اور مشبہ بہ مفرد۔

چوتھی قسم : مرکب کی مرکب کے ساتھ تشبیہ، جیسا کہ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں: "وَالنَّاسُ مُجْتَمِعُونَ حَوْلِي كَرَبِيضَةِ الغَنَمِ "(نہج البلاغہ خطبہ / ۳) سب لوگ میرے گرد بکریوں کے گلّے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

"رَبِيضَة "بکریوں کے اس گلے کو کہتے ہیں جو اپنے چرواہوں کے ساتھ اپنے باڑوں میں ہوتی ہیں اور اس مقام پر حضرتؑ لوگوں کے اجتماع کو انفرادی صورت میں بیان کرنا نہیں چاہ رہے، بلکہ اپنے گرد ان کے اجتماع اور اژدہام کی اس خاص کیفیت کو بیان کر رہے ہیں جو بکریوں کے چرواہوں سمیت ان کے باڑوں میں ہوتی ہے۔

پھر مرکب کی تشبیہ مرکب کے ساتھ اس انداز میں ہوتی ہے کہ طرفین کی ہر جزء دوسری طرف کی ہر جزء کے مقابل میں

حسین انداز میں ہوتی ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے :

وَ كَاَنَّ اَجْرَامَ النُّجُومِ طَوَالِعًا دُرَرٌ نُشِرْنَ عَلٰى بِسَاطٍ اَزْرَقٍ

آسمان پر چمکتے ستارے ایسے ہیں جیسے نیلگوں چادر پر موتی بکھیر دیئے گئے ہوں۔ اسی طرح حضرت علیؑ کا قول ہے "فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاكُلُ الاِيْمَانَ كَمَا تَاكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ" (نہج البلاغہ خطبہ / ۸۴) حسد ایمان کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے ....

ایک اور تقسیم :

طرفین کے تعدد اور عدم تعدد کے لحاظ سے تشبیہ پھر چار قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

پہلی قسم : مشبہ کی تعداد زیادہ ہو اسے "تشبیہ تسویہ" کہتے ہیں، جیسا کہ شاعر کا قول ہے :

صُدْغُ الْحَبِيْبِ وَحَالِي كِلاَهُمَاكَاللَّيَالِي وَ ثَغْرُهُ فِي صَفَاءٍ وَ اَدْمُعِي كَاللَّئَالِي

محبوب کی زلفیں اور میرا حال دونوں تاریک راتوں کی مانند ہیں اور چمک میں اس کے دانت اور میرے آنسو موتیوں کی طرح ہیں۔

دوسری قسم : مشبہ بہ کی تعداد زیادہ ہو تو اسے "تشبیہ جمع" کہتے ہیں، جیسا کہ شاعر کا قول ہے :

اَتَتْنِي بِالاَمْسِ اَبْيَاتُهٗ كَبُرْدِ الشَّبَابِ وَ بَرْدِ الشَّرَابِ
تُعَلِّلُ رُوْحِي بِرَوْحِ الْجِنَانِ وَ ظِلِّ الاَمَانِ وَ نَيْلِ اَمَانِي
وَ عَهْدِ الصِبٰى وَ نَسِيْمِ الصَبَا
وَ صَفْوِ الدِّنَانِ وَ رَجْعِ الْقِيَانِ

کل میرے پاس اس کی طرف سے اشعار آئے جو میری روح کو نسیم بہشت سے بہلا رہے تھے۔ جو جوانی کی چادر، شراب کی خنکی، امان کی چھاؤں، آرزوؤں کے حصول، بچپن کا دور، نسیم صبا، دیگوں کے پکوان اور گلوکاروں کی آواز کی گرگری کی مانند تھے۔

تیسری قسم : طرفین یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں تعداد میں زیادہ ہوں اس کی پھر دو قسمیں ہیں ؛

۱۔ پہلے مشبہات کو عطف وغیرہ کے ساتھ لایا جائے، پھر مشبہ بہ کو، اسے "تشبیہ ملفوف" کہتے ہیں۔ جیسے امرؤ القیس کا شعر ہے :

كَاَنَّ قُلُوبُ الطَّيْرِ رَطبًا وَّ يَابِسًا لَدَى وَكْرِهَا الْعُنَّابُ وَ الْحَشَفُ الْبَالِي

اس کے گھونسلے کے پاس پرندوں کے تازہ اور خشک دل، گویا عناب اور چھوہارے ہیں۔

۲۔ پہلے مشبہ کو لایا جائے پھر کئی مشبہ بہ کو اسے "تشبیہ مفروق" کہتے ہیں، جیسے شاعر کا قول ہے

اَلْخَدُّ وَرْدٌ وَ الصُدْغُ غَالِيَةٌ وَ الرِّيْقُ خَمْرٌ وَ الثَّغْرُ مِن بَرَدٍ

رخسار گل گلاب ہے، کنپٹی خوشبوؤں کا آمیزہ ہے، لعاب دہن شراب ہے اور دانت اولوں جیسے ہیں۔

☆دوسرا رکن: وجہ تشبیہ میں ہے۔

وجہ تشبیہ ایسا معنی ہوتا ہے جس میں طرفین کے اشتراک کا قصد کیا جاتا ہے یعنی اس معنی کیلئے طرفین کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو اس معنی میں مشترکہ طور پر بیان کی جاتی ہیں، خواہ اشتراک تحقیقی ہو یعنی حقیقت پر مبنی ہو یعنی وہ مشترک معنی دونوں میں تحقیقی طور پر ہو جیسے "زَیْدٌ کَالاَسَدِ" میں شجاعت کا معنی تحقیقی طور پر پایا جاتا ہے۔اور حضرت امیرؑ کے اس قول میں بنی امیہ کیلئے بد خلقی کا معنی پایا جاتا ہے: "لَتَجِدَنَّ بَنِي اُمَيَّةَ لَكُمْ اَرْبَابَ سُوءٍ بَعْدِي كَالنَّابِ الضَّرُوسِ" (خطبہ /۹۱) خدا کی قسم تم میرے بعد بنی امیہ کو اپنے لئے بدترین حکمران پاؤ گے وہ تو اس بوڑھی اور سرکش اونٹنی کی مانند ہے۔اور خواہ تخییلی ہو یعنی خیالات پر مبنی ہو، جیسے حضرت امیرؑ کے اس قول میں مشبہ بہ میں "ظلمت" کا تخییلی معنی پایا جاتا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں: "فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ" (خطبہ /۱۰۰) وہ فتنے ایسے ہونگے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے۔اس میں جس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے وہ "ظلمت" ہے جو مشبہ میں تخییلی صورت میں پائی جاتی ہے کیونکہ فتنوں کو تاریکی میں واقع ہونے والے قرار دیا ہے اور فتنوں کا شکار شخص تاریکی میں چلتا ہے اور اسے سیدھا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔اور نہ ہی وہ اس بات سے مطمئن ہوتا ہے کہ اسے کوئی ناگوار حادثہ پیش آجائے۔یہ تو تخییل کی بات تھی مشبہ بہ میں۔اور کبھی مشبہ میں بھی خیالات پر مبنی وجہ تشبیہ پائی جاتی ہے، جیسے شاعر کا قول ہے:

وَ اَرْضٍ كَاَخْلَاقِ الْكِرَامِ قَطَعْتُهَا وَ قَدْ كَحَلَ اللَّيْلُ فَابْصَرَا

شرفاء کے اخلاق کی مانند وسیع زمین کو میں نے طے کیا۔چنانچہ شاعر نے یہاں پر شرفاء کے اخلاق کو ایک وسیع چیز خیال کر کے وسیع زمین کو اس سے تشبیہ دی ہے جب آپ کو یہاں تک معلوم ہو گیا تو آخر میں ایک بات سن لیں وہ یہ کہ وجہ تشبیہ کی کثیر اعتبار سے کئی قسمیں ہیں اور تشبیہ بھی اسی اعتبار سے کئی قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

پہلی تقسیم

اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے: "وجہ شبہ" یا تو طرفین کی حقیقت سے خارج نہیں ہوگی یعنی ان کی نوع یا جنس یا فصل سے ہوگی، یا خارج تو ہوگی لیکن ان کے ساتھ قائم ہوگی۔اگر قائم ہے تو پھر ان کی حقیقی صفت ہوگی یا اضافی، اگر حقیقی صفت ہوگی تو پھر یا تو کیفیت جسمانی ہوگی جو ان اجسام کے ساتھ ہوگی جن کا حس کے ساتھ ادراک کیا جاتا ہے، یا کیفیت نفسانی ہوگی جو ان نفوس کے ساتھ مخصوص ہوگی جن کا عقل کے ساتھ ادراک کیا جا سکتا ہے۔اگر جسمانی ہے تو پہلی ہی مرتبہ اس کا احساس ہو جائے گا یا دوسری مرتبہ۔

پہلی قسم: وہ حس بصر کے ساتھ محسوس ہوگی جیسے رخسار کو گلاب کے پھول کے ساتھ تشبیہ دینے میں سرخی ہوتی ہے یا چہرے کو سورج سے تشبیہ دینے میں روشنی ہے۔یا گیسوؤں کو رات کے ساتھ دینے میں سیاہی ہے

یا اس کا تعلق حس سامعہ کے ساتھ ہوگا، جیسے خوبصورت آواز کو گانے کے آلات یا کسی پرندے کی آواز سے یا کریہ اور

ناپسندیدہ آواز کو گدھے کی آواز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔یا اس کا تعلق حس ذائقہ سے ہوگا، جیسے بعض میٹھے پھلوں کو شکر اور شہد سے اور کڑوے پھلوں کو ایلوے اور اندرائن سے تشبیہ دینا۔یا اس کا تعلق حس شامہ سے ہوگا جیسے بعض خوشبوؤں کو عنبر اور کستوری سے اور بعض بدبوؤں کو مردار اور بدبودار گبریلے سے تشبیہ دینا۔یا اس کا تعلق حس لامسہ سے ہوگا، جیسے نرم و نازک جسم کو ریشم سے اور کھردرے بدن کو ٹاٹ سے تشبیہ دینا۔

دوسری قسم : کہ جس میں وجہ تشبیہ کا پہلی مرتبہ احساس نہیں ہوتا بلکہ دوسری مرتبہ ہوتا ہے، اور وہ اشکال مقدار اور حرکات ہیں۔اور اشکال یا تو مستقیم (سیدھی) ہوں گی یا مستدیر (گول) ہوں گی۔ مستقیم کی مثال، جیسے معتدل قامت کے انسان کو نیزے سے تشبیہ دینا اور مستدیر کی مثال، جیسے کسی گول چیز کو گیند یا حلقہ سے تشبیہ دینا۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ شارح بحرانی نے صرف تقسیم کی اسی حد تک اکتفا کیا ہے کہ اشکال کی دو قسمیں ہیں ؛ مستقیم اور مستدیر۔جبکہ حق یہ ہے کہ شکل کی اور بھی قسمیں ہیں، جیسا کہ امیر المؤمنینؑ کا کلام مبارک ہے "وَالدُّوْرِ الْمُزَخْرَفَةِ الَّتِي لَهَا أَجْنِحَةٌ كَأَجْنِحَةِ النُّسُوْرِ وَ خَرَاطِيْمُ كَخَرَاطِيْمِ الْفِيَلَةِ "(خطبہ ۱۲۶)اور سجے سجائے مکانوں کیلئے تباہی ہے کہ جن کے چھجے گدھوں کے پروں اور ہاتھیوں کی سونڈ کی مانند ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ "جناح نسر "اور "خرطوم فیل "سیدھے اور گول ہونے سے خارج ہیں۔اور مقدار میں تشبیہ کی مثال، جیسے عظیم الجثہ ہونے میں اونٹ اور ہاتھی سے تشبیہ دی جاتی ہیں۔

کبھی شکل اور مقدار میں میں تشبیہ ایک مقام میں جمع ہوتی ہے، جیسا کہ آپؑ ہی کا کلام ہے :"كَأَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ "(خطبہ /۱۲۶) جن کے چہرے ان ڈھالوں کی طرح ہیں کہ جن پر چمڑے کی تہیں منڈھی ہوئی ہوں۔اسی طرح حرکت کی سرعت کو تیر سے تشبیہ دی جاتی ہے اور دنیا کو سائے سے، جیسا کہ امیر علیہ السلام ہی کا کلام ہے "فَإِنَّهَا عِنْدَ ذَوِي الْعُقُوْلِ كَفَيْءِ الظِّلِّ بَيْنَا تَرَاهُ سَابِغًا حَتّٰى قَلَصَ وَ زَائِدًا حَتّٰى نَقَصَ "(خطبہ /۶۱) دنیا عقلمندوں کے نزدیک ایک بڑھتا ہوا سایہ ہے جسے ابھی بڑھا ہوا اور پھیلا ہوا دیکھ رہے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھٹ کر اور سمٹ کر رہ گیا۔

کیفیت نفسانیہ میں جن کا عقل کے ساتھ ادراک ہوتا ہے ان میں اشتراک کی مثال ہے، جیسے غرائز اور اخلاق میں اشتراک ہو، جیسے علم، حلم، فہم، ذکاء، ذہانت، فطانت، کرم اور شجاعت ہیں۔صفت اضافیہ میں اشتراک وہ ہوتا ہے جو ذات میں نہیں دوسری دو چیزوں کے ساتھ اس کا تعلق ہو، جیسے مثال ہے "هٰذِهِ الْحُجَّةُ كَالشَّمْسِ "یہ دلیل سورج کی مانند ہے۔شک وابہام کو دور کرنے میں سورج کی مانند ہے۔کیونکہ دور کرنا نہ تو خود حجت میں ہوتا ہے، نہ سورج میں اور نہ ہی حجاب میں۔

دوسری تقسیم

اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "وجہ شبہ "یا تو کلام میں مذکور ہوگی یا مذکور نہیں ہوگی۔اور اگر مذکور ہوگی تو بذات خود اس کو ذکر کیا جائے گا یا جس کیلئے وہ لازم اور جملہ میں اس کے تابع ہوتی ہے اسے ذکر کیا جاتا ہے۔بذات خود کی مثال :"وَ ثَغْرُهُ فِي صَفَاءٍ وَّ أَدْمُعِي كَاللَّئَالِي "شفاف ہونے میں اس کے دانت اور میرے آنسو موتیوں کی مانند ہیں۔اسی طرح شاعر کا یہ قول

بھی اسی زمرے میں آتا ہے:

يَا شَبِيهَ الْبَدْرِ حُسْنًا وَّ ضِيَاءً اوَّ ضَالاً   وَ شَبِيهَ الْغُصْنِ لِينًا وَّ قِوامًا وَّ اعْتدالا

أَنْتَ مِثْلَ الْوَرْدِ لَونًا وَّ مَلاَلاً   زَارَنَا حَتَّى اِذَا مَا سُرَّنَا بِالْقُرْبِ زَالا

اے حسن، چاشنی اور عطاء و بخشش میں چودھویں کے چاند جیسے! اور نرمی، قد کی خوبصورتی اور تناسب اعضاء میں شاخ تر کے مانند! تو رنگ و بو اور اضطراب میں گلاب کے پھول جیسا ہے، ایسا محبوب ہم سے ملا اور جب قرب کا شرف عطا کر کے ہمیں خوش کیا ہی چاہتا تھا کہ ہم سے جدا ہو گیا۔

لازم کی مثال، جیسے فصیح کلام کیلئے کہا جاتا ہے: "هُوَ كَالْعَسَلِ فِي الْحَلاَوَةِ" وہ مٹھاس میں شہد کی مانند ہے۔ یا" كَالْمَاءِ فِي السَّلاَسَةِ "سلاست (روانی) میں پانی کی طرح ہے۔ یا" كَالنَّسِيمِ فِي الرِّقَّةِ "نزاکت کے لحاظ سے نسیم کی مانند ہے۔ ایسی صورت میں اسے "وجہ شبہ مفصل" کہیں گے۔

دوسری صورت میں کہ جہاں پر وجہ شبہ بذات خود موجود نہ ہو یا اپنے لازم کے لحاظ سے مذکور نہ ہو تو اسے "وجہ شبہ مجمل" کہیں گے۔ اور پھر وہ اس قدر ظاہر ہو کہ اسے ہر ایک سمجھ لے، جیسے "زَيْدٌ كَالأَسَدِ "یا ظاہر نہ ہو بلکہ مخفی ہو، جیسے "كَالْحَلْقَةِ الْمُفْرَغَةِ لاَ يَدْرِي اَيْنَ طَرَفَاهَا" زنجیر کے وسیع حلقے کی مانند معلوم نہیں کہ اس کے دونوں سرے کہاں ہیں؟ اور اسی سے حضرت امیر علیہ السلام کا قول ہے: "اِنَّ لَهُ' اِمْرَاَةً كَالْعَلَقَةِ الْكَلْبِ اَنْفَهُ' "(خطبہ / ۷۲) یہ بھی اتنی دیر کہ کتا اپنی ناک چاٹنے سے فارغ ہو۔

اسی طرح مصنف نے مجمل کی بھی بہت سی قسمیں بتائی ہیں جو ہمارے مدعا سے خارج ہیں۔

تیسری تقسیم

ہیئت ترکیبیہ کو بہت سے مجتمع امور سے خارج کیا جائے گا یا خارج نہیں کیا جائے گا۔ اگر خارج کیا جائے تو اس تشبیہ کو "تمثیل" کہیں گے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كَاَنَّ مِثَارَ النَّقْعِ فَوْقَ رُؤُسِنَا   وَاَسْيَافَنَا لَيْلٌ تَهَاوىٰ كَوَاكِبُه'

ہمارے سروں کے اوپر اٹھتا ہوا غبار اور ہماری تلواریں گویا ایسی رات تھے کہ جس کے ستارے یکبارگی ٹوٹ کر گرنے لگے ہوں۔
اور اگر انہیں خارج نہیں کیا جائے گا تو اس تشبیہ کو "غیر تمثیل" کہیں گے۔

چوتھی قسم

تشبیہ میں معتبر ہیئت، کہ اعیان میں جس کا وجود ہوتا ہے یا تو حسی طور پر مشبہ بہ کے تکرار کی کثرت کی وجہ سے کثرت کے ساتھ پائی جائے گی ایسی تشبیہ کو "قریب مبتذل" کہیں گے، جیسے کہتے ہیں کہ: "وہ سیاہی میں کوئلے کی مانند ہے اور سفیدی میں برف کی طرح ہے۔" یا قلیل مقدار میں پائی جائے گی تو ایسی تشبیہ کو "بعید غریب" کہتے ہیں

پانچویں تقسیم

وجہ تشبیہ یا واحد ہو گی یا متعدد ہوں گی یا مرکب ہو گی۔ اگر واحد ہو تو یا "واحد حسی" ہو گی، جیسے سرخی میں رخسار کی گلاب کے پھول کے ساتھ تشبیہ۔ یا "واحد عقلی" ہو گی، جیسے ہدایت میں علم کی نور کے ساتھ تشبیہ۔

اگر متعدد ہوں یا تو ساری کی ساری حسی ہوں گی، جیسے رنگ، بو یا ذائقہ ہیں جو کسی دوسرے حل کے ساتھ تشبیہ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ یا پھر عقلی ہوں گی، جیسے کوے کے ساتھ کسی پرندے کو تشبیہ دینے کیلئے نگاہ کی تیزی، کمال ہوشیاری اور مادہ سے جفتی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یا پھر بعض حسی اور بعض عقلی ہوں گی، جیسے کسی انسان کو عظمت اور بلندی کے لحاظ سے سورج کے ساتھ تشبیہ دینے کیلئے "حسن طلعت" اور بزرگی کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ....

چند قابل غور باتیں:

۱۔ وجہ عقلی کے ساتھ تشبیہ، وجہ حسی کے ساتھ تشبیہ سے عام ہوتی ہے۔ کیونکہ وجہ حسی کی دونوں طرفیں حسی ہوتی ہیں جبکہ وجہ عقلی کی یا تو دونوں طرفیں حسی ہوتی ہیں یا دونوں عقلی ہوتی ہیں یا ایک حسی اور ایک عقلی ہوتی ہے۔ اس گفتگو سے متعلق تمام قسموں کی مثالیں بیان ہو چکی ہیں ....

۲۔ کبھی وجہ شبہ کو اس تضاد سے اخذ کیا جاتا ہے جو دو ضدوں کے درمیان پایا جاتا ہے پھر اس تضاد کو ملاحت کلام یا مذاق اڑانے یا مسخرہ کرنے کیلئے مناسب مقام پر لایا جاتا ہے، جس طرح ڈرپوک اور بزدل انسان کو شیر سے اور کنجوس و بخیل کو حاتم سے تشبیہ دی جائے ....

اسی باب سے ہے امام امیر علیہ السلام کا کلام، آپ فرماتے ہیں: "يَوْمُهُمْ سُهُودٌ وَ كُحْلُهُمْ دُمُوعٌ" (خطبہ / ۲) ان کے دل بیدار اور سرمہ آنسو ہیں۔ یا جیسا کہ فرماتے ہیں: "اَشْهُودٌ كَغُيَّابٍ وَ عَبِيدٌ كَاَرْبَابٍ" (خطبہ / ۹۵) آیا وہ غیر حاضر لوگوں کی طرح موجود ہیں اور آقاؤں کی مانند غلام ہیں؟

۳۔ وجہ شبہ طرفین پر مشتمل ہوتی ہے، جیسا کہ اس مثال: "اَلنَّحْوُ فِي الْكَلَامِ كَالْمِلْحِ فِي الطَّعَامِ" (کلام میں نحو ایسا ہے جیسے کھانے میں نمک) میں کلام کے اچھا یا برا ہونے کو وجہ شبہ بنایا جائے۔ جس طرح کھانا نمک کے بغیر استعمال نہیں ہوتا اسی طرح نحوی قاعدوں کے استعمال کے بغیر کلام اچھا نہیں لگتا۔

یہ جو بعض لوگوں کا گمان ہے کہ کلام میں نحو قلیل مقدار میں ہو تو کلام اچھا ہوتا ہے اور مقدار میں زیادہ ہو تو کلام بگڑ جاتا ہے، غلط ہے۔ کیونکہ نحو قلت و کثرت کا حامل نہیں ہے بلکہ یہ خاصیت نمک کی ہوتی ہے۔

☆ تیسرا رکن :

تشبیہ کے ذرائع

تشبیہ کے ذرائع۔وہ چیزیں جن کے ذریعہ مشبہ سے مشبہ بہ تک رسائی ہوتی ہے۔مشبہ کی مشبہ بہ کے ساتھ کسی بھی وجہ سے کوئی مشارکت ہوتی ہے ،اس مشارکت تک رسائی کیلئے جن چیزوں اور ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔کاف،کان، مثل، شبہ ، نظیر۔یاان سے حاصل ہونے والے معانی ہیں جو ہم مثل ہونے، ہم شبیہ ہونے اور ہم شکل ہونے پر دلالت کرتے ہیں یا جن میں برابری، حکایت اور شباہت کا معنی پایا جاتا ہے۔

کاف یااس جیسے الفاظ جو مفرد پر داخل ہوتے ہیں ان کا معنی مثل ، شبہ اور "جیسا" کا ہوتا ہے اور جو ذرائع جملہ پر داخل ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں :۱۔لفظی، جیسے "زَيْدٌ كَالأَسَدِ" یا "زَيْدٌ مِثْلُ الأَسَدِ" یا جیسے قرآن مجید کی آیت ہے "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا " (بقرہ / ۱۷) ان کی مثل اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی۔یا جیسے حضرت امیرؑ فرماتے ہیں "فَإِنَّمَا مَثَلُ الدُّنْيَا مَثَلُ الْحَيَّةِ لَيِّنٌ مَسُّهَا وَ قَاتِلٌ سَمُّهَا " دنیا کی مثل سانپ کی سی ہے کہ جس کا چھونا نرم اور جس کا زہر قاتل ہے۔۲۔تقدیری، جیسے قرآن مجید میں ہے "أَوْكَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ...... "اصل میں" كَمَثَلِ ذِو صَيِّبٍ" ہے کہ جسے بعد والے جملے کی دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے ....

اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے : "فَإِنَّمَا مَثَلُكُمْ وَمَثَلُهَا كَسَفْرٍ سَلَكُوا سَبِيلَهُمْ" (خطبہ / ۹۷) تمہاری مثال اور دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے سفر میں مسافروں کی ہوتی ہے۔یہاں پر اس کی اصل یوں ہے "كَمَثَلِ الْمُسَافِرِينَ سَلَكُوا سَبِيلاً...... "۔

کبھی کاف اور اس جیسے الفاظ غیر مشبہ بہ پر بھی داخل ہوتے ہیں جب یہ کئی ایسے مفرد پر ہوں جس کے ساتھ تشبیہ نہ دی جا سکتی ہو جبکہ مشبہ بہ مرکب ہو، جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام دنیا کے بارے میں فرماتے ہیں : "لَاتَعْدُوا (الدُّنْيَا) اِذَا تَنَاهَتْ اِلٰى أُمْنِيَّةِ أَهْلِ الرَّغْبَةِ فِيهَا وَالرِّضَاءِ لَهَا اَنْ تَكُونَ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ سُبْحَانَهُ 'كَمَاءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا' (کہف / ۴۵)" (خطبہ / ۱۰۹) جب یہ اپنی طرف مائل ہونے والوں اور خوش ہونے والوں کی انتہائی آرزوؤں کو پہنچ جاتی ہے تو بس وہی ہوتا ہے جو اللہ سبحانہ نے بیان فرمایا ہے کہ :"اس دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے وہ پانی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو زمین کا سبزہ اس سے گھل مل گیا (اور اچھی طرح پھلا پھولا) پھر سوکھ کر تنکا ہو گیا جسے ہوائیں (ادھر ادھر) اڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

مصنفؒ کہتے ہیں :اس کلام میں آپ کی فصاحت وبلاغت کو دیکھ کر میرے تعجب کی انتہا ہو جاتی ہے کہ سبحان اللہ! آپ کا کلام کس حد تک فصیح وبلیغ ہے کہ آپؑ نے دنیا کیلئے دو تشبیہیں بیان فرمائی ہیں،ایک اپنی طرف سے ،جب فرمایا" كما قال الله" اور دوسری کلام خدا سے " كماءٍ انزلناه...... "اور یہ دونوں تشبیہ کے اس باب سے ہیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے...... "۔

اسی طرح کی ایک اور مثال بھی ہے جو آپؑ نے دنیا کے بارے میں اسی خطبہ میں بیان فرمائی ہے۔اس میں آپؑ نے اہل دنیا کی

کیفیت اور ان کے آخرت کی طرف منتقل ہونے کی یوں تصویر کشی کی ہے :" فَجَاؤُهَا كَمَا فَارَقُوهَا حُفَاةً عُرَاةً قَدْ ظَعَنُوا عَنْهَا بِأَعْمَالِهِمْ إِلَى الْحَيَاةِ الدَّائِمَةِ وَالدَّارِ الْبَاقِيَةِ ،كَمَا قَالَ سُبْحَانَه "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيْدُه" (انبیاء / ۱۰۴) "۔ (خطبہ / ۱۰۹) جس طرح ننگے پاؤں اور ننگے بدن پیدا ہوئے تھے ویسے ہی زمین میں (پیوند خاک) ہو گئے اور اس دنیا سے صرف عمل لے کر ہمیشہ کی زندگی اور سدا رہنے والے گھر کی طرف کوچ کر گئے جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے "جس طرح ہم نے مخلوقات کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے "۔

دو ضروری باتیں :

ا۔ بعض اوقات تشبیہ کے قرب وبعد نیز قوت اور ضعف کیلئے فعل کو ذکر کیا جاتا ہے جو انہی باتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر مقصود تشبیہ کی تقویت اور قرب ہو تو "علمتُ" کے جیسے افعال کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "عَلِمْتُ زَيْدًا أَسَدًا "میں نے جان لیا کہ زید شیر ہے۔ اور اگر تشبیہ کے ضعف اور بعد کو بیان کرنا مقصود ہو تو "ظننتُ" کے جیسے افعال کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "ظَنَنْتُ ...... "یا" حَسِبْتُ زَيْدًا أَسَدًا "میرا خیال یا گمان ہے کہ زید شیر ہے ....

اسی پہلی قسم سے آپؑ کے خطبہ کے یہ کلمات تعلق رکھتے ہیں "مَالِي أَرَاكُمْ أَشْبَاحًا بِلاَ أَرْوَاحٍ وَأَرْوَاحًا بِلاَ أَشْبَاحٍ وَنُسَّاكًا بِلاَ صَلاَحٍ وَتُجَّارًا بِلاَ أَرْبَاحٍ وَ أَيْقَاظًا نُوَّمًا وَ شُهُودًا غُيَّبًا وَ نَاظِرَةً عَمْيَاءَ وَ سَامِعَةً صَمَّاءَ وَ نَاطِقَةً بَكْمَاءَ ....." (خطبہ / ۱۰۶) میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ پیکر بے روح، روح بے قالب بنے ہوئے ہو، عابد بنے پھرتے ہو بغیر صلاح اور تقویٰ کے، تاجر بنے ہوئے ہو بغیر منافع کے، بیدار ہو مگر سوئے ہوئے ہو، حاضر ہو مگر ایسے جیسے غائب ہو، دیکھنے والے ہو مگر اندھے، سننے والے ہو مگر بہرے، گونگے مگر گمراہی کا بولنے والے ہو.............

۲۔ تشبیہ کے سلسلے میں استعمال ہونے والے ذرائع دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں :الف ، مؤکد۔ ب، مرسل۔ چنانچہ مؤکد وہ ہوتا ہے جس میں تشبیہ کیلئے استعمال ہونے والے کلمہ کو حذف کر کے مشبہ بہ کو مشبہ کی خبر بنا دیا جائے، جیسے کہا جائے "زَيْدٌ أَسَدٌ" اور بعض حضرات اس قسم کو "استعارہ" بھی کہتے ہیں انشاء اللہ آگے چل کر اسے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ اور اسی قسم سے مولا علیؑ کا کلام بھی ہے، آپؑ فرماتے ہیں "إِنَّمَا أَنَا قُطْبُ الرَّحَى تَدُورُ عَلَيَّ وَأَنَا بِمَكَانِي "(خطبہ / ۱۱۷) میں چکی کے اندر کا وہ کیل ہوں کہ جس پر وہ گھومتی ہے اور میں اپنی جگہ پر ٹھہرا ہوا ہوں۔ یا کلمہ کو حذف کر کے خبر کے حکم میں لایا جائے، جیسے "کان" کے باب کی خبر ہوتی ہے "انّ" کے باب کی خبر اور " علمتُ" کے باب کا دوسرا مفعول ہوتا ہے، حال یا صفت وغیرہ۔ اور کبھی مفعول بھی خبر ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے :"وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ" (نمل / ۸۸) پہاڑ بادل کی طرح چل رہے ہوں گے۔ اس میں "مرَّ السحاب" کے معنی ہیں "مِثْلُ مَرِّ السَّحَابِ "اور ایسا ہی کلام حضرت امیرؑ کے خطبات وارشادات میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :"لَاضْطَرَبْتُمُ اضْطِرَابَ الأَرْشِيَةِ فِي الطَّوِيِّ الْبَعِيدَةِ" (خطبہ / ۶) تم اس طرح پیچ

وتاب کھانے لگو گے جس طرح گہرے کنوؤں میں رسیاں لرزتی اور تھر تھراتی ہیں۔ آپؑ ہی فرماتے ہیں: "فَجَرْجَرْتُمْ جَرْجَرَةَ الْجَمَلِ الأَسَرِّ وَ تَثَاقَلْتُمْ تَثَاقُلَ النِّضْوِ الأَدْبَرِ "(خطبہ / ۳۹) تم اس اونٹ کی طرح بلبلانے لگے ہو جس کی ناف میں درد ہو اور اس لاغر کمر شتر کی طرح ڈھیلے پڑ گئے ہو جس کی پیٹھ زخمی ہو۔

کبھی مشبہ بہ، مشبہ کی طرف مضاف ہوتا ہے، جیسے "لَجَيْنُ الْمَاءِ" یعنی "مَاءٌ كَاللُّجَيْنِ" اور اسی قسم کی حضرت امیرؑ کا کلام ہے، ارشاد ہوتا ہے: "وَنَاطَ بِهَا زِينَتَهَا مِنْ خَفِيَّاتِ دَرَارِيِّهَا وَ مَصَابِيحِ كَوَاكِبِهَا "(خطبہ / ۹۰) (خدا نے آسمان میں) اس کی زینت کیلئے ننھے منے موتیوں ایسے تارے اور چراغوں کی طرح چمکتے ہوئے ستارے آویزاں کئے۔ جبکہ "مرسل" وہ ہے جو اس کے برعکس ہو یعنی جس میں کلمات تشبیہ کو ذکر کیا جائے اور جس سے ظاہر ہو کہ مشبہ ہی مشبہ بہ ہے۔

☆چوتھا رکن

تشبیہ کی غرض وغایت

متکلم کا تشبیہ سے مقصد یا تو مشبہ کی طرف عائد ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر ایسا ہی ہے یا پھر مشبہ بہ کی طرف۔

پہلی صورت: اس کا مقصد مشبہ کی طرف عائد ہو تو اس کی کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ مشبہ کے ممکن ہونے کو بیان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ مشبہ ایک ایسا امر ہے کہ جس کا وجود ممکن ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی امر اچھی طرح واضح نہ ہو اور اس کی مخالفت ممکن ہو اور ان کے بارے میں دعویٰ کیا جائے کہ ایسا نا ممکن ہے تو پھر تشبیہ کو لایا جاتا ہے تا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ ایسا ممکن ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وَ كَمْ أَبٍ قَدْ عَلاَ بِابْنٍ ذُرَي حَسَبٍ   كَمَا عَلَتْ بِرَسُولِ اللهِ عَدْنَانُ

کتنے باپ ایسے ہیں جو اپنے بلند مرتبہ فرزند کی وجہ سے بلندی کے درجہ پر جا پہنچے ہیں جس طرح رسول خداؐ کی وجہ سے عدنان کو بلند درجہ مل گیا ہے۔ یا ایک اور صاحب کا قول ہے:

فَإِنْ تَفِقْ الأَنَامُ وَ أَنْتَ مِنْهُمْ   فَإِنَّ الْمِسْكَ بَعْضُ دَمِ الْغَزَالِ

اگر لوگوں کو فوقیت نصیب ہوئی ہے تو اس لئے کہ تو ان میں سے ہے کیونکہ کستوری ہرن کے خون ہی کا حصہ ہے ....

۲۔ مشبہ کے وجود کا بیان مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ اگر ذہن میں موجود چیز کو اس کے خارج میں موجود کسی فرد کے ساتھ تشبیہ دی جائے تو اس کی اس بات پر دلالت ہوگی کہ وہ موجود ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "اَلإِنْسَانُ كَزَيْدٍ" انسان جیسے زید ہے۔ اور اس قسم کو "مثل" کہتے ہیں ....

۳۔ مشبہ کی حالت اور اس کا کسی وصف کیساتھ موصوف ہونا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ کپڑے کو سفیدی کے لحاظ سے برف سے تشبیہ دی جائے۔ اور اس قسم کی تشبیہ امامؑ کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے، جیسے: "يَأْلَهُونَ إِلَيْهِ وَلُوهَ الْحَمَامِ وَ

يَرِدُونَهٗ وُرُودَ الأنْعَامِ "(خطبہ ۱)لوگ بیت اللہ کی طرف اس طرح کھنچ کر جاتے ہیں جس طرح کبوتر اپنے آشیانوں کی طرف اور پیاسے حیوان پانی کی جانب۔

۴۔ مشبہ کی قوت اور ضعف، صغر و کبر اور کمی بیشی کی کیفیت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے، جیسا کہ کسی سیاہ چیز کو کوے کے پروں سے تشبیہ دی جاتی ہے..۔

یا کسی بڑی چیز کو اونٹ یا پہاڑ سے تشبیہ دی جاتی ہے، جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "مِنْهُمْ مَنْ هُوَ فِي خَلْقِ الْغَمَامِ الدُّلَّحِ وَ فِي عِظَمِ الْجِبَالِ الشُّمَّخِ وَ فِي قَتْرَةِ الظَّلَامِ الأيْهَمِ وَمِنْهُمْ مَنْ خَرَقَتْ اَقْدامُهُمْ تَخُومَ الْأَرْضِ السُّفْلَىٰ فَهِيَ كَرَايَاتٍ بِيْضٍ قَدْ نَفَذَتْ فِي مَخَارِقِ الْهَوَآءِ"(خطبہ ۸۹)ان (فرشتوں) میں کچھ وہ ہیں جو اللہ کے پیدا کردہ بوجھل بادلوں اور اونچے پہاڑوں کی بلندیوں اور گھٹاٹوپ اندھیروں کی سیاہیوں کی صورتوں میں ہیں اور ان میں کچھ وہ ہیں جن کے قدم تحت الثریٰ کی حدوں کو چیر کر نکل گئے ہیں تو وہ سفید جھنڈوں کی مانند ہیں جو فضا کی وسعت کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں۔

۵۔ مشبہ کی حالت کو مخاطب کے ذہن میں اچھی طرح ذہن نشین کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس کی شان کو اچھی طرح اجاگر کرنا ہوتا ہے، جیسے بیکار کوشش کرنے والے کو پانی پر تحریر کرنے والے کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام باب الحکم میں ارشاد فرماتے ہیں: "اَلدَّاعِي بِلاَعَمَلٍ كَالرَّامِي بِلاَوَتَرٍ"(حکمت ۳۳۷) عمل کئے بغیر دعا مانگنے والا ایسا ہے جیسے چلہ کمان کے بغیر تیر چلائے..۔

اسی طرح جنابؑ کا ایک اور قول ہے: "لَقَدْ تَقَمَّصَهَا ابْنُ اَبِي قُحَافَةِ وَاِنَّهٗ لَيَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحىٰ "(خطبہ ۳) فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر کیلی کا ہوتا ہے..۔

۶۔ مشبہ کی زینت اور خوبصورتی کے اظہار کیلئے۔ اس زینت کے اظہار کا مقصد یا تو اس کیلئے رغبت دلانا ہوتا ہے، جیسے سیاہ چہرے کو ہرن کی آنکھ سے یا مشک نافہ سے تشبیہ دی جاتی ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے

رُبَّ سَوْدَآءَ وَهِيَ بَيْضَآءُ مَعْنًى يَحْسُدُ الْمِسْكَ عِنْدَهَا الْكَافُورُ

مِثْلُ حَبِّ الْعَيْنِ يَحْسِبُهُ النَّاسُ سَوَادًا وَّ اِنَّمَا هُوَ نُورُ

بہت سی سیاہ رنگت والی، حقیقی معنوں میں اس قدر سفید فام ہوتی ہیں کہ کافور بھی مشک نافہ کے ساتھ حسد کرنے لگتا ہے یا جیسے آنکھ کی پتلیاں کہ جنہیں لوگ تو سیاہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ نور ہوتی ہیں۔

یا ایک اور شاعر کا قول ہے:

يَقُولُونَ لَيْلىٰ سَوْدَةٌ حَبَشِيَةٌ وَلَوْلاَ سَوَادُ الْمِسْكِ مَا كَانَ غَالِيَا

لوگ کہتے ہی کہ لیلیٰ سیاہ حبشی عورت ہے (میں کہتا ہوں) اگر مشک نافہ میں سیاہی نہ ہوتی تو اس قدر گراں قیمت نہ ہوتی..

یا پھر مقصد ترغیب نہیں ہوتا جیسے امیر المؤمنین علیہ السلام طاؤس (مور) کی تعریف میں فرماتے ہیں: "تَخَالُ قَصَبَهُ مَدَارِيَ مِنْ فِضَّةٍ وَ مَا اُنْبِتَتْ مِنْ عَجِيْبِ وَارَاتِهِ وَ شُمُوْسِهِ خَالِصَ الْعِقْيَانِ وَ فِلَذَ الزَّبَرْجَدِ فَاِنْ شَبَّهْتَهُ بِمَآاَنْبَتَتِ الاَرْضُ قُلْتَ جَنِيٌّ جُنِيَ مِنْ زَهْرَةِ كُلِّ رَبِيْعٍ وَ اِنْ ضَاهَيْتَهُ بِالْمَلاَبِسِ فَهُوَ كَمَوْشِيِّ الْحُلَلِ اَوْ مُونِقِ عَصْبِ الْيَمِيْنِ وَاِنْ شَاكَلْتَهُ بِالْحُلِيِّ فَهُوَ كَفُصُوصٍ ذَاتِ اَلْوَانٍ قَدْنُطِقَتْ بِاللُّجَيْنِ الْمُكَلَّلِ" (خطبہ ۱۰۴) تم اگر بغور دیکھو گے تو اس کے پروں کی درمیانی پتلیوں کو چاندی کی سلائیاں تصور کرو گے اور ان پر جو عجیب و غریب ہالے بنے ہوئے ہیں اور سورج کی شعاعوں کی مانند (جو پروبال) اگے ہوئے ہیں انہیں (زردی میں) خالص سونا (اور سبزی میں) زمرد کے ٹکڑے خیال کرو گے اگر تم اسے زمین کی اگائی ہوئی چیزوں سے تشبیہ دو گے تو یہ کہو گے کہ وہ ہر موسم بہار کے چنے ہوئے شگوفوں کا گلدستہ ہے۔ اگر کپڑوں سے تشبیہ دو گے تو وہ منقش حلوں یا خوشنما یمنی چادروں کی مانند ہے اور اگر زیورات سے تشبیہ دو گے تو وہ رنگ برنگ کے ان نگینوں کی طرح ہیں جو مرصع بجواہر چاندی میں دائروں کی صورت میں پھیلا دئے گئے ہوں۔

۷۔ نفرت دلانے کیلئے مشبہ کی بدصورتی اور قباحت کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے چیچک کے داغ والے چہرے کو مرغ کے ٹھونگوں کے نشانات سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یا جس طرح حریری نے دینار کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

تَبًّا لَهُ مِنْ حَاذِقٍ مُمَاذِقٍ اَصْفَرُ ذِيْ وَجْهَيْنِ كَالْمُنَافِقِ

تباہی ہو اس جھوٹے دوست پر جو منافق کی طرح زرد رنگ کا دو چہروں والا ہے۔

اسی طرح حضرت امیرؑ نے دنیا کی مذمت میں ارشاد فرمایا ہے۔ (سلمان فارسیؓ کے نام مکتوب میں): "فَاِنَّمَامَثَلُ الدُّنْيَا مَثَلُ الْحَيَّةِ لَيِّنٌ مَّسُّهَا قَاتِلٌ سَمُّهَا" (مکتوب ٦٨) دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے سانپ ہو جو چھونے میں تو نرم ہے لیکن اس کا زہر قاتل ہے۔ اسی طرح اور روایات میں دنیا کو اس بوڑھی عورت سے تشبیہ دی گئی ہے جو بدصورت، غم میں مبتلا کرنے والی اور کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔

۸۔ مشبہ کو اچھوتی اور انوکھی چیز کے طور پر پیش کرنا مقصود ہوتا ہے اور وہ یوں کہ جب مشبہ بہ ایسا عجیب و غریب امر ہو جو ذہن میں بڑی مشکل کے ساتھ آسکتا ہو، تو اس وقت مشبہ بہ کی اس صفت کو لے کر مشبہ کیلئے بیان کا جاتا ہے، جیسے شاعر کا قول ہے:

اُنْظُرْ اِلَى الْفَحْمِ فِيْهِ الْجَمْرُ مُتَّقِدٌ كَاَنَّهُ بَحْرُ مِسْكٍ مَوْجُهُ الذَّهَبُ

اس کوئلے کو دیکھو کہ جس میں چنگاری سلگ رہی ہے ایسا ہے جیسے کستوری کا سمندر ہو کہ جس کی موج سونا ہوتی ہے۔.........

دوسری صورت: کہ جس میں غرض یہ ہوتی ہے کہ تشبیہ میں بیان ہونے والا مقصد مشبہ بہ کی طرف لوٹایا جائے۔ اور اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں؛

ا۔ اس بات کا وہم پیدا کیا جائے کہ مشبہ بہ تشبیہ کے اعتبار سے مشبہ سے زیادہ کامل ہے۔ اور اس میں مبالغہ آرائی

سے کام لیا جائے، جیسا کہ "تشبیہ مقلوب" میں ہوتا ہے کہ اس میں کامل کو ناقص سے تشبیہ دی جاتی ہے جس کا مقصد اس ناقص کی شان کو بلند کرنا ہوتا ہے اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ کامل کیلئے بھی اصل قرار پا چکا ہے۔ یعنی کامل کو اسی سے تشبیہ دی جانی چاہئے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؛

وَ بَدَا الصَّبَاحُ كَأَنَّ غِرَّتَه' وَجْهُ الْخَلِيفَةِ حِيْنَ يُمْتَدَحُ

صبح ظاہر ہوئی اور اس کی پیشانی ایسے ہے جیسے مدح کے وقت خلیفہ کا چہرہ ہوتا ہے۔ ....۔

۲۔ مشبہ بہ کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے، جیسے کوئی بھوکا شخص چودھویں کے چاند جیسے چہرے کو اس کی چمک اور گولائی میں روٹی کے ساتھ تشبیہ دے۔ کیونکہ اس کا اس چہرے کو چاند کے ساتھ تشبیہ دینے کی بجائے روٹی کے ساتھ تشبیہ دینا در حقیقت بھوک کے تقاضوں کے پیش نظر روٹی کی اہمیت اور شان کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے نہ کہ روٹی اس چہرے سے حسن و گولائی میں زیادہ کمال رکھتی ہے، بالفاظ دیگر اس کا اصل مقصد چہرے کی گولائی اور حسن نہیں ہوتا بلکہ روٹی کے ساتھ دل بہلانا ہوتا ہے جس نے اس قسم کی تشبیہ کو بیان کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ....۔

خاتمہ بحث:

مبالغہ میں قوت اور ضعف کے لحاظ سے تشبیہ کے لیے چار ارکان بیان کیے گئے ہیں جیسا کہ کتاب "التلخیص" کے مصنف اور شارح فرماتے ہیں کہ : "تشبیہ کے ارکان چار ہیں، ۱۔ مشبہ ۲۔ مشبہ بہ ۳۔ وجہ شبہ اور ۴۔ کلمات تشبیہ"۔ تو اس لحاظ سے اس کی یوں تقسیم کی جائے گی کہ اگر مشبہ بہ مذکور ہو اور یہ قطعاً مذکور ہوگا تو مشبہ یا مذکور ہوگا یا محذوف، پھر ان دونوں صورتوں میں وجہ شبہ مذکور ہوگی یا محذوف۔ اور پھر چار مذکورہ صورتوں میں کلمات تشبیہ مذکور ہوں گے یا محذوف، تو گویا یہ آٹھ صورتیں بن جائیں گی اور وہ یوں ہیں ؛

۱۔ مشبہ بھی مذکور ہو، وجہ شبہ بھی اور کلمات شبہ بھی جیسے "زَيْدٌ كَالأَسَدِ فِي الشُّجَاعَةِ"۔

۲۔ مشبہ مذکور ہو، لیکن وجہ شبہ اور کلمات شبہ محذوف ہوں، جیسے "زَيْدٌ أَسَدٌ"۔

۳۔ مشبہ مذکور ہو اور وجہ شبہ بھی لیکن کلمات شبہ محذوف ہوں جیسے "زَيْدٌ أَسَدٌ فِي الشُّجَاعَةِ"۔

۴۔ مشبہ مذکور ہو اور کلمات شبہ بھی لیکن وجہ شبہ محذوف ہو، جیسے "زَيْدٌ أَسَدٌ"۔

۵۔ چاروں چیزیں محذوف ہوں جیسے "زَيْدٌ" جب اس کے بارے میں خبر دی جائے۔

۶۔ مشبہ حذف ہو لیکن وجہ شبہ اور کلمات شبہ مذکور ہوں جیسے "كَالأَسَدِ فِي الشُّجَاعَةِ"۔

۷۔ مشبہ اور کلمات شبہ حذف ہوں جیسے 'أَسَدٌ فِي الشُّجَاعَةِ' جب اس کے متعلق خبر دی جائے۔

۸۔ مشبہ حذف ہو اور وجہ شبہ بھی، جیسے "كَالأَسَدِ فِي الشُّجَاعَةِ"۔

اب جبکہ ساری صورتحال واضح ہو چکی ہے تو ہم اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ان آٹھ اقسام میں سے زیادہ

قوی اور اعلیٰ دوسری اور پانچویں قسم ہے، ان کے بعد تیسری، چوتھی، ساتویں اور آٹھویں کا مرتبہ ہے۔ اور باقی دو یعنی پہلی اور چھٹی میں کوئی طاقت نہیں ہے اور آخری دونوں صورتیں عدم قوت کے لحاظ سے مساوی ہیں اور باقی چار متوسط ہیں ۔ ....

دوسری فصل

استعارہ کے بیان میں ہے

معلوم ہونا چاہئے کہ یہ فنون بلاغت کی نہایت ہی عظیم الشان قسم ہے، جس پر علمائے علم بیان نے دل کھول کر خامہ فرسائی کی ہے حتیٰ کہ بعض حضرات نے تو اس پر منفرد تالیفات بھی فرمائی ہیں۔ لیکن یہاں پر ہمارا مقصد تمام علم پر گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ اذہان کو اس کے اس قدر قریب لایا جائے جس سے امیر المؤمنینؑ کے حسین ترین کلام میں پائے جانے والے ابہام اور اشارات کا اجمالی طور پر حل بیان کیا جائے۔

علمائے علم بیان کہتے ہیں کہ "مجاز" کو "تشبیہ" سے بیاہا گیا جس سے "استعارہ" پیدا ہوا۔ کیونکہ "استعارہ" وہ لفظ ہے جو مشابہت کی مناسبت سے اپنے معنی غیر موضوع لہ میں استعمال ہو جیسے "رَاَيْتُ اَسَدًا يَرْمِي" میں لفظ "اَسَد" ہے۔ کیونکہ یہ "مرد شجاع" کے معنی دے رہا ہے کہ جسے "شیر" سے تشبیہ دی گئی ہے جو اس لفظ کا حقیقی معنی ہے۔ استعارہ بڑی حد تک مصوری معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی متکلم کا وہ "فعل" ہوتا ہے جس میں اسم مشبہ بہ، مشبہ کے معنی میں استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔ تو اس لحاظ سے متکلم "مستعیر"، لفظ "مستعار"، معنی مشبہ بہ "مستعار منہ" اور معنی مشبہ "مستعار لہ" ہوگا اور وجہ سب کی "جامع" ہوگی۔ جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مختلف عبارات کے لحاظ سے استعارہ کئی قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔

ا۔ استعارہ اور مستعار لہ

استعارہ کے مستعار لہ، مستعار اور جامع کے لحاظ سے چھ قسمیں ہیں :

ا۔ اس کی دونوں اطراف حسی ہوں اور جامع بھی حسی ہی ہو، جیسے خداوند عالم کا قول ہے : "فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلاً جَسَدًا" (طہ / ۸۸) پھر اس نے (انہی پگھلے ہوئے زیورات سے) ان کے لئے ایک بچھڑا بنایا۔

یہاں پر مستعار منہ بچھڑا ہے، مستعار لہ وہ جانور ہے جسے اللہ نے قبطیوں کے زیورات سے بنایا اور جامع، شکل و صورت ہے۔ اور یہ سب چیزیں حسی ہیں۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے : "فَاَجْرىٰ فِيهَا سِرَاجًا مُسْتَطِيرًا" (خطبہ /۱) ان میں ضوءپاش چراغ رواں دواں کیا۔ یہاں مستعار منہ "چراغ" ہے، مستعار لہ "سورج" ہے اور جامع "روشنی" ہے۔

۲۔ اس کی دونوں طرفیں حسی ہوں لیکن جامع "عقلی" ہو، جیسے خداوند عالم کا فرمان ہے : "وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ" (سورہ یس / ۳۷) رات بھی ان کیلئے (عظمت خداوندی کی) ایک نشانی ہے ہم اس سے دن کو لے جاتے ہیں۔

یہاں پر مستعار منہ "سَلَخ" (بکری کی کھال کھینچنا) ہے، مستعار لہ رات کی جگہ سے روشنی کا ظاہر کرنا ہے جو کہ دونوں حسی

ہیں اور جامع عقلی ہے، یعنی جس طرح بکری کی کھال اتارنے کے بعد گوشت ظاہر ہوتا ہے اسی طرح روشنی کے کشف کرنے سے ظلمت (تاریکی) ظاہر ہوتی ہے۔اور یہ ترتیب عقلی ہے۔اسی طرح آپؑ کا ایک قول ہے: "اِحتَجُوا بالشَّجَرَةِ وَ أضَاعُوا الثَّمَرَةَ "(خطبہ ۶۵)انھوں نے شجرہ ایک ہونے سے تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع کر دیا۔ یہاں پر حضرتؑ نے ثمرہ سے اپنی ذات شریف کا استعارہ لیا ہے جس سے پیغمبرؐ خدا نے آپؑ کو مخصوص فرمایا تھا، جس طرح ثمر، درخت سے مخصوص ہوتا ہے۔اور "اختصاص" ایک عقلی معنی ہے

۳۔اس کی دونوں طرفیں حسی ہوں اور جامع کا کچھ حصہ حسی اور کچھ عقلی ہو، جیسے کہا جاتا ہے کہ " رَأَيْتُ شَمْسًا "(میں نے سورج کو دیکھا) جبکہ حسن طلعت اور بلندی شان میں مراد انسان ہو۔پس "حُسن طلعت" حسی ہے اور "بلندی شان" عقلی ہے۔

۴۔اس کی دونوں طرفیں عقلی ہوں اور جامع بھی عقلی ہو، جیسے قرآن مجید میں ہے: "مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا"(سورہ یس / ۵۲) ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھایا۔یہاں پر مستعار منہ "نیند" ہے، مستعار لہ "موت" ہے اور جامع "فعل کا عدم ظہور" ہے۔اور ساری چیزیں عقلی ہیں۔

۵۔مستعار منہ حسی ہو، مستعار لہ عقلی ہو اور جامع بھی لازمی طور پر عقلی ہو، جیسے خداوند عالم پیغمبرؐ سے فرماتا ہے: "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ"(سورہ حجر / ۹۴) جس چیز کیلئے مامور ہوا سے واضح طور پر بیان کرو۔تو یہاں پر مستعار منہ "صَدْعُ الزُّجَاجَةِ"(شیشے کا توڑنا) ہے جو حسی ہے مستعار لہ تبلیغ رسالت ہے جو کہ عقلی ہے اور ان دونوں کی جامع یعنی تاثیر بھی عقلی ہے۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا فرمان ہے: "يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ "(خطبہ ۳) میں وہ کوہ بلند ہوں جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے جا گرتا ہے۔یہاں پر مستعار منہ "سَیْل "(سیلاب) ہے، مستعار لہ فیض عطا کرنے والے علوم ہیں اور جامع اول صورت میں حیات جسمانی ہے اور دوسری صورت میں حیات روحانی ہے۔اور حیات ایک معقول معنی ہے۔اسی طرح آپؑ کا ایک اور قول ہے: "وَ طَفِقْتُ أَرْتَئِيْ بَيْنَ أَنْ أَصُوْلَ بِيَدٍ جَذَّاءَ أَوْ أَصْبِرَ عَلىٰ طَخْيَةٍ عَمْيَاءَ"(خطبہ ۳) اور سوچنا شروع کر دیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں یا اس بھیانک تیرگی پر صبر کر لوں۔یہاں پر "يَدٍ جَذَّاء"(کٹا ہوا ہاتھ) مستعار منہ ہے اور "عدم ناصر"(مددگار کا نہ ہونا) مستعار لہ ہے اور "تصرف نہ کر سکنا اور نہ لڑ سکنا" جامع ہے۔اور یہی کیفیت لفظ "طَخْيَة"(بھیانک تاریکی) کی ہے جو مستعار منہ ہے اور "معاملات کا الجھ جانا" مستعار لہ ہے اور جامع "ظلمت" ہے۔

۶۔مستعار منہ عقلی ہو اور مستعار لہ حسی ہو اور جامع عقلی ہو، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ "(سورہ الحاقہ / ۱۱) پس ہم نے اس وقت جب پانی میں طغیانی آئی تو تمہیں کشتی میں سوار کر دیا۔یہاں پر مستعار لہ "پانی کی کثرت" ہے جو کہ حسی ہے، مستعار منہ "تکبر" ہے اور جامع "بے حد بلندی" ہے۔اور وہ دونوں عقلی ہیں۔اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے جس میں آپؑ نے زمین کے بچھائے جانے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: "وَ سَكَنَتِ

الاَرْضُ مَدْحُوَّةً فِي لُجَّةِ تَيَّارِهِ وَ رَدَّتْ مِنْ نَخْوَةِ بَأْوِهِ وَاعْتِلاَئِهِ وَ شُمُوخِ اَنْفِهِ وَ سُمُوِّ غُلَوَآئِهِ "(خطبہ ۸۹)اور زمین اس طوفان خیز پانی کے گہراؤ میں اپنا دامن پھیلا کر ٹھہر گئی اور اس کے اٹھلانے میں اور سر اٹھانے کے غرور اور تکبر سے ناک اوپر چڑھانے اور بہاؤ میں تفوق اور سربلندی دکھانے کا خاتمہ کر دیا۔

یہاں پر مستعار لہ، تلاطم کی کثرت اور امواج کی فراوانی کی وجہ سے حاصل ہونے والا پانی کا غرور و نخوت ہے، مستعار منہ افتخار، تکبر اور سرکشی ہے جو کہ عقلی ہے اور جامع حد سے زیادہ بلندی ہے اور یہ بھی عقلی ہے۔

۲۔استعارہ کی قسمیں

لفظ مستعار اگر اسم جنس ہو، جیسے "اسد، قیام اور قعود" وغیرہ تو اسے "استعارہ اصلیہ" کہتے ہیں، ورنہ "استعارہ تبعیہ" کہلائے گا۔ جیسے "فعل، مشتقات اور حروف" وغیرہ ہیں۔ اگرچہ اس بارے میں قدرے تفصیل مجاز کے ساتویں مسئلہ میں بیان ہو چکی ہے، لیکن یہاں پر جو بات بتائی جانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تشبیہ کے سلسلے میں اگر مشتقات میں مصدر کا معنی مقدر ہو گا تو اس وقت "استعارہ تبعیہ" ہو گا اور اگر مسند الیہ میں فعل مقدر ہو گا تو اس وقت "استعارہ مکنیہ" ہو گا۔

..........اس کی مزید تفصیل آگے بیان ہو گی۔ انشاء اللہ

۳۔استعارہ وفاقیہ، استعارہ عنادیہ

اگر استعارہ کی دونوں طرفوں، مستعار منہ اور مستعار لہ کا باہمی اجتماع ممکن ہو تو "استعارہ وفاقیہ" کہلائے گا، کیونکہ اس کی دونوں طرفوں میں اتفاق ہے، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ "(انعام / ۱۲۲)جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا "گمراہ ہو اور ہم اسے ہدایت کریں" تو یہاں پر احیاء کا استعارہ اس کے حقیقی معنوں میں لیا گیا ہے اور وہ ہے کسی چیز کو ہدایت کیلئے زندہ کرنا، جس ہدایت میں "ایصال الی المطلوب" (مطلوب 'نجات' تک پہنچانا) مقصود ہوتا ہے۔ لہذا احیاء اور ہدایت کا ایک جگہ اجتماع ممکن ہے۔

اسی طرح امیرؑ کا قول ہے: "وَ اِنَّمَا الدُّنْيَا مُنْتَهىٰ بَصَرِ الاَعْمىٰ لاَ يُبْصِرُ وَرَاءَ هَا شَيْئًا وَ الْبَصِيرُ يَنْفُذُهَا بَصَرُهُ وَ يَعْلَمُ اَنَّ الدَّارَ وَرَائَهَافَالْبَصِيرُ مِنْهَا شَاخِصٌ وَالاَعْمىٰ اِلَيْهَا شَاخِصٌ وَالْبَصِيرُمِنْهَا مُتَزَوِّدٌوَالاَعْمىٰ لَهَامُتَزَوِّدٌ"(خطبہ ۱۳۳)دل کے اندھے کا منتہائے نظر یہی دنیا ہوتی ہے کہ اسے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور نظر رکھنے والے کی نگاہیں اس سے پار چلی جاتی ہیں اور وہ اس امر کا یقین رکھتا ہے کہ اس کے بعد بھی ایک گھر ہے نگاہ رکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے بابصیرت اس سے آخرت کیلئے زاد حاصل کرتا ہے اور بے بصیرت اس کے سروسامان میں لگا رہتا ہے

تو یہاں پر "بصیر" کا لفظ "عاقل" کیلئے استعارہ لیا گیا ہے، جبکہ "اعمیٰ" کا "جاہل" کیلئے، "بصر اور عقل" کا اجتماع اس طرح ممکن ہے جس طرح "عمیٰ (نابینائی) اور جہالت" کا، اور جامع واضح ہے۔

اگر ان کا اجتماع ممکن نہ ہو تو اسے "استعارہ عنادیہ" کہتے ہیں۔ اس لئے کہ طرفین میں عناد موجود ہوتا ہے اور یہ ایسے ہو گا

جیسے موجود کا معدوم کے لئے استعارہ ہوتا ہے۔ جبکہ موجود مفقود ہو جائے اور اس کے آثار جمیلہ اس کی یادگار کے طور پر باقی رہ جائیں ،یا پھر معدوم کا موجود کیلئے استعارہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔اور زندہ جاہل کیلئے بھی میت کے نام کا استعارہ لیا جاسکتا ہے۔ جس طرح کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :"فَذَالِكَ مَيِّتُ الأَحيَاءِ "(خطبہ ۸۶) یہ زندوں میں مردہ ہے۔ کیونکہ موت اور حیات کا یہاں پر یکجا ہونا ناممکن ہے۔

استعارہ "تہکمیہ" اور استعارہ "تملیحیہ" بھی استعارہ عنادیہ کا ایک حصہ ہیں اور وہ اپنی ضد و نقیض میں ایسی صورت میں استعمال ہوتے ہیں کہ تضاد اور تناقض کو "تناسب" کے مقام پر لایا جاتا ہے تاکہ کسی کا مذاق اڑایا جائے اور اس کا تمسخر کیا جائے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے "فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ عَلِيمٍ "(سورہ توبہ / ۳۴) انہیں (کفار کو) عذاب کی خوشخبری دے دو(انہیں عذاب سے ڈراؤ)۔ تو یہاں پر بشارت کو انذار کی جگہ پر بطور تہکم کے استعمال کیا گیا ہے۔اسی طرح جب کسی بزدل کی تملیح ،ظرافت اور استہزاً مقصود ہو تو اس کیلئے "رَأَيْتُ أَسَدًا "(میں نے شیر کو دیکھا) کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔

۴۔جامع استعارہ

طرفین کے درمیان جامع یا تو ان کے مفہوم میں داخل ہوگا، جیسے پیغمبر گرامیؐ کا ارشاد پاک ہے :"خَيْرُ النَّاسِ رَجُلٌ مُمْسِكٌ بِعَنَانِ فَرَسِهِ كُلَّمَا سَمِعَ هَيْعَةً طَارَ إِلَيْهَا ،أَوْ رَجُلٌ فِي شَعَفَةٍ فِي غَنِيمَةٍ أَوْ يَعْبُدُ اللهَ حَتَّىٰ يَاتِيَهُ الْمَوْتُ "بہترین انسان وہ ہے جو ہر وقت اپنے گھوڑے کی باگ تھامے رہتا ہے جب دشمن کی خوفناک آواز سنتا ہے اسی طرف دوڑ پڑتا ہے یا وہ شخص ہے جو غنیمت کے موقع پر اونٹ کے سر پر رہتا ہے اور مرتے دم تک خدا کی عبادت کرتا رہتا ہے۔

تو یہاں پر دوڑنے کیلئے پرواز کو استعارہ لیا گیا ہے اور ان کے درمیان جامع سرعت سے سفر کرنا ہے ،جو ان کے مفہوم میں داخل ہے۔اگرچہ کہ پرواز ،دوڑنے سے زیادہ قوی ہے دوسری صورت میں جامع ان کے مفہوم میں داخل نہیں ہوگا جس طرح" اسد" کا استعارہ "شجاع مرد" کیلئے ہوتا ہے۔

۵۔استعارہ عمومی اور خصوصی

استعارہ اپنے جامع کے اعتبار سے یا" عمومی" ہوگا جسے "مبتذل" بھی کہتے ہیں۔اس میں جامع ظاہر ہے جیسے کہا جاتا ہے "رَأَيْتُ أَسَدًا يَرْمِي "(میں نے شیر کو پتھر مارتے ہوئے دیکھا)۔یا"خصوصی "ہوگا۔اور خصوصی وہ ہوتا ہے جو ایسے عجیب و غریب انداز میں ہو کہ جس تک ان لوگوں کی رسائی ہو جو طبقہ عامہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید اور کلام امیر المؤمنین علیہ السلام سارے کے سارے استعارے اسی قبیل سے ہیں۔

۶۔استعارہ مطلق ،مرشح ،مجرد

استعارہ یا مطلق ہوگا یا مرشح یا مجرد۔

"استعارہ مطلق" وہ ہوتا ہے جو نہ تو کسی صفت کے ساتھ ملا ہوا ہو اور نہ ہی ایسی تفریع کے ساتھ جو مستعار منہ یا مستعار الیہ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو، جیسے "عِنْدِي أَسَدٌ" (میرے پاس شیر ہے)۔ یاد رہے کہ یہاں پر صفت سے مراد نحوی معنی کے لحاظ سے "نعت" نہیں ہے جس کا شمار توابع میں ہوتا ہے۔

"استعارہ مرشح" وہ ہوتا ہے جو کسی ایسی چیز کے ساتھ ملا ہوا ہو جو مستعار منہ سے مناسبت رکھتی ہے، جیسا کہ خداوند عالم کا فرمان ہے: "أُولَئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ" (سورہ بقرہ/۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا ہے، حالانکہ یہ تجارت ان کے نفع میں نہیں ہے۔ یہاں پر "اشتراء" کو "استبدال" کیلئے استعارہ کے طور پر لیا گیا ہے، پھر اس کی فرع کے طور پر ہر اس چیز کو لایا گیا ہے جو "اشتراء" سے مناسبت رکھتی ہے یعنی "ربح" (منافع) اور "تجارت"۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول بھی ہے: "يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ" (خطبہ ۳) میں وہ کوہ بلند ہوں جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے۔ یہاں پر "سَیل" کو علم کیلئے استعارہ لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ مستعار منہ سے مناسبت رکھنے والی چیز یعنی "اِنْحِدَار" کو ملا دیا گیا ہے۔ اسی طرح آنجنابؑ کا ایک اور قول ہے "أَفْلَحَ مَنْ نَهَضَ بِجَنَاحٍ" (خطبہ ۵) کامیاب وہ ہے جو اٹھے تو پروبال کے ساتھ اٹھے۔ یہاں پر "جناح" کو "اعوان و انصار" کیلئے استعارہ لیا گیا ہے اور مستعار منہ کی مناسبت سے "نُهُوْض" کو اس کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

"استعارہ مجرد" وہ ہوتا ہے جسے مستعار سے مناسبت رکھنے والی چیزوں کے ساتھ ملایا جائے، جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام، سرکار رسالت مآبؐ کی توصیف میں فرماتے ہیں: "أَرْسَلَهُ بِالدِّيْنِ الْمَشْهُوْرِ وَ الْعَلَمِ الْمَأْثُوْرِ" (خطبہ ۲) جنہیں شہرت یافتہ دین اور منقول شدہ نشان کے ساتھ بھیجا۔ یہاں پر "علم" کو استعارہ کے طور پر لیا گیا ہے جو پہاڑ کی چوٹی وغیرہ کے معنی میں ہے کہ جس سے راستہ کی رہنمائی ہوتی ہے اور دین تک رسائی ہوتی ہے اور اسکے ساتھ مستعار لہ سے مناسبت رکھنے والی چیز کو بیان فرمایا ہے جو کہ "ماثور" ہے یعنی صدیوں تک منتقل ہوتی رہے گی، یا ایسا منتخب دین ہے جسے دوسرے تمام ادیان پر تقدم کا شرف حاصل ہے۔ بعض اوقات تجرید اور ترشیح اکٹھے بھی آجاتی ہیں۔ اور ترشیح، اطلاق اور تجرید سے اور تجرید اور ترشیح کے اکٹھا آنے سے زیادہ بلیغ ہے۔

۷۔ استعارہ فی المفرد، استعارہ تمثیلیہ

اگر استعارہ میں "جامع" امر واحد ہو تو یہ "استعارہ فی المفرد" کہلائے گا، جیسے "رَأَيْتُ أَسَدًا" ہے اور اگر ایسے متعدد امور سے اسے لیا گیا ہو جو ایک دوسرے کے لئے قید ہوتے ہیں تو وہ "استعارہ تمثیلیہ" کہلائے گا۔ جس طرح کسی امر میں متردد شخص کو کہا جاتا ہے کہ "میں تمہیں آگے پیچھے آتے جاتے دیکھ رہا ہوں۔ تو یہاں پر تردد کی صورت کو اس شخص کے تردد کی صورت کے ساتھ

تشبیہ دی گئی ہے جو کبھی تو جانے کیلئے آگے بڑھتا ہے اور پھر کچھ سوچ کر واپس آجاتا ہے اور اس کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تو اس میں جامع، آگے پیچھے جانا ہے۔ جو کئی امور سے لیا گیا ہے۔ اسی قبیل سے ہی امیر المؤمنین علیہ السلام کا قول ہے: "فَاِنَّ الشَّیْطَانَ کَامِنٌ فِي کَسْرِهٖ قَدْ قَدَّمَ لِلْوَثْبَةِ یَدًا وَ اَخَّرَ لِلنُّکُوصِ رِجْلاً" (خطبہ ۶۵) اس لئے کہ شیطان اسی کے ایک گوشے میں چھپا بیٹھا ہے جس نے ایک طرف تو حملہ کیلئے ہاتھ بڑھایا ہوا ہے اور دوسری طرف بھاگنے کیلئے قدم پیچھے ہٹا رکھا ہے۔ یہاں پر آپؑ نے امیر شام یا اس کے وزیر اعظم کے تردد کی حالت کو بیان فرمایا ہے جو وہ خلافت یا مصر کی حکومت کے لالچ میں اختیار کئے ہوئے ہے کہ اس کے لئے جنگ کرنے کی خاطر آگے بڑھتا ہے لیکن بزدلی اور ناتوانی کے مدنظر پیچھے ہٹ آتا ہے۔ اس طرح وہ کبھی تو آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔

۸۔ استعارہ تحقیقی، استعارہ بالکنایہ، استعارہ تخییلیہ

اگر استعارے کا معنی حسی اور عقلی طور پر ہو تو اسے "استعارہ تحقیقی" کہتے ہیں حسی کی مثال "لَدَيَّ اَسَدٌ شَاکِي السِّلاَحِ مُقَذَّفٌ" میرے پاس جنگ آزمودہ سلاح پوش شیر ہے۔ تو یہاں پر "اسد" (شیر) شجاع مرد کیلئے استعارہ ہے جو کہ حسی ہے۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا ایک قول ہے "فَاَجْرٰی فِیْهَا سِرَاجًا مُسْتَطِیْرًا" (خطبہ ۱) پس ان میں ضوءپاش چراغ رواں دواں کیا۔ تو یہاں پر "سراج" (چراغ) کا سورج کیلئے استعارہ ہے جو حسی ہے۔ اور عقلی کی مثال خداوند عالم کا یہ قول ہے کہ "وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا" (سورہ نساء / ۱۷۴) ہم نے تمہاری طرف نور بھیجا۔ تو یہاں پر نور کو واضح بیان کرنے کیلئے استعارہ لیا گیا ہے، جو عقلی ہے اور اسی طرح قرآن پاک کا ارشاد مقدس ہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" (سورہ فاتحہ / ۵) ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت فرما۔ تو یہاں پر صراط مستقیم، دین حق ہے اور وہ ملت اسلام ہے، جو کہ عقلی ہے۔

اسی قبیل سے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: "اَرْسَلَهٗ بِالدِّیْنِ الْمَشْهُوْرِ وَ الْعَلَمِ الْمَاْثُوْرِ وَ الْکِتَابِ الْمَسْطُوْرِ وَالنُّوْرِ السَّاطِعِ وَالضِّیَاءِ اللاَّمِعِ وَالْاَمْرِ الصَّادِعِ" (خطبہ / ۳) ان (نبیؐ) کو شہرت یافتہ دین منقول شدہ نشانی لکھی ہوئی کتاب ضوءفشاں نور چمکتی ہوئی روشنی اور فیصلہ کن امر کے ساتھ بھیجا ہے۔ یہاں پر "علم" کو دین کیلئے استعارہ قرار دیا گیا ہے۔ اور نور اور ضیاء کو علم نبویؐ کیلئے اور "صادع" کو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کیلئے۔ اور یہ سب امور عقلی ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تشبیہ کو نفس میں مضمر کیا جاتا ہے اور مشبہ بہ کے سوا تشبیہ کے اور ارکان کو ظاہر نہیں کیا جاتا اور اس تشبیہ پر نفس میں مضمر چیز ہی دلالت کرتی ہے کہ مشبہ کیلئے وہی امر مختص ہے جو مشبہ بہ کیلئے ثابت ہے، بغیر کسی حسی یا عقلی امر کو پیش نظر رکھے ہوئے۔ چنانچہ تشبیہ مضمر کو "استعارہ بالکنایہ" کہتے ہیں اور جو امر مشبہ کیلئے مشبہ بہ کے ساتھ مختص ہوتا ہے اسے "استعارہ تخییلیہ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں صرف خیال ہی اسے مشبہ بہ کی جنس سے سمجھتا ہے۔ اور جو امر مشبہ بہ کے ساتھ مختص ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں؛ ایک وہ کہ جس کے بغیر مشبہ بہ میں وجہ تشبیہ مکمل نہیں ہوتی اور دوسری وہ کہ جو مشبہ بہ میں وجہ تشبیہ کو قائم رکھے ہوتی ہے۔

پہلی قسم کی مثال ابو ذویب ہذلی کا یہ شعر ہے :

وَ اِذِ الْمَنِيَّةُ اَنْشَبَتْ اَظْفَارَهَا اَلْفَيْتُ كُلَّ تَمِيْمَةٍ لَاتَنْفَعُ

جب موت نے اپنے ناخن گاڑ لئے تو میں سمجھ گیا کہ ہر تعویذ بیکار ہے۔ چنانچہ یہاں پر موت کو ایک درندے سے تشبیہ دی گئی ہے جو استعارہ بالکنایہ ہے۔اور موت کیلئے ناخن کا ثابت کرنا استعارہ تخییلیہ ہے۔اسی قبیل سے حضرت امیرؑ کا ایک قول ہے : "فَكَانَ قَدْ عَلِقَتْكُمْ مَخَالِبُ الْمَنِيَّةِ "(خطبہ ۸۴) یہ سمجھنا چاہئے کہ موت کے پنجے تم میں گڑ چکے ہیں۔ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :" وَاعْلَمُوا اَنَّ مَلَاحِظَ الْمَنِيَّةِ نَحْوَكُمْ دَائِبَةٌ وَ كَاَنَّكُمْ بِمَخَالِبِهَا وَقَدْ نَشِبَتْ فِيْكُمْ "(خطبہ ۲۰۳) تمہیں جاننا چاہئے کہ موت کی ترچھی نظریں تمہارے قریب پہنچ چکی ہیں گویا تم اس کے پنجوں میں ہو جو تم میں گاڑ دئے گئے ہیں۔

دوسری قسم کی مثال شاعر کا قول ہے :

فَلَئِنْ نَطَقْتُ بِشُكْرِ بِرِّكَ مُفْصِحًا فَلِسَانُ حَالِي بِالشِّكَايَةِ اَنْطَقُ

اگر میں تیرے احسان کے شکریہ میں کھل کر گویا ہو سکتا ہوں تو میرے حال کی زبان شکایت میں زیادہ کچھ ہو سکتی ہے۔ یہاں پر مقصود پر دلالت کرنے کیلئے حال کو انسان متکلم کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہی استعارہ بالکنایہ ہے۔ پھر حال کیلئے اس زبان کو ثابت کیا ہے جو انسان متکلم میں دلالت کے قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور یہ استعارہ تخییلیہ ہے اسی طرح حضرت امیرؑ کا ایک فرمان ہے "حَتّٰى اِذَا اَنِسَ نَافِرُهَاوَاطْمَئَنَّ نَاكِرُهَاقَمَصَتْ بِاَرْجُلِهَاوَقَنَصَتْ بِاَحْبُلِهَاوَاَقْصَدَتْ بِاَسْهُمِهَا "(خطبہ ۸۲) جب اس سے نفرت کرنے والا دل لگا دیتا ہے اور اجنبی اس سے مطمئن ہو جاتا ہے تو یہ اپنے پیروں کو اٹھا کر زمین پر دے مارتی ہے اور اپنے جال میں پھنسا لیتی ہے اور اپنے تیروں کا نشانہ بنا لیتی ہے۔ یہاں پر دنیا کو پہلے تو اس منہ زور سواری سے تشبیہ دی ہے جو اپنے اوپر سوار ہونے سے مانع ہوتی ہے، پھر اس کیلئے پاؤں بھی ثابت کئے ہیں جن کے ذریعہ وہ منہ زوری دکھاتی ہے اور سوار ہونے سے بدکتی ہے۔ پھر اسے صیاد (شکاری) کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اس کیلئے جال کو ثابت کیا ہے کہ جس کے ذریعہ شکار کیا جاتا ہے اور تیسری مرتبہ اسے تیر انداز کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور پھر اس کے ساتھ تیر کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ جس سے اس کی تیر اندازی قائم اور ثابت ہے............

تیسری فصل

کنایہ

اس کی دو بحثیں ہیں

پہلی بحث

کنایہ کیا ہے ؟

لفظ کنایہ لغت میں باب " کنیٰ یکنیٰ " کا مصدر ہے یا " کنیٰ یکنو " کا جس کا معنی ہے صراحت کو ترک کرنا اور اصطلاح

میں اس کا اطلاق کبھی تو متکلم کے فعل پر ہوتا ہے یعنی "لازم کا ارادہ کر کے ملزوم کو ذکر کیا جاتا ہے جبکہ ملزوم کا ارادہ لازم کے ذکر کے ساتھ جائز ہو"۔ اور کبھی اس کا اطلاق خود اسی لفظ پر کیا جاتا ہے جس سے لازم کا معنی مراد ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ "فُلَانٌ طَوِيْلُ النِّجَادِ" وہ لمبے پڑتلے والا ہے، اس سے مراد طویل القامت شخص ہوتا ہے اور اسے "کنایہ فی المفرد" کہا جاتا ہے۔ اور "کنایہ فی المرکب" یہ ہوتا ہے کہ: "کسی چیز کے کئی معانی میں سے ایک معنی کا قصد کر کے اس کی تصریح کے ثبوت کو ترک کر دیا جائے اور اس کے متعلق کیلئے ثابت کیا جائے جیسے شاعر کا قول ہے:

اِنَّ الْمُرُوَّةَ وَ السَّمَاحَةَ وَالنَّدیٰ فِي قُبَّةٍ ضُرِبَتْ علی ابْنِ الْحَشْرَجِ

مروت، سخاوت اور فیاضی ایک قبہ میں جمع کر دی گئی ہے جو آخورے پر بنایا گیا ہے۔ شاعر اپنے ممدوح کیلئے ان صفات کو ثابت کرنا چاہتا ہے لیکن صراحۃً بیان کرنے کی بجائے کنایہ سے کام لیتے ہوئے ایک قبہ کا ذکر کیا ہے جس میں ان تمام صفات کو جمع دکھایا ہے اور آخورے پر بنایا گیا ہے۔

کنایہ قریبہ۔ اور۔ کنایہ بعیدہ

اگر کنایہ مطلوب کی طرف کسی واسطہ کے ذریعہ منتقل نہ ہو (براہ راست مطلوب کی طرف ہو) "کنایہ قریبہ" کہلاتا ہے، جیسے "طویل النجاد" کہہ کر "طویل القامت" مراد لیا جائے۔

اگر کسی واسطہ کے ذریعہ منتقل ہو تو "کنایہ بعیدہ" ہوگا، جیسے کثرت کے ساتھ مہمان نوازی کرنے والے کو "کثیر الرماد" (بہت زیادہ راکھ والا) کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ذہن کثرت رماد سے دیگوں اور ہانڈیوں کے نیچے کثرت سے جلائی جانے والی لکڑیوں کی طرف منتقل ہوتا ہے، پھر کثرت کے ساتھ کھانا پکانے کی طرف، پھر کثیر تعداد میں کھانے والوں کی طرف، اس سے بڑی تعداد میں آنے والے مہمانوں کی طرف اور آخر میں مقصود یعنی مہمان نواز کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

واسطوں کے قلت اور کثرت کے اعتبار سے مقصود کے ظاہر یا مخفی ہونے کی کیفیتیں بدل جاتی ہیں۔ کبھی تو موصوف مذکور ہوتا ہے، جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے اور کبھی محذوف ہوتا ہے، جیسے مسلمانوں کو اذیت پہنچانے والوں پر تعریض کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے فرمایا: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ" "مسلمان وہ ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہاں پر مسلمان کو ایذاء پہنچانے والے سے اسلام کی نفی کی گئی ہے اور وہ اس کلام میں مذکور بھی نہیں ہے بعض علماء فرماتے ہیں کی تصریح سے کنایہ کی طرف عدول کرنے کے چند اسباب ہیں:

۱۔ مقصد تعریف کرنا ہو، جیسا کہ بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں۔

۲۔ مقصد مذمت کرنا ہو، چوڑی گردن (موٹی گردن) والا کہہ کر بے وقوف مراد لیا جائے کیونکہ گردن کا موٹا اور سر کا بڑا ہونا کسی کی بے وقوفی پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ مقصد کسی لفظ کو ترک کر کے سارے بہتر لفظ کا استعمال ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "اِنَّ هٰذَا اَخِي لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّ لِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ" (ص ۲۳) یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں۔ یہاں پر "نعجۃ" (بھیڑ) کا لفظ بول کر عورت کو مراد لیا گیا ہے، کیونکہ عربوں کی عادت یہ ہے کہ عورت کے لفظ کو صراحت کے ساتھ نہیں بولتے اور یہ انداز ان کے نزدیک نام لینے سے بہتر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں سوائے حضرت مریم علیہا السلام کے کسی عورت کا نام ذکر نہیں ہوا۔ اس بارے میں "سُہیلی" نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ بادشاہ اور بڑے آدمی بھری محفلوں میں اپنے اہل حرم کا ذکر کرتے ہیں نہ ہی ان کا نام لیتے ہیں اور زوجہ کا نام لینے کی بجائے "دلہن" یا "بال بچے" یا "گھر والے" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن جب کنیزوں کی بات ہوتی تو پھر کنایہ سے کام لینے کی بجائے ان کا نام لیتے ہیں۔ چونکہ نصاریٰ نے جناب مریم علیہا السلام کی طرف ناروا نسبتیں دی ہیں لہذا اللہ نے ان کا نام صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے اس وجہ سے نہیں کہ وہ ایک عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں بلکہ اس بنا پر کہ دنیا کو اچھی طرح علم ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اگر ان کا باپ ہوتا تو پھر ان کی ماں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔

۴۔ جب صراحت کے ساتھ ذکر معیوب ہو تو اس معیوب کی بجائے بہتر انداز میں ذکر مقصود ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ "جماع" کی بجائے "ملامسۃ"، "مباشرت" اور اس قسم کے دوسرے الفاظ کنایہ کے طور پر فرمائے ہیں۔ اور "طلب جماع" کی جگہ پر لفظ "مراودہ" کا استعمال کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: "وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا" (سورہ یوسف / ۲۳) جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتا تھا اس نے یوسفؑ سے اپنے مطلب کے حصول کی خواہش کی۔ اسی طرح "جماع" یا "معانقہ" کی جگہ "لباس" کا لفظ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" (بقرہ / ۱۸۷) وہ (عورتیں) تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ دونوں ایک دوسرے کی زینت اور حفاظت کا باعث ہو۔ ایسا ہی پیشاب پاخانہ کے الفاظ کی جگہ پر لفظ "غائط" کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: "اَوْجَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ" (سورہ نساء / ۴۳) تم میں سے جس کسی نے قضائے حاجت کی۔

"غائط" کے اصل معنی زمین کے نشیبی جگہ کے ہیں جہاں پر انسان قضائے حاجت کرتا ہے۔ اسی طرح "قضائے حاجت" کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے حضرت عیسیٰ اور جناب مریم علیہا السلام کیلئے "کھانا کھانے" کا جملہ استعمال کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ" (مائدہ / ۷۵) وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ (چونکہ کھانا کھاتے تھے تو قضائے حاجت بھی ضرور کرتے تھے)۔

"سرین" کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے "ادبار" کے کنایہ سے کام لیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ" (سورہ محمدؐ / ۲۷) ان کے چہروں اور ان کی پشت پر مارتے ہوں گے۔

۵۔ قصد مبالغہ ہو، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَلَمَّا سُقِطَ فِي اَيْدِيهِمْ" (اعراف / ۱۴۹) جب انہیں حقیقت حال کا پتہ چل گیا۔

بنی اسرائیل کے بچھڑے کی عبادت کرنے کی وجہ سے سخت حسرت اور ندامت سے کنایہ ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص سخت حسرت اور ندامت کا شکار ہوتا ہے تو مارے غم کے اپنے ہاتھوں کو کاٹنے لگتا ہے اور ہاتھوں میں دانت واقع ہو جاتے ہیں۔

۶۔ قصد اختصار ہو، جیسے بہت سے الفاظ سے فعل کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: "لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ" (مائدہ / ۷۹) وہ برے اعمال تھے جنہیں وہ انجام دیا کرتے تھے۔ یا جیسا کہ فرماتا ہے: "فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا" (بقرہ / ۲۴) اگر تم نے یہ کام نہ کیا اور کر بھی نہ سکو گے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں کہ جن کو حیطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔

دوسری بحث

کنایہ، مجاز اور تعریض میں فرق

علماء بیان فرماتے ہیں کہ: "کنایہ" یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو ذکر کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کے معنی لازم مراد لیا جائے لیکن اس کیساتھ اصل معنی مراد لینے سے بھی کوئی چیز مانع نہ ہو، جبکہ مجاز یہ ہوتا ہے کہ لفظ بولا جائے اور اس سے معنی موضوع لہ مراد نہ لیا جائے۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کنایہ میں ایک لفظ بول کر اصل معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ لیکن مجاز میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ مجاز کیلئے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے اصلی معنی مراد لینے سے مانع ہوتا ہے جبکہ کنایہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کنایہ اور تعریض میں یہ فرق ہوتا ہے کہ کنایہ میں لفظ غیر موضوع لہ میں ذکر کیا جاتا ہے جبکہ تعریض میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں ایسی چیز کا ذکر کیا جاتا ہے جو کسی غیر مذکور چیز پر دلالت کرتی ہے، جیسے کوئی ضرورت مند کسی شخص کے پاس جاکر کہتا ہے "میں آپ کو سلام کرنے آیا ہوں" تو یہاں پر گویا کلام کو ایسی غرض کی طرف مبذول کیا گیا ہے جو مقصود پر دلالت کرتی ہے۔

اسے "تلویح" اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے وہ چیز ظاہر ہوتی ہے جس کا متکلم ارادہ کرتا ہے۔ یہ تو تھی صاحب کشاف کی تصریح، اب آتے ہیں ابن اثیر کی تصریح کی طرف، وہ فرماتے ہیں کہ "کنایہ" وہ لفظ ہے جو ایسے معنی پر دلالت کرے جس کا حمل کسی جامع چیز کی وجہ سے حقیقت اور مجاز دونوں پر کیا جاسکتا ہو۔ اور یہ مفرد میں بھی ہو سکتا ہے اور مرکب میں بھی، جبکہ تعریض وہ لفظ ہوتا ہے جو کسی معنی پر وضع حقیقی یا مجازی کی وجہ سے نہیں بلکہ تلویح اور اشارے کی بنا پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اس کا استعمال صرف مرکب ہوتا ہے مفرد میں نہیں، جیسے کوئی غرض مند کسی سے کہتا ہے "خدا کی قسم میں ضرورت مند ہوں" تو یہ تعریض ہوگی کیونکہ اس میں لفظ کو نہ تو حقیقت کیلئے وضع کیا گیا ہے اور نہ ہی مجاز کے واسطے۔

تیسرا مطلب:

بدیع کی بعض اقسام

اس باب میں یہ بتایا جائے گا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے بلند مرتبہ کلام میں جہاں فصاحت کے چمن کھلے ہوئے ہیں اور بلاغت کے چشمے جاری ہیں وہاں علم بدیع کی رعنائیاں بھی موجود ہیں جو بہار کے پھولوں کی مانند چمنستان کلام امامت کو معطر کئے ہوئے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ قاری کے پاس ایک معیار اور کسوٹی ہو جس سے وہ علم بدیع کے جوہر کو جانچ سکے اور امام الکلام کے جواہر پاروں

کا سمجھنا اس کیلئے آسان ہو تاکہ اس طرح سے وہ سفینہ معرفت کے ذریعہ آپؑ کے کلام کی خوبیوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر ان لئالی آبدار سے اپنے آپ کو مالا مال کر سکے۔ چنانچہ ہم یہاں پر اس علم کی ہر قسم کیلئے فصحآء و بلغآء کے کلام کے نمونے بھی پیش کریں گے جن سے کلام امامؑ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔

علم بدیع کی تعریف

معلوم ہونا چاہئے کہ: "بدیع وہ علم ہے جس کے ذریعہ مقتضائے حال کی مطابقت اور واضح دلالت کی رعایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحسین کلام کی وجوہات کی معرفت ہوتی ہے۔"

وجوہ کلام کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے کچھ تو معنوی ہوتی ہیں جو بطور اصل معنی کی خوبصورتی کا باعث ہوتی ہیں اگرچہ ان کیلئے بھی الفاظ کی خوبصورتی ضروری ہوتی ہے اور بعض لفظی ہیں۔ تو اس لحاظ سے اس کی اقسام تو بہت ہیں لیکن سب سے زیادہ توجہ تین امور پر دی جاتی ہے۔

ا۔ حسن آغاز ۲۔ حسن تخلص اور ۳۔ حسن اختتام

ا۔ حسن آغاز: اہل بیان اور اساتیذ بلاغت کا قول ہے کہ متکلم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کلام میں تین چیزوں کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرے، جن میں سے پہلی ابتدا ہے۔ متکلم کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کلام کی ابتدا نہایت ہی پیارے، فصیح، پاکیزہ، دلربا، سلیس، اور نہایت ہی حسین الفاظ سے کرے جو ترتیب اور انداز کے مطابق ہوں، مبنیٰ کے اعتبار سے صحیح ہوں، معنی کے لحاظ سے واضح ہوں۔ حشو و زوائد، سکی اور بے جا تقدیم و تاخیر سے مبرا ہوں۔ اس لئے کہ کلام کا آغاز ہی سب سے پہلے کانوں سے ٹکراتا اور ذہن سے جا ملتا ہے اگر آغاز اچھا اور مذکورہ صفات کا حامل ہوگا تو سننے والا باقی کلام کو دلچسپی سے سنے گا بھی اور اسے یاد بھی رکھے گا۔ لیکن اگر اس کی ابتدا ہی ایسے انداز میں ہو کہ جسے کان سننا گوارا ہی نہ کریں اور دل پر تیر اور نیزے بن کر جا لگے تو اسے کوئی سنے گا نہیں، خواہ باقی کلام نہایت ہی دلربا کیوں نہ ہو۔

علماء کا کہنا ہے کہ: "قرآن مجید کی تمام سورتوں کا آغاز بلاغت کے حسین اور کامل ترین نمونوں سے ہوا ہے۔ مثلاً حمد باری تعالیٰ، حروف تہجی اور حروف نداء وغیرہ سے جو اس دعویٰ کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ مثلاً کہیں پر "یَا اَیُّهَا النَّاسُ" سے ابتدا ہوتی ہے تو کہیں پر "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے ساتھ ایسے جملے سامع کو بقیہ کلام غور سے سننے کیلئے بیدار کرتے ہیں۔

اگر آپ کلام امیرؑ کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو امیر المؤمنین کے خطبات کا آغاز اور مطلع، کلام الٰہی کا پیروکار نظر آئے گا۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ مولائے کائناتؑ کے خطبات اور کلام کا آغاز ایسے جملوں اور مفردات پر مشتمل ہے جس میں بلاغت، تفنن اور ایسے انواع و اقسام کے اشارات موجود ہیں جن کی تعریف کرنے سے زبانیں عاجز ہیں۔

براعت استہلال:

حسن آغاز کی ایک فرع ہے جسے "بَرَاعَةُ الاِسْتِهْلَالِ" کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کلام کا آغاز متکلم کے حال سے مناسبت

رکھتا ہو اور یہ بتا رہا ہو کہ گفتگو کس مقصد کے لئے کی جا رہی ہے۔ کسی صراحت کے بغیر ایسے لطیف اشاروں میں ہو کہ جسے ذوق سلیم اور طبع مستقیم فوراً درک کر سکے۔

ابن مقفع کہتے ہیں کہ: ''کلام کی ابتدا متکلم کے اغراض و مقاصد کی غماز ہو جیسا کہ اشعار میں سے بہترین بیت وہ ہوتا ہے جس کے اول کو سننے سے اس کے قافیہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس لئے جاحظ کہتے ہیں: ابن مقفع کے کہنے کا مقصد شاید یہ ہے کہ خطبہ نکاح، خطبہ عید یا خطبہ صلح کا آغاز ایسے لفظوں سے کیا جائے جس کے سننے سے سامعین اس کے آخر تک پہنچ جائیں۔ کیونکہ وہ کلام بہتر نہیں ہوتا جو متکلم کے مافی الضمیر کو ظاہر نہ کرے۔

علماء فرماتے ہیں: اس کی واضح ترین مثال سورہ فاتحہ ہے جو قرآن مجید کا مطلع ہے، جو ان تمام مقاصد پر مشتمل ہے، اسی طرح سورہ ''اِقرَأ'' کا آغاز ہے جو سورہ فاتحہ کی طرح براعت پر مشتمل ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے نزول کی یہ پہلی سورت ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ کے نام کے ساتھ قرائت کا حکم سب سے پہلے ہے اور اس میں توحید رب العالمین سے متعلق چیزیں ہیں۔ اس کی ذات اور صفات یعنی صفت ذاتی اور صفت فعلی کا اثبات ہے، احکام اور اخبار سے متعلق امور ہیں، جیسے ''عَلَّمَ الاِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ'' (اقرأ/۵) انسان کو اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے تو کہا گیا ہے اسے ''عنوان القرآن'' کا نام دینا مناسب ہے، کیونکہ کسی کتاب کا عنوان اس کے اول میں مختصر عبارتوں کے ساتھ اس کے تمام مقاصد کو بیان کرتا ہے۔ لہذا یہ بات واضح ہو گئی کہ براعت کلام کے شروع میں اس لئے ہوتی ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ کلام کی بنیاد کس بات پر رکھی جا رہی ہے۔ مدح پر یا ہجو پر، مبارک دینے پر یا غصہ ظاہر کرنے پر، جھڑکنے پر یا برانگیختہ کرنے پر، خوشخبری دینے پر یا غم کا پیغام سنانے پر وغیرہ پس اگر مطلع میں حسن آغاز اور براعت استہلال جمع ہو جائیں تو اس کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی میدان کا شہسوار ہی لگا سکتا ہے اور یہی چیز امیر المؤمنین کے کلام میں بہت ہی زیادہ ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ایک کلام میں ارشاد فرماتے ہیں: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ اِنْ اَتَى الدَّهْرُ بِالْخَطْبِ الْفَادِحِ وَالْحَدَثِ الْجَلِيْلِ'' (خطبہ ۳۵) ہر حالت میں اللہ کیلئے حمد و ثناء ہے گو زمانہ ہمارے لئے جانکاہ مصیبتیں اور صبر آزما حادثے لے آیا ہے۔ کلام کا مطلع ہی اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اس میں آگے چل کر بہت بڑی خبر کو بیان کیا جائے گا اور اس میں بدیع کی ایسی ایسی قسمیں ہیں اور کلام میں جو جادو جگایا گیا ہے اس سے عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ اس کلام کی عظمت سے اس کے قائل کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، جس کے بارے میں ہم آپ کو مزید آگاہ کریں گے۔

اسی طرح نظم کی صورتحال ہے۔ ابو تمام، معتصم کو قلعہ عموریہ کی فتح کی مبارکباد دیتے ہوئے چند شعر کہتا ہے، حالانکہ نجومیوں نے معتصم کو پیشین گوئی کر دی تھی کہ ایسے وقت میں قلعہ فتح نہیں ہو سکتا؛ ابو تمام کہتا ہے:

اَلسَّيْفُ اَصْدَقُ اَنْبَاءً مِنَ الْكُتُبِ　　فِيْ حَدِّهِ الْحَدُّ بَيْنَ الْجِدِّ وَ اللَّعِبِ

بِيْضُ الصَّفَائِحِ لَا سُوْدُ الصَّحَائِفِ فِي　　مُتُوْنِهِنَّ جِلَاءُ الشَّكِّ وَ الرِّيَبِ

کتابوں کی نسبت تلوار زیادہ سچی خبریں دیتی ہے، اس کے رخسار میں حقیقت اور دل لگی کے مابین حد فاصل ہیں، کتابوں کی کالی تحریروں میں نہیں بلکہ چوڑی تلواروں کی سفیدی میں شکوک و شبہات کی صفائی ہے۔

۲۔ حسن تخلص: افتتاحیہ کلام کا رخ اصل مقصد کی طرف ایسے آسان، نرم اور جامع طریقہ کے ساتھ پھیرنا کہ سامع کو محسوس ہی نہ ہو کہ کلام، اپنے پہلے معنی سے منتقل ہو کر اصل مقصد کی طرف پہنچ چکا ہے اور دوسرے معنی میں الفاظ کانوں میں راسخ ہو جائیں اور دل میں گھر کر جائیں اور یہ ان تین مذکورہ صورتوں میں سے ایک ہے جن میں متکلم کو احسن طریقہ سے اپنا مقصود بیان کرنا ہوتا ہے، کیونکہ سامع کو اس بات کا انتظار رہتا ہے کہ متکلم اپنا مدعا اور مقصود کس انداز میں پیش کرتا ہے۔ اگر کلام میں حسن ہو اور اس کے دونوں اطراف خوشگوار انداز میں بیان کئے جائیں تو سامع کے نشاط میں تحرک پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بعد کے کلام کو بھی خوب غور سے سنتا ہے۔ ورنہ معاملہ برعکس ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ افتتاحیہ کلام کا رخ کسی مناسبت کے بغیر مقصود و مدعا کی طرف موڑ دیا جاتا ہے ایسی صورتحال کو "اقتضاب" اور "ارتجال" کہتے ہیں۔ جس طرح کہ بعض خطباء اپنے خطبوں کے بعد کہتے ہیں "امابعد" تو یہ اقتضاب ہوگا۔ کیونکہ خطیب نے اپنے کلام کو حمد و ثناء کے بعد ایک اور کلام کی طرف کسی ایسی مناسبت کے بغیر منتقل کر دیا جو ان دونوں کے درمیان پائی جاتی لیکن یہ انداز ایک لحاظ سے تخلص سے مشابہت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس نے کسی قصد کے بغیر اچانک کوئی ایسا کلام پیش نہیں کیا جو سابقہ کلام سے مربوط اور متعلق نہ ہو، بلکہ "امابعد" کہا ہے جس کا مطلب ہے کہ حمد و ثناء کے بعد اگر کوئی بات کہی جا سکتی ہے تو یہ ہے .... اس طرح سے کلام کو اس کے پہلے حصے کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے۔

جب یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ بدیع کی مذکورہ تینوں قسمیں کلام امیر المؤمنین علیہ السلام میں بدرجہ اتم اور بنحو احسن موجود ہیں، جیسا کہ کسی محقق اور باخبر شخص سے مخفی نہیں۔ حسن تخلص کی مثال حضرت امیرؑ کا یہ کلام ہے: "اَنْشَأَ الْخَلْقَ اِنْشَاءً ا............ آخر تک" (خطبہ اول) اس نے پہلے پہل خلق کو ایجاد کیا۔ اب دیکھئے کہ آپؑ نے کلام کا آغاز خدا کی حمد و ثناء اور اس کے کچھ صفات جمال و جلال کو بیان کرنے کے بعد کلام کا رخ ان الفاظ کے ساتھ پلٹا "اَنشَاَالْخَلْقَ اِنْشَاءً........" اور یہ خدا کی صفات فعل کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے مخلوق کی تخلیق کی ابتدا کیوں کر کی۔ اور اس کا سلسلہ سابقہ کلام سے بھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ یہ ہے حسن کلام جو آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔ "اقتضاب" کی مثال "اَلاَوَّلُ قَبْلَ كُلِّ اَوَّلٍ وَالآخِرُ بَعْدَ كُلِّ آخِرٍ بِاَوَّلِيَّتِهِ وَجَبَ اَنْ لَّاَوَّلَ لَهُ وَبِآخِرِيَّتِهِ وَجَبَ اَنْ لَّآخِرَلَهُ وَاَشْهَدُاَنْ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ شَهَادَةً يُّوَافِقُ فِيْهَا السِّرُّ الاِعْلَانَ وَالْقَلْبُ اللِّسَانَ اَيُّهَاالنَّاسُ! لَايَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي ......" (خطبہ ۱۰۰) وہ ہر اول سے پہلے اول ہے اور ہر آخر کے بعد آخر ہے اس کی اولیت کے سبب سے واجب ہے کہ اس سے پہلے کوئی نہ ہو اور اس کے آخر ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد کوئی نہ ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ایسی گواہی جس میں ظاہر و باطن یکساں اور دل و زبان ہم نوا ہیں۔ اے لوگو! تم میری مخالفت کے جرم میں مبتلا نہ ہو............

خداوند عالم کے اوصاف کمال اور ملک متعال کی توحید کی گواہی سے فوراً "ایہا الناس" کہہ کر دوسرے موضوع کی طرف کلام کو پلٹا دیا۔ اور یہ کلام میں اقتضاب وارتجال کی ایک جھلک ہے۔

"اقتضاب" جو تخلص سے مشابہ ہے اس کی مثال آپؑ کا یہ کلام ہے "اَمَّابَعْدُ! فَاِنَّ مَعْصِيَةَ النَّاصِحِ الشَّفِيقِ......"

(خطبہ ۳۵) حمد و ثناء کے بعد تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ باخبر اور تجربہ کار ناصح کی مخالفت کا ثمرہ............

اسی طرح شعراء کے کلام میں بھی حسن تخلص پایا جاتا ہے جس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ البتہ اس کے مقابل میں "قبح تخلص" بھی ہے۔ اس کی مثال درج ذیل اشعار ہیں، مگر یہ اشعار پیش کرنے سے پہلے ان کا پس منظر بتانا ضروری ہے وہ یہ کہ:

قیس ابن ذریح نے اپنی بیوی لبنیٰ کو طلاق دے دی اور اس نے کسی اور شخص سے شادی کر لی مگر قیس اپنے اس فعل سے بڑا نادم ہوا، کیونکہ اسے لبنیٰ کے ساتھ بڑی محبت تھی چنانچہ اس نے لبنیٰ کے عشق میں اشعار کہنا شروع کر دیئے اور ان اشعار میں اپنے ہجر و فراق کا رونا رویا کرتا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر ابن ابی عتیق کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے کوشش کر کے لبنیٰ کو اس کے شوہر سے طلاق دلا کر قیس کے ساتھ اس کی دوبارہ شادی کرا دی اس پر قیس اس کا بڑا ممنون ہوا اور اس کے شکریہ کے طور پر یہ اشعار کہے:

جَزَى الرَّحْمٰنُ أَحْسَنَ مَا يُجَازِي عَلَى الإِحْسَانِ خَيْرًا مِنْ صَدِيقِ

وَ قَدْ جَرَّبْتُ اِخْوَانِي جَمِيعًا فَمَا اَلْفَيْتُ كَابْنِ اَبِي عَتِيقِ

سَعَىٰ فِي جَمْعِ شَمْلِي بَعْدَ صَدْعٍ وَ رَاىَ حُدْتُ فِيْهِ عَنِ الطَّرِيْقِ

وَاَطْفَىٰ لَوْعَةً كَانَتْ بِقَلْبِي اَغَصَّتْنِي حَرَارَتُهَا بِرِيْقِ

خداوند عالم اس احسان کی جزائے خیر دے جو ایک دوست کی طرف سے کسی دوست کو بہتر انداز میں ملتی ہے۔ میں نے تمام دوستوں کو آزمایا لیکن ابن ابی عتیق جیسا دوست کسی کو نہیں پایا۔ اس نے ہم بچھڑے ہوؤں کو آپس میں ملایا جبکہ میں راہ راست سے بھٹک گیا تھا۔ اس نے میرے دل میں بھڑکنے والے آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

جب ابن ابی عتیق کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اس کے پاس آیا اور کہنے لگا: "دوست! باز آجاؤ ایسی تعریف سے، کیونکہ اس طرح تو لوگ مجھے 'بھڑوا' سمجھیں گے"۔

۳۔ حسن انتہا: انتہا یا جسے کلام کا اختتامیہ کہا جاتا ہے، یہ تیسرا مقام ہے کہ جہاں پر متکلم کو خاص خیال کرنا ہوتا ہے اور یہ کلام کا آخری حصہ ہوتا ہے جسے اس قدر بہترین انداز میں بیان کرنا چاہئے کہ سننے والے کے دل میں یہ احتمال باقی نہ رہے کہ اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ اور اس حصہ میں زیادہ خوش اسلوبی کی اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں پورے کلام کا خلاصہ ہوتا ہے جو سامع کے ذہن میں مدتوں باقی رہتا ہے۔ اور اگر دوران کلام کوئی خامی رہ بھی گئی تھی تو یہ حصہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔ اور یہ ایسے ہوتا ہے جیسے بد مزہ کھانا کھانے کے بعد لذیذ غذا کھائی جائے۔ لیکن اگر اس کے خلاف ہوا تو نتیجہ برعکس نکلے گا بلکہ بعض اوقات دوران کلام میں پیش کئے جانے والے بہترین نکتے بھی فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی تمام سورتیں اپنے آغاز کی مانند اختتام میں بھی بلاغت کے احسن و اکمل انداز میں پہنچی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان میں غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ حسن و کمال کے آخری درجے تک پہنچی ہوئی ہیں، کیونکہ یا تو دعائیں ہیں یا نصیحتیں یا پند و

موعظے ہیں یا حمد و ثناء یا وعدے ہیں یا وعید ہیں، جو ایسے انداز میں ختم ہوتی ہیں کہ اس کے بعد دلوں میں کسی اور چیز کے سننے کی تڑپ باقی نہیں رہتی۔ جس طرح قرآن مجید کی سورتوں کا اختتام احسن و اکمل انداز میں ہے اسی طرح امام علی علیہ السلام کا کلام معجز نظام بھی قرآنی سورتوں کی اقتداٗ میں خاتمہ کے لحاظ سے بلاغت کے آخری درجہ تک پہنچا ہوا ہے، ملاحظہ فرمائیے آپؑ پہلے تو حج بیت اللہ کے اوصاف بیان کرتے ہیں پھر اس کے وجوب کو بیان فرماتے ہیں اور آخر میں آیت حج پر یہ کہہ کر اسے ختم کرتے ہیں "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ...... " (خطبہ اول) اسی طرح ایک اور مقام پر اپنے ساتھیوں کو تحکیم کی غلطی پر ڈانٹتے ہیں، اپنا حکم نہ ماننے پر سرزنش فرماتے ہیں اور تحکیم کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال اور تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے کے بعد آخر میں بنی ہوازن کے ایک شاعر کا یہ شعر بطور تمثیل ارشاد فرماتے ہیں ؛

اَمَرْتُكُمْ اَمْرِي بِمُنْعَرَجِ اللِّوىٰ فَلَمْ تَسْتَبِيْنُ النُّصْحَ الاَّ ضُحَى الْغَدِ

میں نے مقام "منعرج اللوی" (ٹیلے کے موڑ) پر اپنے حکم سے تمہیں آگاہ کیا (لیکن تم نے میری نصیحت پر عمل نہ کیا) آخر کار دوسرے دن کی چاشت کو میری نصیحت کی صداقت مان لی۔ (خطبہ ۳۵)

ایک اور مقام پر ملاحظہ فرمائیے کہ آپ خطبہ میں پہلے تو ذات پروردگار کے اوصاف جلال و جمال کو بیان فرماتے ہیں اور آخر میں ان الفاظ میں اسے اختتام تک پہنچاتے ہیں :"تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُولُ الْمُشَبِّهُونَ بِهِ وَالجَاحِدُونَ لَهُ عُلُوًّا كَبِيْرًا" (خطبہ ۴۹) اللہ ان لوگوں کی باتوں سے بہت بلند برتر ہے جو مخلوقات سے اس کو تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اپنے اصحاب کو صفین میں جہاد کیلئے برانگیختہ کرنے کیلئے خطبہ ارشاد فرماتے ہیں اور آخر میں فرماتے ہیں :"وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ " (خطبہ ۶۵) اور خدا تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع اور برباد نہیں ہونے دے گا۔ اسی طرح خطبہ ۹۰ کا اختتام دعائیہ کلمات پر فرماتے ہیں۔

شارح معتزلی (ابن ابی الحدید) نے امیر المؤمنین کی شان میں جو قصیدے کہے ہیں ان میں سے ایک قصیدے کے آخر کو ان اشعار کے ساتھ ختم کیا ہے :

سَمْعًا اَمِيرَ الْمُؤمِنِيْنَ قَصَائِدَ يَعْنُو لَهَا بَشَرٌ وَ يَخْضَعُ جَرْوَلُ
اَلدُّرُّ مِنْ اَلْفَاظِهَا وَ لٰكِنَّهُ دَرٌّ لَهُ ابْنُ اَبِي الْحَدِيْدِ مُفَصَّلُ
هِيَ دُوْنَ مَدْحِ اللّٰهِ فِيْكَ وَ فَوْقَ مَا مَدْحَ الْوَرىٰ وَ عَلاَكَ مِنْهَا اَكْمَلُ

اے امیر المؤمنین! وہ قصیدے سماعت فرمائیے جن کیلئے لوگ مطیع ہو جاتے ہیں اور سنگلاخ زمینیں ہموار راستے بن جاتے ہیں موتی ان قصیدوں کے الفاظ سے جڑ کرنے ہیں اور یہ وہ موتی ہیں جنہیں ابن ابی الحدید نے پروئے ہیں۔ جو تیری مدح خدا نے فرمائی ہے میری یہ مدح اس تک تو نہیں پہنچ سکتی لیکن مخلوق نے جو تیری مدحیں کی ہیں ان سے ضرور بلند و بالاتر ہے جبکہ تیری بلندی ان سے بھی کامل تر ہے۔

مطابقت

اسے طباق، تطبیق، تضاد، یا ٹکاؤ بھی کہتے ہیں جس کے لغوی معنی ہیں گھوڑے کا چلتے ہوئے اگلے پاؤں کی جگہ پر پچھلے پاؤں کا رکھنا۔ اور اصطلاح میں "دو متضادوں یعنی دو متقابل معانی کا ایک جملہ میں یکجا ہونا"۔ اب دونوں متضادوں میں جو تقابل پایا جاتا ہے اس میں "تضاد" کی نسبت ہوگی یا "ایجاب وسلب" کی یا "عدم وملکہ" کی یا "تضایف" کی۔ جن کی مثالیں آگے چل کر بیان ہوں گی۔

نسبت خواہ کوئی بھی ہو اس کی کئی قسمیں بنتی ہیں کیونکہ یہ مطابقت یا تو دو حقیقی معنوں میں ہوگی یا دو مجازی معنوں میں یا ایک لفظی اور ایک معنوی میں، یا ایجاب وسلب میں یا جلی اور خفی میں۔

پہلی قسم

اگر مطابقت دو حقیقی معنوں میں ہو تو وہ دونوں یا تو اسم ہوں گے جیسے خداوند عالم کا ارشاد ہے: "تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُودٌ" (سورہ کہف / ۱۸) اگر تو ان کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ نیند میں مستغرق ہیں۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا فرمان ہے: "ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهُ مِنْ حَزْنِ الْاَرْضِ وَ سَهْلِهَا وَ سَبْخِهَا وَ عَذْبِهَا" (خطبہ اول) پھر اللہ نے نرم و سخت اور شورہ زار و شیریں زمین سے مٹی جمع کی۔

یا وہ دونوں فعل ہوں گے، جیسے قرآن مجید میں ہے: "تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" (آل عمران / ۲۶) تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے، جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا قول ہے "اِلَى اللّٰهِ اَشْكُوا مِنْ مَعْشَرٍ يَعِيشُونَ جُهَّالاً وَّ يَمُوتُونَ ضُلاَّلاً" (خطبہ ۱۷) اللہ ہی سے شکوہ ہے ان لوگوں کا جو جہالت میں جیتے ہیں اور گمراہی میں مر جاتے ہیں۔

یا دو حرفوں کے درمیان ہوگی، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "لَهَا مَاكَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" (بقرہ / ۲۸۶) اسی بنا پر انسان جو بھی نیک کام انجام دے اس کی جزا اور جو برا کام کرے اس کی سزا پائے گا۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا قول ہے جس میں اشعث بن قیس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "وَ مَا يُدْرِيكَ مَا عَلَيَّ مِمَّا لِي" (خطبہ ۱۶) تجھے کیا معلوم کہ کونسی چیز میرے حق میں ہے اور کونسی چیز میرے خلاف جاتی ہے۔ بلکہ ایک مقام پر تو آپؑ کے کلام میں تینوں کلمے جمع کئے گئے ہیں، جیسے "لَكَانَ قَلِيلاً فِيمَا اَرْجُولَكُمْ مِنْ ثَوَابِهِ وَ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ عِقَابِهِ" (خطبہ ۵۵) اس ثواب کے لحاظ سے جس میں تمہارے لئے امیدوار ہوں اور اس عقاب کے اعتبار سے جس کا مجھے تمہارے لئے خوف واندیشہ ہے وہ بہت ہی کم ہوگی۔

دوسری قسم

کہ جس میں دو مجازی معانی میں مطابقت ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے: "اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ" (سورہ انعام / ۱۲۲) وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا۔ یعنی گمراہ ہو اور ہم اسے ہدایت کریں، کیونکہ مارنا اور زندہ کرنا ان کے دونوں مجازی

متقابل معنی ہیں ۔ان کا تقابل دو حقیقی معانی جیسا تقابل ہوگا۔اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا قول ہے "فَالْبَصِيرُ مِنْهَا شَاخِصٌ وَالأَعْمىٰ اِلَيْهَا شَاخِصٌ وَالْبَصِيرُ مِنْهَا مُتَزَوِّدٌ وَالأَعْمىٰ لَهَا مُتَزَوِّدٌ" (خطبہ ۱۳۳) نگاہ رکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے بابصیرت اس سے آخرت کیلئے زاد حاصل کرتا ہے اور بے بصیرت اس کے سروسامان میں لگا رہتا ہے۔یہاں پر "اعمیٰ" سے مراد جاہل ہے، "بصیر" سے مراد عقلمند عارف ہے اور ان کے مجازی معنی کا تقابل حقیقی معنی جیسا ہے۔

تیسری قسم

کہ جس میں معنوی مطابقت ہوتی ہے اور وہ یوں کہ کسی چیز کا اپنی ضد کے ساتھ معنی میں مقابلہ ہو لفظ میں نہیں، جیسے قرآن مجید میں ہے: "اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُونَ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّا اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ" (یس / ۱۵،۱۶) تم تو فقط جھوٹ بولتے ہو، انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار آگاہ ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔اس کا معنی ہے کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم سچے ہیں۔یا ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے: "جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً" (سورہ بقرہ / ۲۲) تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت قرار دیا۔ابو علی فارسی کہتے ہیں: چونکہ بناء (چھت) بلند ہوتی ہے لہذا اسماء کے مقابلے میں ارض (زمین) کو لایا گیا ہے جو کہ اس کے برعکس ہے، اسی طرح امیر المؤمنین کا کلام ہے: "مِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوعٍ وَمِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوعٍ" (خطبہ اول) یہ سروں پر بلند بام آسمان، ان کے نیچے بچھا ہوا فرش زمین۔چونکہ "مہاد" سے مراد "مہد" یعنی گہوارہ ہے جو بچوں کیلئے تیار کیا جاتا ہے اور بچے کے نیچے ہوتا ہے لہذا اس کا تقابل "سقف" (چھت) سے کیا گیا ہے جو اوپر ہوتی ہے۔لیکن اگر مہاد کی تفسیر فرش سے کی جائے جو اس کا ایک لغوی معنی بھی ہے تو پھر اس وقت لفظی مطابقت ہوگی۔اس طرح شاعر کا قول ہے؛

فَاِنْ تَقْتُلُونِي فِي الْحَدِيدِ فَاِنَّنِي قَتَلْتُ اَخَاكُمْ مُطْلَقًا لَمْ يُقَيَّدْ

اگر تم مجھے لوہے میں (جکڑ کر) قتل کرو تو یاد رکھو میں نے تمہارے بھائی کو قید کئے بغیر قتل کیا تھا۔یعنی "اگر تم مجھے باندھ کر قتل کرو گے" جو کہ "مطلق" کی ضد ہے اور یہاں پر معنوی مطابقت ہوگی۔

چوتھی قسم

سلب میں مطابقت ہوگی۔وہ یوں کہ ایک ہی مصدر کے دو فعلوں کو ایک جگہ بیان کیا جائے جس میں ایک مثبت اور دوسرا منفی ہو یا ایک امر اور دوسرا نہی ہو۔

پہلی نوعیت کی مثال، خداوند عالم فرماتا ہے: "قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ" (سورہ زمر / ۹) کہہ دے کہ کیا علم والے اور بے علم برابر ہیں؟ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا فرمان ہے: "يُغَارُ عَلَيْكُمْ وَ لَا تُغِيْرُوْنَ وَ تُغْزَوْنَ وَلَا تَغْزُوْنَ" (خطبہ ۲۷) تمہیں لوٹا جا رہا ہے اور تم غیرت سے کام نہیں لیتے، تم سے لڑا جا رہا ہے اور تم نہیں لڑتے۔یا جس طرح فرماتے ہیں "تُكَادُوْنَ وَلَا تَكِيْدُوْنَ" تمہارے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور تم کوئی تدبیر اختیار نہیں کرتے۔یا جس طرح

شاعر کا قول ہے:

خُلِقُوا وَ مَا خُلِقُوا لِمَكْرَمَةٍ فَكَأَنَّهُمْ خُلِقُوا وَ مَا خُلِقُوا

وہ جس چیز سے بھی پیدا کئے گئے ہیں لیکن عزت وبندگی کیلئے پیدا نہیں ہوئے، گویا وہ پیدا ہوئے بھی ہیں اور پیدا نہیں بھی ہوئے۔

دوسری نوعیت کی مثال، یعنی جہاں پر ایک امر اور دوسرا نہی ہو، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے "وَ لَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ" (سورہ مائدہ / ۴۴) لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ امیر المؤمنینؑ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں: "فَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الْآخِرَةِ وَ لَا تَكُونُوا مِنْ أَبْنَاءِ الدُّنْيَا" (خطبہ ۴۲) تم فرزند آخرت بنو اور ابناء دنیا نہ بنو۔

پانچویں قسم

مطابقت مخفی ہو؛ اور وہ یوں کہ دو معانی کو ایک جگہ پر بیان کیا جائے جن میں سے ایک کا تعلق دوسرے کے مقابل کے ساتھ ہو، جیسے "سببیت اور لزوم" جیسا تعلق ہو؛ قرآن کہتا ہے: "أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" (سورہ فتح / ۲۹) کافروں کے مقابلہ میں سخت، آپس میں مہربان ہیں۔ کیونکہ یہاں پر 'رحمت' اگرچہ 'شدت' کے مقابلہ میں نہیں ہے لیکن وہ اس "نرمی" کا سبب ضرور ہوتی ہے جو "شدت" کے مقابلہ میں ہے۔ اسی طرح خداوند عالم ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ" (قصص / ۷۳) فضل کی تلاش اگرچہ سکون کے مقابل میں نہیں ہے لیکن ایک ایسی حرکت کو ضرور مستلزم ہے جو سکون کی ضد ہے اور مذکورہ دونوں صورتوں کی مثال قول امیر المؤمنین میں بھی ملتی ہے، جیسے: "فَالْهُدَىٰ خَامِلٌ وَ الْعَمَىٰ شَامِلٌ" (خطبہ ۲) ہدایت گمنام اور ضلالت ہمہ گیر تھی۔ یہاں پر "عمیٰ" ہدایت کے مقابل میں اگرچہ نہیں ہے لیکن اس (گمراہی) کا سبب ضرور ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "فَإِنَّهُ وَاللّٰهِ الْجِدُّ لَا اللَّعِبُ وَالْحَقُّ لَا الْكَذِبُ" (خطبہ ۱۳۳) خدا کی قسم وہ چیز (موت) سراسر حقیقت ہے ہنسی کھیل نہیں اور سرتاپا حق ہے جھوٹ نہیں۔ یہاں پر اگرچہ حق اور کذب کا تقابل نہیں ہے، لیکن چونکہ حق صدق کیلئے لازمی ہوتا ہے جو کہ کذب کا مقابل ہے اور کذب، باطل کیلئے لازمی ہوتا ہے جو حق کے مقابل میں ہے، اور یہاں پر ایک حسین تقابل پیش کیا گیا۔ اسی طرح شعراء کے کلام میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

مطابقت کی ایک اور بہترین اور مخفی ترین مثال، قرآن مجید کی یہ آیت ہے: "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" (سورہ بقرہ / ۱۷۹) اور قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔

مقابلہ

مقابلہ یہ ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زائد الفاظ کو لایا جائے جو معنی میں ایک دوسرے کے موافق ہوں پھر ان کے مقابلے میں بالترتیب اسی طرح دو یا دو سے زائد الفاظ لائے جائیں اور وہ بھی آپس میں معنی میں موافق ہوں۔ اور توافق سے مراد تقابل کے خلاف ہے نہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے جیسے ہوں۔ کیونکہ اس میں مثل و تناسب کی شرط نہیں ہوتی، جیسا کہ آپ کو آگے چل کر معلوم

ہو گا۔

مقابلہ کبھی تو دو الفاظ کے درمیان ہوتا ہے اور کبھی دو سے زائد کے درمیان اور بقول شیخ صفی الدین تعداد جس قدر بڑھتی جائے گی بلاغت میں اسی قدر اضافہ ہو تا جائے گا، جیسے دو کا مقابلہ دو سے اور تین کا مقابلہ تین سے، اسی طرح آگے چلے جائیں۔ چنانچہ دو کا مقابلہ دو کے ساتھ کی مثال قرآن مجید میں ہے "فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلاً وَّلْيَبْكُوا كَثِيْرًا" (توبہ / ۸۲) انہیں چاہئے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں۔ یہاں پر "ضحک" اور "قلت" ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں، جبکہ ان کے مقابلے میں "بکا" اور "کثرت" کو لایا گیا ہے۔ اس قسم سے امیر المؤمنینؑ کا کلام ہے جس میں دنیا کی تصویر کشی کی گئی ہے، آپ فرماتے ہیں: "مَا اَصِفُ مِنْ دَارٍ اَوَّلُهَا عَنَاءٌ وَ اٰخِرُهَا فَنَاءٌ فِيْ حَلاَلِهَا حِسَابٌ وَ فِيْ حَرَامِهَا عِقَابٌ مَنِ اسْتَغْنٰى فِيْهَا فُتِنَ وَ مَنِ افْتَقَرَ فِيْهَا حَزِنَ وَ مَنْ سَاعَاهَا فَاتَتْهُ وَ مَنْ قَعَدَ عَنْهَا وَاتَتْهُ" (خطبہ ۸۱) میں اس دار دنیا کی حالت کیا بیان کروں کہ جسکی ابتداء رنج اور انتہاء فنا ہو جس کے حلال میں حساب اور حرام میں سزا و عقاب ہو یہاں کوئی غنی ہو تو فتنوں سے واسطہ اور فقیر ہو تو حزن و ملال سے سابقہ رہے، جو دنیا کی سعی میں لگا رہتا ہے اس کی دنیوی آرزوئیں بڑھتی جاتی ہیں جو کوششوں سے ہاتھ اٹھالیتا ہے تو دنیا خود ہی اس سے سازگار ہو جاتی ہے۔ یہاں پر دو دو فقروں کا تقابل کیا گیا ہے جن میں سے بعض میں اضداد ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ اسی طرح شاعر کا قول ہے:

فَتًى تَمَّ فِيْهِ مَا يَسُرُّ صَدِيْقَهٗ عَلٰى اَنَّ فِيْهِ مَا يَسُوْءُ الْاَعَادِيَا

وہ ایسا جوانمرد ہے جس میں دوست کو خوش کرنے والی ہر خوبی بطور کامل موجود ہے، جبکہ اس میں وہ صفات بھی موجود ہیں جو دشمنوں کو ناگوار گزرتی ہیں۔

تین تین فقروں کے تقابل کی مثال امیر المؤمنینؑ کے اس کلام میں ہے: "أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ الدُّنْيَا قَدْ أَدْبَرَتْ وَ آذَنَتْ بِوَدَاعٍ، وَ إِنَّ الْآخِرَةَ قَدْ أَقْبَلَتْ وَ أَشْرَفَتْ بِاطِّلَاعٍ" (خطبہ ۲۸) دنیا نے پیٹھ پھیر کر اپنے رخصت ہونے کا اعلان اور منزل عقبیٰ نے سامنے آکر اپنی آمد سے آگاہ کر دیا ہے۔

چار چار فقروں کے تقابل کی مثال قرآن مجید میں ہے: "فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى" (سورہ لیل ۸ تا ۱۰) پس وہ شخص جو راہ خدا میں انفاق کرے اور پرہیز گاری اختیار کرے اور اللہ کی نیک جزا کی تصدیق کرے ہم اس کی راہوں کو آسان بنا دیں گے لیکن جو شخص بخل کرے گا اسے اس طریقے سے بے نیاز ہونا چاہئے اور اللہ کی اچھی جزاؤں کی تکذیب کرے ہم عنقریب اس کی راہوں کو دشوار بنا دیں گے۔ یہاں پر "اِسْتِغْنَا" سے مراد، خدا سے بے نیازی ہے، اسی لئے اس کا "اِتَّقٰى" کے ساتھ بڑا خوبصورت تقابل ہے۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں: "لَعَنَ اللّٰهُ الْاٰمِرِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ التَّارِكِيْنَ لَهٗ وَ النَّاهِيْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ الْعَامِلِيْنَ بِهٖ" (خطبہ ۱۲۹) خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو اوروں کو بھلائی کا حکم دیں اور خود اسے چھوڑ دیں اور دوسروں کو بری باتوں سے روکیں اور خود ان پر عمل کرتے رہیں۔ یہاں پر چوتھا مقابلہ "لہ" اور "بہ" کے درمیان ہے لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ اسے تین تین کے مقابلہ

کی مثالوں میں شمار کیا جائے، کیونکہ " لہٗ " میں لام اور " بہٖ " میں باء مسببہ فعل کیلئے صلہ بن رہے ہیں اور ان کو مکمل کر رہے ہیں۔

پانچ، پانچ فقروں کے تقابل کی مثال، امیر المؤمنینؑ کا یہ کلام ہے : "فَخُذُوا بَعْضًا يَكُنْ لَكُمْ قَرْضًا وَ لَا تُخَلِّفُوا كُلًّا فَيَكُونَ عَلَيْكُمْ كَلًّا " (خطبہ ۲۰۲) کچھ بھیجو کہ وہ تمہارے لئے (اللہ کے ذمہ) قرضہ ہو جائے گا، سب کا سب پیچھے نہ چھوڑ جاؤ کہ وہ تمہارے لئے بوجھ ہو گا۔

ایک ضروری وضاحت!

صاحب مفتاح نے مقابلہ کی تعریف میں ایک اور قید کا اضافہ کیا ہے۔ وہ اس کی پہلے تو تعریف کرتے ہیں کہ : "مقابلہ وہ ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ موافق چیزوں کو ان کی ضد کے ساتھ جمع کیا جائے......۔ " پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ " ......دو یا دو سے زیادہ موافق چیزوں کے ساتھ شرط یہ ہے کہ ان کی مقابل ضدوں میں مشروط کا ہونا بھی ضروری ہے "۔ انہوں نے اس کی مثال قرآن مجید کی یہ آیت دی ہے : "فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ...... " (سورہ لیل ۸) پس وہ شخص جو راہ خدا میں انفاق کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے ....۔ کیونکہ جب "تیسیر "، "اعطاء "، "اتقاء " اور " تصدیق " کے درمیان مشترک ہے تو اس کی ضد "تعسیر" کو اس کی ضد قرار دیا ہے اور اس کی تعبیر "فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى " ہے جو تمام اضداد کے درمیان مشترک ہے اور وہ اضداد ہیں "بخل "، "استغناء " اور "تکذیب "۔

کلام امیر المؤمنینؑ سے اس کی مثال یہ ہے : "فَاِنْ اَقُلْ يَقُولُوا حَرَصَ عَلَى الْمُلْكِ وَ اِنْ اَسْكُتْ يَقُولُوا جَزِعَ مِنَ الْمَوْتِ " (خطبہ ۵) اگر بولتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ دنیوی سلطنت پر مرمٹے ہوئے ہیں اور اگر چپ رہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ موت سے ڈر گئے ہیں۔

نظیر کی رعایت

اسے تناسب، توفیق، ائتلاف اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔ یعنی " ایسے امور کو جمع کرنا جو تناسب اور توازن میں ایک جیسے ہوں۔ بالفاظ دیگر کسی چیز کے ساتھ ایسی چیز ملائی جائے جو اس کے مشابہ اور لائق ہو "۔

سکاکی کہتے ہیں کہ یہ متشابہات کو جمع کرنے کا نام ہے۔ بہر حال تعریف خواہ کوئی بھی ہو، تو اس میں کبھی تو دو امور کو جمع کیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے : "وَالشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ "(الرحمٰن / ۵) سورج اور چاند منظم حساب کے تحت گردش کرتے ہیں۔ سورج اور چاند کا روشنی دینے میں تناسب اور اشتراک ہے۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا فرمان ہے : "وَالشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ دَائِبَانِ فِي مَرْضَاتِهٖ " (خطبہ ۸۹) سورج اور چاند اس کی منشاء کے مطابق ایک دھارے پر بڑھے جانے کی سر توڑ کوششوں میں

لگے ہوئے ہیں۔

نظم میں اس کی مثال ابن قلاقس کا قول ہے جو اونٹوں کی تعریف میں ہے :

خُوْصٌ کَاَمْثَالِ الْقِسِيِّ نَوَاحِلاً فَاِذَا سَمَا طَلَبٌ فَهُنَّ سِهَامٌ

وہ اونٹیاں اندر دھنسی ہوئی آنکھوں والی اور کمانوں کی طرح دبلی پتلی ہیں، لیکن جب طلب کی بلندی حاصل ہو جاتی ہے تو تیر بن جاتی ہیں۔ یہاں پر اونٹ کو اس کی شکل وصورت اور بناوٹ کے لحاظ سے کمان سے تشبیہ دی ہے پھر کمان کی مناسبت سے تیر اندازی کیلئے مقابلہ میں شرکت سے تشبیہ دی ہے۔

کبھی تین امور کو جمع کیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امیرؑ کا قول ہے : "وَ الدُّنْيَا كَاسِفَةُ النُّورِ ظَاهِرَةُ الْغُرُوْرِ عَلٰى حِيْنِ اصْفِرَارٍ مِنْ وَرَقِهَا وَ اِيَاسٍ مِنْ ثَمَرِهَا وَ اِغْوِرَارٍ مِنْ مَائِهَا" (خطبہ ۸۱) دنیا بے رونق و بے نور تھی اور اس کی فریب کاریاں کھلی ہوئی تھیں، اس وقت اس کے پتوں پر زردی دوڑی ہوئی تھی اور پھلوں سے ناامیدی تھی پانی زمین میں تہہ نشین ہو چکا تھا۔ یہاں پر ورق، ثمر اور ماء (پانی) کے درمیان تناسب ہے۔ اور یہی چیز نظم میں بھی ہوتی ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے

كَاَنَّ ثُرَيَّا عُلِّقَتْ فِيْ جَبِيْنِهٖ وَ فِيْ نَحْرِهِ الشِّعْرٰى وَ فِي خَدِّهِ الْقَمَرُ

گویا ثریا کو اس کی پیشانی پر لٹکا دیا گیا ہے، اس کی گردن میں ستارہ "شعریٰ" ہے اور اس کے رخسار میں چاند ہے۔

کبھی چار امور کو جمع کیا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امیرؑ کا قول ہے : "ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ وَ ضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ وَ اَجْرٰى فِيْهَا سِرَاجًا مُسْتَطِيْرًا وَ قَمَرًا مُنِيْرًا " (خطبہ اول) پھر ان کو ستاروں کی سج دھج اور روشن ستاروں کی چمک دمک سے آراستہ کیا اور ان میں ضوء پاش چراغ اور جگمگاتا چاند رواں کیا۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں : "فَكَفٰى بِالْجَنَّةِ ثَوَابًا وَ نَوَالاً وَ كَفٰى بِالنَّارِ عِقَابًا وَ وَبَالاً وَ كَفٰى بِاللّٰهِ مُنْتَقِمًا وَ نَصِيْرًا وَ كَفٰى بِالْكِتَابِ حَجِيْجًا وَ خَصِيْمًا " (خطبہ ۸۲) بخشش اور عطا کیلئے جنت اور عقاب وعذاب کیلئے دوزخ سے بڑھ کر کیا ہو گا اور انتقام لینے اور مدد کرنے کیلئے اللہ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے اور سند حجت بن کر اپنے خلاف سامنے آنے کیلئے قرآن سے بڑھ کر کیا ہے ؟

کبھی چار سے زائد امور میں بھی اجتماع ہوتا ہے، جیسے آپؑ انسانی تخلیق کے بارے میں فرماتے ہیں : "اَمْ هٰذَا الَّذِيْ اَنْشَاَهُ فِيْ ظُلُمَاتِ الْاَرْحَامِ نُطْفَةً دِهَاقًا وَ عَلَقَةً مُحَاقًا وَ جَنِيْنًا وَ رَاضِعًا وَ وَلِيْدًا وَ يَافِعًا ثُمَّ مَنَحَهٗ قَلْبًا حَافِظًا وَ لِسَانًا لَافِظًا وَ بَصَرًا لَاحِظًا" (خطبہ ۸۲) یا پھر اسے دیکھو جسے اللہ نے ماں کے پیٹ کی اندھیاریوں اور پردے کی اندرونی تہوں میں بنایا، جو ایک جراثیم حیات سے چھلکتا ہوا نطفہ اور بے شکل وصورت منجمد خون تھا، پھر انسانی خدوخال کے سانچے میں ڈھال کر جنین بنایا اور پھر طفل شیر خوار اور حد رضاعت سے نکال کر طفل نوخیز اور پھر بھر پور جوان بنایا۔ پھر اللہ نے اسے نگہداشت کرنے والا دل اور بولنے والی زبان اور دیکھنے والی آنکھیں دیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں : "اَلَّذِيْ لَمْ يَزَلْ قَائِمًا دَائِمًا اِذْ لَا سَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ وَ لَا حُجُبٌ ذَاتُ اَرْتَاجٍ وَ لَا لَيْلٌ دَاجٍ وَ لَا بَحْرٌ سَاجٍ وَ لَا جَبَلٌ ذُوْ فِجَاجٍ وَ لَا فَجٌّ ذُوْ اِعْوِجَاجٍ وَ لَا

اَرْضٌ ذَاتُ مِهَادٍ وَ لاَ خَلْقٌ ذُو اعْتِمَادٍ "(خطبہ ۸۹) وہ اس وقت بھی قائم و بر قرار تھا کہ جب نہ برجوں والا آسمان تھا، نہ بلند دروازوں والے حجاب تھے، نہ اندھیری راتیں، نہ ٹھہرا ہوا سمندر، نہ لمبے چوڑے راستوں والے پہاڑ، نہ آڑی ترچھی پہاڑی راہیں، نہ بچھے ہوئے فرشوں والی زمین اور نہ کس بل رکھنے والی مخلوق تھی۔

اسی خوبصورت نوع سے نظم میں جامع نہج البلاغہ علامہ سید رضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

حَيَّرَنِي رَوْضٌ عَلَىٰ خَدِّهِ وَيْلِيْ مِنْ ذَاكَ وَ وَيْلِي عَلَيْهِ
اَيُّ جَنًى يَقْطِفُ مِنْ حُسْنِهِ وَ كُلُّ مَا فِيْهِ حَبِيْبٌ اِلَيْهِ
نَرْجِسَتَيْ عَيْنَيْهِ أَمْ وَرْدَتَيْ خَدَّيْهِ أَمْ رَيْحَانَتَي عَارِضَيْهِ

مجھے اس کے رخساروں پر کے بُستانوں نے حیران کر دیا، اس سے میری بربادی بھی ہے اور مجھے اس پر افسوس بھی ہے، وہ اس کے حسن کے کس کس پھل پھول کو توڑے گا جبکہ جو کچھ بھی اس میں ہے وہ اسے بہت پیارا ہے۔ اس کی نرگسی آنکھوں کو یا اس کے گلابی گالوں کو یا اس کے رخسار کے گلدستوں کو؟

ان اشعار کے بارے میں لوگوں کے تاثرات یہ ہیں کہ اس میں نسیم سحر سے بھی زیادہ لطیف جھونکے اور جادو سے بھی زیادہ تاثیر ہے۔

تشابہ اطراف

تشابہ اطراف یہ ہوتا ہے کہ کلام کو ایسے جملے پر ختم کیا جائے جو اس کی ابتدا سے مناسبت رکھتا ہو۔ کچھ لوگ تو اسے "نظیر کی مناسبت" کے زمرے میں شمار کرتے ہیں اور کچھ حضرات اسے "تناسب اطراف" کا نام دیتے ہیں، لیکن بہتر وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے۔ بعض حضرات اسے "تسبیغ" کے مترادف سمجھتے ہیں جسے ہم اس کے بعد بیان کریں گے۔ بہر حال نام کوئی بھی ہو، کلام کی ایک خوبی تشابہ اطراف بھی ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے "لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُوَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَوَهُوَاللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" (انعام / ۱۰۳) آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں لیکن وہ سب آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے اور وہ طرح طرح کی نعمتوں کا عطا کرنیوالا ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے۔ "لطیف" کی مناسبت اس کی آنکھوں کے ساتھ قابل ادراک نہ ہونے سے ہے اور "خبیر" کی مناسبت اس کے تمام اشیاء کے ادراک کرنے سے ہے کیونکہ جو اشیاء کا مدرک ہوتا ہے وہ ان سے باخبر ہوتا ہے اور اسی سے امیر المؤمنینؑ کا کلام بلاغت نظام ہے "طَبِيْبٌ دَوَّارٌ بِطِبِّهِ وَقَدْ اَحْكَمَ مَرَاهِمَهُ وَ اَحْمَىٰ مَوَاسِمَهُ وَيَضَعُ مِنْ ذٰلِكَ حَيْثُ الْحَاجَةُ اِلَيْهِ مِنْ قُلُوْبٍ عُمْيٍ وَ اٰذَانٍ صُمٍّ وَ اَلْسِنَةٍ بُكْمٍ وَ مُتَتَبِّعٌ بِدَوَائِهِ مَوَاضِعَ الْغَفْلَةِ وَمَوَاطِنَ الْحَيْرَةِ "(خطبہ ۱۰۷) آنحضرتؐ ایک طبیب تھے جو اپنی حکمت و طب کو لئے ہوئے چکر لگا رہا ہو اس نے اپنے مرہم ٹھیک کر لئے ہوں اور داغنے کے آلات تپا لئے ہوں وہ اندھے دلوں بہرے کانوں اور گونگی زبانوں کے علاج معالجہ میں جہاں ضرورت ہوتی ہے ان چیزوں کو استعمال میں لاتا ہو اور دوا لئے

غفلت زدہ اور حیرانی و پریشانی کے مارے ہوؤں کی کھوج میں لگا رہتا ہو۔ یہاں پر "مُتَتَبِّعٌ بِدَوَائِهِ" کی مناسبت "دَوَّارٌ بِطِبِّهِ" کے ساتھ ہے اور "مَوَاضِعُ الْغَفْلَةِ" اور "مَوَاطِنَ الْحَيْرَةِ" کی مناسبت "قُلُوْبٌ عُمْىٌ" اور "آذَانٌ صُمٌّ" سے ہے۔

تسبیغ

تسبیغ، جسے بعض لوگ "تشابہ اطراف کا" نام بھی دیتے ہیں، نثر و نظم دونوں میں ہوتی ہے اور "تسبیغ" یہ ہے کہ "نثر میں بیان کرنے والا پہلے قرینے کے سجع کو، اس کے بعد والے قرینہ میں دوبارہ لے آئے۔ اور نظم میں قافیہ کو بعد میں آنے والے بیت کے اول میں لے آئے"۔ اسی طرح سے اس قسم کی اطراف متشابہ ہو جائیں گی۔ نثر کی مثال، قرآن مجید میں ہے کہ : "وَعْدَ اللّٰهِ لاَ يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُوْنَ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (سورہ روم / ۷-۶) یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے یہ لوگ تو دنیا کی صرف ظاہری زندگی کو ہی جانتے ہیں۔ یہاں پر پہلی آیت کے آخری لفظ کو دوسری آیت کے اول میں بیان کیا گیا ہے اور یہ الفاظ فاصلہ کے بغیر بھی دہرائے جاتے ہیں جیسے : "مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ" (سورہ نور / ۳۵) نور خدا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی روشن چراغ کسی طاق میں رکھا ہوا ہو اور وہ چراغ فانوس میں ہو اور وہ فانوس فروزاں ستارے کی مانند شفاف و درخشاں ہو۔

اس سلسلہ میں امیر المؤمنین علیہ السلام کا کلام ملاحظہ فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے : "اَلْمُنَجِّمُ كَالْكَاهِنِ وَالْكَاهِنُ كَالسَّاحِرِ وَالسَّاحِرُ كَالْكَافِرِ وَالْكَافِرُ فِي النَّارِ" (خطبہ ۷۳) منجم حکم میں مثل کاہن کے ہے اور کاہن مثل ساحر (جادوگر) کے ہے اور ساحر مثل کافر کے ہے اور کافر کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں : "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْوَاصِلِ الْحَمْدَ بِالنِّعَمِ وَالنِّعَمَ بِالشُّكْرِ" (خطبہ ۱۱۳) تمام حمد اس اللہ کیلئے ہے جو حمد کا پیوند نعمتوں سے اور نعمتوں کا سلسلہ شکر سے ملانے والا ہے۔ اسی طرح کا کلام باب حکم میں بھی ہے، ملاحظہ فرمایئے : "اَلظَّفَرُ بِالْحَزْمِ وَالْحَزْمُ بِاِجَالَةِ الرَّاْيِ وَالرَّاْيُ بِتَحْصِيْنِ الْاَسْرَارِ" (حکمت ۴۸) کامیابی دور اندیشی سے وابستہ ہے اور دور اندیشی فکر و تدبر کو کام میں لانے سے اور تدبر بھیدوں کو چھپا کے رکھنے سے ہے، اسی ہی باب سے ہے حضرتؑ کا یہ کلام : "اَلْاِسْلاَمُ هُوَ التَّسْلِيْمُ وَالتَّسْلِيْمُ هُوَ الْيَقِيْنُ وَالْيَقِيْنُ هُوَ التَّصْدِيْقُ وَالتَّصْدِيْقُ هُوَ الْاِقْرَارُ وَالْاِقْرَارُ هُوَ الْاَدَاءُ وَالْاَدَاءُ هُوَ الْعَمَلُ" (حکمت ۱۲۵) اسلام سر تسلیم خم کرنا ہے، سر تسلیم جھکانا یقین ہے، یقین تصدیق، تصدیق اعتراف، اعتراف فرض کی بجا آوری، اور فرض کی بجا آوری کا نام عمل ہے۔

نظم میں بھی یہی چیز ملاحظہ فرمائیں، ابو نواس کہتے ہیں :

خَزِيْمَةُ خَيْرُ بَنِيْ حَازِمٍ وَ حَازِمُ خَيْرُ بَنِيْ دَارِمِ
وَ دَارِمُ خَيْرُ تَمِيْمٍ وَ مَا مِثْلُ تَمِيْمٍ فِيْ بَنِيْ آدَمِ

خزیمہ بنی حازم سے بہتر ہیں، بنی حازم بنی دارم سے افضل ہیں، بنی دارم، بنی تمیم سے بہتر ہیں اور بنی تمیم کی تو بنی

آدم میں مثال ہی نہیں۔

کتاب "زہر الربیع" میں اس نوع کی ایک بہترین روایت درج کی گئی ہے، اور وہ یہ کہ "اصمعی" کہتے ہیں کہ میں ایک دن سخت بارش کے دوران ایک راستے سے گزر رہا تھا تو وہاں پر ایک شخص کو دیکھا جو الٹی پوستین اوڑھے ہوئے بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا "اس اعرابی کے ساتھ مذاق نہ کیا جائے؟"، انہوں نے کہا "کیوں نہیں!" اصمعی نے اس شخص سے کہا" اعرابی! کچھ جانتے بھی ہو کہ کس حالت میں ہو؟" اس نے کہا "نہیں تو!" اصمعی نے کہا:

كَأَنَّكَ كَعْكَعَةٌ فِيْ وَسَطِ رَشٍّ　　أَصَابَ الرَّشَّ رَشٌّ بَعْدَ رَشٍّ

گویا تم زبردست اور تیز موسلادھار بارش میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو۔ یہ سن کر اس نے کہا: "تم بھی جانتے ہو کہ تمہاری کیا کیفیت ہے؟"۔ کہا "نہیں!"۔ اعرابی نے کہا:

كَأَنَّكَ بَعْرَةٌ فِيْ ثَقْبِ كَبْشٍ　　مُدَلْدَلَةٌ وَ ذَاكَ الْكَبْشُ يَمْشِي

گویا تم مینڈھے کے سوراخ میں مینگنی ہو جو لٹک رہی ہو اور مینڈھا چل رہا ہو۔ اصمعی کہتے ہیں کہ: یہ سن کر میں ہنس دیا اور کہا" شائد تمہیں عربوں کے شعر یاد ہیں۔" اس نے کہا: "نہیں بلکہ عربوں نے میرے شعر یاد کئے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا" اپنے کچھ اشعار تو سناؤ۔" اس نے کہا" کس قافیہ میں؟" تو مجھے واو مجزوم کے قافیہ سے بڑھ کر مشکل کوئی اور قافیہ نہیں ملا، لہذا کہا کہ اسی قافیہ میں شعر کہو؛ اس نے کہا:

قَوْمٌ بِخَاقَانَ عَهِدْنَاهُمْ سَقَاهُمُ اللّٰهُ مِنَ النَّوْ

وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں ہم خاقان کے پاس ملے، خدا انہیں پچھتر (بارش والے ستارے) سے سیراب کرے۔ میں نے کہا" نو" (پچھتر) کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

نَوْءُ السِّمَاكَيْنِ وَ رَيَّاهُمَا بَرْقٌ تَرىٰ اِيْمَاضَهُ ضَوْ

دو سماک ستاروں کا پچھتر اور ان کے پانی سے پر بادل تو سراسر تجلی ہیں جس کی چمک نور معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کہا" ضوء" کیا ہے؟ اس نے کہا:

ضَوْءُ تَلَأْلَأَ فِيْ دُجىٰ لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ مَغِيْمَةٍ لَوْ

وہ نور جو ابر آلود تاریک رات کے اندھیروں میں چمکا، اگر............ میں نے کہا" لو" کیا ہے؟ اس نے کہا:

لَو مَرَّ فِيْهَا سَائِرٌ مُدْلَجٌ عَلىٰ هَضِيْمِ الْكَشْحِ مُنْطَوْ

اگر اس رات میں تمام شب چلنے والا کسی لاغر شکم سواری پر چلے جو لپٹی سکڑی ہوئی ہے۔ میں نے کہا" مُنطَوْ" کیا ہے؟ اس نے کہا:

مُنْطَوِى الظَّهْرِ هَضِيْمُ الْحَشَا كَالْبَازِ يَنْقَضُّ مِنَ الْجَوّ

لپٹی سکڑی پشت اور کمر سے لگے پیٹ والی جیسے باز ہوتا ہے جو فضا میں جھپٹ رہا ہو۔ میں نے کہا 'جوّ' کیا ہے؟ اس نے کہا:

فَجَوُّ السَّمَاءِ وَ الرِّيْحُ تَهْوِي بِهٖ مِثْلُ رِجَالِ الْحَيِّ يَدْعُوْ

آسمان کی فضا جہاں پر ہوا اس باز کو نیچے گراتی ہے جو قبیلے کے مردوں کو پکارتا ہے۔ میں نے پوچھا "یدعو" کیا ہے؟ اس نے کہا:

يَدْعُوْا جَمِيْعًا وَ الْقَنَا شُرَّعًا كُيِفْتَ مَا لاَقُوْا وَ يَلْقُوْا

وہ سب کو پکارتا ہے، نیزوں کو بھی جبکہ وہ سیدھے کئے جا چکے ہوں، خدا کرے تم اس مصیبت سے بچے رہو جس سے وہ دوچار ہوتے ہیں اور ہوں گے۔ میں نے کہا "یلقوا" کیا ہے؟ اس نے کہا:

اِنْ كُنْتَ لاَ تَفْهَمُ مَا قُلْتُهٗ فَاِنَّ عِنْدِيْ صَنْعَةُ الْبَوْ

جو کچھ میں نے کہا ہے اگر تو اسے نہیں سمجھتا تو میرے پاس مور ابنانے کا فن بھی ہے۔ میں نے کہا "بو" کیا ہے؟ تو اس نے قبضہ تلوار کو ہاتھ میں لے کر کہا:

اَلبَوْ لاَ يَحْجُبُ عَنْ اُمِّهٖ يَا اَلْفَ قَرْنَانِ تَقُمْ اَوْ

مورا اپنی ماں سے چھپایا نہیں جا سکتا، اے دو دھاری تلوار کے یار! اٹھ اور اپنی راہ لے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا، چار مرغیاں ذبح کر کے انہیں پکایا، جب پک کر تیار ہو گئیں تو اس کے پاس آیا اور کہا "یہ چار مرغیاں ہیں انہیں چار آدمیوں میں تقسیم کرو! میں ہوں تم ہو میری بیوی ہے اور میرا ایک لڑکا ہے"۔ اس نے کہا انہیں جفت، جفت کر کے تقسیم کروں یا طاق، طاق؟ میں نے کہا "جفت کر کے" اس نے کہا "تم ہو، تمہاری بیوی ہے، تمہارا لڑکا ہے اور ایک مرغی ہے۔ یہ سب مل کر چار ہو گئے اور چار جفت ہیں۔ میں ہوں اور یہ تین مرغیاں ہیں جو مل کر چار بنتے ہیں اور یہ بھی جفت ہیں" چنانچہ میں ایک مرغی لے کر آ گیا، اور جب دوسری رات ہوئی تو اس کی طرف تین مرغیاں لے کر گیا اور کہا کہ "میرا ایک اور لڑکا بھی آ گیا ہے لہذا ان مرغیوں کو طاق طاق کر کے تقسیم کرو" اس نے کہا "ٹھیک ہے تمہارے دونوں لڑکے، ان کی ماں اور تم چار ہو اور یہ پانچویں مرغی ہے یہ سب مل کر طاق بنتے ہیں، جبکہ میں اور دو مرغیاں مل کر تین بنتے ہیں اور یہ بھی طاق ہے، لہذا لے جاؤ ایک مرغی! چنانچہ میں ایک مرغی لے کر چلتا بنا۔ جب تیسری رات آئی تو اس کے پاس ایک مرغی لے کر آیا کہ اسے تقسیم کرے۔ اس نے کہا اس کے دونوں پر تمہارے دونوں پروں (لڑکوں) کیلئے ہیں اور عجز (اس کا پچھلا حصہ) عجوز (بوڑھیا) کیلئے ہے اور سر، سردار کیلئے ہے اور وہ آپ ہیں اور صدر (سینہ) صدر مجلس کے (میرے) لئے ہے۔ جب اس کی واپسی کا وقت ہوا تو میں اسے چھوڑنے کیلئے باہر تک گیا۔ اس نے کہا "اب واپس لوٹ جاؤ اور جو کچھ میں نے اپنی جگہ پر چھوڑا ہے اسے لے لو وہ تمہارے لئے ہی ہے۔" میں واپس آ گیا اور اس کی جگہ پر دیکھا تو بہت سارے دینار موجود تھے، جو میں نے لے لئے۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ وہ شخص حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔

عکس

عکس یہ ہوتا ہے کہ کلام میں ایک جزء کو مقدم اور دوسری کو مؤخر کر دیا جائے، پھر اس کا عکس لاتے ہوئے مؤخر کو مقدم اور

مقدم کو مؤخر کیا جائے۔ اسے "تبدیل" بھی کہتے ہیں۔ اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک جزء جملہ کی دونوں طرفوں میں سے ایک میں واقع ہو اور اسے دوسری جزء کی طرف مضاف کر دیا جائے اور دوسرے جملہ میں اس طرح کا عکس کر دیا جائے، مثلاً کہتے ہیں: "عَادَاتُ السَّادَاتِ، سَادَاتُ الْعَادَاتِ" سرداروں کی عادتیں ،عادتوں کی سردار ہوتی ہیں۔ "اَوْصَافُ الْاَشْرَافِ ،اَشْرَافُ الْاَوْصَافِ" شریفوں کی صفات، شریف ترین صفات ہوتی ہیں۔ "كُتُبُ الْاَحْبَابِ ،اَحْبَابُ الْكُتُبِ" دوستوں کے خطوط، محبوب ترین خطوط ہوتے ہیں۔ "شِيَمُ الْاَحْرَارِ ،اَحْرَارُ الشِّيَمِ" شریفوں کی عادتیں، شریف ترین عادتیں ہوتی ہیں۔ "كَلَامُ الْمُلُوْكِ،مُلُوْكُ الْكَلَامِ" بادشاہوں کے کلام، کلاموں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو مثلاً "عادات" کا لفظ جملہ کا ایک حصہ ہے جو اس کے دوسرے حصہ "سادات" کی طرف مضاف ہے اور وہ اس کا مضاف الیہ ہے اور پھر ان کے درمیان عکس کی صورت پیدا کر کے "سادات" کو "عادات" پر مقدم کر دیا گیا ہے اسی طرح باقی مثالوں کی صورت حال ہے۔

۲۔ عکس ایک فعل کے دو متعلقین کے درمیان واقع ہوتا ہے، جیسا کہ امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے: "مَالِيَ اَرَاكُمْ اَشْبَاحًا بِلاَ اَرْوَاحٍ وَاَرْوَاحًا بِلاَ اَشْبَاحٍ" (خطبہ ۱۰۷) لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ پیکر بے روح اور روح بے قالب بنے ہوئے ہو یا ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "تَرَى الْمَرْحُوْمَ مَغْبُوْطًا وَالْمَغْبُوْطَ مَرْحُوْمًا" (خطبہ ۱۱۳) تم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہو جسکی حالت قابل رحم ہوتی ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس پر رشک کھایا جائے اور قابل رشک آدمی کو دیکھتے ہو کہ چند ہی دنوں میں اسکی حالت پر ترس آجاتا ہے۔

۳۔ دو جملوں کے دو عاملوں کے درمیان عکس واقع ہوتا ہے، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ" (سورہ روم / ۱۹) وہ خدا زندوں کو مردہ سے اور مردوں کو زندہ سے نکالتا ہے۔ "وَ يُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" (سورہ حج / ۶۱) اللہ تعالی رات کو دن میں اور دن کو رات میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں امیر المؤمنین کا کلام ہے: "فَسُبْحَانَ اللهِ مَااَقْرَبَ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ لِلَحَاقِهِ بِهِ وَاَبْعَدَالْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ لِانْقِطَاعِهِ عَنْهُ" (خطبہ ۱۱۳) سبحان اللہ زندہ مردوں سے انہی میں مل جانے کی وجہ سے کتنا قریب ہے اور مردہ زندوں سے تمام تعلق ٹوٹ جانے کی وجہ سے کس قدر دور ہے۔ یہاں پر 'حی' اور 'میت' دونوں 'اقرب' اور 'ابعد' سے متعلق ہیں پہلے حی کو میت پر پھر میت کو حی پر مقدم کیا گیا ہے۔

۴۔ دو فعلوں کے دونوں متعلقین کے درمیان عکس واقع ہوتا ہے اور ان دونوں متعلقین کے وسط میں فعل ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں "فَبِالْاِيْمَانِ يُسْتَدَلُّ عَلَى الصَّالِحَاتِ وَبِالصَّالِحَاتِ يُسْتَدَلُّ عَلَى الْاِيْمَانِ" (خطبہ ۱۵۵) ایمان سے نیکیوں پر استدلال کیا جاتا ہے اور نیکیوں سے ایمان پر دلیل لائی جاتی ہے۔

۵۔ جملہ کے دونوں طرفوں میں دو لفظوں کے درمیان عکس واقع ہوتا ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے: "لاَ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ

لاَ هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ "(ممتحنہ / ۱۰) نہ تو وہ (عورتیں) کفار کیلئے حلال ہیں اور نہ ہی کفار ان کیلئے حلال ہیں۔ پہلے "هُنَّ" کو "هُمْ" پر مقدم کیا گیا ہے اور بعد میں "هُمْ" کو "هُنَّ" پر۔ اور یہ دونوں الفاظ ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک جملہ کی ایک جانب واقع ہوا ہے، ایک مسند الیہ کی جانب میں اور دوسرا مسند کی جانب میں۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے: "فَاِنْ اَصَابَ خَافَ اَنْ يَكُوْنَ قَدْ اَخْطَأَ وَ اِنْ اَخْطَأَ رَجَا اَنْ يَكُوْنَ قَدْ اَصَابَ "(خطبہ ۱۷) اگر صحیح بات بھی کہی ہو تو اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں غلط نہ ہو اور غلط جواب ہو تو اسے یہ توقع رہتی ہے کہ شاید یہ صحیح ہو۔ یہاں پر "اصاب" اور "اخطأ" دونوں فعل ہیں جن میں سے ایک شرط کی جانب میں اور دوسرا اجزا کی جانب میں واقع ہوا ہے اور پھر عکس کی صورت اختیار کی ہے۔

۶۔ عکس، دو جملوں کے درمیان دو قرینوں کے اطراف میں واقع ہوتا ہے، جیسا کہ امیر المؤمنینؑ کا ارشاد ہے: "اَوْحَشُوْا مَا كَانُوْا يُوْطِنُوْنَ وَ اَوْطَنُوْا مَا كَانُوْا يُوْحِشُوْنَ "(خطبہ ۱۸۷) جسے وطن بنایا تھا اسے سنسان چھوڑ گئے اور جس سے وحشت کھایا کرتے تھے وہاں اب جا کر سکونت اختیار کرنی پڑے گی۔

۷۔ عکس، جملہ کے دونوں اطراف میں واقع ہوتا ہے، جیسے لوگ کہتے ہیں "اَلْجُنُوْنُ فُنُوْنٌ وَ الْفُنُوْنُ جُنُوْنٌ" دیوانگی کے فنون ہیں اور فنون بھی دیوانگی کا نام ہے۔ جیسا کہ تفتازانی کہتے ہیں:

طَوَيْتُ بِاِحْرَازِ الْفُنُوْنِ وَ نَيْلِهَا ۔۔۔ رِدَاءَ شَبَابِي وَ الْجُنُوْنُ فُنُوْنٌ
فَلَمَّا تَعَاطَيْتُ الْفُنُوْنَ وَ حَظَّهَا ۔۔۔ تَبَيَّنَ لِيْ اَنَّ الْفُنُوْنَ جُنُوْنٌ

میں نے فنون کے حصول اور ان کی حفاظت کیلئے اپنی جوانی کی چادر لپیٹ لی ہے، جبکہ دیوانگی کے کئی شعبے ہیں تو جب میں نے تمام فنون اور ان کے مفادات کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا تو پتہ چلا کہ فنون بذات خود دیوانگی ہیں۔ اسی طرح عکس کی ایک اور مثال ابی ہلال عسکری کے اشعار میں ہے جن میں وہ بہار کا گیت گاتے ہوئے کہتے ہیں:

لَبِسَ الْمَآءُ وَ الْهَوَآءُ صَفَاءً ۔۔۔ وَ اكْتَسَى الرَّوْضُ بَهْجَةً وَ بَهَاءً
فَتَخَالُ السَّمَآءَ بِاللَّيْلِ اَرْضًا ۔۔۔ وَ تَرَى الْاَرْضَ فِي النَّهَارِ سَمَآءً

آب و ہوا نے صفائی کا لباس پہن لیا اور گلستانوں اور چمنزاروں نے شادابی اور خوبصورتی کی چادر اوڑھ لی، اگر آپ اس منظر کو دیکھیں تو یہ گمان کرنے لگیں کہ آسمان رات کو زمین ہے اور زمین دن کو آسمان ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے

فَلاَ مَجْدَ فِي الدُّنْيَا لِمَنْ قَلَّ مَالُهٗ ۔۔۔ وَلاَ مَالَ فِيْ الدُّنْيَا لِمَنْ قَلَّ مَجْدُهٗ

دنیا میں جس کے پاس مال نہیں اس کے پاس عزت نہیں اور جس کے پاس عزت نہیں اس کے پاس مال نہیں۔ ایک اور شاعر کہتا ہے:

قَدْ يَجْمَعُ الْمَالَ غَيْرُ آكِلِهٖ ۔۔۔ وَ يَاكُلُ الْمَالَ غَيْرُ مَنْ جَمَعَهٗ
وَ يَقْطَعُ الثَّوْبَ غَيْرُ لاَبِسِهٖ ۔۔۔ وَ يَلْبَسُ الثَّوْبَ غَيْرُ مَنْ قَطَعَهٗ

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مال کو وہ شخص جمع کرتا ہے جو کھا نہیں سکتا اور اسے کھا وہ جاتا ہے جس نے اسے جمع نہیں کیا ہوتا، اسی طرح کپڑے کو وہ شخص کاٹتا ہے جو اسے پہنتا نہیں اور پہنتا وہ ہے جس نے اسے کاٹا نہیں ہوتا۔

رد عجز

رد عجز علی الصدر: یہ ہوتا ہے کہ "ایسا کلام لایا جائے جس کا آخر اس کے اول کے ساتھ چند وجوہ کے لحاظ سے ملتا ہو، کلام خواہ نظم ہو یا نثر"۔ اس کی چار قسمیں ہیں وہ یوں کہ جو دو الفاظ فقرے کے اول اور آخر میں آرہے ہیں یا تو مفرد یعنی لفظی اور معنوی طور پر متفق ہوں گے یا متجانس یعنی لفظی طور پر تو مشابہ ہوں گے لیکن معنی کے لحاظ سے نہیں۔ یا متجانس سے ملحق ہوں گے یعنی جن کا جامع اشتقاق یا شبہ اشتقاق ہوگا۔

۱۔ جب دونوں الفاظ مکرر ہوں، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے۔ " وَتَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰيهُ "(سورہ احزاب / ۳۷) تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس سے ڈرو

۲۔ جب دونوں متجانس ہوں، جیسے کہتے ہیں " سَائِلُ اللَّئِيْمِ يَرْجِعُ وَدَمْعُهٗ سَائِلٌ " کمینے سے سوال کرنے والا اسی حالت میں لوٹتا ہے کہ اس کے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔

۳۔ جب دونوں کا جامع، اشتقاق ہو، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: " اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا "(سورہ نوح / ۱۰) اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو کہ وہ بہت بخشنے والا ہے۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا کلام ہے: " وَ اَسْتَهْدِهِ قَرِيْبًا هَادِيًا " (خطبہ ۸۲) اسی سے ہدایت چاہتا ہوں چونکہ وہ قریب تر اور ہادی ہے۔ ایک اور مقام پر اسی طرح کا فرمان ہے: " وَ كَيْفَ غَفْلَتُكُمْ عَمَّا لَيْسَ يُغْفِلُكُمْ " (خطبہ ۱۸۷) آخر کیونکر تم اس سے غفلت میں پڑے ہوئے ہو جو تم سے غافل نہیں۔ اسی خطبہ میں ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں " حُمِلُوْا اِلٰى قُبُوْرِهِمْ غَيْرَ رَاكِبِيْنَ وَ اُنْزِلُوْا فِيْهَا غَيْرَ نَازِلِيْنَ " (خطبہ ۱۸۷) انہیں کاندھوں پر لاد کر قبروں کی طرف لے جایا گیا حالانکہ وہ خود سوار نہیں ہو سکتے، انہیں قبروں میں اتار دیا گیا جبکہ وہ خود اترنے پر قادر نہ تھے۔

۴۔ جب دونوں کا جامع، شبہ اشتقاق ہو، جیسے قرآن مجید میں ہے: " قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِيْنَ "(سورہ شعراء / ۱۶۸) جناب لوطؑ نے کہا میں تو بہر حال تمہارے اعمال کا دشمن ہوں۔

قول مصنفؒ: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ایک پانچویں قسم کو بھی ملایا جائے، اور وہ یہ کہ دو مکرر لفظوں میں سے ایک اول کلام سے زیادہ قریب ہو اور دوسرا آخر کلام سے جیسا کہ حضرت امیرؑ کا ایک کلام نہج البلاغہ کے باب الحکم (حکمت ۳۸۱) میں ہے " اَلْكَلَامُ فِيْ وِثَاقِكَ مَالَمْ تَتَكَلَّمْ بِهٖ فَاِذَا تَكَلَّمْتَ بِهٖ صِرْتَ فِيْ وِثَاقِهٖ " کلام تمہاری قید و بند میں ہے جب تک تم نے اسے کہا نہیں اور اگر کہہ دیا تو تم اس کی قید و بند میں ہو۔

قول مترجم: یہاں پر نظم کے متعلق بھی اسی طرح کی اقسام کو بیان کیا گیا ہے جنہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

رجوع

رجوع یہ ہوتا ہے کہ " کلام سابق کی طرف کسی نکتے کی بنا پر پلٹا کھایا جائے اسے نقض یا باطل کرنے کیلئے " لیکن اس سے یہ

مراد نہیں کہ متکلم نے کوئی غلطی کی ہوتی ہے پھر اس کی تصحیح کر رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا رجوع "غلط" ہوتا ہے "بدیع" نہیں ہوتا۔ بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کی خطاؤں پر مطلع کیا جاتا ہے اور ایسا عمداً کیا جاتا ہے اور دوسرے کلام میں ان خطاؤں کی تصحیح مقصود ہوتی ہے۔ کیونکہ جس بات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اس کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: "فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ وَمَرَقَتْ اُخْرىٰ وَ قَسَطَ اٰخَرُوْنَ كَاَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوْا كَلَامَ اللّٰهِ حَيْثُ يَقُوْلُ "تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَايُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" بَلىٰ وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعُوْهَا وَ وَعَوْهَا وَ لٰكِنَّهُمْ حَلِيَتِ الدُّنْيَا فِي اَعْيُنِهِمْ وَ رَاقَهُمْ زِبْرِجُهَا" (خطبہ ۳) مگر اس کے باوجود جب میں امر خلافت کو لیکر اٹھا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ ڈالی، دوسرا دین سے نکل گیا اور تیسرے گروہ نے فسق اختیار کر لیا گویا انہوں نے اللہ کا یہ ارشاد سنا ہی نہیں تھا کہ "یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کیلئے قرار دیا ہے جو نہ دنیا میں بے جا بلندی چاہتے ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا انجام پرہیزگاروں کیلئے ہے" ہاں ہاں خدا کی قسم! ان لوگوں نے اس کو سنا تھا اور یاد کیا تھا لیکن ان کی آنکھوں میں دنیا کا جمال کھب گیا تھا اور اس کی سج دھج نے انہیں لبھا دیا تھا۔ کیونکہ جب آپ نے ناکثین (اصحاب جمل)، قاسطین (اہل شام) اور مارقین (خوارج) کی بغاوت کی طرف اشارہ کیا تو اس کے بعد فرمایا گویا ان لوگوں نے خدا کا یہ کلام نہیں سنا "تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ........." اور یہ اس بات کی تنبیہ ہے کہ اس آیت کا سننا لازم اور اس میں غور و فکر کرنا ضروری ہے کہ اگر غور و فکر کرتے تو نہ تو بغاوت کرتے اور نہ ہی زمین میں فساد برپا کرتے۔ چونکہ انہوں نے بغاوت اور فساد کو ترک نہیں کیا لہذا یہ ایسا ہے جیسے انہوں نے اسے سنا ہی نہیں۔ پھر اپنے کلام سے رجوع کر کے ایک خاص نکتے کی وجہ سے اپنے اس کلام کو نقض کرتے ہیں اور ان کے نہ سننے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہاں خدا! انہوں نے سنا بھی ہے اور اس کو یاد بھی کیا ہے، اسم جلالہ کی قسم کھا کر اس بات کی تاکید کر رہے ہیں کہ سننے اور یاد کرنے کے بعد بھی انہوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور یہ بات زور دے کر کہہ رہے ہیں کہ ان کے اس آیت سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ ان کا دنیا و مافیہا کے فتنوں میں گرفتار ہو جانا اور اس کی رنگینیوں اور دلفریبیوں کے دھوکے میں آجانا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت بڑی رسوائی اور عذاب عظیم کے مستحق ہو گئے ہیں۔

ارصاد

"ارصاد" کا لفظ "رصد" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "گھات لگانا" کیونکہ اس قسم کے کلام میں جب سامع کلام کا پہلا حصہ سنتا ہے تو اس کا ذہن کلام کے آخری حصہ کی تاک میں ہوتا ہے کہ اس کی آخر کلام کیلئے کس قسم کی دلالت ہوتی ہے اور اس کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ: "نثر کے کسی فقرہ یا شعر کے کسی بیت کو اختتام تک پہنچانے سے پہلے کوئی ایسا کلمہ ذکر کیا جائے جو فقرے یا بیت کے آخر پر دلالت کرے"۔ اور ایسا کسی کلمہ کی تکرار کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور اس کا دوسرا نام "تسهیم" بھی ہے جو "بُرد مسهم" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے دھاری دار چادر، چونکہ چادر کے مختلف رنگ لکیروں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ہر رنگ اس

بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے یا بعد میں کوئی دوسرا رنگ ہو، بہر صورت نثر میں اس کی مثال قرآن مجید میں ہے، ارشاد قدرت ہے "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ" (سورہ عنکبوت / ۴۰) اللہ ہرگز ان پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا کلام ہے، ارشاد ہوتا ہے "وَاَجْرٰهَا (الكَوَاكِب) عَلٰى اَذْلَالِ تَسْخِيْرِهَا مِنْ ثَبَاتِ ثَابِتِهَا وَمَسِيْرِ سَائِرِهَا وَهُبُوْطِهَا وَصُعُوْدِهَا وَنُحُوْسِهَا وَ سُعُوْدِهَا" (خطبہ ۹۰) اور ستاروں کو جبر و قہر سے ان کے ڈھرے پر لگایا کہ کوئی ثابت رہے اور کوئی سیار، کبھی اتار ہو اور کبھی ابھار اور کسی میں نحوست ہو کسی میں سعادت جبکہ نظم میں اس کی مثال بختری کا قول ہے :

اَحَلَّتْ دَمِي مِنْ غَيْرِ جُرْمٍ وَ حَرَّمَتْ بِلاَ سَبَبٍ يَوْمَ اللِّقَاءِ كَلاَمِي

فَلَيْسَ الَّذِي حَلَّلْتِهِ بِمُحَلَّلٍ وَ لَيْسَ الَّذِي حَرَّمْتِهِ بِحَرَامِ

اس (محبوبہ) نے میرے خون کو بغیر کسی جرم کے حلال قرار دے دیا اور ملاقات کے دن کسی وجہ کے بغیر میرے ساتھ بولنے کو حرام قرار دے دیا، تو (اے محبوبہ!) تو نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہے در حقیقت وہ مباح اور حلال نہیں ہے اور جس چیز کو حرام قرار دیا ہے در حقیقت وہ حرام نہیں ہے۔ اسی طرح ابن ہانی اندلسی کہتے ہیں :

وَ اِذَا حَلَلْتَ فَكُلُّ وَادٍ مُمْرِعٌ وَ اِذَا ظَعَنْتَ فَكُلُّ شِعْبٍ مَاحِلٌ

وَ اِذَا بَعُدْتَ فَكُلُّ شَيْءٍ نَاقِصٌ وَ اِذَا قَرُبْتَ فَكُلُّ شَيْءٍ كَامِلٌ

اور جب تم کسی وادی میں فروکش ہو جاتے ہو تو سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور جب وہاں سے رخت سفر باندھ لیتے ہو تو ہر گھاٹی قحط زدہ بن جاتی ہے۔ جب کسی چیز سے دور ہو جاتے ہو تو وہ ناقص ہو جاتی ہے اور جب کسی کے قریب ہو جاتے ہو تو وہ کامل بن جاتی ہے۔

بیان مثل

مثل ایسی عبارت ہوتی ہے جسے متکلم اپنے کلام میں اور شاعر اپنے بیت میں ضرب المثل کے عنوان سے ذکر کرتا ہے، جس سے حسن تمثیل مقصود ہوتی ہے خواہ وہ کوئی صفت ہو یا حکمت یا کوئی اور چیز۔ ضرب المثل سے مقصود حقائق سے اس انداز میں پردہ اٹھانا ہوتا ہے کہ جس سے خیالی چیزیں حقیقت کا اور وہمی چیزیں یقین کا روپ دھار لیتی ہیں۔ غائب گویا حاضر ہوتا ہے، سرسخت مخالف کے بھی آنسو نکل آتے ہیں اور سرکشوں کی سرمستیوں کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین یعنی قرآن حکیم اور دوسری آسمانی کتابوں میں امثال کو بہت حد تک بیان کیا ہے۔ اسی طرح حضرت پیغمبر خداؐ، انبیاء علیہم السلام اور حکماء کے اقوال بھی اسی قسم کی ضرب الامثال سے بھرے پڑے ہیں۔ قرآن پاک اس بارے میں کہتا ہے : "وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَا اِلاَّ الْعَالِمُوْنَ" (سورہ عنکبوت / ۴۳) ہم لوگوں کو سمجھانے کیلئے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہل علم کے سوا کوئی انہیں نہیں سمجھتا۔ بلکہ انجیل میں تو "سورۃ الامثال" کے عنوان سے ایک مستقل سورہ موجود ہے۔ چونکہ ضرب الامثال سے غرض کسی خاص مقصد کو لطیف پیرائے میں بیان کرنا ہوتا ہے لہذا ان کی حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور اسے کسی قسم کے تغیر و تبدل اور

دستبرد سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

جب یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو چکی تو اب ہم آتے ہیں اس کے بیان کی طرف چنانچہ اس قسم کی مثالیں نظم و نثر دونوں میں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں، نثر میں قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ضرب الامثال پر مشتمل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ "كُلُّ نَفْسٍ بِمَاكَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ" (مدثر / ۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کیلئے گروی ہے۔

۲۔ "مَاعَلَى الرَّسُوْلِ الَّاالْبَلاَغُ" (عنکبوت / ۱۸) اور رسول پر تو واضح ابلاغ کے سوا کچھ اور فرض نہیں ہے

۳۔ "مَاعَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ" (توبہ / ۹۱) نیکوکار لوگوں سے سزا اور مؤاخذہ کی کوئی راہ نہیں ہے۔

۴۔ "كُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ" (روم / ۳۲) ہر گروہ اسی سے خوش ہے جو کچھ اس کے پاس ہے۔

۵۔ "لاَ يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ" (مائدہ / ۱۰۰) پاک و ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۶۔ "لاَ يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلاَّ بِاَهْلِهٖ" (فاطر / ۴۳) بری چالبازیاں صرف اپنے چلانے والوں کا ہی دامن پکڑتی ہیں۔

۷۔ "هَلْ جَزَاءُ الاِحْسَانِ اِلاَّالاِحْسَانُ" (رحمٰن / ۶۰) کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

اس سلسلہ میں احادیث نبویؐ ملاحظہ ہوں:

۱۔ "خَيْرُ الْأُمُوْرِ اَوْسَطُهَا" بہترین امور، درمیانہ امور ہی ہوتے ہیں۔

۲۔ "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" انسان اس کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ محبت کرتا ہے

۳۔ "اَلشَّاهِدُ يَرىٰ مَا لاَ يَرَاهُ الْغَائِبُ" حاضر وہ چیز دیکھتا ہے جو غائب نہیں دیکھتا۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔

اب ملاحظہ فرمایئے کلام امیر المؤمنینؑ:

۱۔ "فَصَبَرْتُ وَ فِي الْعَيْنِ قَذًى" (خطبہ ۳) مجھے اس اندھیر پر صبر ہی قرین عقل نظر آیا جبکہ آنکھوں میں تنکے پڑے ہوئے تھے۔

۲۔ "فَاَنْتُمْ غَرَضٌ لِنَابِلٍ وَ اَكَلَةٌ لِآكِلٍ وَ فَرِيْصَةٌ لِصَائِلٍ" (خطبہ ۱۴) تم ہر تیر انداز کا نشانہ، ہر کھانے والے کا لقمہ اور ہر شکاری کی صید افگنیوں کا شکار ہو۔

۳۔ "لٰكِنَّهُ لاَرَأْيَ لِمَنْ لاَيُطَاعُ" (خطبہ ۲) لیکن اس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔

۴۔ "وَ الَّذِي نَصَرَهُمْ وَ هُمْ قَلِيْلٌ لاَ يَنْتَصِرُوْنَ وَ مَنَعَهُمْ وَ هُمْ قَلِيْلٌ لاَ يَمْتَنِعُوْنَ حَيٌّ لاَ يَمُوْتُ" (خطبہ ۱۳۴) جس نے اس وقت ان کی تائید و نصرت کی تھی جبکہ وہ کم تعداد میں تھے کہ وہ دشمن سے انتقام لے سکیں اور انہیں ان سے روکے رکھا جبکہ وہ کم تعداد میں تھے کہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے تھے۔ وہی زندہ ہے جسے موت نہیں۔

۵۔ "مَنْ صَارَعَ الْحَقَّ صَرَعَه'" (حکمت ۴۰۸) جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔

۶۔ "تَكَلَّمُوْا تُعْرَفُوْا فَاِنَّ الْمَرْءَ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِهٖ" (حکمت ۳۹۲) بات کرو تاکہ پہچانے جاؤ کیونکہ آدمی اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔

۷۔ "اَلْغَالِبُ بِالشَّرِّ مَغْلُوْبٌ" (حکمت ۳۲۷) شر کے ذریعہ غلبہ پانے والا حقیقۃً مغلوب ہے۔

۸۔ "مَوَدَّةُ الآبَاءِ قَرَابَةٌ بَيْنَ الاَبْنَاءِ" (حکمت ۳۰۸) باپوں کی باہمی محبت اولاد کے درمیان ایک قرابت ہوا کرتی ہے۔

۹۔ "قِلَّةُ الْعِيَالِ اَحَدُ الْيَسَارَيْنِ" (حکمت ۱۴۱) متعلقین کی کمی دو قسموں میں سے ایک قسم کی آسودگی ہے۔

۱۰۔ "قِيْمَةُ كُلِّ امْرِءٍ مَا يُحْسِنُه'" (حکمت ۸۱) ہر شخص کی قیمت وہ ہنر ہے جو اس شخص میں ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ضرب الامثال ہیں جو غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

رہی نظم کی بات، تو اس سلسلہ میں امراءالقیس کندی کا شعر ملاحظہ ہو؛

اِذِ الْمَرْءُ لَمْ يَخْزُنْ عَلَيْهِ لِسَانَه'   فَلَيْسَ عَلىٰ شَيْءٍ سِوَاهُ بِخَازِنِ

جب انسان اپنی زبان کو بولنے سے قابو نہیں رکھ سکتا تو پھر وہ کسی چیز پر بھی قابو نہیں رکھ سکتا۔ نیز اس بارے میں عدی بن زید عبادی کا شعر ہے؛

كَفىٰ وَاعِظًا بِالْمَرْءِ اَيَّامُ دَهْرِهٖ   تَرُوْحُ لَه'بِالْوَاعِظَاتِ وَ تَغْتَدِيْ

عَنِ الْمَرْءِ لَاتَسْئَلْ وَ اسْئَلْ عَنْ قَرِيْنِهٖ   فَاِنَّ الْقَرِيْنَ بِالْمُقَارِنِ مُقْتَدِيْ

وَ ظُلْمُ ذَوِي الْقُرْبىٰ اَشَدُّ مَضَاضَةً   عَلَى الْحُرِّ مِنْ وَقْعِ الْحِسَامِ الْمُهَنَّدِ

آدمی کیلئے اس کے زمانے کے دن وعظ و نصیحت کیلئے کافی ہوتے ہیں جو ہر صبح و شام نصیحت والی چیزیں لیکر اس کے پاس آتے ہیں (بے شک) کسی شخص کے بارے میں نہ پوچھ بلکہ اس کے ساتھی کے بارے میں پوچھ لے کیونکہ ہر شخص اپنے ساتھی کے نقش قدم پر چلتا ہے، شریف اور آزاد آدمی کیلئے قریبی رشتہ داروں کا ظلم فولادی تلوار کے وار سے زیادہ المناک ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے شعراء کے کلام میں اس قسم کی امثال موجود ہیں۔

جمع

جمع سے مراد یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں دو یا دو سے زیادہ مختلف چیزوں کو ایک ہی حکم کے تحت بیان کرے اور ان میں ایک ایسی جہت پائی جائے جو ان کو جمع کرے، جیسا کہ حضرت امیرؑ کا قول ہے: "اِنَّ الْمَالَ وَ الْبَنِيْنَ حَرْثُ الدُّنْيَا وَ الْعَمَلَ الصَّالِحَ حَرْثُ الآخِرَةِ" (خطبہ ۲۳) بے شک مال اور اولاد دنیا کی کھیتی اور عمل صالح آخرت کی کشت زار ہے۔ یہاں پر مال اور اولاد

کو ایک جگہ پر جمع کیا گیا ہے حالانکہ یہ دونوں علیحدہ چیزیں ہیں لیکن ان میں ایک قدر مشترک ایسی پائی جاتی ہے جو ان کو متحد کر رہی ہے اور وہ ہے "کھیتی"۔ اسی طرح نظم میں سید علی صدر الدین کا قول ہے ؛

اِنَّ الْمَكَارِمَ وَ الْفَضَائِلَ وَ النَّدٰی طَبْعٌ جُبِلْتَ عَلَيْهِ غَيْرَ تَطَبُّعٖ

وَ الْمَجْدُ وَ الشَّرَفُ الْمُؤَمَّلُ وَ الْعُلٰی وَقْفٌ عَلَيْكَ وَ لَيْسَ بِالْمُسْتَوْدَعٖ

کریمانہ خصائل اور شریفانہ فضائل اسی طرح جود اور سخا تیری فطری صفات ہیں۔ جو تجھ میں پیدا کی گئی ہیں اور یہ کوئی بناوٹی نہیں ہیں جنہیں اپنایا گیا ہو۔ بزرگی، آرزو کے مطابق حاصل شدہ شرف اور بلندی مرتبہ سب تیرے ہی لئے وقف ہیں۔ جو ہمیشہ کے لئے ہیں اور عارضی نہیں ہیں۔

تفریق

یہ جمع کی ضد ہے، یعنی دو امروں میں ایک ہی قسم کا تباین ذکر کیا جائے چاہے مدح کے طور پر ہو یا کسی اور طریقہ پر، نثر میں اس کی مثال حضرت امیر علیہ اسلام کا فرمان ہے : "صَاحِبُكُمْ يُطِيْعُ اللّٰهَ وَاَنْتُمْ تَعْصُوْنَهٗ وَ صَاحِبُ اَهْلِ الشَّامِ يَعْصِى اللّٰهَ وَ هُمْ يُطِيْعُوْنَهٗ" (خطبہ ۹۶) تمہارا حاکم اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور تم اس کی نافرمانی کرتے ہو اور اہل شام کا حاکم اللہ کی نافرمانی کرتا ہے مگر وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں : "غَيْرَةُ الْمَرْاَةِ كُفْرٌ وَ غَيْرَةُ الرَّجُلِ اِيْمَانٌ" (حکمت ۱۲۴) عورت کا غیرت کرنا کفر ہے اور مرد کا غیور ہونا ایمان ہے۔ اسی طرح نظم میں رشید وطواط کا شعر ہے ؛

مَا نَوَالُ الْغَمَامِ وَقْتَ الرَّبِيْعِ كَنَوَالِ الْاَمِيْرِ يَوْمَ سَخَاءٍ

فَنَوَالُ الْاَمِيْرِ بَدْرَةُ عَيْنٍ وَ نَوَالُ الْغَمَامِ قَطْرَةُ مَاءٍ

بہار کے موسم میں بادل کی بخشش، امیر کے سخاوت کے دن کی مانند نہیں ہے، اس لئے کہ امیر کا عطیہ سونے کی تھیلی ہوتا ہے جبکہ بادل کی سخاوت صرف پانی کا ایک قطرہ۔ ادیب یعقوب نیشاپوری کہتے ہیں ؛

رَاَيْتُ عُبَيْدَاللّٰهِ يَضْحَكُ مُعْطِيًا وَ يَبْكِيْ اَخُوْهُ الْغَيْثُ عِنْدَ عَطَائِهٖ

وَ كَمْ بَيْنَ ضَحَّاكٍ يَجُوْدُ بِمَا لِهٖ وَ آخَرَ بَكَّاءٍ يَجُوْدُ بِمَائِهٖ

میں (اپنے ممدوح) عبید اللہ کو دیکھتا ہوں کہ وہ ہنس ہنس کر عطا کرتا ہے، جبکہ اس کا برادر (وصفی) ابر باراں کی طرح رو رو کر عطا کرتا ہے۔ کس قدر عظیم فرق ہے ان دونوں کے درمیان ؛ کہ ایک تو مال کی سخاوت ہنس ہنس کر دیتا ہے اور دوسرا پانی کی سخاوت بھی رو رو کر کرتا ہے۔

جمع مع تفریق

متکلم اپنے کلام میں پہلے تو دو چیزوں کو ایک معنی میں لاتا ہے پھر ان کی دونوں جہات کو مختلف معانی میں تقسیم کر دیتا ہے، نثر میں اس کی مثال امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ کلام ہے : "حَتّٰى يَقُوْمَ الْبَاكِيَانِ يَبْكِيَانِ ۔ بَاكٍ يَبْكِيْ لِدِيْنِهٖ وَ بَاكٍ يَبْكِيْ

لِدُنْيَاهُ" (خطبہ ۹۷)اور یہاں تک کہ دو قسم کے رونے والے کھڑے ہو جائیں گے، ایک دین کیلئے رونے والا اور ایک دنیا کیلئے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "وَ سَيَهْلِكُ فِيَّ صِنْفَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ يَذْهَبُ بِهِ الْحُبُّ اِلَى غَيْرِ الْحَقِّ وَ مُبْغِضٌ مُفْرِطٌ يَذْهَبُ بِهِ الْبُغْضُ اِلَى غَيْرِ الْحَقِّ" (خطبہ ۱۲۷) میرے بارے میں دو قسم کے لوگ تباہ و برباد ہوں گے ایک حد سے زیادہ چاہنے والے جنہیں محبت کی افراط غلط راستے پر لگا دے گی اور ایک میرے مرتبہ میں کمی کر کے دشمنی رکھنے والے کہ جنہیں یہ عناد حق سے بے راہ کر دے گا۔ یہاں پر ہلاکت میں دونوں اصناف کو جمع کیا ہے پھر ہلاکت کی جہت کو بیان کرتے ہوئے ان کے درمیان فرق کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح باب الحکم میں بھی ارشاد فرماتے ہیں: "هَلَكَ فِيَّ رَجُلاَنِ مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٌ قَالٍ" (حکمت ۱۱۷) میرے بارے میں دو قسم کے لوگ تباہ و برباد ہوئے، ایک وہ چاہنے والا جو حد سے بڑھ جائے اور دوسرا وہ دشمنی رکھنے والا جو عداوت رکھے۔

نظم میں رشید وطواط کا شعر ہے؛

فَوَجْهُكِ كَالنَّارِ فِيْ ضَوْئِهَا وَ قَلْبِيْ كَالنَّارِ فِيْ حَرِّهَا

تمہارا چہرہ روشنی میں آگ جیسا ہے اور میرا دل گرمی میں آگ کی مانند ہے۔ اسی طرح سید علی صدر الدین کہتے ہیں؛

مَابَيْنَ قَلْبِيْ وَ بَرْقِ الْمُنْحَنِيْ نَسَبٌ كِلاَهُمَا مِنْ سَعِيْرِ الْوَجْدِ يَلْتَهِبُ

قَلْبِيْ لِمَا فَاتَهُ مِنْ وَصْلِ سَاكِنِهِ وَ البَرْقُ اِذْفَاتَهُ مِنْ ثَغْرَةِ الشَّنَبِ

میرے دل اور وادی کے موڑ کی بجلی کے درمیان ایک طرح کی باہمی نسبت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں غم کی بھڑکتی آگ سے شعلہ ور ہیں۔ میرا دل اس لئے شعلہ ور ہے کہ اس کے اندر جاگزین (محبوب) کی ملاقات اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے جبکہ بجلی اس لئے شعلہ ور ہے کہ اس سے (محبوبہ کے) دانتوں کی چمک راہ چھوڑ گئی ہے۔

تقسیم

تقسیم کا لغوی معنی تو تجزیہ اور تفریق یعنی اجزا کو متفرق کرنا ہے۔ لیکن اصطلاحی معنی میں اس کا اطلاق تین معنوں پر ہوتا ہے۔

۱۔ ایسی چیز کو ذکر کیا جائے جس کے دو یا دو سے زیادہ اجزاء ہوں اور پھر تعیینی طور پر ان میں سے ایک قسم کے ساتھ وہی چیز ملا دی جائے جو اس سے مختص ہوتی ہے۔ اس آخری قید سے لف و نشر مرتب خارج ہو جائے گا کیونکہ اس کیلئے تعین کی شرط نہیں ہے جیسا کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو گا۔ نثر میں تقسیم کی مثال، مولا علی علیہ السلام کا یہ قول ہے: "وَ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَ شَهِيْدٌ سَائِقٌ يَسُوْقُهَا اِلَى مَحْشَرِهَا وَ شَاهِدٌ يَشْهَدُ عَلَيْهَا بِعَمَلِهَا" (خطبہ ۱۰۴) ہر نفس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک شہادت دینے والا، ہانکنے والا اسے میدان حشر تک ہانک کر لے جائے گا اور گواہ اس کے عملوں کی شہادت دے گا۔

۲۔ کسی چیز کے احوال کو ذکر کیا جائے پھر ان احوال سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا ذکر کیا جائے جیسا کہ علی بن ابی طالب

علیہ السلام ہی فرماتے ہیں : "اَلْمَرْءُ الْمُسْلِمُ یَنْتَظِرُمِنَ اللّٰہِ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ اِمَّادَاعِيَ اللّٰہِ فَمَاعِنْدَاللّٰہِ خَیْرٌلَہٗ وَاِمَّا رِزْقُ اللّٰہِ فَاِذَاھُوَذُوْاَھْلٍ وَمَالٍ وَمَعَہٗ دِیْنُہٗ وَحَسَبُہٗ" (خطبہ ۲۳) مسلمان شخص دواچھائیوں میں سے ایک کا منتظر رہتا ہے یا اللہ کی طرف سے بلاوا آئے تو اس شکل میں اللہ کے یہاں کی نعمتیں ہی اس کیلئے بہتر ہیں یا اللہ کی طرف سے دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں گی تو اس صورت میں اس کے ہاں مال بھی ہے اور اولاد بھی پھر اس کا دین اور عزت نفس بھی بر قرار رہے۔ اسی طرح آپؑ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں : "اَوَلَسْتُمْ تَرَوْنَ اَھْلَ الدُّنْیَایُصْبِحُوْنَ وَیُمْسُوْنَ عَلٰی اَحْوَالٍ شَتّٰی فَمَیِّتٌ یُبْکٰی وَاٰخَرُیُعَزّٰی وَصَرِیْعٌ مُبْتَلٰی وَعَائِدٌیَعُوْدُوَ اٰخَرُبِنَفْسِہٖ یَجُوْدُوَطَالِبٌ لِلدُّنْیَا وَ الْمَوْتُ یَطْلُبُہٗ وَ غَافِلٌ وَ لَیْسَ بِمَغْفُوْلٍ عَنْہُ" (خطبہ ۹۸) تم دنیا والوں پر نظر نہیں کرتے کہ جو مختلف حالتوں میں صبح وشام کرتے ہیں کہیں کوئی میت ہے جس پر رویا جارہا ہے اور کہیں کسی کو تعزیت دی جارہی ہے کوئی عاجز وزمین گیر مبتلائے مرض ہے اور کوئی عیادت کرنیوالا عیادت کررہا ہے، کہیں کوئی دم توڑ رہا ہے کوئی دنیا تلاش کرتا پھرتا ہے اور موت اسے تلاش کررہی ہے اور کوئی غفلت میں پڑا ہوا ہے لیکن موت اس سے غافل نہیں ہے۔

۳۔ کسی چیز کی تمام اقسام کو پوری طرح بیان کردیا جائے یا بالفاظ دیگر جس چیز کو ابتدا میں بیان کیا جائے اس کے مختلف معانی کے تقاضوں کے مطابق اس کی تمام اقسام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اس کی مثال قرآن مجید میں یوں دی گئی ہے : "یَھَبُ لِمَنْ یَشَآءُ اِنَاثًا وَ یَھَبُ لِمَنْ یَشَآءُ الذُّکُوْرَ اَوْ یُزَوِّجُھُمْ ذُکْرَانًا وَ اِنَاثًاوَ یَجْعَلُ مَنْ یَشَآءُ عَقِیْمًا" (شوریٰ/۴۹) وہ جسے چاہے بیٹی عطا فرماتا ہے اور جسے چاہے بیٹا عطا فرماتا ہے یا اگر چاہے تو بیٹا اور بیٹی دونوں عطا فرمادیتا ہے اور جسے چاہے بانجھ بنادیتا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے : "فَاَصْحَابُ الْمَیْمَنَۃِ مَا اَصْحَابُ الْمَیْمَنَۃِ وَ اَصْحَابُ الْمَشْئَمَۃِ مَا اَصْحَابُ الْمَشْئَمَۃِ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ" (واقعہ/ ۸ تا ۱۰) پہلا گروہ اصحاب میمنہ کا ہے اور اصحاب میمنہ کیا ہیں، دوسرا گروہ اصحاب شوم ہیں اور اصحاب شوم کیا ہیں اور تیسرا گروہ وہ ہیں جو سبقت لیجانے والے اور پیشقدمی کرنے والے ہیں۔

اسی طرح امیر المومنینؑ کا کلام ہے : "شُغِلَ مَنِ الْجَنَّۃُ وَ النَّارُ اَمَامَہٗ سَاعٍ سَرِیْعٌ نَجَا وَ طَالِبٌ بَطِیْءٌ رَجَا وَ مُقَصِّرٌ فِی النَّارِ ھَوٰی" (خطبہ ۱۶) جس کے پیش نظر جنت و دوزخ ہو اس کی نظر کسی اور طرف نہیں اٹھ سکتی جو تیز قدم دوڑنے والا ہے وہ نجات یافتہ ہے، جو طلبگار ہو مگر سست رفتار اس سے بھی توقع ہوسکتی ہے مگر جو ارادۃً کوتاہی کرنے والا ہو اسے تو دوزخ میں ہی گرنا ہے۔ یہ تقسیم دوسری آیت کی تقسیم کے مطابق ہے "سَاعٍ سَرِیْعٌ" جلدی کوشش کرنیوالا برابر ہے "سابِقُوْنَ" کے، "طَالِبٌ بَطِیْءٌ" ہم پایہ ہے "اَصْحَابُ الْمَیْمَنَۃِ" کے اور "مُقَصِّرٌ ھَاوِيْ" مساوی ہے "اَصْحَابُ الْمَشْئَمَۃِ" کے۔

نظم میں صفی الدین کا پیغمبر گرامیؐ کی شان میں مدحیہ شعر ہے :

اَفْنٰی جُیُوْشَ الْعِدیٰ غَزْوًا فَلَسْتَ تَرٰی سِوٰی قَتِیْلٍ وَ مَاسُوْرٍ وَ مُنْھَزِمٍ

آنجنابؐ نے دشمن کے لشکروں کو جنگ میں ختم کردیا، تو ان دشمنوں کی حالت یہ ہے کہ تم انہیں یا مقتول دیکھو گے یا قیدی اور یا فراری۔

جمع مع تقسیم

جمع مع تقسیم یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی حکم کے تحت بہت سی چیزوں کو جمع کیا جائے پھر اسے تقسیم کر دیا جائے۔ قرآن مجید سے اس کی مثال ہے: "ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَ مِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ" (فاطر / ۳۲) پھر ہم نے یہ آسمانی کتاب اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک جماعت کو میراث میں دے دی لیکن ان میں سے ایک جماعت نے اپنے اوپر ظلم کیا، ان میں سے کچھ میانہ رو تھے اور ان میں سے ایک جماعت نیکیوں میں سبقت لے گئی۔

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلٰى فَمَلَاَهُنَّ اَطْوَارًا مِنْ مَلَآئِكَتِهِ مِنْهُمْ سُجُوْدٌ لَايَرْكَعُوْنَ وَ رُكُوْعٌ لَا يَنْتَصِبُوْنَ وَ صَافُّوْنَ لَايَتَزَايَلُوْنَ وَ مُسَبِّحُوْنَ لَا يَسْأَمُوْنَ" (خطبہ اول) پھر خداوند عالم نے بلند آسمانوں کے درمیان شگاف پیدا کئے اور ان کی وسعتوں کو طرح طرح کے فرشتوں سے بھر دیا کچھ ان میں سے سربسجود ہیں جو رکوع نہیں کرتے کچھ رکوع میں ہیں جو سیدھے نہیں ہوتے کچھ صفیں باندھے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ نہیں چھوڑتے اور کچھ بغیر کسی وقفہ کے پاکیزگی بیان کر رہے ہیں۔

جمع مع تفریق و تقسیم

متکلم پہلے تو ایک امر کے تحت بہت سی چیزوں کو جمع کرتا ہے، پھر انہیں تقسیم کر دیتا ہے اور اس کے بعد ہر ایک قسم کیلئے اس سے مناسب امر کو بیان کرتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "يَوْمَ يَأْتِ لَاتَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَ سَعِيْدٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَ شَهِيْقٌ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ اِلَّامَاشَاءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيْدُ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِيْنَ فِيْهَامَادَامَتِ السَّمٰوَاتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" (ہود / ۱۰۵ تا ۱۰۸) جس روز قیامت آجائے گی کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کرے گا ان میں سے ایک گروہ شقی ہے اور دوسرا سعادتمند جو شقی ہیں وہ آگ میں ہیں اور ان کیلئے جہنم میں زفیر و شہیق (طویل اور دم گھٹنے والے) نالے ہیں جب تک زمین و آسمان قائم ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے کیونکہ تیرا پروردگار جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے لیکن جو سعادتمند ہیں وہ جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر جو کچھ تیرا پروردگار چاہے یہ بخشش ہے منقطع نہ ہونے والی۔ پہلے تو بات نہ کر سکنے میں تمام نفوس کو جمع کیا اور فرمایا "لا تکلم نفس" پھر ان کی تباین کی صورت میں تفریق کی اور واضح کیا کہ بعض تو "شقی" ہیں اور بعض "سعید" ہیں پھر ان کی تقسیم کر کے سعادتمندوں کیلئے ان چیزوں کا ذکر کیا جو ان کے مناسب ہیں یعنی جنت اور اس کی سعادتیں اور بدبختوں کیلئے ان کے مناسب حال چیزوں کو بیان کیا، یعنی جہنم اور اس کا عذاب۔ اسی طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کا کلام ہے جس میں آپؑ نے مرنے والوں کے حالات پر روشنی ڈالی ہے ارشاد فرماتے ہیں "فَجَعَلَهُمْ فَرِيْقَيْنِ اَنْعَمَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ وَانْتَقَمَ مِنْ هٰؤُلَاءِ فَاَمَّااَهْلُ الطَّاعَةِفَاَثَابَهُمْ فِيْ جِوَارِهِ وَخَلَّدَهُمْ فِيْ دَارِهِ

۔اِلیٰ قَوْلِہٖ۔ فَاَمَّا اَھْلُ الْمَعْصِیَةِ فَاَنْزَلَھُمْ شَرَّ دَارِہٖ وَ غَلَّ الْاَیْدِیْ اِلَی الْاَعْنَاقِ "(خطبہ ۱۰۸) انہیں دو حصوں میں بانٹ دے گا ایک کو انعام و اکرام دے گا اور ایک سے انتقام لے گا، جو فرمانبردار تھے انہیں جزا دے گا کہ وہ اس کے جوار رحمت میں رہیں اور اپنے گھر میں انہیں ہمیشہ کیلئے ٹھہرا دے گا اور جو نافرمان ہوں گے انہیں ایک برے گھر میں پھینک دے گا اور ان کے ہاتھ گردن سے کس کر باندھ دے گا۔ "جَعَلَھُمْ" کی جمع غائب کی ضمیر میں تمام مرنے والوں کو جمع کیا پھر ان کی دو فریقوں میں تفریق کر دی جن میں سے ایک تو وہ ہے جس پر خدا کی نعمتیں ہوں گی اور دوسرا وہ کہ جن سے انتقام لیا جائے گا اس کے بعد "فَاَمَّا اَھْلُ الطَّاعَةِ" اور "فَاَمَّا اَھْلُ الْمَعْصِیَةِ" کہہ کر ان کو تقسیم کر دیا کیونکہ "اہل اطاعت"، "اَنْعَمَ عَلَیْھِمْ" کے مقابل میں ہیں اور "اہل معصیت"، "اِنْتَقَمَ مِنْھُمْ" کے برابر میں ہیں۔ اس باریک نکتے پر خوب غور کیجئے گا۔

اسی طرح نظم میں بھی ہے۔ ابن شرف قیروانی کہتے ہیں ؛

لِمُخْتَلِفِي الْحَاجَاتِ جَمْعٌ بِبَابِہٖ فَھٰذَا لَہٗ فَنٌّ وَھٰذَا لَہٗ فَنٌّ
فَلِلْخَامِلِ الْعُلْیَا وَ لِلْمُعْدِمِ الْغِنَا وَ لِلْمُذْنِبِ الْعُتْبیٰ وَ لِلْخَائِفِ الْاَمْنَ

لوگ مختلف حاجات لے کر اس کے دروازے پر جمع ہیں اور ہر ایک کا اپنا اپنا حال ہے تو وہاں پر گمنام کو بلند درجہ ملتا ہے، نادار کو تونگری، گناہگار کو رضامندی اور خائف کیلئے امن ہے۔

افتنان

ایک یا ایک سے زائد فنون کلام یعنی نسیب، حماسہ، مدح، ہجو، تہنیت یا تعزیت میں سے دو یا دو سے زیادہ فنون کو ذکر کیا جائے، اور یہ صرف نظم سے ہی خاص نہیں نثر میں بھی ہوتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے : "کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَ یَبْقیٰ وَجْہُ رَبِّكَ ذُوْ الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَام "(الرحمٰن / ۲۶ تا ۲۷) وہ تمام لوگ جو زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہے گی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے فخر و تعزیت کو یکجا بیان فرمایا ہے پہلے تو خداوند سبحانہ نے جن وانس، ملائکہ اور دوسری تمام ذی روح مخلوق کو "تعزیت" فرمائی اور ساتھ ہی کائنات کے خاتمہ کے بعد اپنی ذات کی بقا کی "مدح" بھی بیان کی۔ اور یہ سب کچھ دس الفاظ میں ہے جہاں پر اس نے اپنی ذات کی بقا کی تعریف کی ہے وہاں پر "جلال و اکرام" کے ساتھ اپنی توصیف بھی فرمائی ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اسی سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں "زَرَعُوا الْفُجُوْرَ وَ سَقَوْہُ الْغُرُوْرَ وَ حَصَدُوْا الثُّبُوْرَ لَا یُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ عَلَیْھِمُ السَّلَامُ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ اَحَدٌ وَ لَا یُسَوّیٰ بِھِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُھُمْ عَلَیْہِ اَبَدًا "(خطبہ ۲) انہوں نے فسق و فجور کی کاشت کی، غفلت و فریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی، اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اس میں کلام کا ذیل آل محمدؐ کی مدح و ستائش پر مشتمل ہے جبکہ صدر کلام میں دشمنان آل محمدؐ کی ہجو و قدح کی گئی ہے۔

ہجو و مدح نظم میں بھی یکجا ہوتے ہیں، جیسے ابی ربیعہ اپنے کلام میں یزید بن حاتم کی تعریف کرتے ہوئے اسے یزید بن اسید پر

فضیلت دیتا ہے جو اس قدر جلدی بولتا تھا کہ اس کی بات کسی کو سمجھ نہیں آپاتی تھی:

لَشَتَّانَ مَابَيْنَ الْيَزِيْدَيْنِ فِى النَّدىٰ ۔۔۔ يَزِيْدُ سُلَيْمٍ وَ الاَعَزُّ ابْنُ حَاتِمٍ

فَهَمُّ الْفَتَى الاَزْدِيُّ اِتْلاَفُ مَالِهٖ ۔۔۔ وَ هَمُّ الفَتَى الْقَيْسِىُّ جَمْعُ الدَّرَاهِمِ

فَلاَ يَحْسَبُ التَّمْتَامُ اَنِّيْ هَجَوْتُهٗ ۔۔۔ وَ لٰكِنَّنِيْ فَضَّلْتُ اَهْلَ الْمَكَارِمِ

دونوں یزیدوں (ابن حاتم اور ابن اسید) کے درمیان سخاوت کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ اس لئے کہ بنی سلیم کے یزید کو ہر وقت اپنے مال لٹادینے کی فکر لاحق رہتی ہے جبکہ بنی قیس کا یزید ہمیشہ درہم و دینار سمیٹنے کی سوچوں میں لگا رہتا ہے۔ پس تامفہوم انداز میں بولنے والا یہ گمان نہ کرے کہ میں نے اس کی ہجو کی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے صاحب شرافت کو فضیلت دی ہے۔

مذہب کلامی

اس کی تعریف یہ ہے کہ بلیغ شخص مطلوب کیلئے لازم مقدمات کو تسلیم کرنے کے بعد متکلمین کے انداز میں اپنے مدعا پر دلیل لے آتا ہے۔ جیساکہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ کی حکایت کی گئی ہے "فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لآاُحِبُّ الاٰفِلِيْنَ" (انعام /۷۶) جب چاند غروب ہو گیا تو ابراہیمؑ نے کہا کہ میں غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یعنی چاند چونکہ غروب ہونے والا ہے اور میرا رب غروب نہیں کرتا اس لئے چاند میرا رب نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا کلام ذی شان ہے جہاں پر خلافت کیلئے اپنی اولویت کی دلیل پیش فرماتے ہیں اور مہاجرین وانصار کے دعویٰ خلافت کو باطل کرتے ہیں اس کی تفصیل سے آپ انشاء اللہ اس مقام پر اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں "خَلَقَ الْخَلْقَ مِنْ غَيْرِرَوِيَّةٍاِذْكَانَتِ الرَّوِيَّاتُ لاَتَلِيْقُ اِلاَّ بِذَوِي الضَّمَائِرِوَلَيْس بِذِيْ ضَمِيْرٍفِيْ نَفْسِهٖ" (خطبہ ۱۰۷) اس نے بغیر سوچ وبچار میں پڑے مخلوق کو پیدا کیا، اس لئے کہ غور و فکر اس کے مناسب ہوا کرتی ہے جو دل ودماغ جیسے اعضاء رکھتا ہو اور وہ دل ودماغ کے احتیاجات سے بری ہے۔ آپؑ کی اس قسم کی گفتگو توحید پر مشتمل خطبات میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، جو کسی باخبر انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اسی طرح نظم میں بھی یہی قسم موجود ہے جیساکہ شیخ صفی الدین حضرت رسول خداؐ کی تعریف میں کہتے ہیں:

كَمْ بَيْنَ مَنْ اَقْسَمَ اللّٰهُ الْعُلىٰ بِهٖ ۔۔۔ وَ بَيْنَ مَنْ جَاءَ بِاِسْمِ اللّٰهِ فِى الْقَسَمِ

کتنا فرق ہے اس میں جس کی قسم خدا نے کھائی ہے اور اس میں جو خدا کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ یہاں پر شاعر کا مقصود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت ہے، اور اس پر وہ دلیل یہ پیش کرتا ہے خداوند تعالی نے حضرت رسول خداؐ کی قسم ان الفاظ میں کھائی ہے "لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" (حجر /۷۲) (اے رسول!) تیری جان کی قسم! یہ لوگ اپنی مستی میں سرگردان ہیں۔ جبکہ کسی اور پیغمبر کی قسم نہیں کھائی، بلکہ انہوں نے خدا کی قسمیں کھائی ہیں۔ ان دونوں میں کس قدر فرق ہے! اسی طرح ایک اور شاعر نے حضرت امیرؑ کی تعریف اور ان کی دوسرے لوگوں پر برتری ثابت کرتے ہوئے کہا ہے:

كَمْ بَيْنَ مَنْ شَكَّ فِيْ خِلَافَتِهٖ وَ بَيْنَ مَنْ قِيْلَ اَنَّهٗ اللّٰهُ

کتنا فرق ہے اس میں کہ جس کی خلافت میں لوگوں کو شک ہے اور اس میں جس کے بارے میں لوگوں کو خدا ہونے کا شک ہے۔

مبالغہ

اسے "تبلیغ" بھی کہتے ہیں اور بعض حضرات نے اسے "افراط فی الصفة" کا نام بھی دیا ہے۔ اور اس کی تعریف یہ ہے کہ: "کسی چیز کیلئے کوئی وصف ثابت کیا جائے اور اس وصف میں شدت یا ضعف کا اس حد تک دعوی کیا جائے کہ جسے عام طور پر بعید سمجھا جائے لیکن عقلاً اور عادۃً ممکن ہو"، جیسے قرآن مجید میں خداوند تعالی فرماتا ہے: "يَوْمَ تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا" (حج / ۲) جس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی ماؤں کو اپنے دودھ پیتے بچوں کا ہوش نہیں رہے گا اور (دہشت کے مارے) ہر حاملہ عورت اپنا حمل گرا دے گی۔ یعنی جب قیامت کا ہول اچانک آئے گا تو اپنے بچے کو دودھ پلانے والی ماں مارے دہشت کے اس کے منہ سے اپنا پستان کھینچ لے گی یعنی مائیں اپنے بچوں کی دودھ بڑھائی کی مدت بھول جائیں گی اور "حاملہ عورتیں" اپنی حمل کی مدت کو پورا کئے بغیر بچوں کو جنم دیدیں گی۔ اس کلام میں ذکر ہونے والے دو لفظ "ذہول" اور "وضع" روز قیامت کے وصف میں شدت مبالغہ کے طور پر ہیں اور یہ دونوں عقلاً اور عادۃً ممکن ہیں۔

اسی قسم کا کلام امیر المؤمنینؑ کی زبانی سنئے: "فَاَبَيْتُمْ عَلَيَّ اِبَاءَ الْمُخَالِفِيْنَ الْجُفَاةِ وَالْمُنَابِذِيْنَ الْعُصَاةِ حَتّٰى ارْتَابَ النَّاصِحُ بِنُصْحِهٖ وَضَنَّ الزَّنْدُ بِقَدْحِهٖ" (خطبہ ۳۵) لیکن تم تو تند خو مخالفین اور عہد شکن نافرمانوں کی طرح انکار پر تل گئے، یہاں تک کہ ناصح خود اپنی نصیحت کی سوچ میں پڑ گیا اور طبیعت اس چقماق کی طرح بجھ گئی کہ جس نے شعلے بھڑکانا بند کر دیا ہو۔ یہاں نصیحت کرنے والے کا اپنی نصیحت کے بارے میں سوچ میں پڑ جانا اور چقماق کا شعلے بھڑکانا بند کر دینا ان لوگوں کے سخت انکار اور تمرد کیلئے مبالغہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں جبکہ یہ دونوں عقل و عادت کے لحاظ سے ممکن ہیں۔

اغراق

"اغراق" یہ ہوتا ہے کہ کلام میں ایسی چیز کے مبالغہ کا دعویٰ کیا جائے جو عقل کے لحاظ سے ممکن لیکن عادت کے لحاظ سے محال ہو۔ جیسے امیر المؤمنینؑ کا یہ کلام ہے: "يَنْحَدِرُ عَنِّيَ السَّيْلُ وَلَا يَرْقٰى اِلَيَّ الطَّيْرُ" (خطبہ ۳) (میں وہ کوہ بلند ہوں) جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے اور مجھ تک پرندہ پر نہیں مار سکتا کیونکہ ایسے مقام پر پرندے کا نہ چڑھنا جہاں پر انسان ہوتا ہے، عادت کے لحاظ سے ناممکن ہے، لیکن عقلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ممکن ہے کیونکہ امام عالیمقام کا مقام نورانیت اور معجزات خارق العادات اس حد تک بلند ہیں کہ واقعی وہاں پر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

غلو

"غلو" یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کی تعریف میں ایسے اوصاف کو دعویٰ کیا جائے جو عقل اور عادت دونوں لحاظ سے محال ہوں، اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مبالغہ اور چیز ہے اور اغراق اور غلو دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں البتہ غلو میں صداقت پیدا کرنے کیلئے "کَادَ"، "لَولاَ"، "لَو" اور حرف تشبیہ کا ذکر کیا جائے تو مطلب صحیح ہو جاتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "یَکَادُ زَیْتُهَایُضِیٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ" (نور / ۳۵) اس کا روغن (ایسا صاف و خالص ہو کہ) اگرچہ اسے آگ چھوئے بھی نہیں لیکن وہ روشن ہو جاتا ہو۔ روغن کا آگ کے چھوئے بغیر روشن ہونا عقل اور عادت کے لحاظ سے محال ہے، لیکن "یَکَادُ" کے داخل ہونے سے یہ استحالہ دور ہو گیا ہے کیونکہ یہ لفظ "قریب ہونے" پر دلالت کرتا ہے نہ کہ اس کے واقع ہونے پر، جن کا ہونا محال ہے۔

اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا قول ہے: "فَکَاَنَّ مَا هُوَ کَائِنٌ مِنَ الدُّنْیَا عَنْ قَلِیْلٍ لَمْ یَکُنْ وَ کَاَنَّ مَا هُوَ کَائِنٌ مِنَ الآخِرَةِ عَمَّا قَلِیْلٍ لَمْ یَزَلْ" (خطبہ ١٠٨) دنیا کی ساری موجود چیزیں معدوم ہو جائیں گی گویا کہ وہ موجود تھیں ہی نہیں اور آخرت میں پیش آنے والی چیزیں جلد ہی موجود ہو جائیں گی گویا کہ وہ ابھی سے موجود ہیں۔ کیونکہ جس چیز کو ہونا ہے وہ تو لبد تک موجود نہیں ہوگی اور جس چیز کو اب تک موجود ہونا چاہئے تھا وہ ازل سے ہے ہی نہیں اور یہ دونوں عقلاً اور عادۃً محال ہیں کیونکہ موجود اور عدم کی نفی اور ماضی کے ساتھ مستقبل ضروری ہے لیکن جب "کَاَنَّ" تقریب اور شبیہ کیلئے لایا گیا تو محال کا تصور اٹھ گیا اور مقصود کے سرعت کے ساتھ زوال اور فنا کی طرف اشارہ ہے اور آخرت کے جلد لاحق ہونے اور اس کی بقا کا باور کرانا ہے۔ اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گی۔

تجاہل عارفانہ

صاحب مفتاح نے اس کا نام "معلوم کی جگہ نامعلوم کو لانا" رکھا ہے کیونکہ اس میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ یہاں پر "تجاہل" کا لفظ پسندیدہ نہیں ہے، اس لئے کہ اس قسم کا کلام قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ اور مناسب نہیں ہے کہ کلام خدا کیلئے تجاہل کا لفظ استعمال کیا جائے۔

اس کا استعمال مبالغہ کیلئے ہوتا ہے اور مبالغہ مدح میں ہوگا یا مذمت میں یا تعظیم میں یا تحقیر میں یا توبیخ یا تقریر میں یا تعریض میں یا تاسف میں یا تعجب میں یا کسی اور امر میں، بقول علامہ تفتازانی: یہ تعداد اسقدر کثیر ہے کہ کوئی شخص اسے حیطہ تحریر میں نہیں لا سکتا چنانچہ لوگوں کو گمراہی پر تنبیہ و توبیخ میں مبالغہ سے کام لیتے ہوئے امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں "فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ اَمْ اَیْنَ تُصْرَفُوْنَ اَمْ بِمَاذَا تَغْتَرُّوْنَ" (خطبہ ٨٢) پھر کہاں بھٹک رہے ہو اور کدھر کا رخ کئے ہوئے ہو یا کن چیزوں کے فریب میں آگئے ہو۔

تقریر میں مبالغہ کے طور پر فرماتے ہیں: "اَوَلَسْتُمْ اَبْنَاءَ الْقَوْمِ وَالآبَاءَ وَاِخْوَانَهُمْ وَالاَقْرِبَاءَ" (خطبہ ٨٢) کیا تم انہی مرچکنے والوں کے بیٹے باپ اور بھائی اور قریبی نہیں ہو؟

تعجب میں مبالغہ کے طور پر فرماتے ہیں: "مَالِيْ اَرَاكُمْ اَشْبَاحًا بِلاَ اَرْوَاحٍ وَاَرْوَاحًا بِلاَ اَشْبَاحٍ" (خطبہ ۱۰۷) میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ پیکر بے روح اور روح بے قالب بنے ہوئے ہو۔

تحقیر میں مبالغہ کے طور پر فرماتے ہیں: "يَا خَيْبَةَ الدَّاعِيْ مَنْ دَعَا وَ اِلىٰ مَا اُجِيْبَ" (خطبہ ۲۲) اف کتنا نامراد ہے یہ جنگ کیلئے پکارنے والا! یہ ہے کون؟ جو للکارنے والا ہے اور کس مقصد کیلئے اس کی بات کو سنا جارہا ہے؟ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "اَنْتَ تَكْفِيْنِيْ؟ فَوَاللّٰهِ مَا اَعَزَّ اللّٰهُ مَنْ اَنْتَ نَاصِرُه" (خطبہ ۱۳۶) تو بھلا مجھ سے کیا نپٹے گا؟ خدا کی قسم! جس کا تجھ جیسا مددگار ہو اللہ اسے غلبہ وسرفرازی نہیں دیتا۔

تعظیم میں مبالغہ کے طور پر فرماتے ہیں "فَكَيْفَ تَصِلُ اِلىٰ صِفَةِ هٰذَا عَمَائِقُ الْفِطَنِ اَوْ تَبْلُغُه قَرَائِحُ الْعُقُوْلِ اَوْ تَسْتَنْظِمُ وَصْفَه اَقْوَالُ الْوَاصِفِيْنَ" (خطبہ ۱۶۴) ایک ایسی مخلوق کی صفتوں تک فکروں کی گہرائیاں کیونکر پہنچ سکتی ہیں یا عقلوں کی طبع آزمائیاں کس طرح وہاں تک رسائی پاسکتی ہیں یا بیان کرنے والوں کے کلمات کیونکر اس کے وصفوں کو ترتیب دے سکتے ہیں۔

حسرت میں مبالغہ سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں: "اَيْنَ اِخْوَانِيَ الَّذِيْنَ رَكِبُوا الطَّرِيْقَ وَ مَضَوْا عَلَى الْحَقِّ اَيْنَ عَمَّارٌ وَاَيْنَ ابْنُ التَّيِّهَانِ وَاَيْنَ ذُوالشَّهَادَتَيْنِ وَاَيْنَ نُظَرَائُهُمْ" (خطبہ ۱۸۱) وہ میرے بھائی جو سیدھی راہ پر چلتے رہے اور حق پر گزر گئے؟ کہاں ہیں عمار؟ کہاں ہیں ابن تیہان؟ اور کہاں ہیں ذوالشہادتین؟ اور ان جیسے؟

اس کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جو ایک محقق کو غور کرنے سے مل جائیں گی۔ اسی طرح نظم میں بھی مذکورہ صورتیں موجود ہیں۔

اعتراض (جملہ معترضہ)

اس کا نام بعض لوگوں نے "حشو" بھی رکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی کلام یا دو متصل کلاموں کے درمیان ایک یا کئی جملے لائے جائیں جن کا وہاں پر مقام نہیں ہوتا اور یہ صرف پیدا ہونے والے وہم کو دور کرنے کیلئے لائے جاتے ہیں۔ اور کلام سے مراد صرف مسند اور مسند الیہ ہی نہیں بلکہ ہر وہ فاضل کلام ہے جن کا مسند اور مسند الیہ سے تعلق ہوتا ہے، خواہ وہ توابع ہوں یا کوئی اور۔ دو متصل کلاموں سے مراد یہ ہے کہ دوسرا کلام پہلے کیلئے بیان کے طور پر ہو یا بدل کے طور پر یا تاکید وغیرہ کی صورت میں۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ یہ صرف پیدا ہونے والے وہم کو دور کرنے کیلئے آتا ہے، اس سے "احتراس" نکل جائے گا اور "احتراس" سے مراد یہ ہے کہ کلام میں مقصود کے خلاف پیدا ہونے والے خلل کو دور کرنے کیلئے کسی چیز کو لایا جائے، جیسے طرفہ کا قول ہے؛

فَسَقىٰ دِيَارَكَ غَيْرَ مُفْسِدِهَا حُلُوْبُ الرَّبِيْعِ وَ دِيْمَةٌ تَهْمِيْ

چنانچہ "غیر مفسدھا" اس بات سے احتراس ہے کہ وہ بارش ہو جو تباہ کن نہ ہو۔ کیونکہ کبھی بارش کا نزول گھروں وغیرہ کے لئے تباہ کن بھی ہوتا ہے۔ جملہ معترضہ یا اعراض اور اعتراض کبھی تاکید کے لئے آتا ہے جیسے امیر المؤمنین علیہ السلام کا فرمان ہے: "فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَه خَلَقَ الْخَلْقَ حِيْنَ خَلَقَهُمْ غَنِيًّا عَنْ طَاعَتِهِمْ اٰمِنًا مِنْ مَعْصِيَتِهِمْ" (خطبہ ۱۸۲) اللہ سبحانہ

نے جب مخلوقات کو پیدا کیا تو ان کی اطاعت سے بے نیاز اور ان کے گناہوں سے بے خطر ہو کر کارگاہ ہستی میں انہیں جگہ دی۔ کیونکہ اس سے مراد اس بات کی تاکید ہے کہ خداوند متعال کو نقص واحتیاج کی صفات سے منزہ ومبرا سمجھا جائے۔ جس طرح وہ ازل سے ان صفات سے پاک ہے اسی طرح ابد میں بھی پاک ومبرا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تخلیق وایجاد سے اس کی غرض اپنی ذات کیلئے کسی قسم کے فائدے کا حصول یا نقصان کا ازالہ نہیں ہے جس طرح کہ دوسرے کاریگروں اور تخلیق کاروں میں ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اس لئے بناتے ہیں کہ اس کی انہیں ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح سے وہ کمال کو حاصل کرتے ہیں جو پہلے ان میں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ ذاتی طور پر ناقص اور محتاج ہوتے ہیں۔

کبھی اس جملہ سے مراد کسی مصیبت کے عظیم ہونے پر متنبہ کرنا ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَيَاعَجَبًاوَاللهِ يُمِيْتُ الْقَلْبَ وَ يَجْلِبُ الْهَمَّ مِنْ اِجْتِمَاعِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ عَلىٰ بَاطِلِهِمْ وَ تَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ" (خطبہ ۲۲) العجب ثم العجب، خدا کی قسم! ان لوگوں کا باطل پر ایکا کرنا اور تمہاری جمعیت کا حق سے منتشر ہو جانا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

کبھی کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "اَلاَ وَ فِيْ غَدٍ وَ سَيَاتِيْ غَدٌ بِمَا لاَ تَعْرِفُوْنَ يَاخُذُ الْوَالِيْ" (خطبہ ۱۳۸) ہاں کل اور یہ کل بہت نزدیک ہے ایسی چیزوں کو لے کر آجائے گا جنہیں تم ابھی تک نہیں پہچانتے۔ یہاں پر "فی غدٍ" کا تعلق "یاخذ" کے ساتھ ہے اور ظرف ومظروف کے درمیان جملہ معترضہ ہے، جو آنے والی کل کی عظمت کو بیان کر رہا ہے۔

کبھی توبیخ کی تاکید کیلئے آتا ہے، جیسے حضرت علی علیہ السلام ہی کا فرمان ہے: "وَ لَمْ اَعْرِفْكُمْ مَعْرِفَةً وَ اللهِ جَرَّتْ نَدَمًا" (خطبہ ۲۲) نہ تم سے جان پہچان ہوتی ایسی شناسائی واللہ جو ندامت کا سبب اور رنج واندوہ کا باعث بنی۔ دونوں کلاموں کے درمیان جملۂ قسم "معترضہ" اور توبیخ کیلئے بیان ہوا ہے۔

کبھی نفرت دلانے کیلئے آتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؑ کا فرمان گرامی ہے: "فَاِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ دَنَائَةً تَظْهَرُ فَيَخْشَعُ لَهَا اِذَا ذُكِرَتْ وَتُغْرٰى بِهَا لِئَامُ النَّاسِ كَانَ كَالْفَالِجِ الْيَاسِرِ" (خطبہ ۲۳) جب تک کوئی مرد مسلمان کسی ایسی ذلیل حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا کہ جو ظاہر ہو جائے تو اس کے تذکرہ سے اسے آنکھیں نیچی کرنی پڑیں، جس سے ذلیل آدمیوں کی جرات بڑھے وہ اس کامیاب جواری کی مانند ہے...... یہاں پر آپ کا یہ فرمان "كَانَ كَالْفَالِجِ الْيَاسِرِ"، انَّ کی خبر ہے اور "فَيَخْشَعُ" کا جملہ درمیان میں معترضہ ہے۔

کبھی ذات خداوند عالم کو منزہ قرار دینے کیلئے آتا ہے، جیسے خداوند عالم کا فرمان ہے: "يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحَانَهٗ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُوْنَ" (نحل / ۵۷) وہ اللہ کیلئے بیٹیوں کے قائل تھے، اللہ اس سے منزہ ہے، لیکن اپنے لئے وہ وہ کچھ چاہتے ہیں جو انہیں پسند ہوتا ہے۔ یہاں پر لفظ "سبحانہ" معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے جس کا مقصد خداوند تعالیٰ کی اس بات سے تقدیس وتنزیہ مقصود ہے جس کی یہ لوگ نسبت دیا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت امیر المؤمنینؑ کا ارشاد گرامی ہے "فَقَالَ سُبْحَانَهٗ وَ هُوَ الْعَالِمُ بِمُضْمَرَاتِ الْقُلُوْبِ وَ مَحْجُوْبَاتِ الْغُيُوْبِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا" (خطبہ ۱۸۱) چنانچہ اللہ

سبحانہ نے باوجودیکہ وہ دل کے بھیدوں اور پردہ غیب میں چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہ ہے فرمایا کہ میں ایک بشر بنانے والا ہوں۔ یہاں پر "وَهُوَ الْعَالِمُ" سے لے کر...... "الْغُيُوْبِ" تک جملہ معترضہ ہے، اسے یہاں پر خداوند قدوس کی تنزیہ کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام آئے گی۔

جملہ معترضہ دو متصل کلاموں کے درمیان بھی آتا ہے اور ایک سے زیادہ جملے بھی ہو سکتے ہیں، جیسا کہ امیرالمؤمنینؑ فرماتے ہیں: "اَمَا وَاللّٰهِ لَوْ اِنِّيْ حِيْنَ اَمَرْتُكُمْ بِمَا اَمَرْتُكُمْ بِهٖ حَمَلْتُكُمْ عَلَى الْمَكْرُوْهِ الَّذِيْ يَجْعَلُ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا فَاِنِ اسْتَقَمْتُمْ هَدَيْتُكُمْ وَ اِنِ اعْوَجَجْتُمْ قَوَّمْتُكُمْ وَ اِنْ اَبَيْتُمْ تَدَارَكْتُكُمْ لَكَانَتِ الْوُثْقٰى" (خطبہ ۱۲۰) خدا کی قسم جب میں نے تمہیں تحکیم کے مان لینے کا حکم دیا تھا اگر اسی امر ناگوار جنگ پر تمہیں ٹھہرائے رکھتا کہ جس میں اللہ تمہارے لئے بہتری ہی کرتا، چنانچہ تم اس پر جمے رہتے تو تمہیں سیدھی راہ پر لے چلتا اگر ٹیڑھے ہوتے تو تمہیں سیدھا کر دیتا اگر انکار کرتے تو تمہارا تدارک کرتا تو بلاشبہ یہ ایک مضبوط طریقہ کار ہوتا۔ یہاں پر "حِيْنَ اَمَرْتُكُمْ بِمَا اَمَرْتُكُمْ" کا جملہ معترضہ ہوتا ہے جو "اِنَّ" اور اس کی خبر "حَمَلْتُكُمْ" کے درمیان واقع ہے اور یہ تاکید کیلئے ہے، اسی طرح "فَاِنِ اسْتَقَمْتُمْ هَدَيْتُكُمْ" کا جملہ دو شرطیہ جملوں کے درمیان ہے اور "فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ" میں "فاء" بھی اپنی جگہ پر معترضہ ہے، جس طرح کہ اس شعر میں معترضہ ہے؛

وَاعْلَمْ فَعِلْمُ الْمَرْءِ يَنْفَعُهٗ اَنْ سَوْفَ يَاتِيْ كُلُّ مَا قُدِّرَا

تمہیں معلوم ہونا چاہئے اور انسان کا علم اسے اس بات کا فائدہ پہنچاتا ہے کہ جو مقدر میں ہے اسے جلد مل کر رہتا ہے۔

تکرار

کسی خاص نکتے کے پیش نظر کسی عبارت میں ایک یا کئی کلموں کا اپنے لفظ اور معنی کے ساتھ مکرر لانے کا نام "تکرار" ہے۔

نکتے کئی طرح کے ہو سکتے ہیں، جن میں سے ایک تاکید بھی ہے، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ" (تکاثر / ۳۔۴) حقیقت کو جان لو گے ہر گز ایسا نہیں ہے یہ جلدی تمہیں معلوم ہو جائے گا، یہاں پر جملے کی تکرار باز رکھنے کیلئے ہے۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا کلام ہے، آپؑ فرماتے ہیں "اَلْعَمَلَ اَلْعَمَلَ ثُمَّ النِّهَايَةَ النِّهَايَةَ وَالْاِسْتِقَامَةَ الْاِسْتِقَامَةَ ثُمَّ الصَّبْرَ الصَّبْرَ وَالْوَرَعَ الْوَرَعَ" (خطبہ ۱۷۵) عمل کرو عمل کرو عاقبت وانجام کو دیکھو استوار و بر قرار رہو پھر یہ کہ صبر کرو صبر کرو تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ یہاں پر جملوں کی تکرار سے غرض ان امور کی طرف رغبت دلانا اور ان کیلئے برانگیختہ کرنا ہے۔ اسی طرح آپؑ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "اَلْجِهَادَ الْجِهَادَ" (خطبہ ۱۸۱) جہاد، جہاد۔ ایک اور مقام پر خوف خدا دل میں پیدا کرنے کیلئے فرماتے ہیں "فَاللّٰهَ اللّٰهَ يَا مَعْشَرَ الْعِبَادِ" (خطبہ ۱۸۲) اے گروہ بندگان! خدا سے، خدا سے ڈرو۔

ایک نکتہ استبعاد میں اضافہ ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: "هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ" (مؤمنون / ۳۶) بہت بعید، بہت بعید ہیں وہ وعدے جو تم سے کئے جا رہے ہیں۔

ایک نکتہ تنبیہ اور بیدار کرنے کے لیے بھی ہے اور یہ نکتہ کبھی سابقہ نکتے کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "هَيْهَاتَ قَدْفَاتَ مَافَاتَ وَذَهَبَ مَاذَهَبَ" (خطبہ ۱۹۰) جو چیز ہاتھ سے نکل گئی سو نکل گئی اور جو وقت جا چکا سو جا چکا۔

ایک نکتہ تحذیر، محتاط رہنے اور بچنے کیلئے ہے، جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "فَالحَذَرَ الحَذَرَ مِنْ طَاعَةِ سَادَاتِكُمْ وَ كُبَرَائِكُمُ الَّذِيْنَ تَكَبَّرُوْا" (خطبہ ۱۹۱) دیکھو اپنے ان سرداروں اور بڑوں کے اتباع کرنے سے ڈرو جو اپنے جاہ و حشمت پر اکڑتے ہیں۔

ایک نکتہ دل میں ہول پیدا کرنے اور ڈرانے کیلئے ہے، خداوند عالم فرماتا ہے: "اَلْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ" (معارج /۱۔۲) وہ دن جو یقیناً واقع ہو کر رہے گا اور وہ واقع ہونے والا دن کیسا ہے۔ "اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ" (قارعہ /۱۔۲) وہ چھبنے والا حادثہ ہے اور وہ کیسا چھبنے والا حادثہ ہے۔

ایک نکتہ کلام کے طولانی ہونے کی وجہ سے مطلب کے دور ہو جانے پر دوبارہ اسے یاد دلاتا ہے، خواہ تکرار کسی رابطہ سے خالی ہو، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَافُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَصَبَرُوْا اِنَّ رَبَّكَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (نحل /۱۱۰) لیکن تیرا پروردگار ان لوگوں کیلئے جنہوں نے دھوکا کھانے کے بعد ہجرت کی (یعنی ایمان کی طرف پلٹ آئے) پھر راہ خدا میں جہاد کیا اور استقامت دکھائی یہ کام انجام پانے کے بعد تیرا پروردگار غفور و رحیم ہے۔ یا پھر رابطہ کے ساتھ ہو، جیسا کہ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَالَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ" (آل عمران /۱۸۸) یہ گمان نہ کیجئے کہ جو لوگ اپنے برے گمان پر خوش ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایسے کام کے ضمن میں ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے سر انجام نہیں دیا وہ عذاب الٰہی سے امان میں ہیں۔

ایک نکتہ درد اور حسرت کا اظہار ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے؛

فَيَا قَبْرَ مَعْنٍ اَنْتَ اَوَّلُ حُفْرَةٍ مِنَ الاَرْضِ خُطَّتْ لِلسَّمَاحَةِ مَضْجَعًا

وَ يَا قَبْرَمَعْنٍ كَيْفَ وَارَيْتَ جُوْدَه' وَ قَدْ كَانَ مِنْهُ الْبَرُّ وَ الْبَحْرُ مُتْرَعًا

اے معن (بن زائدہ) کی قبر! تو زمین کا وہ پہلا گڑھا ہے جو سخاوت کیلئے آرام گاہ کے طور پر کھودا گیا ہے۔ اے معن کی قبر! تو نے اس کی سخاوت کو کیونکر چھپالیا، حالانکہ اس سے تو بحر و بر چھلک رہے تھے۔

ایک نکتہ کسی چیز کی عظمت کو اجاگر کرنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَا اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ" (واقعہ /۲۷) اور اصحاب یمین کیا خوب ہیں اصحاب یمین۔

ایک نکتہ انکار و سرزنش کرنا بھی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ" (سورۂ رحمٰن) تو اے جن وانس! تم اپنے رب کی کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

ایک نکتہ تکرار شدہ کلام کی شان کو اجاگر کرنا اور اس کے کمالات کا اظہار ہے، جیسا کہ حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں: "
اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلىٰ مَاتَاخُذُ وَتُعْطِيْ وَعَلىٰ مَاتُعَافِيْ وَ تَبْتَلِيْ حَمْدًا يَكُوْنُ اَرْضَى الْحَمْدِ لَكَ وَاَحَبَّ الْحَمْدِ اِلَيْكَ وَاَفْضَلَ الْحَمْدِ عِنْدَكَ حَمْدًا يَمْلَأُ مَاخَلَقْتَ وَ يَبْلُغُ مَا اَرَدْتَ حَمْدًا لَايُحْجَبُ عَنْكَ وَلَايَقْصُرُ دُوْنَكَ حَمْدًا لَايَنْقَطِعُ عَدَدُهٗ وَلَايَفْنىٰ مَدَدُهٗ" (خطبہ ۱۵۹) بار الہا! تو جو کچھ (دے کر) لے لیتا ہے اور جو کچھ عطا کرتا ہے اور جن مرضوں سے شفا دیتا ہے اور جن آزمائشوں میں ڈالتا ہے سب پر تیرے لئے حمد و ثناء ہے۔ ایسی حمد جو انتہائی درجے تک تجھے پسند آئے اور انتہائی درجے تک تجھے محبوب ہو اور تیرے نزدیک ہر ستائش سے بڑھ چڑھ کر ہو ایسی حمد جو کائنات کو بھر دے اور جو تو نے چاہا اس کی حد تک پہنچ جائے، ایسی حمد کہ جس کے آگے تیری بارگاہ تک پہنچنے سے نہ کوئی حجاب ہو اور نہ اس کیلئے کوئی بندش۔ ایسی حمد کہ جس کی گنتی نہ کہیں پر ٹوٹے اور نہ اس کا سلسلہ ختم ہو۔

ایک نکتہ مدح و ستائش میں اضافہ ہے، جیسا کہ حضرت رسالتمآبؐ کا ارشاد مقدس ہے:

اَلْكَرِيْمُ بْنُ الْكَرِيْمِ بْنِ الْكَرِيْمِ بْنِ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ يَعْقُوْبَ بْنِ اِسْحَاقَ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ

کریم ابن کریم جو کریم ابن کریم ہے، یعنی حضرت یوسف فرزند حضرت یعقوب فرزند حضرت اسحاق فرزند ابراہیم ہیں۔

ایک نکتہ لطف اندوزی اور لذت آشنائی بھی ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے؛

تَاللّٰهِ يَا ظَبَيَاتِ الْقَاعِ قُلْنَ لَنَا لَيْلَايَ مِنْكُنَّ اَمْ لَيْلىٰ مِنَ الْبَشَرِ

اے نرم و ہموار زمین کی ہرنیو! تمہیں خدا کی قسم! ہمیں بتاؤ کہ میری لیلیٰ تم میں سے ہے یا لیلیٰ انسانوں میں سے ہے؟ اسی طرح ایک اور شاعر کا قول ہے؛

سَقَى اللّٰهُ نَجْدًا وَ السَّلَامُ عَلىٰ نَجْدٍ وَ يَا حَبَّذَا نَجْدٌ عَلَى النَّاْيِ وَ الْبُعْدِ

نَظَرْتُ اِلىٰ نَجْدٍ وَ بَغْدَادَ دُوْنَهٗ لَعَلِّيْ اَرىٰ نَجْدًا وَ هَيْهَاتَ مِنْ نَجْدِ

خدا نجد کو سیراب کرے اور نجد پر سلام ہو، اے نجد! دور و نزدیک سے تیرے کیا ہی کہنے۔ میں نے بغداد کے ورے نجد کی طرف نگاہ دوڑائی، شاید میں نجد کو ایک نظر دیکھ لوں، لیکن ہائے! نجد کتنا ہی دور ہے!! یہاں پر نجد کو پانچ مرتبہ دہرایا گیا ہے اور وہ صرف لذت آشنائی اور لطف اندوزی کیلئے۔ تکرار کے بارے میں علمائے بدیع نے اپنی کتابوں میں بہت سے نکات کو ذکر کیا ہے اور انصاف یہ ہے کہ ان سب کا اغلب فائدہ تاکید ہے اور جو نکتہ انہوں نے بتایا ہے وہ یا تو کلام کے درمیان سے انہوں نے لیا ہے یا پھر قرینہ مقام سے۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں۔

شجاعت فصاحت

کلام کے لازمی حصوں میں سے کسی چیز کا سامع کے اعتماد پر حذف کرنا "شجاعت فصاحت" کہلاتا ہے۔ سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے شیخ ابو الفتح اس جنس کو "شجاعت فصاحت" اس لئے کہتے ہیں کیونکہ فصیح اسے اس صورت میں استعمال

کرتا ہے جبکہ اس کا دل جری اور اس کلام میں پایا جانے والا قرینہ بہت کافی ہوتا ہے"۔ اس کی مثال خداوند عالم کا یہ کلام ہے: "حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ "(ص / ۳۲) یہاں تک کہ (سورج) پردے میں چھپ گیا۔ یہاں پر "الشمس" محذوف ہے اور اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح خداوند عالم فرماتا ہے: "اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ "(قدر / ۱) یقیناً ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا۔ یعنی "قرآن" کو۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ "(قیامت / ۲۶) جب گلے تک پہنچ جائے گی، یعنی "روح"۔

اسی طرح "شجاعت فصاحت" کلام امیر المؤمنینؑ میں بھی موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے: "اَمَا وَ اللّٰهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا ابْنُ اَبِي قُحَافَةَ وَاِنَّهُ لَيَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحىٰ "(خطبہ ۳) خدا کی قسم! فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اس کی کیلی کا ہوتا ہے۔ یہاں پر "ھا" کی دونوں ضمیریں "خلافت کی طرف لوٹ رہی ہیں جبکہ اس سے پہلے اس کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "دَارٌ بِالْبَلَاءِ مَحْفُوْفَةٌ وَ بِالْغَدْرِ مَعْرُوْفَةٌ "(خطبہ ۲۲۴) ایسا گھر ہے جو بلاؤں سے گھرا ہوا ہے اور دھوکے کے ساتھ مشہور ہے۔ یعنی "دنیا"۔ اس قسم کا کلام بہت زیادہ ہے۔

استخدام

استخدام یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسے لفظ کو لایا جائے جس کے دو یا دو سے زیادہ معنی ہوں(۱) اور مراد صرف ایک معنی لیا جائے پھر ایک ضمیر کو لایا جائے جس سے دوسرا معنی مراد لیا جائے۔ یا دو ضمیروں کو لایا جائے اور دونوں کے علیحدہ علیحدہ معانی مراد لئے جائیں۔ پہلی صورت کی مثال خداوند عالم کا یہ فرمان ہے: "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ سُلَالَةٍ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَكِيْنٍ "(مؤمنون / ۱۲) ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو ایک نطفہ کی صورت میں ایک اطمینان بخش جگہ (رحم) میں رکھا۔ یہاں پر "انسان" سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور "جَعَلْنَاهُ" میں موجود ضمیر انہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ البتہ بعض تفسیروں میں "انسان" کی تفسیر "اولاد آدم" سے کی گئی ہے، تو ایسی صورت میں اسے "استخدام" کے زمرے میں نہیں لایا جائے گا۔

یہ تو تھی نثر کی بات، نظم میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ جریر کہتے ہیں؛

اِذَا نَزَلَ السَّمَاءُ بِاَرْضِ قَوْمٍ رَعَيْنَاهُ وَ اِنْ كَانُوْا غِضَابًا

جب کسی قوم کی سرزمین پر بارش ہوتی ہے تو ہم اس (کی کھیتی اور نباتات) کو پیش نظر رکھتے ہیں اگرچہ لوگ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ یہاں پر "رَعَيْنَاهُ" میں موجود ضمیر سے مراد "نباتات" ہے جو بارش سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا اس سے "سببیت" کا تعلق ہے۔ یعنی اس کے سبب سے۔

دوسری صورت جب معانی دو ہوں اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ معنی مراد لیا جائے۔ اس کی مثال قرآن مجید سے یہ

(۱) چاہے دو دونوں حقیقی ہوں یا مجازی، ایک حقیقی ہو اور دوسرا مجازی۔

ہے: "لاَ تَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ وَلاَجُنُبًا الاَّعَابِرِیْ سَبِیْلٍ "(نساء / ۴۳) جب تم نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ، جب تک تم یہ نہ سمجھ سکو کہ کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جب تم جنابت کی حالت میں ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو مگر راہ کے عبور کرنے میں۔ ابو البقاء کہتے ہیں کہ یہاں پر لفظ "صلوٰۃ" کیلئے دو معنی ہیں، ایک نماز کا قائم کرنا، اس لئے کہ اس میں "حَتّٰی تَعْلَمُوْا" کا قرینہ پایا جاتا ہے اور ایک "نماز کا مقام" اس لئے کہ اس میں "وَ لاَ جُنُبًا" کا قرینہ موجود ہے۔ البتہ یہ تاویل ہمارے لئے تامل سے خالی نہیں۔ لیکن اس کی واضح ترین مثال حضرت امیر علیہ السلام کا یہ قول ہے: "فَخُذُوْا لِلْحَرْبِ اُهْبَتَهَا وَاَعِدُّوْالَهَا عُدَّتَهَافَقَدْ شَبَّ لَظَاهَاوَعَلاَسَنَاهَا" (خطبہ ۲۶) تم جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ، اس کیلئے سازوسامان مہیا کر لو کہ اس کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور لپیٹیں بلند ہو رہی ہیں۔ یہاں پر پہلی تین ضمیریں "حرب" (جنگ) کی طرف لوٹ رہی ہیں اور اس سے اس کا حقیقی معنی مراد ہے اور آخری دو ضمیریں بھی اسی کی طرف لوٹ رہی ہیں لیکن یہاں پر اس کا مجازی معنی مراد ہے یعنی "نار الحرب" (جنگ کی آگ)۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "وَخَلَقَ الاٰجَالَ فَاَطَالَهَاوَقَصَّرَهَا وَقَدَّمَهَا وَاَخَّرَهَا" (خطبہ ۹۰) اس نے زندگی کی مختلف مدتیں مقرر کی ہیں کسی کو زیادہ، کسی کو کم، کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے کر دیا ہے۔ چونکہ "اجل" کا اطلاق دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک تو کسی چیز کے مقررہ وقت پر اور دوسرے موت کے وقت پر، لہذا "اَطَالَهَا" اور "قَصَّرَهَا" میں موجود ضمیریں پہلے معنی کے لحاظ سے اس کی طرف لوٹ رہی ہیں اور آخری دو دوسرے معنی کے لحاظ سے۔

اسی طرح نظم میں بھی ہے۔

تفسیر

اس کی تعریف یہ ہے کہ: "متکلم اپنے نظمیہ یا نثریہ کلام میں ایسی چیز لے آئے کہ جس کی اچھی طرح وضاحت کے بغیر اسے نہ سمجھا سکے۔ بالفاظ دیگر اس کلام پر کچھ اس طرح پردے پڑے ہوئے ہوں کہ جنہیں ہٹائے بغیر کلام نہ سمجھا سکے۔ اسے "تبیین" بھی کہا جاتا ہے۔ نثر میں اس کی مثال امیر المؤمنینؑ کا یہ قول ہے: "اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَانِ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَ طُوْلُ الاَمَلِ فَاَمَّا اِتِّبَاعُ الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَ اَمَّا طُوْلُ الاَمَلِ فَيُنْسِى الاٰخِرَةَ" (خطبہ ۴۲) مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے، ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی وہ چیز ہے جو حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ اسی طرح آپؑ، اسلام کی ان الفاظ میں توصیف فرماتے ہیں: "فَهُوَ اَبْلَجُ الْمَنَاهِجِ وَ اَوْضَحُ الْوَلاَئِجِ مُشْرِفُ الْمَنَارِ مُشْرِقُ الْجَوَادِّ مُضِيْءُ الْمَصَابِيْحِ كَرِيْمُ الْمِضْمَارِ رَفِيْعُ الْغَايَةِ جَامِعُ الْحَلْبَةِ مُتَنَافِسُ السُّبْقَةِ شَرِيْفُ الْفُرْسَانِ التَّصْدِيْقُ مِنْهَاجُهٗ وَ الصَّالِحَاتُ مَنَارُهٗ وَ الْمَوْتُ غَايَتُهٗ وَ الدُّنْيَا مِضْمَارُهٗ وَ الْقِيَامَةُ حَلْبَتُهٗ وَ الْجَنَّةُ سُبْقَتُهٗ" (خطبہ ۱۰۵) وہ تمام سیدھی راہوں میں زیادہ روشن، تمام عقیدوں میں زیادہ واضح ہے، اس کے مینار بلند، راہیں درخشاں اور چراغ روشن ہیں۔ اس کا میدان عمل باوقار اور مقصد و غایت بلند ہے۔ اس کے میدان میں تیز رفتار گھوڑوں کا اجتماع ہے اس کی طرف بڑھنا مطلوب و پسندیدہ ہے۔ اس کے شاہسوار عزت والے، اس کا راستہ اللہ اور

رسول کی تصدیق اور اچھے اعمال راستے کے نشانات ہیں۔ دنیا گھڑ سواری کا میدان، موت پہنچنے کی حد، قیامت گھوڑوں کے جمع ہونے کی جگہ اور جنت بڑھنے کا انعام ہے۔ اسی طرح آپؑ تقویٰ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: "اُوْصِيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِتَقْوَى اللّٰهِ الَّتِيْ هِيَ الزَّادُ وَ بِهَا الْمَعَادُ زَادٌ مُبْلِغٌ وَ مَعَادٌ مُنْجِحٌ" (خطبہ ۱۱۳) اے اللہ کے بندو! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں اس لئے کہ یہی تقویٰ زادراہ ہے اور اسی کو لیکر پلٹنا ہے یہ زادراہ منزل تک پہنچانے والا اور یہ پلٹنا کامیاب پلٹنا ہے۔

نظم میں بھی یہی چیز موجود ہے، جیسے شاعر کہتا ہے:

ثَلَاثَةٌ تَشْرُقُ الدُّنْيَا بِبَهْجَتِهَا شَمْسُ الضُّحىٰ وَ اَبُوْ اِسْحَاقَ وَ الْقَمَرُ

تین چیزیں دنیا کو اپنی روشنی سے منور کر رہی ہیں: چمکتا سورج، ابو اسحاق اور چاند۔ اسی طرح ایک اور شاعر کا قول ہے:

غَيْثٌ وَ لَيْثٌ فَغَيْثٌ حِيْنَ تَسْأَلُهُ عُرْفًا وَ لَيْثٌ لَدَى الْهَيْجَاءِ ضِرْغَامٌ

وہ بارش بھی ہے اور شیر بھی، بارش اس وقت ہے جب تم اس سے کسی بخشش کا سوال کرو اور جب جنگ کا موقع ہوتا ہے تو وہ بہادر شیر ہوتا ہے۔

توریہ

اسے ایہام، توجیہ، تجنیس اور تخییل بھی کہتے ہیں۔ اور ابو البقاء کے بقول اسے "توریہ" کہنا ہی زیادہ بہتر ہے، کیونکہ یہ مسمّی سے مطابقت کے زیادہ نزدیک ہے۔ اس لئے کہ یہ مصدر ہے "وَرَّيْتُ الْخَبَرَ" کا جس کا معنی ہے خبر کو چھپا کر کچھ اور بتایا جائے۔ گویا متکلم خبر کو پس پشت ڈال کر اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اور اس کی تعریف یہ ہے: "ایک ایسا لفظ ذکر کیا جائے جس کے دو معنی ہوں جن میں سے ایک، لفظ سے زیادہ قریب اور اس پر لفظ کی دلالت ظاہری ہو اور دوسرا بعید اور اس پر لفظ کی دلالت مخفی ہو اور متکلم دوسرے معنی کو مخفی قرینہ کی وجہ سے مراد لے اور پہلے معنی کو چھپائے رکھے، جس سے سامع پہلے مرحلہ میں یہ سمجھے کہ اس سے قریب کا معنی مراد لیا جا رہا ہے۔"

اس تعریف کی بنا پر بعض علمائے بیان نے اس کا نام "ایہام" رکھا ہے اور یہ تعریف اس سے زیادہ بہتر ہے جو کہ بعض لوگوں نے ان الفاظ میں کی ہے کہ: "ایک ایسا لفظ ذکر کیا جائے جس کے دو معنی ہوں ایک قریب اور دوسرا اجنبی، جب اسے سامع سنے تو اسے قریب کے معنی کیلئے سمجھے لیکن متکلم کی مراد اجنبی معنی ہو۔ اس آخری تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک لفظ کیلئے ظاہر بھی ہوتا ہے اور اس کیلئے تاویل بھی، جس سے سامع کا ذہن فوری طور پر ظاہر کی طرف جاتا ہے جبکہ متکلم کی مراد تاویل ہوتی ہے۔

علم بیان میں ہمیں اس باب کے علاوہ کوئی اور باب اتنا دقیق تر اور لطیف تر نظر نہیں آتا جو کلام الٰہی اور انبیاء کرام کے کلام میں پیدا ہونے والے اشتباہات دور کرنے کیلئے معاون، مددگار اور مفید ہو۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ توریہ مجردہ ۲۔ توریہ مرشحہ

اور ۳۔ توریہ مبینہ۔

ا۔ توریہ مجردہ وہ ہوتا ہے کہ موریٰ بہ (جس لفظ کے ساتھ توریہ کیا جارہا ہے) اور موریٰ عنہ (جس سے توریہ کیا جارہا ہے) کے درمیان کوئی چیز جامع نہ ہو۔ یعنی دونوں اطراف کسی قدر جامع سے خالی ہوں۔ اس کیلئے خداوند عالم کے کلام کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے: "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوىٰ" (طٰہٰ / ۵) (خدائے) رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ کیونکہ یہاں پر "استوا" سے اس کا دور کا معنی مراد لیا گیا ہے یعنی "تسلط اور قبضہ" اور قریب کے معنی یعنی "استقرار" کا توریہ کیا گیا ہے، جبکہ ان دونوں معنوں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان کے درمیان میں مناسبت رکھتی ہو۔ البتہ اس میں یہ اشکال بھی پیدا کیا گیا ہے کہ یہاں پر اس کے قریبی معنی کے ساتھ ایک صورت ملی ہوئی ہے اور وہ ہے عرش۔ کیونکہ عرش، استقرار سے مناسبت رکھتا ہے۔

اسی طرح کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک فرمان ہے: "اِنَّمَا نَحْنُ حَفْنَةٌ مِنْ حَفَنَاتِ رَبِّنَا" ہم تو اپنے رب کے "لپوں" میں سے ایک "لپ بھر" ہیں۔ یہاں پر "حفنة" (لپ بھر) کا قریبی معنی تو ہے "ہتھیلی بھر"۔ لیکن اس سے مراد دور کا معنی لیا گیا ہے یعنی ہم اپنی اس قدر کثیر تعداد کے باوجود خدا کے نزدیک بہت ہی قلیل ہیں یا اس کی ملکیت اور رحمت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں۔

اسی قسم کا کلام امیر المؤمنینؑ کے خطبہ میں بھی ہے، جہاں پر آپؑ نے اشعث بن قیس کو "حَائِكُ ابْنُ حَائِكٍ وَ مُنَافِقٌ ابْنُ كَافِرٍ" کہہ کر پکارا ہے۔ کیونکہ "حائک" کا قریبی معنی تو "جولاہا" ہوتا ہے، لیکن آپؑ نے اس سے دور کا معنی "حَائِكُ الْكِذْبِ" جھوٹ کو بننے والا یعنی افتراء پرداز، مراد لیا ہے۔

نظم میں بھی اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

۲۔ توریہ مرشحہ وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر ایسی چیز کو لئے ہوئے ہو جو موریٰ بہ سے مناسبت رکھتی ہو۔ خواہ وہ توریہ سے پہلے ذکر کی جائے یا اس کے بعد۔ تو اس لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ توریہ سے پہلے ہو، جیسے خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَالسَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ" (ذاریات / ۴۷) ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا ہے۔ یہاں پر "اید" سے مراد اس کا دور کا معنی مراد لیا گیا ہے، یعنی قدرت جبکہ وہ ایسی چیز کو ساتھ لئے ہوئے ہے جو قریب کے معنی یعنی ہاتھ سے مناسبت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے "بنیناھا" اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ النَّاشِرِ فِي الْخَلْقِ فَضْلاً وَ الْبَاسِطِ فِيْهِمْ بِالْجُوْدِ يَدَه" (خطبہ ۹۹) اس اللہ کیلئے حمد و ثناء ہے جو مخلوقات میں اپنا دامن فضل پھیلائے ہوئے اور اپنا دست قدم بڑھائے ہوئے ہے۔ یہاں پر "ید" سے مراد نعمت لی گئی ہے جبکہ اس کے ساتھ وہ چیز بھی موجود ہے جو اس کے قریب کے معنی سے مناسبت رکھتی ہے اور وہ ہے "بسط" (غور کیجئے گا)۔

ب۔ توریہ کے بعد ہو، جیسے الصاحب عطاء الملک کا ایک عورت کے بارے میں شعر ہے جس کا نام "شجر" ہے:

يَاحَبَّذَا شَجَرٌ وَ طِيْبُ نَسِيْمِهَا لَوْ اَنَّهَا تُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ

کیا کہنا شجر اور اس کی پاکیزہ ہواؤں کا، اے کاش! اسے ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا۔ یہاں پر شجر کا لفظ کہہ کر اس سے موصوف عورت ہی کو مراد لیا ہے اور اس کے بعد پاکیزہ ہوا اور پانی کا ذکر کیا ہے۔ جو کسی شجر (درخت) سے مناسبت رکھتے ہیں۔

قول مصنفؒ: یہاں پر اس کی ایک اور قسم بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ مناسبت توریہ سے پہلے بھی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد بھی، جیسے حضرت امیرؑ کا قول باب الحکم ہے: "مَنْ يُعْطِ بِالْيَدِ الْقَصِيْرَةِ يُعْطَ بِالْيَدِ الطَّوِيْلَةِ" (حکمت ۲۳۲) جو کوتاہ ہاتھ سے دیتا ہے وہ لمبے ہاتھ سے پاتا ہے۔ یہاں پر دونوں ہاتھوں سے مراد نعمت ہے لیکن ان کا ظاہری معنی ہاتھ بنتے ہیں اور ان کیلئے قریب کے واسطہ مناسب معنی موجود ہے اور وہ ہے "عطا"، "کوتاہ" اور "لمبا" اور "ید قصیرہ" بندے کی طرف سے نعمت مراد ہے اور "ید طویلہ" خداوند سبحانہ کی نعمت مراد ہے۔

۳۔ توریہ مبنیہ، جس کے اندر ایسی چیز ہو جو موریٰ عنہ کے معنی سے مناسبت رکھتی ہو۔

یا تو اس سے پہلے ہو گی، جیسے حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے: "فَاَجْرىٰ فِيْهَاسِرَاجًامُسْتَطِيْرًا وَ قَمَرًا مُنِيْرًا" (خطبہ اول) اور ان میں ضوء پاش چراغ اور جگمگاتا چاند رواں کیا۔ یہاں پر سراج سے مراد سورج ہے اور اس کے ساتھ اس سے مناسبت رکھنے والی چیز ملی ہوئی ہے یعنی "اَجْرىٰ" کیونکہ جریان (حرکت) سورج میں ہوتی ہے چراغ میں نہیں ہوتی، غور کیجئے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ وہ مناسبت موریٰ عنہ کے بعد ہو گی، جیسے شاعر کا قول ہے؛

اَمَا وَاللّٰهِ لَوْلَا خَوْفُ سَخَطِكِ لَهَانَ عَلَيَّ مَا اَلْقىٰ بِرَهْطِكِ

مَلَكْتِ الْخَافِقَيْنِ فَتُهْتِ عُجْبًا وَ لَيْسَ هُمَا سِوىٰ قَلْبِيْ وَ قَرْطُكِ

خدا کی قسم! اگر تیری ناراضگی کا ڈر نہ ہوتا تو (اے محبوبہ!) تیرے قبیلے کی طرف سے مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑا بہت آسان تھا۔ تو نے دو مضطرب چیزوں پر قابو پالیا جس کی وجہ سے غرور میں آکر بھٹک گئی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مضطرب چیزیں صرف اور صرف میرا دل اور تیرا گوشوارہ تھا۔ "خافقان" کا ظاہری معنی تو مشرق اور مغرب ہے، لیکن شاعر نے ان سے مراد اپنا دل اور محبوبہ کا گوشوارہ لیا ہے، جبکہ یہ دور کے معنی ہیں۔ اور پھر ان پر آخری مصرع میں نص قائم کر کے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے۔

توجیہ

اسے بعض حضرات نے "ابہام" کا نام دیا ہے اور بعض اسے "محتمل الضدین" بھی کہتے ہیں اور اس کی تعریف یہ ہے کہ متکلم کوئی ایسی بات کہے جس سے دو متضاد معنی مراد لئے جا سکتے ہوں۔ مثلاً اس سے مدح بھی مراد لی جا سکتی ہو اور ہجو بھی، اسی طرح اور متضاد معانی اور اس کے بعد کوئی ایسی چیز نہ آئے جو اس کی وضاحت کرے۔ کیونکہ اس سے مقصود ابہام اور مقصد کو چھپانا ہوتا ہے۔ اس کی احسن مثال امیر المؤمنینؑ کا وہ کلام ہے جو آپؑ نے قتل عثمان کے سلسلے میں بیان فرمایا، فرماتے ہیں "لَوْاَمَرْتُ بِهٖ لَكُنْتُ قَاتِلًا اَوْنَهَيْتُ عَنْهُ لَكُنْتُ نَاصِرًا" (خطبہ ۳۰) اگر میں اس کے قتل کا حکم دیتا تو البتہ اس کا قاتل ٹھہرتا اور اگر اس کے قتل سے

دوسروں کو روکتا تو اس کا معاون و مددگار ہوتا (اس لئے بالکل غیر جانبدار رہا)۔ اس سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے آپؑ اس کے قاتلین میں شمار ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کے مددگاروں میں سے ہیں اسی بنا پر آپؑ نے حال و مقام کے تقاضوں کے پیش نظریات کو مبہم طور پر بیان فرمایا ہے۔ البتہ اس کی مکمل تفصیل اسی خطبہ میں بیان کی جائے گی۔ اسی بارے میں ایک شامی شاعر نے کہا ہے ؛

اِذَا سُئِلَ عَنْهُ حَذَا شُبْهَةً وَ عَمَی الْجَوَابَ عَلَی السَّائِلِیْنَا

فَلَیْسَ بِرَاضٍ وَ لاَ سَاخِطٍ وَ لاَ فِی النُّهَاةِ وَ لاَ الآمِرِیْنَا

وَ لاَ هُوَ سَآءَ وَلاَ سَرَّہٗ وَ لاَ بُدَّ مِنْ بَعْضِ ذَا اَنْ یَکُوْنَا

جب ان سے اس شبہ کے بارے میں پوچھا گیا تو پوچھنے والوں کو اس کا کوئی جواب نہ دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو آپؑ اس پر راضی ہیں اور نہ ناراض، نہ روکنے والوں میں سے ہیں اور نہ ہی حکم دینے والوں میں سے، نہ تو اسے ناراض کیا ہے اور نہ ہی خوش کیا ہے حالانکہ ضروری تھا کہ ان میں سے ایک تو ہوتے۔

نظم میں بھی یہ پائی جاتی ہے، جیسا کہ بشار شاعر، ایک کانے درزی کے بارے میں کہتا ہے ؛

خَاطَ لِیْ عَمْرٌو قَبَا لَیْتَ عَیْنَیْهِ سَوَاءٌ قُلْتُ شِعْرًا لَیْسَ یَدْرِیْ اَ مَدِیْحٌ اَمْ هِجَاءٌ

عمرو نے میرے لئے قبا کو سیا ہے، کاش کہ اس کی دونوں آنکھیں ایک جیسی ہوتیں۔ میں نے ایسا شعر کہا ہے جسے وہ نہیں سمجھتا کہ آیا اس کی تعریف ہے یا ہجو ؟ کیونکہ دونوں آنکھوں کیلئے برابری سے مراد نابینائی میں بھی برابری ہو سکتی ہے اور بینائی میں برابری بھی۔

توشیح

توشیح یہ ہے کہ کلام کے آخر میں تثنیہ کا جملہ لایا جائے جن کی تفسیر دو اسموں کے ساتھ کی جائے جن میں سے دوسرا اسم پہلے پر معطوف ہو۔ علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ اس کو توشیح اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا لغوی معنی ہے دھنی ہوئی روئی کو لپیٹنا۔ گویا ایک تثنیہ کو کہ جس کی تفسیر دو اسموں سے کی جاتی ہے دھنی ہوئی روئی کی مانند قرار دیا گیا ہے کہ جسے بعد میں لپیٹا جائے اور یہ قسم امیرالمؤمنینؑ کے کلام میں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہے، جیسا کہ آپؑ فرماتے ہیں " اِنَّ اَخْوَفَ مَااَخَافُ عَلَیْکُمْ اِثْنَانِ اَلْحِرْصُ (اَیْ اِتِّبَاعُ الْهَوَیٰ) وَطُوْلُ الاَمَلِ " (خطبہ ۴۲) مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے، ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے امیدوں کا پھیلاؤ۔ یہ جملہ ہم تفسیر کی مثالوں میں بھی بیان کر آئے ہیں لیکن یہاں پر اسے لانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر توشیح کی تعریف بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح تفسیر کی۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: " وَ سَیَهْلِكُ فِیَّ صِنْفَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ یَذْهَبُ بِهِ الْحُبُّ اِلَی غَیْرِ الْحَقِّ وَمُبْغِضٌ مُفْرِطٌ یَذْهَبُ بِهِ الْبُغْضُ اِلَی غَیْرِ الْحَقِّ " (خطبہ ۱۲۷) میرے بارے میں دو قسم کے لوگ تباہ و برباد ہوں گے ایک حد سے زیادہ چاہنے والے جنہیں محبت کی افراط غلط راستے پر لگا دے گی اور ایک میرے مرتبہ میں کمی کر کے دشمنی رکھنے والے جنہیں یہ عناد حق سے بے راہ کر دے گا، اسی طرح

ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں "لَايَنْبَغِي لِلْعَبْدِ اَنْ يَثِقَ بِخَصْلَتَيْنِ الْعَافِيَةُ وَالْغِنٰى بَيْنَا تَرَاهُ مُعَافًا اِذْسَقِمَ وَبَيْنَا تَرَاهُ غَنِيًّا اِذِ افْتَقَرَ" (حکمت ۴۲۶) کسی بندے کیلئے مناسب نہیں کہ وہ دو چیزوں پر بھروسہ کرے ایک صحت اور دوسرے دولت کیونکہ ابھی تم کسی کو تندرست دیکھ رہے تھے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بیمار پڑ جاتا ہے، اور ابھی تم اسے دولت مند دیکھ رہے تھے کہ فقیر و نادار ہو جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "يَهْلِكُ فِيَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ وَ بَاهِتٌ مُفْتَرٍ" (حکمت ۴۶۹) میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاکت میں مبتلا ہوں گے ایک محبت میں حد سے بڑھ جانے والے، دوسرا جھوٹ و افتراء باندھنے والے۔ نیز یہ بھی فرماتے ہیں: "هَلَكَ فِيَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٌ قَالٍ" (حکمت ۱۱۷) میرے بارے میں دو قسم کے لوگ تباہ و برباد ہوئے، ایک وہ چاہنے والا جو حد سے بڑھ جائے اور دوسرا وہ دشمنی رکھنے والا جو عداوت رکھے۔

اسی نوعیت کا کلام نظم میں بھی ہوتا ہے۔

تعدید

اسے کچھ لوگ "سیاقۃ الاعداد" کا نام بھی دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہوتا ہے کہ چند مفرد اسماء کو ایک انداز میں ذکر کیا جائے۔ اور اگر اس بارے میں الفاظ کے جوڑا ہونے، ہم جنس ہونے، ایک دوسرے کے مطابق ہونے، ایک دوسرے کے مقابل ہونے یا اس قسم کی دوسری چیزوں کی رعایت کو پیش نظر رکھا جائے تو کلام کے حسن اور لطافت کو چار چاند لگ جائیں۔ اس قسم کی گفتگو روزمرہ کے استعمال میں بھی آتی ہے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں "حل و عقد، رد و قبول، امر و نہی، نفی و اثبات، بست و کشاد، ہدم و بناء اور منع و عطا وغیرہ"۔ اس بارے میں امیر المؤمنینؑ کا کلام ملاحظہ فرمایئے: "فَيَعْلَمُ سُبْحَانَهُ مَافِي الْاَرْحَامِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَقَبِيْحٍ اَوْ جَمِيْلٍ وَ سَخِيٍّ اَوْ بَخِيْلٍ وَشَقِيٍّ اَوْ سَعِيْدٍ" (خطبہ ۱۲۸) اللہ ہی جانتا ہے کہ شکموں میں کیا ہے، نر ہے یا مادہ، بد صورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل اور بدبخت ہے یا خوش نصیب۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "وَالْحَمْدُلِلّٰهِ الْكَائِنِ قَبْلَ اَنْ يَكُوْنَ كُرْسِيٌّ اَوْ عَرْشٌ اَوْ سَمَآءٌ اَوْ اَرْضٌ اَوْ جَآنٌّ اَوْ اِنْسٌ" (خطبہ ۱۸۱) تمام حمد اس اللہ کیلئے ہے جو عرش و کرسی، زمین و آسمان اور جن و انس سے پہلے موجود تھا۔ ایک دوسری جگہ پر آپؑ کا ارشاد ہے: "وَمَا الْجَلِيْلُ وَاللَّطِيْفُ وَالثَّقِيْلُ وَالْخَفِيْفُ وَالْقَوِيُّ وَالضَّعِيْفُ فِيْ خَلْقِهِ اِلَّا سَوَآءٌ وَكَذٰلِكَ السَّمَاءُ وَالْهَوَاءُ وَالرِّيَاحُ وَالْمَاءُ فَانْظُرْ اِلَى الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ وَ النَّبَاتِ وَ الشَّجَرِ وَ الْمَاءِ وَ الْحَجَرِ" (خطبہ ۱۸۴) اس کی مخلوقات میں بڑی اور چھوٹی، بھاری اور ہلکی، طاقتور اور کمزور چیزیں یکساں ہیں اور یونہی آسمان، فضا، ہوا اور پانی برابر ہیں لہٰذا تم چاند، سورج، سبزے، درخت، پانی اور پتھر کی طرف دیکھو۔

یہی قسم نظم میں بھی پائی جاتی ہے، ملاحظہ ہو شاعر کا قول:

اَلْخَيْلُ وَ اللَّيْلُ وَ الْبَيْدَآءُ تَعْرِفُنِيْ وَ السَّيْفُ وَ الرُّمْحُ وَ الْقِرْطَاسُ وَ الْقَلَمُ

گھوڑا، رات اور جنگل مجھے جانتے ہیں، اور تلوار، نیزہ، قرطاس اور قلم بھی۔

حسن نسق

اس کا اطلاق دو طرح کے معانی پر ہوتا ہے ؛

۱۔ تنسیق صفات : اور وہ یہ ہے کہ کسی چیز کیلئے مسلسل کئی صفات ذکر کئے جائیں، جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے : "هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ" (حشر / ۲۳) اللہ وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اصلی مالک وہی ہے، ہر عیب سے منزہ ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا، مؤمنین کو سلامتی بخشتا ہے، ہر چیز کا نگہبان ہے، صاحب قدرت ہے، طاقتور ہے اور عظمت کے لائق ہے۔ امیر المؤمنینؑ دنیا کے بارے میں فرماتے ہیں : "غَرَّارَةٌ ضَرَّارَةٌ حَائِلَةٌ زَائِلَةٌ نَافِدَةٌ بَائِدَةٌ اَكَّالَةٌ غَوَّالَةٌ" (خطبہ ۱۱۰) دنیا دھوکے باز، نقصان رساں، ادلنے بدلنے والی، فنا ہونیوالی، ختم ہونیوالی، مٹ جانے والی، کھا جانے والی اور ہلاک کردینے والی ہے۔ اسی طرح دعائے استسقاء کے سلسلہ میں بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں : "اَللّٰهُمَّ سُقْيَامِنْكَ مُحْيِيَةً مُرْوِيَةً تَامَّةً عَامَّةً طَيِّبَةً مُبَارَكَةً هَنِيْئَةً مَرِيْعَةً مَرِيْئَةً زَاكِيًا نَبْتُهَا ثَامِرًا فَرْعُهَا نَاضِرًا وَرَقُهَا" (خطبہ ۱۱۴) خدایا! ایسی سیرابی ہو جو مردہ زمینوں کو زندہ کرنے والی، سیراب کرنے والی، بھرپور برسنے والی، سب جگہ پھیل جانے والی اور پاکیزہ و بابرکت اور خوشگوار و شاداب ہو جس سے نباتات پھلنے پھولنے لگیں، شاخیں بار آور اور پتے ہرے بھرے ہو جائیں۔

نظم میں اس کی مثال شاعر کا قول ہے ؛

دَانٍ بَعِيْدٌ مُحِبٌّ مُبْغِضٌ بَهِجٌ اَعَزُّ حُلْوٌ مُمِرٌّ لِيْنٌ شَرِسٌ

نزدیک ہے، دور ہے، دوست ہے، دشمن ہے، مسرور ہے، بہت ہی میٹھا ہے، بڑا ہی کڑوا ہے، نرم ہے اور تند خو بھی ہے۔

۲۔ ایسے مسلسل کلمات لائے جائیں جو ایک دوسرے پر معطوف ہوں، باہم جڑے ہوئے ہوں اور ان کا آپس میں باہمی جڑاؤ اس پیارے انداز سے ہو کہ اگر ان میں سے ہر جملے کو علیحدہ بھی استعمال کیا جائے تو وہ مستقل طور پر قائم ہو اور اپنا مستقل معنی دے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے : "وَ قِيْلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِيْ مَائَكِ وَ يَا سَمَاءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَاءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ" (ہود / ۴۴) اور کہا گیا اے زمین! اپنا پانی نگل جا، اے آسمان! رک جا۔ پانی نیچے چلا گیا اور معاملہ ختم ہو گیا، وہ کشتی جودی پہاڑی کے دامن میں ٹھہر گئی، اس وقت کہا گیا کہ ظالم لوگوں کیلئے خدا کی رحمت سے دوری ہے اس طرح امیر المؤمنینؑ توحید کا نظریوں پیش کرتے ہیں : "اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهٗ وَكَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيْقُ بِهٖ وَ كَمَالُ التَّصْدِيْقِ بِهٖ تَوْحِيْدُهٗ وَ كَمَالُ تَوْحِيْدِهِ الْاِخْلَاصُ لَهٗ وَ كَمَالُ الْاِخْلَاصِ لَهٗ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ" (خطبہ اول) دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے، کمال معرفت اس کی تصدیق ہے، کمال تصدیق توحید ہے، کمال توحید تنزیہ و اخلاص ہے اور کمال تنزیہ و اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے۔ "فَمَنْ وَصَفَ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ وَمَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاهُ وَمَنْ جَزَّاهُ فَقَدْ جَهِلَهٗ وَمَنْ جَهِلَهٗ فَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ وَمَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ وَمَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ"

وَ مَنْ قَالَ فِيْمَ فَقَدْ ضَمَّنَهُ وَ مَنْ قَالَ عَلاَمَ فَقَدْ اَخْلىٰ مِنْهُ"(خطبہ اول) جس نے ذات الٰہی کے علاوہ صفات مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا اور جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی، جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس کیلئے جزء بناڈالا اور جو اس کیلئے اجزاء کا قائل ہوا وہ اس سے بے خبر رہا، جو اس سے بے خبر رہا اس نے اسے قابل اشارہ سمجھ لیا، جس نے اسے قابل اشارہ سمجھا اس نے اس کی حدبندی کر دی اور جس نے اسے محدود سمجھا وہ اسے دوسری چیزوں کی قطار میں لے آیا جس نے یہ کہا وہ کسی چیز میں ہے اس نے اسے کسی شئے کے ضمن میں فرض کر لیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں۔

التفات

اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام کی ایک روش کو چھوڑ کر دوسری روش اس طرح اختیار کی جائے کہ وہ معنی کے لحاظ سے پہلی روش کے منافی نہ ہو بلکہ اس کیلئے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس سے واضح تر تعریف تلخیص میں کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ: کسی معنی کو تینوں تعبیرات یعنی تکلم، خطاب اور غیبت میں سے کسی ایک کے ساتھ بیان کیا جائے جبکہ اس سے پہلے ان میں سے کسی اور کو اختیار کیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سعد الدین تفتازانی نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ دوسری تعبیر ظاہری الفاظ کے مقتضی کے خلاف ہو اور اس سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ کلام کو کسی اور لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی نسبت انہوں نے جمہور اور مشہور کی طرف دی ہے بالفاظ دیگر معدول عنہ اور معدول الیہ دونوں کلام میں مذکور ہوں۔ بہر صورت اس کی چھ قسمیں بنتی ہیں، کیونکہ مذکورہ تینوں تعبیرات یعنی تکلم، خطاب اور غیبت کو دو سے ضرب دینے سے چھ صورتیں سامنے آئیں گی۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک تعبیر دو صورتوں میں منتقل ہو گی۔

۱۔ تکلم سے غیبت کی طرف التفات ہو، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے "اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" (کوثر/۱۔۲) بے شک ہم نے آپکو کوثر عطا کیا ہے، پس اپنے رب کیلئے نماز پڑھو اور قربانی کرو حالانکہ ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ "لِرَبِّكَ" کی جائے "لَنَا" کہا جاتا۔ اسی طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کا فرمان ہے "فَاِنْ اَقُلْ يَقُوْلُوْا حَرَصَ عَلَى الْمُلْكِ وَاِنْ اَسْكُتْ يَقُوْلُوْا جَزِعَ مِنَ الْمَوْتِ هَيْهَاتَ بَعْدَ اللَّتَيَّا وَالَّتِيْ وَاللّٰهِ لَابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ اُمِّهِ" (خطبہ ۸) اگر بولتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ دنیوی سلطنت پر مرمٹے ہوئے ہیں اور اگر چپ رہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ موت سے ڈر گئے ہیں۔ افسوس اب یہ بات جبکہ میں ہر طرح کے نشیب و فراز دیکھے بیٹھا ہوں، خدا کی قسم! ابو طالب کا بیٹا موت سے اتنا مانوس ہے کہ بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے اتنا مانوس نہیں ہوتا۔ ظاہری روش کا تقاضا یہ ہے کہ "لَابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اٰنَسُ" کی بجائے "لَاَنِّيْ اٰنَسُ" کہا جائے۔

۲۔ تکلم سے خطاب کی طرف التفات، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "وَ مَا لِيَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ" (یس/۲۲) میں کیوں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ حالانکہ

ظاہری تقاضا یہ ہے کہ "تُرْجَعُوْنَ" کی بجائے "اُرْجَعُ" کہا جاتا۔ البتہ اس قسم سے کلام امیر المؤمنین سے کوئی مثال نہیں مل سکی۔

۳۔ غیبت سے تکلم کی طرف التفات، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "وَاللّٰهُ الَّذِيْ اَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ اِلٰى بَلَدٍ مَيِّتٍ" (فاطر / ۹) اور وہی خدا تو ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تا کہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں پس ہم ان بادلوں کو مردہ زمینوں کی طرف بھیجتے ہیں۔ ظاہری طور پر "فَسُقْنَاهُ" کی بجائے "فَسَقَاهُ" ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "وَ اللّٰهِ لَابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ اُمِّهٖ وَ لٰكِنِّيْ قَدِ انْدَمَجْتُ عَلٰى مَكْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بُحْتُ بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمْ" (خطبہ ۸) خدا کی قسم! ابو طالب کا بیٹا موت سے اتنا مانوس ہے کہ بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے اتنا مانوس نہیں ہوتا البتہ ایک علم پوشیدہ میرے سینے کی تہوں میں لپٹا ہوا ہے کہ اسے ظاہر کر دوں تو تم پیچ و تاب کھانے لگو گے۔ اس کا تقاضا تھا کہ فرماتے "قَدِ انْدَمَجَ عَلٰى مَكْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بَاحَ بِهٖ"۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "وَالَّذِيْ نَفْسُ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ بِيَدِهٖ لَاَلْفُ ضَرْبَةٍ بِالسَّيْفِ اَهْوَنُ عَلَيَّ مِنْ مِيْتَةٍ عَلٰى فِرَاشٍ" (خطبہ ۱۲۲) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں ابن ابی طالب کی جان ہے کہ بستر پر اپنی موت مرنے سے تلوار کے ہزار وار کھانا میرے لئے آسان ہے۔ یہاں پر "عَلَيَّ" کی جگہ "عَلَيْهِ" ہونا چاہئے تھا جو کہ اصل کا تقاضا ہے۔

۴۔ غیبت سے خطاب کی طرف التفات، جیسا کہ خداوند عالم کا قرآن مجید میں فرمان ہے: "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (سورہ حمد) جزا کے دن کا مالک ہے۔ خداوندا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اسی ذیل میں امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "مَاهِيَ اِلَّا الْكُوْفَةُ اَقْبِضُهَا وَ اَبْسُطُهَا اِنْ لَمْ تَكُوْنِيْ اِلَّا اَنْتِ تَهُبُّ اَعَاصِيْرُكِ فَقَبَّحَكِ اللّٰهُ" (خطبہ ۲۵) یہ عالم ہے اس کوفہ کا جس کا بندوبست میرے ہاتھ میں ہے۔ اے شہر کوفہ! اگر تیرا یہی عالم رہا کہ تجھ میں آندھیاں چلتی رہیں، تو خدا تجھے غارت کرے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "وَ مَنْ عَاشَ فَعَلَيْهِ رِزْقُهٗ وَ مَنْ مَاتَ فَاِلَيْهِ مُنْقَلَبُهٗ لَمْ تَرَكَ الْعُيُوْنُ فَتُخْبِرَ عَنْكَ بَلْ كُنْتَ قَبْلَ الْوَاصِفِيْنَ مِنْ خَلْقِكَ" (خطبہ ۱۰۸) جو زندہ ہے اس کے رزق کا ذمہ اس پر ہے اور جو مر جائے اس کا پلٹنا اسی کی طرف ہے۔ اے اللہ! آنکھوں نے تجھے دیکھا ہی نہیں کہ تیری خبر دے سکیں بلکہ تو تو اس وصف کرنے والی مخلوق سے پہلے ہی موجود تھا۔

نظم میں ابو العلاء معری کا قول ہے:

هِيَ قَالَتْ لَمَّا رَأَتْ شَيْبَ رَأْسِيْ ۔۔۔ وَ اَرَادَتْ تَنَكُّرًا وَ ازْوِرَارًا

اَنَا بَدْرٌ وَ قَدْ بَدَا الصُّبْحُ فِيْ رَأْ ۔۔۔ سِكَ وَ الصُّبْحُ يَطْرُدُ الْاَقْمَارَا

لَسْتَ بَدْرًا وَاِنَّمَا اَنْتِ شَمْسٌ ۔۔۔ لَا تُرَىٰ فِي الدُّجٰى وَ تُبْدُوْ نَهَارًا

جب اس (حسینہ) نے میرے سر کی سفیدی کو دیکھا تو منہ موڑ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی: میں چودھویں کا چاند

ہوں جبکہ تمہارے سر میں صبح نمودار ہو چکی ہے اور صبح چاند کو بھگا دیتی ہے۔ (تب میں نے کہا) تم چودھویں کا چاند نہیں بلکہ تم تو سورج ہو جو تاریکی میں نہیں بلکہ دن میں ظاہر ہوتا ہے۔

۵۔ خطاب سے تکلم کی طرف التفات، اس کی مثال نہ تو مجھے قرآن مجید میں مل سکی ہے اور نہ ہی کلام امیر المؤمنینؑ سے، البتہ نظم میں ہے جیسا کہ ابو فراس بن حمدان کہتا ہے ؛

وُقُوْفُكَ بِالدِّيَارِ عَلَيْكَ عَارٌ وَ قَدْ رُدَّ الشَّبَابُ الْمُسْتَعَارُ
أَبَعْدَ الأَرْبَعِيْنَ مُحَرَّمَاتٌ تُمَادُ فِى الصَّبَابَةِ وَ اغْتِرَارُ
نَزَعْتُ عَنِ الصِّبَا اِلاَّ بَقَايَا يُحَقِّرُهَا عَلَى الشَّيْبِ الْوَقَارُ
وَ طَالَ اللَّيْلُ بِيْ وَ لَرُبَّ دَهْرٍ نَعِمْتُ بِهٖ لَيَالِيْهِ قِصَارٌ

تیرا (محبوبہ کے قبیلے کے) مساکن میں رکا رہنا تیرے لئے شرم کی بات ہے، جبکہ عاریۃً لی ہوئی جوانی واپس لوٹ چکی ہے۔ کیا چالیس سال (کی عمر) کے بعد عشق و فریفتگی میں حرام چیزوں کو کھینچ تان کر لایا جائے گا؟ میں بچپن کی نادانی سے باز آ چکا ہوں، سوائے کچھ بچی کھچی باتوں کے کہ جنہیں وقار و متانت بڑھاپے میں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اب میرے لئے رات لمبی ہو گئی ہے حالانکہ جس دور میں میں سرور پاتا تھا اس زمانے کی راتیں مختصر ہوتی تھیں

۶۔ خطاب سے غیبت کی طرف التفات، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "حَتّٰىٓ اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ" (یونس / ۲۲) یہاں تک کہ تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور وہ انہیں لے چلتی ہے۔ ظاہری طور پر "جَرَيْنَ بِهِمْ" کی جگہ پر "جَرَيْنَ بِكُمْ" ہونا چاہئے تھا۔ اس نوع کی مثال مجھے کلام امیر المؤمنینؑ میں نہیں مل سکی، البتہ ہو سکتا ہے کہ مزید غور و خوض کے بعد کہیں مل جائے۔ نظم میں اس کی مثال علامہ سید رضیؒ کا کلام ہے جس میں انہوں نے خلفاء بنی امیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے ؛

رُدُّوْا تُرَاثَ مُحَمَّدٍ رُدُّوْا لَيْسَ الْقَضِيْبُ لَكُمْ وَ لاَ الْبُرْدُ
هَلْ اَعْرَقَتْ فِيْكُمْ كَفَاطِمَةَ أَمْ هَلْ لَكُمْ كَمُحَمَّدٍ جَدٌّ
جُلُّ افْتِخَارِهِمْ بِأَنَّهُمْ عِنْدَ الْخِصَامِ مَصَاقِعٌ لُدٌّ
اِنَّ الْخَلاَئِفَ وَ الاُوْلٰى فَخَرُوْا بِهِمْ عَلَيْنَا قَبْلُ اَوْ بَعْدُ
شَرَفُوْا بِنَا وَ لِجَدِّنَا خُلِقُوْا فَهُمْ صَنَآئِعُنَا اِذَا عُدُّوْا

(حضرت) محمدؐ کی میراث (ان کی اولاد کو) پلٹا دو، اس لئے کہ نہ تو عصائے حکومت تمہارا حق ہے اور نہ ردائے خلافت۔ آیا تم میں (جناب) فاطمہ (زہراؑ) جیسی اصل شرافت کوئی خاتون ہے؟ یا محمدؐ جیسا تمہارا کوئی نانا ہے؟ بنی عباس کا سارا فخر صرف اس بات میں ہے کہ وہ لڑائی جھگڑے کے وقت زور زور سے بولتے اور سخت جھگڑا کرتے ہیں۔ بے شک خلفاء اور ان کی وجہ سے ہم پر فخر کرنے والے سب سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ہماری ہی وجہ سے شرفیاب ہیں اور ہمارے نانا کے طفیل ان کی تخلیق ہوئی ہے لہٰذا ان کا جب بھی شمار ہوگا تو ہمارے ہی شرمندۂ احسان لوگوں میں ہوگا۔

(قول مصنفؒ:) التفات کی ساتویں اور آٹھویں قسم مجھے ملی ہے اور وہ ہے واحد متکلم سے جمع متکلم کی طرف اور جمع متکلم سے واحد متکلم کی طرف عدول اور یہ دونوں قسمیں حضرت امیرؑ کے اس خطبہ میں ہیں: "لَمْ يَكُنْ لِاَحَدٍ فِيَّ مَهْمَزٌ وَ لَا لِقَائِلٍ فِيَّ مَغْمَزٌ اَلذَّلِيْلُ عِنْدِيْ عَزِيْزٌ حَتّىٰ اٰخُذَ الْحَقَّ لَه' وَ الْقَوِيُّ عِنْدِيْ ضَعِيْفٌ اٰخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ رَضِيْنَا عَنِ اللّٰهِ قَضَائَه' وَ سَلَّمْنَا لِلّٰهِ اَمْرَه' اَتَرَانِيْ اَكْذِبُ عَلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَاَنَا اَوَّلُ مَنْ صَدَّقَه' "(خطبہ ۳۷) کسی کیلئے مجھ میں عیب گیری کا موقع اور حرف گیری کی گنجائش تھی ہی نہیں۔ دبا ہوا میری نظروں میں طاقتور ہے، جب تک کہ میں اس کا حق نہ دلوا دوں اور طاقتور میرے یہاں کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ دلوا دوں۔ ہم قضائے الٰہی پر راضی ہو چکے ہیں اور اسی کو سارے امور سونپ دئے ہیں کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھتا ہوں، خدا کی قسم میں وہ ہوں جس نے سب سے پہلے آپؐ کی تصدیق کی۔

"التفات" کا محسنات بدیعیہ میں اس لئے شمار ہوتا ہے کہ جب کلام ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس میں سامع کیلئے ایک نیا اور اچھوتا پن ظاہر ہوتا ہے جو اس کے نشاط میں تازگی پیدا کر دیتا ہے اور ذوق اسے غور سے سننے کیلئے بیدار ہوتا ہے۔

مشاکلہ

"کسی چیز کا ذکر کسی اور لفظ کے ساتھ بوجہ اس کے ساتھ واقع ہونے کے"۔ مشاکلہ کہلاتا ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد مقدس ہے: "وَ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (شوریٰ / ۴۰) برائی کا بدلہ ویسی ہی سزا ہے۔ حالانکہ "سَيِّئَةٌ" کا دوسرا لفظ حق ہے برائی نہیں، لیکن چونکہ پہلے "سَيِّئَةٍ" کے ساتھ واقع ہوا ہے لہٰذا اسے بھی "سَيِّئَةٌ" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ہے: "تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ" (مائدہ / ۱۱۶) (حضرت عیسیٰؑ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا) تو ان سب باتوں کو جانتا ہے جو میرے دل میں ہیں اور جو تیری ذات میں ہیں میں نہیں جانتا۔ اسی طرح امیر المؤمنینؑ کا فرمان ہے: "وَاسْتَئِلُوْهُ مِنْ اَدَاءِ حَقِّهٖ مَا سَئَلَكُمْ" (خطبہ ۱۱۲) جو اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور تمہارے لئے فرض قرار دیا ہے اسے پورا کرنے (کی توفیق) کا اس سے سوال کرو۔ یہاں پر "سَئَلَكُمْ" کا معنی ہے "اَمَرَكُمْ وَ فَرَضَه' عَلَيْكُمْ" کیونکہ سوال کرنا اعلیٰ سے ادنیٰ کا کام ہوتا ہے جبکہ ادنیٰ سے اعلیٰ کا سوال نہیں بلکہ امر اور اس کی بجا آوری کا لزوم ہوتا ہے۔ لیکن امامؑ نے یہاں پر لفظ "سؤال" کا استعمال کیا ہے کیونکہ یہ "وَاسْتَئِلُوْهُ" کے پہلو میں واقع ہوا ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "وَايْمَ اللّٰهِ لَئِنْ فَرَرْتُمْ مِنْ سَيْفِ الْعَاجِلَةِ لَا تَسْلَمُوْا مِنْ سَيْفِ الْاٰخِرَةِ" (خطبہ ۱۲۴) خدا کی قسم! اگر تم دنیا کی تلوار سے بھاگے تو آخرت کی تلوار سے نہیں بچ سکتے۔ حالانکہ آخرت میں تلوار نہیں ہوگی بلکہ یہاں پر مشاکلہ سے کام لیتے ہوئے جہنم اور خدا کا غضب مراد لیا ہے۔ اسی طرح نظم میں ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

قَالُوْا اقْتَرِحْ شَيْئًا نُجِدْ لَكَ طَبْخَه' قُلْتُ اطْبِخُوْا لِيْ جُبَّةً وَ قَمِيْصًا

انہوں نے (مجھ سے) کہا: کوئی چیز پسند کیجئے تاکہ ہم اسے آپ کیلئے عمدہ طریقے سے پکادیں تو میں نے کہا: میرے لئے جبہ اور پیراہن ہی پکادو (یعنی سی دو)۔ یہاں پر "اُطْبِخُوْا" سے مراد "خَيِّطُوْا" ہے کیونکہ جبہ اور پیراہن پکائے نہیں سئے جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کلمہ کو پہلے آنا چاہئے بعد میں آتا ہے اور جسے بعد میں آنا چاہئے پہلے آتا ہے، مثلاً شاعر کہتا ہے؛

مَنْ مُبْلِغٌ اَفْنَاءَ يَعْرُبِ كُلَّهَا　　اِنِّيْ بَنَيْتُ الْجَارَ قَبْلَ الدَّارِ

کوئی ہے جو بنی یعرب کے تمام لوگوں تک یہ بات پہنچادے کہ میں نے گھر بنانے سے پہلے پڑوسی کا انتخاب کیا ہے۔

مذمت جیسی تعریف

اس کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ کسی چیز سے مذمت کی منفی صفت کو اس کی مدح کی صفت کے ساتھ مستثنیٰ کیا جائے، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "لاَ يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَ لاَ تَاْثِيْمًا اِلاَّ قِيْلاً سَلاَمًا سَلاَمًا" (واقعہ / ۲۵۔۲۶) بہشت میں وہ نہ تو کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی گناہ کی باتیں، صرف وہ چیز جو سنیں گے سلام ہی سلام ہے۔

نظم میں نابغہ ذبیانی کا قول ہے؛

وَ لاَ عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ اَنَّ سُيُوْفَهُمْ　　بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

اور ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواروں کی دھاروں میں لشکروں کے ساتھ مڈبھیڑ کی وجہ سے دندانے پڑ گئے ہیں۔

۲۔ کسی چیز کیلئے مدح کی صفت ثابت کی جائے اور اس کے بعد ہی حروف استثناء کے ذریعہ ایک اور مدحیہ صفت کو لایا جائے، جیسا کہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ بَيْدَ اَنِّيْ مِنْ قُرَيْشٍ" میں تمام عربوں سے زیادہ فصیح ہوں جبکہ میں قریش سے ہوں۔ اس سے ملتا جلتا حضرت علی علیہ السلام کا وہ قول ہے جو آپؑ نے محمد بن ابی بکر کی خبر شہادت سن کر ارشاد فرمایا تھا کہ: "اِنَّ حُزْنَنَا عَلَيْهِ عَلىٰ قَدْرِ سُرُوْرِهِمْ بِهِ اِلاَّ اَنَّهُمْ نَقَصُوْا بَغِيْضًا وَنَقَصْنَا حَبِيْبًا" (حکمت ۳۲۵) ہمیں اس کے مرنے کا اتنا ہی رنج و قلق ہے جتنی دشمنوں کو اس سے خوشی ہے بلاشبہ ان کا ایک دشمن کم ہوا اور ہم نے ایک دوست کو کھو دیا۔

نظم میں نابغی جعدی کا قول ہے؛

فَتًى كَمُلَتْ اَخْلاَقُهُ غَيْرَ اَنَّهُ　　جَوَادٌ فَمَا يُبْقِيْ مِنَ الْمَالِ بَاقِيًا

وہ ایک مکمل اخلاق کا مالک جوان ہے مگر یہ کہ وہ ایک ایسا سخی ہے جو مال میں سے کچھ بھی باقی بچا کر نہیں رکھتا۔

مذکورہ قسم کا فائدہ تاکید اور مبالغہ ہے، کیونکہ استثناء میں اصل اتصال ہوتا ہے اور جب کسی حرف استثناء کو ذکر کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کے کلمہ کو ذکر نہیں کیا جاتا تو یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ ماقبل سے کسی چیز کو خارج کیا جائے گا۔ لیکن جب حرف استثناء کے بعد مدح کی صفت آجاتی ہے تو پھر اس میں تاکید کا معنی پیدا ہو جاتا ہے اور مدح در مدح کی کیفیت بن جاتی ہے اور یہ بتاتا

مقصود ہوتا ہے کہ اس میں مذمت کی کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی کہ جسے مستثنیٰ کیا جائے لہذا مدح کی صفت کے استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تجرید

تجرید یہ ہے کہ : کسی صفت والے امر سے اس جیسے امر کو جو اسی طرح کی صفت کا حامل ہے حاصل کیا جائے تا کہ یہ بتایا جائے کہ یہ صفت اس امر میں مبالغہ کی حد تک کامل ہے کہ اس سے ایک اور موصوف کو حاصل کرنا صحیح ہے۔ اور اس کی کئی قسمیں ہیں :

۱۔ "مِنْ" تجرید یہ کے ساتھ ہو جو "منتزع منہ" (جس سے کوئی امر حاصل کیا جارہا ہے) پر داخل ہوتی ہے جب کوئی شخص کہتا ہے "مِنْ فُلَانٍ صِدِّيْقٌ حَمِيْمٌ "یعنی فلاں شخص صداقت اور دوستی کی اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ اس سے اس جیسا ایک اور دوست بھی بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا ایک قول ہے، آپؑ ارشاد فرماتے ہیں : " يَا أَهْلَ الْكُوْفَةِ مُنِيْتُ مِنْكُمْ بِثَلَاثٍ وَ اِثْنَيْنِ صُمٌّ ذَوُوْ أَسْمَاعٍ وَ بُكْمٌ ذَوُوْ كَلَامٍ وَ عُمْيٌ ذَوُوْ أَبْصَارٍ لَا أَحْرَارُ صِدْقٍ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَ لَا إِخْوَانُ ثِقَةٍ عِنْدَ الْبَلَاءِ "(خطبہ ۹۶) اے اہل کوفہ! میں تمہاری تین اور اس کے علاوہ دو باتوں میں مبتلا ہوں۔ پہلے تو یہ کہ تم کان رکھتے ہو پر بہرے ہو، بولنے چالنے کے باوجود گونگے ہو اور آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہو اور پھر یہ کہ نہ تم جنگ کے موقع پر سچے جوانمرد ہو اور نہ مصیبت میں قابل اعتماد بھائی ہو۔ یہاں پر اہل کوفہ کے صم، بکم اور عمی جیسی صفات کے ساتھ مبالغہ کی حد تک موصوف بنایا گیا ہے اور یہ سلسلہ نظم میں بھی ہوتا ہے۔

۲۔ "باء" تجرید یہ کے ساتھ جو "منتزع منہ" پر داخل ہوتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ "لَئِنْ سَأَلْتَ فُلَانًا لَتَسْأَلَنَّ بِهِ بَحْرًا "اگر تم فلاں شخص سے سوال کرنا چاہتے ہو تو اسے سے سمندر کا سوال کرو، کہ فلاں شخص جود و سخا کی صفت سے مبالغہ کی حد تک موصوف ہے کہ وہ سمندر ہے۔

اور یہ نظم میں بھی ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے :

دَعَوْتُ كُلَيْبًا دَعْوَةً فَكَأَنَّمَا دَعَوْتُ بِهِ اِبْنَ الطَّوْدِ أَوْ هُوَ أَسْرَعُ

میں نے کلیب کو ایک بار پکارا تو گویا میں نے صدائے بازگشت کو پکارا ہے۔ یا وہ اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ مدد کو آنے والا ہے۔

۳۔ "باء" مصاحبت کے ساتھ ہوگی، جیسے شاعر کہتا ہے :

وَ شَوْهَاءَ تَعْدُوْ بِيْ إِلَى صَارِخِ الْوَغَا بِمُسْتَلْئِمٍ مِثْلَ الْفَنِيْقِ الْمُرَحَّلِ

اور کئی تیز نظر گھوڑے مجھے لڑائی میں مدد کیلئے پکارنے والے کی طرف ایسے لے کر چلتے ہیں جیسے کوئی شتر بے مہار زرہ پوش بہادر کو اپنے ساتھ لے کر دوڑتا ہے۔

۴۔ "فِيْ" کے ساتھ ہوگی، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے : "لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ "(حم سجدہ / ۲۸) اس (جہنم) میں ان کیلئے جاودانی سزا ہے۔

۵۔ کسی حرف کے واسطہ کے بغیر ہو گی، جیسے قتادہ بن مسلم کہتے ہیں ؛

فَلَئِنْ بَقِيْتُ لَاَرْحَلَنَّ بِغَزْوَةٍ تَحْوِي الْغَنَآئِمَ اَوْ يَمُوْتُ كَرِيْمٌ

اگر تو میں زندہ بچ رہا ضرور ایسی لڑائی کیلئے سفر کروں گا جس میں مال غنیمت جمع کیا جائے گا یا پھر شرافت کی موت اختیار کروں گا۔ یہاں پر "کریم" سے مراد اپنی ذات لی ہے، گویا اپنے کرم میں مبالغہ کی وجہ سے کریم اپنی ذات کو قرار دیا ہے۔

۶۔ کنایہ کے طور پر ہو گی، جیسے اعشیٰ کہتا ہے ؛

يَا خَيْرَ مَنْ يَرْكَبُ الْمَطِيَّ وَ لاَ يَشْرِبُ كَأْسًا بِكَفِّ مَنْ بَخِلاَ

اے میرے وہ ممدوح! جوان سب سے بہتر ہو جو سواریوں پر سوار ہوتے ہیں اور کسی بخیل کے ہاتھ سے جام نوش نہیں کرتے۔

حسن تعلیل

حسن تعلیل یہ ہے کہ کسی وصف کیلئے لطیف پیرائے کے ساتھ کسی مناسب علت کا دعویٰ کیا جائے جو اس کیلئے حقیقی اور فی الواقع نہ ہو........ جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "دَارٌ هَانَتْ عَلىٰ رَبِّهَا فَخَلَطَ حَلاَلَهَا بِحَرَامِهَا وَ خَيْرَهَا بِشَرِّهَا" (خطبہ ۱۱۲) یہ ایک ایسا گھر ہے جو اپنے رب کی نظروں میں ذلیل و خوار ہے، چنانچہ اس کے حلال کے ساتھ حرام اور بھلائیوں کے ساتھ برائیاں ملی ہوئی ہیں۔

نظم میں ابی ہلال کا شعر ہے ؛

زَعَمَ الْبِنَفْسَجُ اَنَّهُ كَعَذَارِهِ حُسْنًا فَسَلُّوْا عَنْ قَفَاهُ لِسَانَهُ

بنفشہ کو گمان ہے کہ حسن میں اس کے رخسار کی مانند ہے، لہٰذا اس کی زبان گدی سے کھینچ لو۔

احتراس

اس کی تعریف "اعراض" کی تعریف میں گذر چکی ہے اور ہم یہاں پر اسے مستقل عنوان سے اس لئے ذکر کر رہے ہیں کہ یہ ایک ایسی تعبیر ہے کہ اسے ایسے کلام میں وہم کو دور کرنے کیلئے لایا جاتا ہے جس میں مقصود کے خلاف پیدا ہو گیا ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں چیونٹی کی زبانی کہا گیا ہے "لاَيَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهُ وَهُمْ لاَ يَشْعُرُوْنَ" (نمل / ۱۸) کہیں سلیمانؑ اور ان کا لشکر تمہیں بے خبری میں روند نہ ڈالے۔ ایک اور مقام پر ہے: "وَ اضْمُمْ يَدَكَ اِلىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِسُوْءٍ" (طٰہٰ / ۲۲) اور اپنا ہاتھ اپنی بغل کے اندر لے جاؤ وہ بے عیب، سفید اور چمکتا ہوا نکلے گا۔

اسی طرح حضرت امیر المؤمنینؑ کا قول ہے "كَائِنٌ لاَعَنْ حَدَثٍ مَوْجُوْدٌ لاَعَنْ عَدَمٍ مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لاَبِمُقَارَنَةٍ وَغَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لاَبِمُزَايَلَةٍ فَاعِلٌ لاَبِمَعْنىٰ الْحَرَكَاتِ" (خطبہ اول) وہ ہے، ہوا نہیں، موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے نہ جسمانی اتصال کی طرح، وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے نہ جسمانی دوری کے طور پر وہ فاعل ہے لیکن حرکات و آلات کا

محتاج نہیں "أَنْشَأَ الْخَلْقَ اِنْشَاءً وَ ابْتَدَأَهُ ابْتِدَاءً مِنْ غَيْرِ رَوِيَّةٍ أَجَالَهَا وَلَا تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا وَلَا حَرَكَةٍ أَحْدَثَهَا" (خطبہ اول) اس نے پہلے خلق کو ایجاد کیا بغیر کسی فکر کی جولانی کے اور بغیر کسی تجربہ کے جس سے فائدہ اٹھانے کی اسے ضرورت پڑی ہو اور بغیر کسی حرکت کے جسے اس نے پیدا کیا ہو۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "قَرِيبٌ مِنَ الْأَشْيَاءِ غَيْرُ مُلَامِسٍ بَعِيدٌ مِنْهَا غَيْرُ مُبَايِنٍ مُتَكَلِّمٌ لَا بِرَوِيَّةٍ مُرِيدٌ بِلَا هِمَّةٍ صَانِعٌ لَا بِجَارِحَةٍ" (خطبہ ۱۷۸) وہ ہر چیز سے قریب ہے لیکن جسمانی اتصال کے طور پر نہیں، وہ ہر شئے سے دور ہے مگر الگ نہیں وہ غور و فکر کئے بغیر کلام کرنے والا اور بغیر آمادگی کے قصد و ارادہ کرنے والا اور بغیر اعضاء کی مدد کے بنانے والا ہے۔

توحید کے بارے میں اس نوع کی مثالیں آپؑ کے کلام میں بہت زیادہ ہیں۔

نظم میں فرزدق کا قول ہے ؛

لَعَنَ الْاِلٰهُ بَنِيْ كُلَيْبٍ اِنَّهُمْ لَا يَغْدِرُوْنَ وَ لَا يَفُوْنَ لِجَارٍ

اللہ لعنت کرے بنی کلیب پر، نہ وہ عذر خواہی کرتے ہیں اور نہ ہمسائے سے وفا کرتے ہیں۔ "لَا يَفُوْنَ" اس وہم کو دور کرنے کیلئے ہے کہ ان کا عذر خواہی نہ کرنا بے وفائی کیلئے نہیں ہوتا۔

لف و نشر

بہت سی چیزوں کو یکجا اکٹھا کیا جائے اور ہر ایک کو یا تو تفصیلی طور پر نص کے ساتھ یکجا کیا جائے یا اجمالی طور پر، ایسا لفظ لایا جائے جو سب کو شامل ہو یہ "لف" کہلاتا ہے۔ اس کے بعد بہت سی چیزوں کیلئے علیحدہ علیحدہ عدد کو ذکر کیا جائے اور تعیین کئے بغیر ان کو متعدد کی طرف پلٹایا جائے اس اطمینان پر کہ سننے والا ہر ایک عدد کو اس کے مناسب لف کے ساتھ خود ہی مطابقت دے گا یہ "نشر" کہلاتا ہے ؛

پہلی صورت یعنی لف تفصیلی کی دو قسمیں ہیں، اس لئے کہ نشر یا تو لف کی ترتیب کے مطابق ہوگا کہ نشر کا پہلا کلمہ لف کے پہلے عدد کے ساتھ مطابقت رکھتا ہوگا اور دوسرا دوسرے کے ساتھ آخر تک۔ ایسی قسم کو "لف و نشر مرتب" کہتے ہیں اور اگر ان میں باہم ترتیب نہ ہو تو اس کو "لف و نشر غیر مرتب" کہتے ہیں۔

چنانچہ پہلی قسم یعنی لف و نشر مرتب کی مثال قرآن مجید میں ہے : "وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ" (قصص / ۷۳) اور یہ امر اس کی رحمت سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے دن اور رات بنائے تاکہ تم ان میں سکون پاؤ اور فضل الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ۔

لیل و نہار کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا پھر ترتیب کے ساتھ لیل سے متعلق چیز کو ذکر کیا جو کہ سکون ہے اور اس کے بعد نہار سے متعلق چیز کو جو کہ خدا کے فضل کی تلاش ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ کا کلام ہے "وَلَوْ وَهَبَ مَا تَنَفَّسَتْ عَنْهُ مَعَادِنُ الْجِبَالِ وَضَحِكَتْ عَنْهُ اَصْدَافُ الْبِحَارِ مِنْ فِلِزِّ اللُّجَيْنِ وَالْعِقْيَانِ وَنُثَارَةِ الدُّرِّ وَحَصِيدِ الْمَرْجَانِ مَا اَثَّرَ ذٰلِكَ

فِيْ جُوْدِہٖ" (خطبہ ۹۰) اگر وہ چاندی اور سونے جیسی نفیس دھاتیں کہ جنہیں پہاڑوں کے معدن لمبی لمبی سانسیں بھر کر اچھال دیتے ہیں اور بکھرے ہوئے موتی اور مرجان کی کٹی ہوئی شاخیں کہ جنہیں دریاؤں کی سیپیاں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اگل دیتی ہیں، بخش دے تو اس سے اس کے جود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

کیونکہ سونا اور چاندی جیسی دھاتیں وہ ہیں جنہیں پہاڑوں کے معدن سانسیں بھر کر اچھال دیتے ہیں اور بکھرے ہوئے موتی اور مرجان کی کٹی شاخیں ایسی ہیں جنہیں دریاؤں کی سیپیاں کھلکھلا کر اگل دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں : "وَ لِیَخْتَبِرَ بِذٰلِكَ الشُّكْرَ وَ الصَّبْرَ مِنْ غَنِیِّهَا وَ فَقِیْرِهَا" (خطبہ ۹۰) تاکہ مالدار اور فقیر کے شکر اور صبر کو جانچے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "فَاسْتَوْدَعَهُمْ فِيْ اَفْضَلِ مُسْتَوْدَعٍ وَاَقَرَّهُمْ فِيْ خَیْرِ مُسْتَقَرٍّ، تَنَاسَخَتْهُمْ كَرَائِمُ الْاَصْلَابِ اِلٰی مُطَهَّرَاتِ الْاَرْحَامِ" (خطبہ ۹۳) اس نے ان انبیاء کو بہترین سونپے جانے کی جگہوں میں رکھا اور بہترین ٹھکانوں میں ٹھہرایا۔ وہ بلند مرتبہ صلبوں سے پاکیزہ شکموں کی طرف منتقل ہوتے رہے۔

نظم میں بھی بہت سے شعراء کے اقوال موجود ہیں۔

دوسری قسم یعنی لف ونشر غیر مرتب کی مثال امیر المؤمنینؑ کا یہ فرمان ہے : "فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ خَلَقَ الْخَلْقَ حِیْنَ خَلَقَهُمْ غَنِیًّا عَنْ طَاعَتِهِمْ اٰمِنًا مِنْ مَعْصِیَتِهِمْ لِاَنَّهٗ لَا تَضُرُّهٗ مَعْصِیَةُ مَنْ عَصَاهُ وَ لَا تَنْفَعُهٗ طَاعَةُ مَنْ اَطَاعَهٗ" (خطبہ ۱۹۱) اللہ سبحانہ نے جب مخلوقات کو پیدا کیا تو ان کی اطاعت سے بے نیاز اور ان کے گناہوں سے بے خطر ہو کر کارگاہ ہستی میں انہیں جگہ دی کیونکہ اسے نہ کسی معصیت کار کی معصیت سے نقصان اور نہ کسی فرمانبردار کی اطاعت سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جب بے نیازی اور اطمینان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تو اس بے نیازی کی علت یہ بیان کی کہ لوگوں کی اطاعت سے اسے فائدہ نہیں پہنچتا اور ان کی نافرمانی سے اسے نقصان نہیں ہوتا جبکہ معلول دونوں کے برعکس ہیں۔

دوسری صورت جبکہ لف اجمالی صورت میں ہو تو اس کی مثال خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے : "وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی" (بقرہ/۱۱۱) وہ (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یعنی یہودی کہتے ہیں کہ بہشت میں صرف یہودی ہی جائیں گے اور نصرانی کہتے ہیں کہ بہشت میں صرف نصرانی ہی جائیں گے۔ تو یہاں پر دونوں فریقوں کو اور ان کے اقوال کو "قَالُوْا" میں اجمالی طور پر یکجا ہی بیان کر دیا ہے کیونکہ اس میں التباس کا خطرہ نہیں تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ہر فریق دوسرے کو گمراہ جانتا ہے، اور ہر ایک کا یہی عقیدہ ہے کہ جنت میں صرف وہی جائے گا کوئی دوسرا نہیں۔

امیر المؤمنینؑ کے کلام میں ایک جگہ پر اس نوع کی دونوں قسمیں اکٹھی بیان ہوئی ہیں یعنی لف تفصیلی اور لف اجمالی اور اس میں نشر تفصیلی ہے، ملاحظہ فرمایئے : "یَا اَهْلَ الْكُوْفَةِ مُنِیْتُ مِنْكُمْ بِثَلَاثٍ وَ اِثْنَتَیْنِ صُمٌّ ذَوُوْ اَسْمَاعٍ وَ بُكْمٌ ذَوُوْ كَلَامٍ وَ

عُمْيٌ ذَوُوْ اَبْصَارٍ لاَ اَحْرَارُ صِدْقٍ عِنْدَ اللِّقَاءِ وَ لاَ اِخْوَانُ ثِقَةٍ عِنْدَ الْبَلاَءِ "(خطبہ ۹۶)اے اہل کوفہ! میں تمہاری تین اور اس کے علاوہ دو باتوں میں مبتلا ہوں۔ پہلے تو یہ کہ تم کان رکھتے ہو پر بہرے ہو، بولنے چالنے کے باوجود گونگے ہو اور آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہو اور پھر یہ کہ نہ تم جنگ کے موقع پر سچے جوانمرد ہو اور نہ مصیبت میں قابل اعتماد بھائی ہو۔

یہاں پر "ثلاث" اور "اثنین" لف تفصیلی ہیں اور ان ہر دو میں لف اجمالی ہے، پھر ہر ایک کیلئے تفصیلی "نشر" بیان فرمایا ہے اور وہ ہے "صُمٌّ بُكْمٌ اور عُمْيٌ" اس کے بعد اثنین کا نشر تفصیلی بیان کیا ہے اور وہ ہے "لاَ اَحْرَارَ صِدْقٍ" اور "لاَ اِخْوَانَ ثِقَةٍ" اور یہ صرف امیرؑ کے کلام کی خصوصیت اور ان سے مخصوص صفت ہی ہے۔

اقتباس

اقتباس یہ ہوتا ہے کہ کلام میں قرآن مجید سے کوئی کلمہ یا کوئی آیت اس انداز میں ذکر کی جائے کہ کلام کا حصہ نہ ہو اور کلام کو خوبصورت اور مزین کر دے۔ یہ جو تعریف میں کہا گیا ہے کہ کلام کا حصہ نہ ہو، تو اس سے وہ چیز خارج ہو جائے گی جو کلام میں تصریحاً یا اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید سے ہے، جیسا کہ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں: "فَرَضَ حَجَّهُ وَ اَوْجَبَ حَقَّهُ وَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ وَ فَادَتَهُ فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ...... (آل عمران / ۹۷)" (خطبہ اول) اس نے حج کو فرض اور ادائیگی حق کو واجب کیا ہے اور اس کی طرف راہ نوردی فرض کر دی ہے جس طرح کہ اس پاک و پاکیزہ ذات نے فرمایا ہے: لوگوں پر واجب ہے کہ وہ محض خدا کیلئے خانہ کعبہ کا حج کریں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: كَاَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوْا كَلاَمَ اللّٰهِ حَيْثُ يَقُوْلُ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ...... "(خطبہ ۳) گویا انہوں نے اللہ کا یہ ارشاد سنا ہی نہیں تھا کہ یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کیلئے قرار دیا ہے...... تو اس کو اصطلاح میں اقتباس نہیں کہیں گے۔ لہذا جب آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تو اب آتے ہیں اقتباس کی طرف اور وہ جناب امیر المؤمنینؑ کے اس کلام میں کلمہ سے اقتباس کیا گیا ہے، جس میں آپؑ فرماتے ہیں: "تَعَاهَدُوْا اَمْرَ الصَّلٰوةِ وَحَافِظُوْا عَلَيْهَا" (خطبہ ۱۹۸) نماز کی پابندی اور اس کی نگہداشت کرو اور زیادہ سے زیادہ بجالاؤ۔ تو یہ خداوند عالم کے اس فرمان سے اقتباس کیا گیا ہے "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" (بقرہ / ۱۳۸) تمام نمازوں اور خصوصاً نماز وسطیٰ کی انجام دہی میں کوشاں رہو۔ اور اس کلام میں آیت سے اقتباس کیا گیا ہے: "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ" (خطبہ ۶۵) اور نتیجہ میں تم ہی غالب ہو اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو ضائع و برباد نہیں ہونے دے گا۔ اسی طرح اس کلام میں بھی آیت سے اقتباس کیا گیا ہے: "وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِيْنٍ" (خطبہ ۷۰) ٹھہرو کچھ دیر بعد تم بھی اس کی حقیقت کو جان لو گے۔ اس طرح کی صورتیں کلام امیر المؤمنین میں کثرت سے موجود ہیں۔

نظم میں بھی اقتباس پایا جاتا ہے، جیسا کہ ابو الفضائل احمد بن یوسف بن یعقوب اپنے ایک خوبصورت قصیدہ میں اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں زیادہ تر سورہ مریم سے کیا گیا ہے:

لَيْتَ اَنْسَ الْاَحْبَابَ مَا دُمْتُ حَيًّا ۔۔۔ اِذْ نَوَوْا لِلنَّوٰى مَكَانًا قَصِيًّا

وَ تَلَوْا اٰیَۃَ الدُّمُوْعِ فَخَرُّوْا خِیْفَۃَ الْبَیْنِ سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا

وَ بِذِکْرَاھُمْ یُسَبِّحُ دَمْعِیْ کُلَّمَا اشْتَقْتُ بُکْرَۃً وَّ عَشِیًّا

وَ اُنَاجِی الْاِلٰہَ مِنْ فَرْطِ حُزْنِیْ کَمُنَاجَاۃِ عَبْدِہٖ زَکَرِیَّا

وَ اخْتَفٰی نُوْرُھُمْ فَنَادَیْتُ رَبِّیْ فِیْ ظَلَامِ الدُّجٰی نِدَاءً خَفِیًّا

وَھَنَ الْعَظْمُ بِالْبِعَادِ فَھَبْ لِیْ رَبِّ بِالْقُرْبِ مِنْ لَدُنْکَ وَلِیًّا

وَ اسْتَجِبْ فِی الْھَوٰی دُعَآئِیْ فَاِنِّیْ لَمْ اَکُنْ بِالدُّعَآءِ مِنْکَ شَقِیًّا

قَدْ فَرٰی قَلْبِی الْفِرَاقُ وَ حَقًّا کَانَ یَوْمُ الْفِرَاقِ شَیْئًا فَرِیًّا

لَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا فَاِنِّیْ کُنْتُ نَسِیًّا یَوْمَ الْھَوٰی مَنْسِیًّا

کاش کہ جب تک میں زندہ رہوں اپنے پیاروں کو بھولا رہوں کیونکہ انہوں نے جدائی کی خاطر دور دراز کی جگہ کا قصد کیا ہے اور انہوں نے آنسو والی آیت کی تلاوت کی اور جدائی کے خوف سے روتے ہوئے سجدے میں گر پڑے اور میں صبح و شام جب بھی ان کا مشتاق ہوتا ہوں تو ان کی یاد سے میرے آنسو تسبیح پڑھتے ہیں اور میں شدت غم سے اپنے معبود سے اس کے بندے زکریاؑ کی سی سرگوشی اور عجز و مناجات کرتا ہوں۔ ان لوگوں کی روشنی خاموش ہوگئی تو میں نے تاریک رات کی اندھیاروں میں اپنے رب کو تنہائی میں پکارا کہ دوری کی وجہ سے میرے استخوان کمزور ہو چکے ہیں پس اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے ایک قریبی دوست عطا فرما اور محبت کے بارے میں میری دعا کو قبول فرما کیونکہ میں تجھے نہ پکارنے کی وجہ سے شقی نہیں ہوں میرے دل کو جدائی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ جدائی کا دن عجیب شئے تھا۔ کاش! میں اس سے پہلے مر گیا ہوتا، کیونکہ میں محبت کے روز بھولا بسرا ہوا تھا۔

یاد رہے کہ اقتباس شدہ لفظ میں قدرے تبدیلی میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ ارباب بلاغت نے اس کی تصریح کی ہے اور حضرت امیر المؤمنینؑ علی بن ابی طالب کا یہ فرمان ہے کہ : "لَمْ یُوْجِسْ مُوْسٰی خِیْفَۃً عَلٰی نَفْسِہٖ اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَۃِ الْجُھَّالِ" (خطبہ ۴) حضرت موسیٰؑ نے اپنی جان کیلئے خوف کا لحاظ نہیں کیا بلکہ جاہلوں کے غلبہ کا ڈر تھا۔ کیونکہ یہ خداوند عالم کے اس قول سے اقتباس کیا گیا ہے: "وَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی" (طٰہٰ / ۶۷) موسیٰؑ اس وقت اپنے دل میں کچھ ڈرے۔

ایک مغربی شاعر کہتا ہے؛

قَدْ کَانَ مَا خِفْتُ اَنْ یَّکُوْنَا اِنَّا اِلَی اللّٰہِ رَاجِعُوْنَا

میں ڈرتا تھا کہ ہم خدا کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ خداوند عالم کے اس قول "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" سے اقتباس کیا گیا ہے۔

تلمیح

تلمیح یہ ہے کہ "دوران کلام کسی مشہور حدیث، ضرب المثل یا مشہور قصہ کو صراحۃً نہیں بلکہ اشارۃً ذکر کیا جائے"۔ اور

زیادہ خوبصورت اور بلیغ کلام وہ ہوگا جس میں زیادہ سے زیادہ معنی مقصود حاصل ہو۔ نثر میں تلمیح کی مثال حضرت علیؑ کا یہ قول ہے جس میں مشہور حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے "اَلَمْ اَعْمَلْ فِيْكُمْ بِالثَّقْلِ الْاَكْبَرِ وَاَتْرُكْ فِيْكُمُ الثَّقْلَ الْاَصْغَرَ" (خطبہ ۸۶) کیا میں نے تمہارے سامنے ثقل اکبر (قرآن) پر عمل نہیں کیا اور ثقل اصغر (اہل بیتؑ) کو تم میں نہیں رکھا؟ اس میں مشہور بین الفریقین، حدیث ثقلین کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

نظم میں توریہ کے ساتھ ایک شاعر کہتا ہے:

يَابَدْرُ اَهْلُكَ جَارُوْا وَعَلَّمُوْكَ التَّجَرِّيْ وَقَبَّحُوْلَكَ وَصْلِيْ

وَحَسَّنُوْلَكَ هِجْرِيْ فَلْيَفْعَلُوْا مَا اَرَادُوْا لِاَنَّهُمْ اَهْلُ بَدْرِ

اے بدر! تیرے اہل نے تجھ پر ستم کیا اور تجھے جسارت سکھادی اور میرے ساتھ ملنا تیرے لئے برا قرار دیا اور مجھ سے جدائی کو تیرے لئے اچھا قرار دیا، لہذا وہ جو چاہیں کرتے رہیں کیونکہ وہ اہل بدر جو ہوئے! اس میں عامہ کی طرف سے بیان ہونے والی اس روایت کی طرف اشارہ ہے جس میں حاطب کے قتل کے بارے میں بدر کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

مثل میں تلویح کی مثال، امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ قول ہے: "وَنَخَلْتُ لَكُمْ مَخْزُوْنَ رَأْيِيْ لَوْ كَانَ يُطَاعُ لِقَصِيْرٍ اَمْرٌ" (خطبہ ۳۵) اپنی قیمتی رائے کا نچوڑ تمہارے سامنے رکھ دیا تھا، کاش کہ "قصیر" کا حکم مان لیا جاتا۔ اسی طرح ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں: "فَمَا اَتَىٰ عَلَيَّ اٰخِرُ الْقَوْلِ حَتّٰى اَرَاكُمْ مُتَفَرِّقِيْنَ اَيَادِيْ سَبَا" (خطبہ ۹۶) ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوتی کہ تم "اولاد سباء" کی طرح تتر بتر ہو جاتے ہو۔ مذکورہ دونوں کلاموں میں پیش ہونے والے ضرب الامثال کا لطف اس وقت آئے گا جب ان کی تشریح کا موقع آئے گا۔

نظم میں کعب بن زہیر کا قول ہے:

كَانَتْ مَوَاعِيْدُ عَرْقُوْبٍ لَهَا مَثَلاً وَ مَا مَوَاعِيْدُهَا اِلاَّ الْاَبَاطِيْلُ

عرقوب کے وعدے اس (محبوبہ) کیلئے ضرب المثل بن چکے ہیں جبکہ وہ جھوٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ مطرزی مقامات حریری کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: "عرقوب خیبر کا ایک یہودی تھا اور اس قدر جھوٹا تھا کہ جو بھی وعدہ کرتا تھا اسے پورا نہیں کرتا تھا پھر کہتے ہیں کہ حمزہ اصبہانی کہتے ہیں کہ وہ یتْرَب[1] کا رہنے والا تھا۔ جھوٹے وعدوں میں اسے ضرب المثل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ "فلاں عرقوب سے بھی زیادہ وعدہ خلاف ہے" ابی عبید نے وعدہ خلافی کے باب میں اپنی امثال میں عرقوب کی وعدہ خلافیوں کا یوں تذکرہ کیا ہے کہ ابن کلبی کہتے ہیں: "عرقوب، عمالقہ میں سے ایک شخص کا نام ہے جو اپنے بھائی کا سوال پورا کرنے کو یکے بعد دیگرے کھجوروں کے پھولنے، کھجوروں کے ادھ کچرے ہونے، گدرانے، پکنے، پھر خشک ہونے اور آخر کار چھوہارے بن جانے کے اوقات تک ٹالتا رہا، آخر جب چھوہارے بن گئے تو اس نے راتوں رات کھجور کو کاٹ ڈالا اور بھائی کو کچھ نہ دیا۔ اس وقت سے وعدہ خلافی

(۱) یتْرَب "تاء" اور "راء" مفتوحہ کے ساتھ۔ مدینۃ النبیؐ کے قریب ایک مقام کا نام ہے جسے بعض لوگ "یثرب" کہتے ہیں۔ حالانکہ اس جگہ کا نام یتْرَب ہے یثرب نہیں ہے۔ حریری نے اسی بات کی طرف متوجہ کیا ہے۔ (شارح)

میں ضرب المثل ہو گیا"۔ اسی بارے میں اعشیٰ کہتا ہے ؛

وَعَدْتَ وَ كَانَ الْخُلْفُ مِنْكَ سَجِيَّةً مَوَاعِيْدُ عَرْقُوْبٍ اَخَاهُ يَتْرَبَ

تو نے وعدہ کیا ہے اور وعدہ خلافی تیری عادت ہے، جس طرح یترب کے عرقوب نے اپنے بھائی سے وعدہ خلافی کی۔ اسی طرح اس بارے میں اور بھی اشعار ہیں۔

تلمیح میں داستان کی طرف اشارہ، نثر کی صورت میں حضرت امیر المؤمنینؑ کا قول ہے : "اِنَّ امْرَءً ادلَّ عَلىٰ قَوْمِهِ السَّيْفَ وَسَاقَ اِلَيْهِمُ الْحَتْفَ لَحَرِيٌّ اَنْ يَمْقُتَهُ الاَقْرَبُ" (خطبہ ۱۹) جو شخص اپنی قوم پر تلوار چلادے اور اس کی طرف موت کو دعوت اور ہلاکت کا بلا وادے وہ اسی قابل ہے کہ قریبی اس سے نفرت کریں۔ اسی طرح ایک اور قول ہے : "اَيْهٍ اَبَاوَذْحَةَ" (خطبہ ۱۱۵) ہاں ابو وذحہ اور کچھ ؟ مذکورہ بالا دونوں کلاموں میں دو مختلف داستانوں کی طرف اشارہ ہے، ایک تو اشعث بن قیس ملعون کی داستان کی طرف جب اس نے اپنی قوم کے ساتھ غداری کی تھی اور دوسرا حجاج ملعون کی داستان کی طرف جب اسے خنفساء (گبریلے) نے کاٹ لیا تھا اور اس سے اس کی موت واقع ہوئی۔ انشاء اللہ ان کی تفصیل اپنے اپنے مقامات پر آئے گی۔

نظم میں تلمیح کی مثال، شاعر کا یہ قول ہے ؛

فَوَ اللّٰهِ مَا اَدْرِيْ اَحْلَامُ نَائِمٍ اَلَمَّتْ بِنَا اَمْ كَانَ فِي الرَّكْبِ يُوْشَعُ

تو خدا کی قسم! مجھے نہیں معلوم کہ آیا ہمیں نیند میں خواب نظر آرہے ہیں یا واقعاً سواروں میں کوئی یوشعؑ بھی ہے ؟ یہ حضرت موسیٰ کے جوان یوشع بن نونؑ کی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کیلئے ڈوبتا ہوا سورج واپس پلٹ آیا تھا۔ کیونکہ روایت میں ہے کہ ان کی جابر اور ظالم لوگوں کے ساتھ جمعہ کے دن لڑائی ہو گئی تھی اور سارا دن جنگ جاری رہی جب سورج ڈوبنے لگا تو انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ غروب آفتاب سے پہلے تک جنگ ختم نہیں ہو گی اور ہفتہ (سنیچر) کے دن جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے خدا سے دعا مانگی اور ڈوبتا ہوا سورج واپس پلٹ آیا اور اس وقت تک غروب نہیں ہوا جب تک جنگ ختم نہیں ہو گئی تھی۔

تعریض

تعریض یہ ہے کہ "ایسا کلام پیش کیا جائے جو کسی ایک معنی پر دلالت کر رہا ہو لیکن وہم یہ پیدا کیا جائے کہ اس سے غرض کسی اور معنی کی ہے"۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے : "وَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ" (بقرہ / ۲۲۵) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم اشارے کنائے سے (ان) عورتوں سے خواستگاری کرو۔

تعریض سے مقصود :

۱۔ یا تو موصوف کی بلندی شان، علو مقام اور رفعت منزلت ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے مثلاً "وزارت عظمیٰ کا یہ حکم ہے" جبکہ مقصود وزیر اعظم کا نام ہوتا ہے لیکن اس کی رفعت منزلت کی وجہ سے اس کا نام نہیں لیا جاتا...

اسی سلسلہ میں حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں "دَلِيْلُهَامَكِيْثُ الْكَلَامِ بَطِيْءُ الْقِيَامِ سَرِيْعٌ اِذَا قَامَ" (خطبہ ۹۹) اس پرچم کی

رہنمائی کرنے والا وہ ہے جو بات کرنے میں جلد بازی نہیں کرتا (پوری طرح غور کرنے کیلئے) اپنے اقدام میں تاخیر کرتا ہے اور جب کسی امر کو لے کر کھڑا ہو جائے تو پھر تیز گام ہے۔ اس تعبیر میں جس کنایہ سے کام لیا گیا ہے وہ ہے حضرتؑ کی اپنی ذات والا صفات کی عظمت و جلالت کا اظہار، لیکن اپنا ذکر کئے بغیر صفات بتادیں۔

۲۔ یا پھر مقصود خوبصورت اور نرم انداز میں نکاح کی ترغیب دلانا ہے، جیسے کسی عورت سے نکاح کی غرض سے کہا جائے "بہت سے لوگ تمہارے بارے میں دلچسپی رکھتے ہیں" یا "بہت سے لوگوں کو تمہارے وصل کی خواہش ہے" یا "تم ایک نیک اور خوبصورت خاتون ہو تمہیں شوہر کے بغیر نہیں ہونا چاہئے!" وغیرہ۔

۳۔ یا کسی کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے اسے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کوئی ضرورت مند کسی سے کہتا ہے "آپ کو سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں" یا "آپ کی زیارت کیلئے آیا ہوں!" وغیرہ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقاصد کیلئے اس کا استعمال ہوتا ہے، لیکن ان تمام میں سب سے بہتر حضرت امیرؑ کا یہ فرمان ہے: "وَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنَّهُ لاَيَنْبَغِي اَنْ يَكُوْنَ الْوَالِيْ عَلَى الْفُرُوْجِ وَالدِّمَآءِ وَالْمَغَانِمِ وَالاَحْكَامِ وَاِمَامَةِ الْمُسْلِمِيْنَ الْبَخِيْلَ فَيَكُوْنَ فِي اَمْوَالِهِمْ نَهْمَتُهُ وَلاَالْجَاهِلَ فَيُضِلَّهُمْ بِجَهْلِهِ وَلاَالْجَافِيْ فَيَقْطَعَهُمْ بِجَفَائِهِ وَلاَ الْحَائِفَ لِلدُّوَلِ فَيَتَّخِذَ قَوْمًادُوْنَ قَوْمٍ وَلاَالْمُرْتَشِيْ فِي الْحُكْمِ فَيَذْهَبَ بِالْحُقُوْقِ وَيَقِفَ بِهَادُوْنَ الْمَقَاطِعِ وَلاَالْمُعَطِّلَ لِلسُّنَّةِفَيُهْلِكَ الأُمَّةَ" (خطبہ ۱۳۱) اے لوگو! تمہیں یہ معلوم ہے کہ ناموس، خون، مال غنیمت، (نفاذ) احکام اور مسلمانوں کی پیشوائی کیلئے کسی طرح مناسب نہیں کہ کوئی بخیل حاکم ہو، کیونکہ اس کے دانت مسلمانوں کے مال پر لگے رہیں گے۔ اور نہ کوئی جاہل کہ وہ انہیں اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کردے گا اور نہ کوئی کج خلق کہ وہ تند مزاجی سے چرکے لگاتا رہے گا، نہ کوئی مال و دولت میں بے راہ روی کرنے والا کہ وہ کچھ لوگوں کو دے گا اور کچھ کو محروم کردے گا اور نہ فیصلے کرنے میں رشوت لینے والا کہ وہ دوسروں کے حقوق کو رائیگاں کردے گا اور انہیں انجام تک نہ پہنچائے گا اور نہ کوئی سنت کو بیکار کردینے والا کہ وہ امت کو تباہ و برباد کردے گا۔

اس میں ان لوگوں کیلئے تعریض ہے جو منصب کے نااہل ہونے کے باوجود اسے ہتھیائے ہوئے ہوتے ہیں اور مذموم صفات اور رذیل اخلاق کے مالک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: "لَمْ تَكُنْ بَيْعَتُكُمْ اِيَّايَ فَلْتَةً" (خطبہ ۱۳۶) تم نے میری بیعت اچانک اور سوچے سمجھے بغیر نہیں کی۔ یہ خلیفہ اول پر تعریض ہے کیونکہ بقول خلیفہ ثانی ان کی اچانک اور بے سوچے سمجھے بیعت کی گئی تھی۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "لَمْ يُسْهِمْ فِيْهِ عَاهِرٌوَلاَضَرَبَ فِيْهِ فَاجِرٌ" (خطبہ ۲۱۲) آپ کے نسب میں کسی بدکار کا ساجھا اور کسی فاسق کی شرکت نہیں۔ اس کلام میں کچھ منافقین پر تعریض ہے جن کے نسب میں گڑبڑ تھی۔

نظم میں ابو فراس بن حمدان کے اشعار ہیں جن میں اس نے علویوں کی تعریف کی ہے اور امویوں پر تعریض:

مَافِيْ دِيَارِهِمْ لِلْخَمْرِ مُعْتَصِرٌ وَ لاَ بُيُوْتُهُمْ لِلسُّوْءِ مُعْتَصِمٌ
وَ لاَ تَبِيْتُ لَهُمْ خُنْثٰى تُنَادِمُهُمْ وَ لاَ يُرىٰ لَهُمْ قِرْدٌ لَهُ حَشَمٌ

نہ تو ان کے گھروں میں کوئی شراب نچوڑنے والا ہے اور نہ ان میں کسی قسم کی برائی کو دسترس حاصل ہے۔ اور نہ تو ان کے ہاں کوئی

خواجہ سرا شراب پیتے پلاتے راتیں گزار دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس کوئی بندر ہے جس کی خدمت پر نوکر چاکر مامور ہوں۔ "خنثیٰ" سے اس نے معتصم کا ندیم "عبادہ" مراد لیا ہے اور "قرد" (بندر) سے اس کی مراد زبیدہ کا بندر ہے جس کے متعلق اس نے لوگوں کو اس پر سلام کرنے کا حکم دے رکھا تھا اور اس کیلئے نوکر چاکر مقرر کیے ہوئے تھے۔ آخر کار اس بندر کو یزید بن مزید شیبانی نے مار ڈالا تھا۔

ایک ضروری بات:

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ چند وجوہ کی بنا پر تعریض، تصریح سے زیادہ بہتر اور راجح ہے۔ چونکہ:

۱۔ نفس فاضلہ کا میلان معانی کے استنباط کی طرف ہوتا ہے، لہذا وہ تعریض کا زیادہ خواہشمند ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی فکر سے معنی کو ڈھونڈھ نکالے۔

۲۔ تعریض کے ذریعہ ہیبت اور حشمت کے پردے بحال رہتے ہیں۔

۳۔ واضح الفاظ میں نہی کرنے سے سننے والے کے دل میں رنجش پیدا ہو سکتی ہے جبکہ تعریض سے ایسا نہیں ہوتا اور یہ بات واضح ہے۔

۴۔ تصریح کی صرف ایک صورت ہوتی ہے جبکہ تعریض کی کئی صورتیں اور متعدد رستے ہوتے ہیں۔

ایغال

کلام (خواہ نظم ہو یا نثر) کو ایسے مفید نکتے پر ختم کرنا، جس کے بغیر بھی کلام اپنا معنی پورا پورا دے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ" (یٰس / ۲۰۔۲۱) اس نے کہا: اے میری قوم! رسولانِ خدا کی پیروی کرو اور ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں۔ یہاں "وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ" کے بغیر بھی کلام کا معنی مکمل ہو جاتا ہے، کیونکہ رسول یقیناً ہدایت یافتہ ہی ہوتے ہیں لیکن اس میں ایغال کی افادیت یہ ہے کہ اس طرح سے ان لوگوں کو اتباع کیلئے زیادہ سے زیادہ آمادہ کرنا اور رسولوں کی طرف رغبت دلانا مقصود ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ: اے لوگو! تمہیں ان کے ساتھ ملے رہنے سے کوئی دنیوی نقصان نہیں ہے بلکہ صحیح دین کا منافع بھی ملے گا جس سے تمہاری دنیا اور آخرت سنور جائے گی۔ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں: "وَنَحْنُ عَلٰى مَوْعُوْدٍ مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مُنْجِزٌ وَعْدَهٗ وَ نَاصِرٌ جُنْدَهٗ" (خطبہ ۱۴۶) اور ہم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کو پورا کریگا اور اپنے لشکر کی خود ہی مدد کرے گا۔ آپؑ کا یہ فرمانا "خدا اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے" ایغال سے متعلق ہے، اس کی مزید تفصیل اپنے مقام پر آئے گی......

ایجاز

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ "امکانی حدود تک کم از کم الفاظ کے ساتھ معنی کو ظاہر کرنا" اور اس کی خوبصورتی کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ متکلم کو فصاحت پر کس قدر قدرت حاصل ہے؟ اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایجاز قصر ۲۔ ایجاز حذف

ا۔ ایجاز قصر یہ ہوتا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی حاصل کئے جائیں۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤمَرُ" (حجر / ۹۴) جس چیز کیلئے مامور ہوا سے کھول کر بیان کردو۔ تین لفظوں نے تمام شرائط رسالت بیان کردئے ہیں۔ اسی طرح ارشاد خداوندی ہے: "خُذِ الْعَفْوَ وَ أمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الجَاهِلِيْنَ" (اعراف / ۱۹۹) ان سے نرمی برتو، ان کا عذر قبول کرلو، انہیں نیکیوں کی طرف دعوت دو اور جاہلوں سے رخ موڑلو اور ان سے جھگڑا نہ کرو۔ ان تین جملوں میں تمام مکارم اخلاق کو بیان کردیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: اس میں تمام مکارم اخلاق جمع ہیں کیونکہ "اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ نَبِيَّهُ فِي هٰذِهِ الآيَةِ بِمَكَارِمِ الاَخْلاَقِ وَلَيْسَ فِي الْقُرْآنِ آيَةٌ اَجْمَعُ لِمَكَارِمِ الاَخْلاَقِ مِنْهَا" خداوند عالم نے اس آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو تمام مکارم اخلاق کا دستور دیا ہے اور قرآن مجید میں اس آیت سے بڑھ کر اور کوئی آیت مکارم اخلاق کیلئے جامع آیت نہیں ہے۔ اسی طرح خداوند عالم ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "لِكَيْلاَ تَاسَوْا عَلىٰ مَافَاتَكُمْ وَلاَ تَفْرَحُوْا عَلىٰ مَا اٰتٰكُمْ" (حدید / ۲۳) یہ اس لئے ہے تاکہ جو کچھ تم نے گنوایا ہے اس پر غمگین نہ ہونا اور جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس پر خوش نہ ہونا۔ اس آیت کے بارے میں امام الزاہدین علی بن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: "جُعِلَ الزُّهْدُ بَيْنَ كَلِمَتَيْنِ مِنَ الْقُرْآنِ" قرآن مجید کے دو کلموں کے اندر تمام زہد کو سمو دیا گیا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے "لِكَيْلاَ تَاسَوْا" تو جو شخص گذشتہ پر افسوس نہیں کرتا اور آئندہ پر خوش نہیں ہوتا وہ زہد کے دونوں اطراف کو حاصل کرلیتا ہے۔۔۔ ....

اس کلام کے پرتو میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کا یہ فرمان ملاحظہ فرمائیے: "فَاِنَّ الْغَايَةَ اَمَامَكُمْ وَ اِنَّ وَرَائَكُمُ السَّاعَةَ تَحْدُوْكُمْ تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِاَوَّلِكُمْ آخِرُكُمْ" (خطبہ ۲۱) تمہاری منزل مقصود تمہارے سامنے ہے موت کی ساعت تمہارے عقب میں ہے جو آگے اور پیچھے کی طرف سے لے کر چل رہی ہیں، ہلکے پھلکے رہو تاکہ آگے بڑھنے والوں کو پاسکو۔ تمہارے اگلوں کو تمہارے پچھلوں کا انتظار کرایا جارہا ہے کہ یہ بھی ان تک پہنچ جائیں۔

اس کلام کا اختصار ملاحظہ فرمائیے اور پھر دیکھئے کہ اس میں کس قدر وسیع معانی پوشیدہ ہیں وہ یوں کہ ایک تو اس میں دنیا کے زوال و فنا کی طرف اشارہ ہے اور "تَخَفَّفُوْا" کے ساتھ دنیا و مافیہا سے زہد اختیار کرنے کا کنایہ ہے۔ اس لئے سید رضیؒ اس کلام کے آخر میں فرماتے ہیں: "آپؑ کا یہ ارشاد کہ "تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا" اس سے بڑھ کر تو کوئی جملہ سننے ہی میں نہیں آیا جس کے الفاظ کم اور معانی بہت ہوں۔ اللہ اکبر! اس کلمہ کے معانی کتنے بلند اور اس حکمت کا چشمہ صاف و شفاف ہے!!..........."۔ اسی نوع سے علم الٰہی کے بارے میں آپؑ کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے جو باب الحکم میں موجود ہے، جب آپؑ سے توحید و عدل الٰہی کے بارے میں سوال کیا گیا تو جواب میں فرمایا: "اَلتَّوْحِيْدُ اَنْ لاَ تَتَوَهَّمَهُ وَالْعَدْلُ اَنْ لاَتَتَّهِمَهُ" (حکمت ۴۷۰) توحید یہ ہے کہ اسے اپنے وہم و تصور کا پابند نہ بناؤ اور عدل یہ ہے کہ اس پر الزامات نہ لگاؤ۔ اسی طرح دنیا سے نفرت دلانے کیلئے باب الحکم کے مختصر لفظوں میں ارشاد فرماتے ہیں: "اِذَا كُنْتَ فِيْ اِدْبَارٍ وَالْمَوْتُ فِيْ اِقْبَالٍ فَمَا اَسْرَعَ الْمُلْتَقٰى" (حکمت ۲۸) جب تم دنیا کو پیٹھ دکھا رہے ہو اور موت تمہاری طرف رخ کئے ہوئے بڑھ رہی ہے، تو پھر ملاقات میں دیر کیسی؟ قناعت کے سلسلے میں فرماتے ہیں: "اَشْرَفُ الْغِنٰى تَرْكُ الْمُنٰى" (حکمت ۳۴) بہترین دولت مندی تمناؤں کا ترک کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اس قسم کے اور بھی بہت سے ارشادات ہیں جو اس

باب میں بیان ہوں گے، انشاء اللہ۔ اس لئے طوالت کے خوف سے انہیں یہاں پر بیان نہیں کیا جاتا۔

نظم میں بھی یہی نوع موجود ہے، جیسا کہ فرزدق شاعر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی تعریف و توصیف میں کہتے ہیں :

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَائُهٗ نَعَمْ

انہوں نے تشہد کے علاوہ کہیں پر بھی "لا" (نہیں) نہیں فرمایا، اگر تشہد میں بھی ایسا کہنا نہ ہوتا تو آپؑ کا یہ "لا" بھی "نَعَمْ" (ہاں) ہوتا۔ اس شعر میں کلام کا اختصار دیکھئے کہ صرف ایک ہی جملہ میں امام سجادؑ کے جود و سخا کی صفت کو اس کے تمام اطراف و جوانب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور سخاوت کے کسی گوشہ کو نہیں چھوڑا گیا، اس سے بڑھ کر کوئی اور ایسا لفظ تصور میں بھی نہیں آسکتا جو اختصار کے باوجود معنی کے ہمہ اطراف و جہات کی گہرائی اور گیرائی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہو۔

۲۔ ایجاز حذف : اور اس کے کئی فوائد ہیں ؛

ا۔ محذوف کے ظہور کی بنا پر بے مقصد باتوں سے احتراز اور اختصار کی خوبی کو اپنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپؑ کا باب الحکم میں ارشاد ہے : "مِسْكِيْنٌ ابْنُ اٰدَمَ مَكْتُوْمُ الْاَجَلِ مَكْنُوْنُ الْعِلَلِ مَحْفُوْظُ الْعَمَلِ" (حکمت ۴۱۹) بیچارہ آدمی کتنا بے بس ہے موت اس سے نہاں بیماریاں اس سے پوشیدہ اور اس کے اعمال محفوظ ہیں۔ یہاں پر مسند الیہ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کا ظاہر اپنے مقصود پر دلالت کر رہا ہے۔

ب۔ موقع کی نزاکت اور موجودہ صورت حال ہی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ محذوف کو بیان نہ کیا جائے ورنہ اہم مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ "تحذیر" اور "اغراء" کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اور یہی چیزیں آپؑ کے کلام بلاغت نظام میں بڑی حد تک ملتی ہیں۔ مثلاً "تحذیر" کے سلسلے میں فرماتے ہیں : "اِيَّاكُمْ وَ التَّلَوُّنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ" (خطبہ ۱۷۵) دین خدا میں رنگ بدلنے سے بچو!۔ اور اسی خطبہ میں "اغراء" کے سلسلے میں فرماتے ہیں : "اَلْعَمَلَ اَلْعَمَلَ ثُمَّ النِّهَايَةَ النِّهَايَةَ وَ الْاِسْتِقَامَةَ الْاِسْتِقَامَةَ ثُمَّ الصَّبْرَ الصَّبْرَ وَ الْوَرَعَ الْوَرَعَ" (خطبہ ۱۷۵) عمل کرو عمل کرو عاقبت و انجام کو دیکھو استوار و برقرار ہو پھر یہ کہ صبر کرو صبر کرو تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو۔

کبھی "تحذیر" اور "اغراء" کو ایک جگہ پر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپؑ فرماتے ہیں : "فَالْحَذَرَ الْحَذَرَ اَيُّهَا الْمُسْتَمِعُ وَ الْجِدَّ الْجِدَّ اَيُّهَا الْغَافِلُ" (خطبہ ۱۳۲) اے سننے والو! ڈرو ڈرو اور اے غفلت کرنے والو! کوشش کرو کوشش کرو۔

ج۔ دوران کلام میں کثرت سے استعمال ہونے والے لفظ کو تخفیف کیلئے حذف کرنا، جیسے حرف ندا کا حذف کرنا۔

د۔ مسند الیہ کی تعظیم و احترام کے پیش نظر اسے حذف کر دینا۔

ہ۔ مسند الیہ کی توہین و تحقیر کو پیش نظر رکھ کر اسے حذف کر دینا کہ زبان پر اس کا نام لینا گوارا نہ ہو، جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام اشعث بن قیس کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں : "عَلَيْكَ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ لَعْنَةُ اللَّاعِنِيْنَ حَائِكٌ ابْنُ حَائِكٍ وَ مُنَافِقٌ ابْنُ كَافِرٍ" (خطبہ ۱۹) تجھ پر اللہ کی پھٹکار اور لعنت کرنے والوں کی، جولاہے کا بیٹا جولاہا اور کافر کی گود میں پلنے والا منافق! یہاں پر مسند الیہ کو اس کی حقارت کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں : "عَجَبًا لِابْنِ النَّابِغَةِ

يَزْعَمُ لِاَهْلِ الشَّامِ اَنَّ فِيَّ دُعَابَةً "(خطبہ ۸۸) نابغہ کے بیٹے پر حیرت ہے کہ وہ میرے بارے میں اہل شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مسخرہ پن پایا جاتا ہے۔ یہاں پر "ابن نابغہ" کے موصوف (فرزند عاص) کو اس کی حقارت کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے۔

ز۔ وزن اور فاصلے کی مناسبت کو پیش نظر رکھ کر مسند الیہ کو حذف کر دینا، جیسا کہ حضرتؑ نے اشعث بن قیس کو تعزیت دیتے ہوئے فرمایا: "اِنْ صَبَرْتَ صَبْرَ الاَكَارِمِ وَ اِلَّاسَلَوْتَ سُلُوَّ الْبَهَائِمِ "(حکمت ۴۱۴) اگر بزرگوں کی طرح تو نے صبر کیا تو خیر! ورنہ چوپاؤں کی طرح ایک دن بھول جاؤ گے۔ یہاں پر مذکورہ صورت کے پیش نظر جواب شرط اور جزا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایجاز کے اور بہت سے فوائد ہیں جنہیں ارباب بلاغت نے "مسند الیہ کے حذف" کے باب میں ذکر کیا ہے۔

نظم میں بھی یہی چیز موجود ہے، مثلاً شاعر کہتا ہے ؛

اَنَا ابْنُ جَلاً وَ طَلاَّعِ الثَّنَايَا		مَتىٰ اَضَعُ الْعَمَامَةَ تَعْرِفُوْنِي

میں جلاء کا بیٹا ہوں اور گھاٹیوں پر چڑھنے والا جب میں عمامہ اتاروں گا تم مجھے پہچانو گے اصل میں "اَنَا ابْنُ رَجُلٍ جَلاَ الْاُمُوْرَ" ہے۔

تجانس

اسے جناس، تجنیس اور مجانست بھی کہتے ہیں۔ اور یہ سارے الفاظ "جنس" سے مشتق ہیں اور اس کا لغوی معنی ہے "دو چیزوں کا ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک ہی جنس کے تحت داخل ہونا"۔ اور اصطلاحی معنی ہے "دو کلموں کا ایک لفظ (تلفظ) یا ایک خط (تحریر) میں باہم مشابہ ہونا"۔ اس کی کئی قسمیں ہیں لیکن ہم یہاں پر صرف وہی اقسام بیان کریں گے جو ارباب بلاغت کے درمیان رائج اور کلام امیر المؤمنین علیہ السلام میں موجود ہیں۔

ا۔ تجانس تام:۔ اس کا دوسرا نام تجانس کامل بھی ہے اور اس کی تعریف یہ ہے کہ "دو لفظ، حروف کی اقسام اور حرکات و سکنات اور تعداد و ترتیب میں ایک دوسرے سے متفق ہوں" پس اگر دونوں الفاظ ایک نوع یعنی دونوں اسم یا دونوں فعل ہوں تو اسے "مماثل" کہا جائے گا اور اگر دونوں کی نوع مختلف ہو یعنی اسم اور فعل یا اسم اور حرف یا فعل اور حرف ہو تو اسے "مستوفی" کہا جائے گا۔ اور اس نوع کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ احسن انداز میں فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے جبکہ کلمات کی صورت کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ جب کہ خداوند عالم کا ارشاد مقدس ہے: "يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَالَبِثُوْاغَيْرَسَاعَةٍ" (روم / ۵۵) اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو گناہگار قسمیں کھائیں گے کہ وہ عالم برزخ میں ایک ساعت سے بھی زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ بہت سے علماء علم بیان نے یہی مثال بیان کی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کیلئے اس کے علاوہ اور کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ جبکہ بعض حضرات نے یہ آیت بھی بطور مثال ذکر کی ہے "يَكَادُسَنَابَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالاَبْصَارِ يُقَلِّبُ اللّٰهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَاِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُوْلِي الاَبْصَارِ" (نور / ۴۳۔۴۴) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں (کی بینائی ہی) کو لے جائے۔ اللہ تعالیٰ رات اور دن کو الٹ پھیر کرتا ہے اور اس میں صاحبان بصیرت کیلئے عبرت ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں "ابصار" جمع ہے "بصر" کی جس کا معنی ہے "نگاہ" اور دوسری آیت میں بھی "بصر" کی جمع ہے لیکن اس کا معنی "عقل" ہے۔ اسی طرح حضرت امیر علیہ

السلام کا ارشاد ہے کہ : "وَمَنْ اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ وَمَنْ اَبْصَرَ اِلَيْهَا اَعْمَتْهُ" (خطبہ ۸۱) جو شخص دنیا کو عبرت کا آئینہ سمجھ کر دیکھتا ہے تو وہ اس کو روشن و بینا کر دیتی ہے اور جو صرف دنیا پر نظر رکھتا ہے تو وہ اسے کور و نابینا بنا دیتی ہے۔ اس میں پہلے "ابصر" کا معنی ہے عقل و خرد سے کام لینا اور دنیا کو عبرت کا آلہ بنانا، جبکہ دوسرے "ابصر" کا معنی ہے اچنتی نگاہوں سے دیکھنا۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں : "فَالْبَصِيرُ مِنْهَا شَاخِصٌ وَالْاَعْمىٰ اِلَيْهَا شَاخِصٌ وَالْبَصِيرُ مِنْهَا مُتَزَوِّدٌ وَالْاَعْمىٰ لَهَا مُتَزَوِّدٌ" (خطبہ ۱۳۳) نگاہ رکھنے والا اس سے نکلنا چاہتا ہے اور اندھا اسی پر نظریں جمائے رہتا ہے، اس میں پہلا "شَاخِص" رحلت کرنے والے کے معنی میں ہے اور دوسرا ایسی چیز پر نظریں جمانے والے کے معنی میں ہے جو اس کے سامنے ہو۔ (البتہ اس بارے میں کافی گفتگو کی گئی ہے جسے یہاں پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے)۔...............................

۲۔ تجانس محرف :۔ تجانس محرف یہ ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ حروف، تعداد اور ترتیب میں متفق لیکن ہیئت میں مختلف ہوں۔ یہ اختلاف یا تو حرکت کے ذریعہ ہوگا، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے : "وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِيْنَ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ" (الصافات / ۷۲۔ ۷۳) ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے تھے دیکھو جنہیں ڈرایا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔ جبکہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے : "عَجَزَ الْمُقَوِّمُ وَ اَعْضَلَ الْمُقَوَّمُ" (خطبہ ۲۶) سیدھا کرنے والا عاجز آگیا اور جسے سیدھا کیا جا رہا ہے وہ لا علاج ثابت ہوا۔ اس طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ : "بَيْنَ قَتِيْلٍ مَظْلُوْلٍ وَ خَائِفٍ مُسْتَجِيْرٍ يَخْتَلُوْنَ بِعَقْدِ الْاَيْمَانِ وَ بِغُرُوْرِ الْاِيْمَانِ" (خطبہ ۱۵۱) کچھ تو ان میں سے شہید ہوں گے کہ جن کا بدلہ نہ لیا جائے گا اور کچھ خوف زدہ ہوں گے جو اپنے لئے پناہ ڈھونڈتے پھریں گے انہیں قسموں اور ظاہری زبان کی فریب کاریوں سے دھوکہ دیا جائے گا۔ پہلا لفظ "أیمان" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ "یمین" کی جمع ہے اور دوسرا لفظ "اِیمان" ہے جو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے وہی اسلام کا ساتھی۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں : "فَاِنَّ التَّقْوىٰ فِي الْيَوْمِ الْحِرْزُ وَ فِيْ غَدٍ الطَّرِيْقُ اِلَى الْجَنَّةِ" (خطبہ ۱۹۰) تقویٰ آج دنیا میں پناہ و سپر ہے اور کل جنت کی راہ ہے۔

نظم میں بھی یہی چیز پائی جاتی ہے، جیسے ابو العلاء معری کا یہ شعر ہے :

لِغَيْرِيْ زَكٰوةٌ مِنْ جَمَالٍ فَاِنْ يَكُنْ ‌ ‌ ‌ ‌ زَكٰوةُ جَمَالٍ فَاذْكُرِيْ ابْنَ سَبِيْلٍ

میرے علاوہ دوسروں کو اونٹوں کی زکوٰۃ جاری ہے، لیکن اے میری محبوبہ اگر جمال (حسن) کی زکوٰۃ ہو تو (مجھ) پردیسی کو یاد رکھنا۔ اسی طرح اس کا ایک اور شعر ہے :

وَ الْحُسْنُ يَظْهَرُ فِيْ شَيْئَيْنِ رَوْنَقُهُ ‌ ‌ ‌ ‌ بَيْتٍ مِنَ الشِّعْرِ اَوْ بَيْتٍ مِنَ الشَّعَرِ

حسن تو بس دو ہی چیزوں میں بھلا لگتا ہے یا شعر کے بیت میں یا بالوں کے گھر (خیمہ) میں۔ چنانچہ پہلے دو کلمات (جمال اور شعر) پہلے حرف کے کسرہ (زیر) کے ساتھ ہیں اور دوسرے دو، پہلے حرف کے فتحہ (زبر) کے ساتھ۔

یا پھر یہ اختلاف حرکت اور سکون دونوں کے ذریعہ ہوگا، یعنی دو ہم جنس الفاظ میں سے ایک متحرک اور ایک ساکن ہوگا۔ جیسے امیر علیہ السلام کا قول ہے : "لَا تَرَى الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطًا اَوْ مُفَرِّطًا" (حکمت ۷۰) جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد

سے بڑھا ہوا ورِیا اس سے بہت پیچھے۔ یہاں پر پہلا لفظ "فا" کے سکون کے ساتھ اور دوسرا اس کی زبر کے ساتھ ہے اور تشدید کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یا پھر حرکت اور سکون کا یکجا اختلاف ہوگا یعنی ان میں سے ایک حرف ساکن ہوگا اور ایک متحرک اور ساتھ ہی متحرک حروف کی حرکت میں بھی اختلاف ہوگا، جیسے امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں :" فَمَاأَقَلَّ مَنْ قَبِلَهَا وَ حَمَلَهَا حَقَّ حَمْلِهَا "(خطبہ ۱۹۰) خداوند عالم جب اپنی بخشی ہوئی نعمتوں کے بارے میں سوال کرے گا تو اسے قبول کرنے والے اور اس کا پورا پورا حق ادا کرنے والے بہت ہی تھوڑے نکلیں گے۔ اسی طرح عرب کہتے ہیں "رَطْبُ الرُّطَبِ ضَرْبٌ مِنَ الضَّرَبِ" کھجور کی تازگی اس کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

نظم میں بھی ایسا ہی ہے ؛

لَيْلِيْ وَ لَيْلىٰ نَفیٰ نَوْمِيْ اِخْتِلاَفُهُمَا ۔۔۔ بِالطَّوْلِ وَ الطُّوْلِ لَوِ اعْتِدَالاً
يَجُوْدُ بِالطَّوْلِ لَيْلِيْ كُلَّمَا بَخِلَتْ ۔۔۔ بِالطُّوْلِ لَيْلىٰ وَ اِنْ جَادَتْ بِهِ بَخِلاً

لیلیٰ اور میری آج کی رات نے باہمی چپقلش میں میری نیند کو اڑادیا، ایک نے اپنے کرم واحسان کی وجہ سے اور دوسری نے اپنی درازی کی وجہ سے، کیا ہی خوشی کی بات ہوتی کہ اگر دونوں اعتدال کا راستہ اختیار کرتیں !!۔ وہ یوں کہ جب لیلیٰ احسان میں بخل کرتی تو رات درازی میں سخاوت کرتی اور اگر لیلیٰ کرم وعطا میں سخاوت کرتی تو رات درازی میں بخل سے کام لینا شروع کردیتی۔ اسی طرح اس موقع پر امیر المؤمنینؑ کا سابقہ قول "بِعُقَدِ الاَيْمَانِ وَ بِعُرُوْرِ الاِيْمَانِ "(خطبہ ۱۵۱) کو بھی بطور مثال ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ تجانس ناقص :۔ تجانس ناقص یہ ہوتا ہے کہ دو لفظ، حروف، ترتیب اور ہیئت میں ایک جیسے اور باہم متفق ہوں لیکن تعداد حروف میں مختلف ہوں یعنی ان میں سے ایک لفظ میں حروف کی تعداد دوسرے سے زیادہ ہو۔ اگر وہ زائد حرف حذف کردیا جائے تو پھر دونوں میں تعداد کا فرق بھی ختم ہو جائے۔

اس قسم کی زیادتی یا تو کلمہ کے اول میں ہوگی یا پھر آخر میں۔ جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں :"كَيْفَ اَصْبَحَتْ بُيُوْتُهُمْ قُبُوْرًا وَمَاجَمَعُوْا بُوْرًا "(خطبہ ۱۳۲) کس طرح ان کے گھر قبروں میں بدل گئے اور جمع شدہ پونجی تباہ ہوگئی۔ نظم میں بھی ہوتا ہے، جیسا کہ رشید وطواط کہتے ہیں ؛

يَا خَلِيَّ الْبَالِ قَدْ بَلْبَلْتَ بِالْبَلْبَالِ بَال ۔۔۔ بِالنَّوىٰ زَلْزَلْتَنِيْ وَالْعَقْلُ فِى الزِلْزَالِ زَال
يَارَشِيْدَالْقَدِّ قَدْ قَوَّسْتَ قَدِّيْ فَاسْتَقِمْ ۔۔۔ فِى الْهَوىٰ فَافْرَغْ وَقَلْبِيْ شَاغِلُ الْاَشْغَالِ غَال
يَااَسِيْلَ الْخَدِّخَدَّالدَّمْعُ خَدِّيْ فِى النَّوىٰ ۔۔۔ عَبْرَتِيْ وَدَقٌ وَ عَيْنِيْ مِنْكَ يَا ذَا الْخَالِ خَال

اے فکر واندوہ سے خالی دل والے ! تو نے سخت غم کی وجہ سے میرے دل کو ہیجان میں ڈال دیا ہے۔ تو نے مجھے دوری اور جدائی کی وجہ سے لرزادیا ہے، جبکہ اس لرزش میں عقل جواب دے گئی ہے۔ اے خوبصورت قد والے جوان رعنا ! تو نے میرا قد (کمان کی طرح) جھکادیا ہے، لہذا تو محبت میں اعتدال سے کام لے اور غم سے فارغ البال رہ۔ جبکہ میرا دل طرح طرح کی مصروفیات میں الجھا

ہوا ہے اور غم حد سے بڑھا ہوا ہے۔ اے نرم رخسار والے! آنسوؤں نے میرے رخسار کو چھیل کر اس میں گڑھے بنا دیئے ہیں۔ اے رخسار پر تل والے! میرے آنسو بارش بنے ہوئے ہیں جبکہ میری آنکھ تیری صورت سے خالی ہے۔

یا پھر دوسرے لفظ کے اول میں ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: "وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلیٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ" (القیامۃ / ۲۹) اور پاؤں کی پنڈلیاں جان کنی کی شدت سے ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں گی ہاں اس دن سب کا راستہ تیرے پروردگار کی دادگاہ کی طرف ہوگا۔ امیر المؤمنینؑ کا قول ہے: "وَایْمُ اللّٰهِ لَتَحْتَلِبُنَّهَا دَمًا وَ لَتُتْبِعُنَّهَا نَدَمًا" (خطبہ ۵۵) خدا کی قسم! تم اپنے کیے کے بدلے میں دودھ کی بجائے خون دوہو گے اور بالآخر تمہیں ندامت و شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔

اسی طرح نظم میں بھی زیادتی پائی جاتی ہے۔ ....

....

یا پھر زیادتی پہلے لفظ کے درمیان میں پائی جائے گی، جیسے حضرت امیرؑ کا قول ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَا يَفِرُهُ الْمَنْعُ وَ الْجُمُوْدُ وَ لَا يُكْدِيْهِ الْاِعْطَاءُ وَ الْجُوْدُ" (خطبہ ۹۰) تمام حمد اس اللہ کیلئے ہے جو فیض و عطا کے روکنے سے مالدار نہیں ہو جاتا اور جود و عطاء سے کبھی عاجز و قاصر نہیں ہوتا۔ اسی طرح باب الحکم میں فرماتے ہیں: "اِنَّ كَلَامَ الْحُكَمَاءِ اِنْ كَانَ صَوَابًا كَانَ دَوَاءً وَ اِذَا كَانَ خَطَاءً كَانَ دَاءً" (حکمت ۲۶۵) جب حکماء کا کلام صحیح ہو تو وہ دواء ہے اور غلط ہو تو سراسر مرض ہے۔

یا یہ زیادتی دوسرے لفظ کے درمیان میں ہوگی، جیسے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "فَاعْتَبِرُوْا بِمَا كَانَ مِنْ فِعْلِ اللّٰهِ بِاِبْلِيْسَ اِذْ اَحْبَطَ عَمَلَهُ الطَّوِيْلَ وَجَهْدَهُ الْجَهِيْدَ" (خطبہ ۱۹۱) تمہیں چاہئے کہ اللہ نے شیطان کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے عبرت حاصل کرو کہ اسکی طویل عبادتوں اور بھرپور کوششوں پر اس کے ایک گھڑی کے گھمنڈ نے پانی پھیر دیا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حرف کی زیادتی آخر میں ہو اور یہ اسم مذیل کے ساتھ خاص ہوتی ہے کیونکہ اس میں پائے جانے والی زیادتی ایک ذیل ہوتی ہے نثر میں اس کی مثال، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں: "فُلَانٌ سَالٌ مِنْ اَحْزَانِهِ سَالِمٌ مِنْ زَمَانِهِ حَامٍ لِعِرْضِهِ حَامِلٌ لِفَرْضِهِ" فلاں شخص رنج و غم سے بچا ہوا، زمانے کی دستبرد سے محفوظ، اپنی عزتوں کا محافظ اور اپنے فرائض کا پابند ہے۔ امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں: "وَ مَدَارِ رَحَاهَا تَبْدُوْ فِيْ مَدَارِجَ خَفِيَّةٍ" (خطبہ ۱۵۱) اس کا کھونٹا مضبوط ہو جائے فتنے ہمیشہ چھپے ہوئے راستوں سے ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

نظم میں اس کی مثال شاعر کا یہ شعر ہے؛

فَيَا يَوْمَهَا كَمْ مِنْ مُنَافٍ مُنَافِقٍ   وَ يَا لَيْلَهَا كَمْ مِنْ مُوَافٍ مُوَافِقٍ

اے میری محبوبہ کے دن! کس قدر ہیں مخالفت کرنے والے اور منافقت کرنے والے اور اے محبوبہ کی رات! حق ادا کرنے والے اور موافقت کرنے والے کتنا زیادہ ہیں!!

کبھی یہ زیادتی اسم مذیل میں دو حرفوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس قسم کی زیادتی "اسم مرفل" کے ساتھ خاص ہے، یعنی اگر اسم کے آخر میں دو حرفوں کی زیادتی ہو تو وہ "اسم مرفل" کہلاتا ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے؛

فَيَالَكَ مِنْ عَزْمٍ وَ حَزْمٍ طَوَاهُمَا جَدِيْدُ الرَّدیٰ بَيْنَ الصَّفَا وَ الصَّفَايِحِ

اے پختہ ارادہ اور حکمت عملی! تمہارا کیا کہنا جنہیں تازہ مرنے والے نے چٹانوں اور سلوں کے درمیان لپیٹ دیا ہے۔

تجانس ناقص کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ :دو لفظ حروف کی تعداد، ترتیب اور ہیئت میں تو متفق اور ایک جیسے ہوں لیکن انواع کے لحاظ سے مختلف ہوں یعنی ان میں سے ایک کا کوئی ایک حرف دوسرے کے کسی حرف سے مختلف ہو۔اگر یہ دونوں مخرج کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب یابالکل ہی ہم مخرج ہوں تو اس قسم کو "تجانس مضارع" کہیں گے ورنہ "تجانس لاحق" ہوگا۔

۴۔ تجانس مضارع :۔

تجانس مضارع کی تین قسمیں ہیں،وہ یوں کہ :

۱۔دونوں مختلف حروف یا تو دو ہم جنس لفظوں کے اول میں آئیں گے۔جیسے حضرت امیرؑ کا قول ہے :

"فِيْ قَرَارِ خِبْرَةٍ وَ دَارِ عِبْرَةٍ " (خطبہ ۱۰۲)اس مقام آزمائش اور محل عبرت میں......۔یہاں پر "خاء" اور "عین" حروف حلق میں سے ہیں اور پہلا حرف "خاء" حلق کے وسط سے اور دوسرا "عین" منہ میں اس کے قریب سے خارج ہوتا ہے۔اسی طرح حضرت علی بن ابی طالبؑ کا ایک اور قول ہے :"وَ حِرْصًا فِيْ عِلْمٍ وَ عِلْمًافِيْ حِلْمٍ "(خطبہ ۱۹۲) حصول علم کی طلب، بردباری کے ساتھ دانائی......۔یہاں پر "عین" اور "حاء" دونوں ہم مخرج ہیں اور حلق کے وسط سے نکلتے ہیں۔

۲۔یا دونوں مختلف حروف دو ہم جنس لفظوں کے وسط میں آئیں گے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ" (سورہ انعام ۲۶)وہ تو دوسروں کو اس سے روکتے اور خود بھی اس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔یہاں پر "ہاء" اور "ہمزہ" ہم مخرج ہیں۔جبکہ حضرت امیر علیہ اسلام کے اس کلام میں "عِبَادٌ مَخْلُوْقُوْنَ اِقْتِدَارًا وَ مَرْبُوْبُوْنَ اِقْتِسَارًا " (خطبہ ۸۲) یہ بندے اس کے اقتدار کا ثبوت دینے کیلئے وجود میں آئے ہیں اور غلبہ و تسلط کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے۔یہاں پر "اقتدار" اور "اقتسار" میں "دال" اور "سین" زبان کی نوک سے نکلتے ہیں البتہ "دال" زبان اور سامنے کے دو دانتوں کے ذرہ اوپر کے درمیان سے اور "سین" زبان اور سامنے کے دونوں دانتوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔اسی طرح حضرت کا یہ ارشاد :"اَللّٰهُمَّ سَقْيًا مِنْكَ مُحْيِيَةً مُرْوِيَةً تَامَّةً عَامَّةً طَيِّبَةً مُبَارَكَةً هَنِيْئَةً مَرِيْعَةً مَرِيْئَةً "(خطبہ ۱۱۴)خدایا!ایسی سیرابی ہو جو مردہ زمینوں کو زندہ کرنے والی، سیراب بنانے والی، بھرپور برسنے والی، سب جگہ پھیل جانے والی اور پاکیزہ و بابرکت اور خوشگوار و شاداب ہو۔آخری دو کلموں(مَرِيْئَه۔مَرِيْعَه)میں "ہمزہ" اور "عین" حرف حلق ہیں۔

اسی طرح نظم میں بھی ہے،جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؛

وَ مَاخُلِقَتْ عُيُوْنُ الْعَيْنِ اَمَّا نَظَرْنَ سِوىٰ بَلَايَا لِلْبَرَايَا

آہو چشم حسینوں کی آنکھیں صرف مخلوق کی آزمائش کیلئے بنائی گئی ہیں، قطرب کے بقول "لام" اور "راء" ہم مخرج ہیں۔

۳۔یا دونوں مختلف حروف، دو ہم جنس لفظوں کے آخر میں آئیں گے، جیسا کہ مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں :"وَلَايَغْلِبَنَّكُمْ فِيْهَاالْاَمَلُ وَلَايَطُوْلَنَّ عَلَيْكُمْ فِيْهَاالْاَمَدُ"(خطبہ ۱۵) کہیں ایسا نہ ہو کہ آرزوئیں تم پر غالب آجائیں اور اس چند روزہ زندگی کی مدت کو دراز سمجھ بیٹھو۔یہاں پر "امل" اور "امد" میں "لام" اور "دال" قریب المخرج ہیں۔اسی طرح آپؑ کے اس

قول "اَلْخَیْرُ مِنْهُ مَامُوْلٌ وَالشَّرُّ مِنْهُ مَامُوْنٌ" (خطبہ ۱۹۰) اس سے بھلائی کی توقع کی جاسکتی ہے جبکہ اس سے گزند کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا؛ میں "ماموں" کی لام اور "مامون" کی نون قریب المخرج ہیں۔ نظم میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؛

سَاَكْسُوْكَ مِنْ مَكْنُوْنِ نَظْمِيْ وَشَايِعًا 	تَنَاطُ بِجَيْدِ الدَّهْرِ مِنْهَا وَ شَائِحُ

عنقریب میں تجھے اپنے پوشیدہ اشعار کی ایسی چادروں میں ڈھانپ دوں گا جن کے جڑاؤ کے ہار زمانے کی گردن میں ڈالے جاتے ہیں۔ یہاں پر "وشایع" کی عین اور "وشائح" کی حا حروف حلق سے ہیں۔

۵۔ تجانس لاحق :۔ پہلے کی طرح اس کی بھی تین قسمیں ہیں :

ا۔ دو مختلف حروف دونوں الفاظ کے اول میں ہوں، جیسے امام علیہ السلام فرماتے ہیں : "فَعَاوِدُوْا الْكَرَّ وَ اسْتَحْيُوْا مِنَ الْفَرِّ فَاِنَّهُ عَارٌ فِي الْاَعْقَابِ وَ نَارٌ يَوْمَ الْحِسَابِ" (خطبہ ۶۵) بار بار حملہ کرو اور بھاگنے سے شرم کرو اس لئے کہ یہ پشتوں تک کیلئے ننگ و عار اور روز محشر جہنم کی آگ کا باعث ہے۔

نظم میں اس کی مثال شیخ صفی الدین حلیؒ کا قول ہے ؛

أَبِيْتُ وَ الدَّمْعُ هَامٍ هَامِلٌ سَرِبٌ 	وَ الْجِسْمُ مِنْ أَضْنَمٍ لَحْمٍ عَلٰى وَضَمٍ

میری رات اس حال میں گزرتی ہے کہ آنکھوں سے آنسو رواں اور جاری و ساری رہتے ہیں اور غم کی وجہ سے جسم کی یہ کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے قصاب کے تختہ پر پڑا ہوا گوشت ہوتا ہے۔

۲۔ دو مختلف حروف دونوں الفاظ کے وسط میں ہوں جیسے امام علیہ السلام ہی کا فرمان ہے : "فَظَلَّ سَادِرًا وَبَاتَ سَاهِرًا" (خطبہ ۸۲) کہ وہ بھٹکا سا ہو کر رہ گیا اور رات اندوہ و مصیبت کی کلفتوں میں گذاری نیز فرماتے ہیں : "وَ هُوَ دِيْنُ اللّٰهِ الَّذِيْ اَظْهَرَهُ وَ جُنْدُهُ الَّذِيْ اَعَدَّهُ وَ اَمَدَّهُ" (خطبہ ۱۲۶) یہ تو اللہ کا دین ہے جسے اس نے سب دینوں پر غالب رکھا ہے اور اسی کا لشکر ہے جسے اس نے تیار کیا ہے اور اس کی نصرت کی ہے۔

نظم میں بدیع الزمان ہمدانی کا قول ہے ؛

يَا غُلَامُ الْكَاسَ فَالْيَاسُ مِنَ النَّاسِ مُرِيْحٌ

اے نوجوان! لو شراب کا پیالہ، کیونکہ لوگوں سے ناامیدی راحت جان ہوتی ہے۔ اسی طرح صفی الدین حلی کہتے ہیں ؛

بِيْضٌ دَعَاهُنَّ الْغَبِيُّ كَوَاعِبًا 	وَ لَوِ اسْتَبَانَ الرُّشْدَ قَالَ كَوَاكِبًا

وہ گوری رنگت والیاں کہ جنہیں کند ذہن شخص نے نار پستان کا نام دیا ہے حالانکہ اگر وہ صحیح طریقے سے جان لیتا تو کہتا کہ یہ تو ستارے ہیں۔

۳۔ دو مختلف حروف دونوں الفاظ کے آخر میں ہوں۔ جیسے امام علیہ السلام فرماتے ہیں : "وَ لَيْسَ لِلْعَاقِلِ اَنْ يَكُوْنَ شَاخِصًا اِلَّا فِيْ ثَلَاثٍ، مَرَمَّةٍ لِمَعَاشٍ اَوْ خُطْوَةٍ فِيْ مَعَادٍ اَوْ لَذَّةٍ فِيْ غَيْرِ مُحَرَّمٍ" (حکمت ۳۹۰) عقلمند آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ گھر سے دور ہو مگر تین چیزوں کیلئے ا۔ معاش کے بندوبست کیلئے ۲۔ امر آخرت کی طرف قدم اٹھانے یا ۳۔ ایسی

لذت اندوزی کیلئے کہ جو حرام نہ ہو۔

نظم میں شاعر کا قول ہے :

يَكْفِي الانَامَ بِسَيْبِهِ وَ بِسَيْفِهِ عِنْدَ الْمَكَارِمِ وَ الْمَكَارِهِ دَائِمًا

وہ ہمیشہ سخاوت اور مشکل اوقات میں اپنے مال و تلوار کے ساتھ لوگوں کی کفایت کرتا ہے۔

کچھ حضرات تجانس کی اس قسم کو یعنی جو حروف میں مختلف ہوتی ہے "تجانس تصریف" کہتے ہیں۔ چاہے مخرج سے اس کا تعلق ہو یا نہ ہو۔

پھر دونوں ہم جنس الفاظ خواہ وہ تجانس کی کسی قسم سے ہوں اگر وہ "سجع" یا "فاصلہ" کے آخر میں ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق بھی ہو جیسے عربوں کی کہاوت ہے : "مَنْ قَرَعَ بَابًا وَ لَجَّ وَلَجَ "جو شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اصرار کرتا ہے تو وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ یا جیسے : "مَنْ طَلَبَ شَيْئًا وَ جَدَّ وَجَدَ "جو شخص کسی چیز کے حاصل کرنے میں کوشش کرتا ہے تو وہ حاصل کر لیتا ہے۔ وغیرہ جن کا ذکر مختلف انواع کے دوران ہو چکا ہے، تو اسے "تجانس مردد" یا "تجانس مکرر" کہتے ہیں۔ نظم میں اس کی بہترین مثال بستی کے یہ اشعار ہیں :

أَبَا الْعَبَّاسِ لَاتَحْسَبْ بِأَنِّيْ لِشَيْبِيْ مِنْ حُلِّيِ الأَشْعَارِ عَارٍ

لِيَ طَبْعٌ كَسِلْسَالٍ مَعِيْنٍ زُلَالٍ مِنْ ذَرى الأَحْجَارِ جَارٍ

اِذَا مَاأَكْبَتِ الادْوَارُ زَنْدًا فَلِيْ زَنْدٌ عَلَى الأَدْوَارِ وَارٍ

اے ابو العباس! تم یہ خیال نہ کرو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے اشعار کے زیورات سے خالی ہوں، کیونکہ میری طبع ایسی ہے جیسے بلند و بالا چٹانوں کی چوٹیوں سے بہہ نکلنے والے رواں، میٹھے اور خوشگوار چشمے ہوتے ہیں۔ جب کئی بار کی حرکتیں چقماق سے آگ پیدا نہ کر سکیں تو میرے پاس ایسا چقماق ہے جو دوہرے شعروں کو سلگا دیتا ہے۔

۶۔ تجانس مقلوب :۔ اسے "تجانس قلب" بھی کہتے ہیں اور وہ ہوتا ہے کہ جسکے دونوں الفاظ حروف، انواع اور ہیئت میں تو ایک جیسے ہوں لیکن ترتیب میں مختلف ہوں اس کی دو قسمیں ہیں :

ا۔ "قلب کل" : اور یہ وہ ہوتی ہے کہ پہلے لفظ کا آخری حرف دوسرے لفظ کا پہلا ہو اور جو اس سے پہلے ہو وہ اس کا دوسرا ہو اور جو اس سے پہلے ہو وہ تیسرا حرف ہو۔ اس نوع کی مثال مجھے کلام امیر المؤمنینؑ میں نہیں ملی، البتہ مندرجہ ذیل کلام کو اس نوع سے قرار دینا بعید نہیں ہے "حَتّىٰ يَعْرِفَ الْحَقُّ مَنْ جَهِلَهُ، وَ يَرْعَوِيَ عَنِ الْغَيِّ وَ الْعُدْوَانِ مَنْ لَهِجَ بِهِ "(خطبہ ۲۰۵) تاکہ یہ حق سے بے خبر حق کو پہچان لیں اور گمراہی و سرکشی کے شیدائی اس سے اپنا رخ موڑ لیں۔ کیونکہ "جہل" اور "لہج" مقلوب ہیں البتہ "جَهِلَهُ" میں موجود ضمیر اگر اس سے مانع نہ ہو۔ نظم میں اس کی مثال یہ شعر ہے :

حِسَامُكَ فِيْهِ لِلأَحْبَابِ فَتْحٌ وَ رُمْحُكَ مِنْهُ لِلأَعْدَاءِ حَتْفٌ

تیری تلوار دوستوں کیلئے فتح کا نشان ہے اور تیرا نیزہ دشمنوں کیلئے موت کا پیغام ہے۔

۲۔ "قلب بعض" :اس کی مثالیں مولا کے کلام میں کثیر حد تک ہیں۔ مثلاً ایک مثال حضرت سلمان فارسیؓ کے نام مکتوب میں آپؑ کا یہ کلام ہے : "أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّمَا مَثَلُ الدُّنْيَا مَثَلُ الْحَيَّةِ لَيِّنٌ مَسُّهَا قَاتِلٌ سَمُّهَا" (مکتوب ۶۸) دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے جو چھونے میں تو نرم ہے لیکن اس کا زہر قاتل ہے۔ اسی طرح باب الحکم میں آپؑ کا ارشاد ہے : "اَلْعِلْمُ مَقْرُوْنٌ بِالْعَمَلِ فَمَنْ عَلِمَ عَمِلَ" (حکمت ۳۶۶) علم عمل سے وابستہ ہے لہٰذا جو جانتا ہے وہ عمل بھی کرتا ہے۔

نظم میں ابو تمام کا شعر ہے ؛

بِيْضُ الصَّفَائِحِ لَاسُوْدُ الصَّحَائِفِ فِي   مُتُوْنِهِنَّ جِلَاءُ الشَّكِّ وَ الرِّيَبِ

کتابوں کی کالی تحریروں میں نہیں بلکہ چوڑی تلواروں کی سفیدی میں شکوک و شبہات کی صفائی ہے۔

اسی طرح ابن حیوس کا یہ شعر ہے ؛

تَلْقَىٰ بِهَا الرُّوَّادُ رَوْضًا زَاهِرًا   وَ تُصَادِفُ الْوُرَّادُ حَوْضًا مُفْعَمًا

پڑاؤ کرنے کیلئے جگہ کی تلاش میں نکلنے والے اس سر زمین میں سر سبز و شاداب باغات کو پا لیتے ہیں اور پانی کی تلاش میں آنے والے بھرے چھلکتے تالابوں کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔

یہ تو تھیں تجانس مقلوب کی چند مثالیں۔ البتہ بعض حضرات نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ "جس کے دونوں اطراف کے حروف تعداد میں برابر ہوں لیکن ترتیب میں مختلف ہوں" تو اس کی تعریف میں وہ اقسام بھی شامل ہو جائیں گی جو ہیئت کے لحاظ سے برابر ہوتی ہیں، جیسا کہ حضرت امیر المؤمنینؑ کا فرمان ہے : "وَلَا يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ اِلَّا أَهْلُ الْبَصَرِ وَالصَّبْرِ" (خطبہ ۱۷۲) اسی طرح عمومیت کے دائرے میں یہ کلام بھی آجائے گا "يَمْزَجُ الْحِلْمَ بِالْعِلْمِ وَالْقَوْلَ بِالْعَمَلِ" (خطبہ ۱۹۲) اس نے علم میں علم اور قول میں عمل سمو دیا۔

اسی طرح عمومیت میں شاعر کے یہ اشعار بھی آجایں گے ؛

حَكَانِيْ بَهَارُ الرَّوْضِ لَمَّا اَلِفْتُهٗ   وَ كُلُّ مُشَوَّقٍ لِلْبَهَارِ مُصَاحِبٌ

فَقُلْتُ لَهٗ مَا بَالُ لَوْنِكَ شَاحِبًا   فَقَالَ لِاَنِّيْ حِيْنَ اُقْلَبُ رَاهِبٌ

سبزہ زار کے گل عین البقر نے میری اس وقت نقل اتاری جب میں اس سے مانوس ہو گیا اور ہر بہار کا عاشق، عین البقر کے پھول کو اپنا ساتھی بنانا پسند کرتا ہے۔ میں نے اس پھول سے کہا تیری رنگت کو کیا ہوا کہ بدل جاتی ہے؟ تو اس نے کہا کہ : جب مجھے الٹایا جاتا ہے تو میں راہب بن جاتا ہوں (کہ جن کی رنگت بدلی ہوئی ہوتی ہے)۔

(بہار کو جب الٹایا جائے تو راہب بن جاتا ہے، اسی طرح اردو میں ایک شعر ہے :

جمع یکجا ہوں تو زہد کجا؟   راہب و بارش و شراب و بہار

چنانچہ آخری مصرعہ کو الٹا کر پڑھا جائے تو بھی اسی طرح ہو گا۔ از مترجم)

ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؛

رَقَّتْ شَمَائِلُ قَاتِلِي فَلِذٰلِكَ رُوْحِي لَاتَقِرُّ　　　　رَدَّالْحَبِيْبُ جَوَابَه فَكَاَنَّه فِي اللَّحْظِ دُرٌّ

میرے قاتل (محبوب) کی خو، بہت ہی نرم ہے اسی وجہ سے میری جان قرار نہیں پکڑتی، محبوب نے اس (بے قراری) کا جواب دیا تو لگتا تھا کہ آنکھوں میں موتی ہی موتی ہیں۔

۷۔ تجانس مصحف :۔ اسے "تجانس خط" بھی کہا جاتا ہے اور اس کی تعریف یہ ہے کہ : "دو کلمے ایسے لائے جائیں جو خط (تحریر) میں تو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں، الفاظ (تلفظ) میں نہیں"۔ جیسے خداوند عالم کا ارشاد ہے : "وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" (کہف / ۱۰۴) اور اس کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یہاں پر "يَحْسَبُوْنَ" اور "يُحْسِنُوْنَ" تحریری طور پر آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے: "فَاِنَّهَاكَانَتْ اَثَرَةً شَحَّتْ عَلَيْهَانُفُوْسُ قَوْمٍ وَسَخَتْ عَنْهَانُفُوسُ آخَرِيْنَ" (خطبہ ۱۶۱) ان کی یہ خود غرضی تھی جس میں کچھ لوگوں کے نفس اس پر مرمٹے تھے اور کچھ لوگوں کے نفسوں نے اس کی پرواہ تک نہ کی۔ یہاں پر "شَحَّتْ" اور "سَخَتْ" تحریر میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ اسی طرح فرماتے ہیں "وَكَانَ قَدْعَبَدَاللهَ سِتَّةَ آلَافِ سَنَةٍ" (خطبہ ۱۹۱) حالانکہ اس نے چھ ہزار سال خدا کی عبادت کی۔ یہاں پر "ستّة" اور "سنة" تحریری مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی خطبہ میں ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں: "فَاجْعَلُوْا عَلَيْهِ حَدَّكُمْ وَلَه جِدَّكُمْ" اپنے جوش و غضب کا پورا مرکز اسے قرار دو اور پوری کوشش کرو اس کے خلاف صرف کرو۔ یہاں پر "حد" اور "جد" باہم مشابہ ہیں۔ معاویہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں : "غَرَّكَ عِزُّكَ فَصَارَ قِصَارُ ذٰلِكَ ذُلُّكَ فَاخْشَ فَاحِشَ فِعْلِكَ فَعَلَّكَ تُهْدَا بِهٰذَا" تجھے تیری عزت نے دھوکہ دیا ہے تو یہ ایک چھوٹی سی چیز بھی تیرے لئے ذلت بن گئی ہے اپنے غلط کاموں سے ڈر شاید اس طرح سے ہدایت پا جائے۔

نظم میں ابو طیب متنبی کا شعر ہے ؛

جَرَى الْخُلْفُ اِلاَّ فِيْكَ اَنَّكَ وَاحِدٌ　　　　وَ اَنْتَ لَيْثٌ وَ الْمُلُوْكُ ذِئَابٌ

وَ اَنَّكَ اِنْ قُوْيِسْتَ صَحَّفَ قَارِئٌ　　　　ذِئَابًا وَ لَمْ يُخْطِئْ وَ قَالَ ذُبَابٌ

ہر ایک کا بدل ضرور ہے سوائے آپ کے کیونکہ صرف آپ ہی یکتائے روزگار ہیں اور صرف آپ ہی شیر ہیں جبکہ دیگر بادشاہ بھیڑیے ہیں اگر آپ کا موازنہ کیا جائے تو میرے شعر کو پڑھنے والا "ذئاب" (بھیڑیے) کی جگہ "ذباب" (مکھی) پڑھ دے تو بھی اس نے غلط نہیں پڑھا۔

بعض حضرات نے "تجانس خط" کی یوں تعریف کی ہے کہ : "دو لفظ کتابت میں ایک جیسے ہوں" جبکہ کچھ اور حضرات نے کہا ہے کہ : "جس کے دونوں ارکان حروف میں ہم شکل لیکن نقاط میں مخالف ہوں" تو اس طرح کی تعریف میں "تجانس لفظی" اور "تجانس خطی" دونوں شامل ہو جائیں گے مثلاً حضرت امیرؑ کا فرمان : "صِحَّةُ الْجَسَدِ مِنْ قِلَّةِ الْحَسَدِ" (حکمت ۲۵۶) حسد کی کمی بدن کی تندرستی کا سبب ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے اقوال ہیں، مثلاً "يُوْنِقُ مَنْظَرُهَا وَ يُوْبِقُ مَخْبَرُهَا" (خطبہ ۸۲) اس کا ظاہر خوشنما اور باطن تباہ کن ہے۔ یا جیسا کہ "لَاتُقْلِعُ الْمَنِيَّةُ اِخْتِرَامًا وَلَايَرْعَوِى الْبَاقُوْنَ اِجْتِرَامًا" (خطبہ ۸۲) نہ موت

کاٹ چھانٹ سے منہ موڑتی ہے اور نہ باقی رہنے والے گناہ سے باز آتے ہیں۔ اسی طرح یہ فرمان بھی ہے "وَ لَانَاكِبِيْنَ وَ لَا نَاكِثِيْنَ" (خطبہ ۱۰۵) نہ حق سے روگردان اور نہ عہد شکن۔ مولائے کائنات کے اس سلسلے میں کثیر تعداد میں فرامین موجود ہیں۔ اور نظم میں ابونواس کا یہ شعر ہے؛

مِنْ بَحْرِ شِعْرِكَ اَغْتَرِفُ وَ بِفَضْلِ عِلْمِكَ اَعْتَرِفُ

میں تیری شاعری کے سمندر سے چلو بھرتا ہوں اور تیرے علمی فضل و کمال کا اعتراف کرتا ہوں۔ اسی طرح "حبرہ" اور "خبرہ" یا "عار" اور "نار" وغیرہ جیسے الفاظ اسی زمرے میں شامل ہیں۔ بعض متاخرین نے تجانس کی کئی اور اقسام بھی بیان کی ہیں لیکن ہم انہیں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیونکہ ان کی مثالیں یا تو نادر ہیں یا پھر ان میں تکلف اور رکاکت پائی جاتی ہے جو بعض تو حد فصاحت سے بھی نکل چکی ہیں۔

بہر حال اب ہم ایک مرتبہ پھر بدائع کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کے بیان کا ہم نے اول سے قصد کیا ہوا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ہے:

اشتقاق

اشتقاق یہ ہے کہ چند الفاظ ایسے لائے جائیں کہ جن سب کا لغوی معنی ایک ہو، جیسے خداوند عالم فرماتا ہے: "وَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ" (روم / ۴۳) اے پیغمبرؐ! اپنا رخ مستقیم اور پائیدار دین کی طرف کئے رہو۔ یہاں پر "اَقِمْ" اور "قَيِّمْ" دونوں "قَامَ يَقُوْمُ" سے مشتق ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ" (بقرہ / ۲۷۶) اللہ سود کو نابود کردیگا اور صدقات کو بڑھا دے گا۔ یہاں پر "رِبَا" اور "يُرْبِي" دونوں "رَبَا يَرْبُوْ" سے مشتق ہیں جس کا معنی ہے زیادہ ہونا۔ اور اسی طرح یہ ارشاد قرآن مجید میں ہے: "اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ" (نمل / ۴۴) سلیمان کے ساتھ مل کر تسلیم کرتی ہوں اور "يَا اَسَفَا عَلٰى يُوْسُفَ" (یوسف / ۸۴) ہائے یوسف پر افسوس! یا "فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ" پس اس نے اپنا ڈول کنویں میں لٹکایا وغیرہ جیسے کلمات ہیں۔ اور کلام امیر المؤمنینؑ سے یہ کلمہ بھی ہے کہ: "فَالْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ" (خطبہ ۱۸۶) چنانچہ مسلمان وہی ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان بچے رہیں۔ اس نوع کے کلمات کلام امیر المؤمنینؑ میں بکثرت موجود ہیں۔

نظم میں بھی ابن حجت کا قول ہے؛

مُحَمَّدٌ اَحْمَدُ الْمَحْمُوْدُ مَبْعَثُهٗ كُلٌّ مِنَ الْحَمْدِ تَبْيِيْنُ اِشْتِقَاقِهِمْ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت زیادہ قابل تعریف ہیں اور آپ کی بعثت کی بھی تعریف کی گئی ہے، چاہے محمدؐ ہوں یا احمدؐ اور محمودؐ، تمام الفاظ کا اشتقاق "حمد" ہی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے؛

وَ نَرْتَابُ بِالْاَيَّامِ عِنْدَ سُكُوْنِهَا وَ مَا اَرْتَابَ بِالْاَيَّامِ غَيْرُ مُرِيْبِ

وَ مَا الدَّهْرُ فِيْ حَالِ السُّكُوْنِ بِسَاكِنٍ وَ لٰكِنَّهٗ مُسْتَجْمِعٌ لِوُثُوْبٍ

ایام دہر کے سکوت کے وقت بھی ہمیں کھٹکا لگا رہتا ہے اور حادثات زمانہ سے اسے کھٹکا نہیں ہوتا جسے کبھی کوئی قلق نہ ہوا ہو۔ زمانہ سکون کی حالت میں بھی ساکن نہیں ہوتا بلکہ وہ جھپٹنے کیلئے اپنے پر تول رہا ہوتا ہے۔

شبہ اشتقاق

شبہ اشتقاق یہ ہے کہ دو یا ان سے زیادہ الفاظ میں سے ہر ایک کے اندر ایسے حروف پائے جائیں جو ایک دوسرے سے ملتے ہوں لیکن ان میں سے ہر ایک کی اصل جدا ہو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

"وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ" (رحمٰن / ۵۴) دونوں باغوں کے پکے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہونگے۔

"وَقَالَ اِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِيْنَ" (شعراء / ۱۶۸) جناب لوطؑ نے کہا میں تو بہر حال تمہارے اعمال کا دشمن ہوں ۔کیونکہ یہاں پر "قَالَ"، "قَوْلٌ" سے مشتق ہے جبکہ "قَالِيْنَ" کا مصدر "قِلًى" ہے۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے کہ : "وَ اَهْلُهَا عَلٰى سَاقٍ وَ سِيَاقٍ" (خطبہ ۱۹۰) اس کے رہنے والے پا در رکاب چل چلا کے منتظر ہیں۔ کیونکہ "سَاقٍ" پنڈلی کو کہتے ہیں اور "سِيَاقٌ" مصدر ہے "سَاقَ يَسُوْقُ" کا اسی طرح نظم میں موسم بہار کی تعریف کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے :

اِنَّ فَصْلَ الرَّبِيْعِ فَصْلٌ مَلِيْحٌ تَضْحَكُ الْاَرْضُ مِنْ بُكَاءِ السَّمَآءِ

ذَهَبٌ حَيْثُمَا ذَهَبْنَا وَ دُرٌّ حَيْثُ دُرْنَا وَ فِضَّةٌ فِی الْفَضَآءِ

موسم بہار نہایت ہی خوش منظر ہوتا ہے، کیونکہ اس موسم میں آسمان روتا (بارش برساتا) ہے اور زمین اس کے رونے سے ہنستی (پھول کھلاتی) ہے۔ ہم جہاں کا بھی رخ کریں سونا ہی سونا نظر آتا ہے، جدھر کو گھومیں موتی ہی موتی ہوتے ہیں اور فضا میں نگاہ دوڑائیں تو چاندی ہی چاندی نظر آتی ہے۔

سجع

یہ لفظ "سَجْعُ الْحَمَامَةِ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے فاختہ کا گنگنانا۔ چونکہ وہ اپنی آواز کو ایک خاص انداز کے تحت دہراتی رہتی ہے لہذا کلام میں "سَجْع" کو اسی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اس کی تعریف یہ ہے کہ "نثر میں دو فاصلوں کا آپس میں اس طرح موافق ہونا جس طرح نظم میں قافیہ کی موافقت ہوتی ہے"۔

کبھی سجع کا اطلاق ایک جیسے الفاظ پر بھی ہوتا ہے جو فقرات کے آخر میں ہوتے ہیں۔ قرآن کے فقرے "فواصل" اور شعر کے فقرے "قوافی" کہلاتے ہیں۔ اور سجع کی کئی قسمیں ہیں :

۱۔ "سجع مطرف" نثر میں یہ ہوتا ہے کہ وزن میں دونوں فاصلے مختلف ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے

"مَالَكُمْ لاَ تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا" (نوح / ۱۳۔۱۴) تم اللہ کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے حالانکہ اس نے تمہیں مختلف مرحلوں میں پیدا کیا۔ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں "اِتَّخَذُوْا الشَّيْطَانَ لاَمْرِهِمْ مِلاَكًا وَ اتَّخَذَهُمْ لَهٗ اَشْرَاكًا" (خطبہ ۷) انہوں نے ہر کام کا کرتا دھرتا شیطان کو بنا رکھا ہے اور اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنا لیا ہے۔

نظم میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے دونوں قافیے مختلف ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؛

اَفَاطِمُ مَهْلاً بَعْضَ هٰذَا التَّدَلُّلِ وَاِنْ كُنْتِ قَدْ اَزْمَعْتِ صَرْمِيْ فَاَجْمِلِيْ

اے فاطمہ !اس صورتحال کے بعد صبر کرو!! اگر میرے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو بھی اسے خوبصورت طریقے سے انجام دو۔

۲۔ "سجع مرصع" وہ ہوتا ہے کہ 'جس کے دونوں قرینے اس طرح ہوں کہ اس کے آخری حصے وزن اور قافیہ کے لحاظ سے متفق ہوں خواہ سارے یا ان میں سے بہت کچھ' بالفاظ دیگر پہلے قرینہ میں جو الفاظ بھی ہوں سارے کے سارے یا ان میں سے اکثر کے مقابلے میں دوسرے قرینے میں بھی اسی طرح الفاظ، وزن اور قافیہ کا اتفاق موجود ہو، جس طرح حضرت امیرؑ فرماتے ہیں "اَحْمَدُهٗ اِسْتِتْمَامًا لِنِعْمَتِهٖ وَ اِسْتِسْلاَمًا لِعِزَّتِهٖ" (خطبہ ۲) اس کی حمد و ثناء کرتا ہوں اس کی نعمتوں کی تکمیل چاہنے اور اس کی عزت و جلال کے آگے سر جھکانے میں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَلاَ بِحَوْلِهٖ وَ دَنَا بِطَوْلِهٖ" (خطبہ ۸۲) تمام حمد اس اللہ کیلئے ہے جو اپنی طاقت کے لحاظ سے بلند اور بخشش کے اعتبار سے قریب ہے، اسی خطبہ میں فرماتے ہیں "مَانِحِ كُلِّ غَنِيْمَةٍ وَفَضْلٍ وَكَاشِفِ كُلِّ عَظِيْمَةٍ وَاَزْلٍ" ہر نفع و زیادتی کا عطا کرنیوالا اور ہر مصیبت و ابتلاء کا دور کرنیوالا ہے۔

نظم میں ترصیع یہ ہوتی ہے کہ شاعر بیت کے اول میں جو بھی الفاظ لائے اسی طرح بیت کے آخر میں اس قسم کے الفاظ وزن اور قافیہ کے لے آئے ....اس کی بہترین مثال رشید الدین معروف بہ وطواط کا ....وہ عالیشان قصیدہ ہے جس میں اس نے اپنے دور کے ایک بڑے آدمی کی تعریف کی ہے ؛

جَنَابُ ضِيَاءِ الدِّيْنِ لِلْبِرِّ مَرْقَعٌ وَ بَابُ ضِيَاءِ الدِّيْنِ لِلْحُرِّ مَرْبَعٌ
وَ سِيْرَتُهٗ الزَّهْرَآءُ لِلْحَقِّ مَعْلَمٌ وَ سِدَّتُهٗ السَّمَآءُ لِلْخَلْقِ مَجْمَعٌ
فَجُدِّدَ مِنْهُ لِلْمَرَاشِدِ اَرْسُمٌ وَ شُيِّدَ مِنْهُ لِلْمَحَامِدِ اَرْبَعٌ
وَ عَلْيَاهُ فِيْهَا لِلْخَوَاطِرِ مَسْرَحٌ وَ لَقْيَاهُ فِيْهَا لِلنَّوَاظِرِ مَرْتَعٌ
فَمَنْهِلُ مَنْ يَرْوِيْ ثَنَآئَكَ مُفْعَمٌ وَ مَنْزِلُ مَنْ يَنْوِيْ جَفَآئَكَ بَلْقَعٌ
وَ صَوْلُكَ لِلاَشْرَارِ مُتْوٍ وَ مُتْلِفٌ وَطَوْلُكَ لِلاَخْيَارِ مَرْوٍ وَ مُشْبِعٌ

ضیاء الدین کی بارگاہ احسان کا مرقع ہے اور ضیاء الدین کا دروازہ شریف آدمی کیلئے مقام امن ہے۔ اس کی روشن سیرت حق کیلئے نشان راہ ہے اور اس کا ایوان بالا مخلوق کیلئے مقام اجتماع ہے۔ پس اس سے مقاصد حق کیلئے علامات کی تجدید کر دی گئی ہے اور قابل تعریف کارناموں کیلئے چاروں ستونوں کو مضبوط تر بنا دیا گیا ہے۔ اس کا بلند مرتبہ، دلوں کیلئے سیر گاہ ہے اور اس کا دیدار نگاہوں کیلئے

مرغزار ہے۔ تیری تعریف کرنے والے کا گھاٹ لبالب ہے اور تیرے ساتھ جفا کا قصد کرنے والے کا گھر ویران ہے۔ غلط قسم کے لوگوں پر تیرا حملہ ان کیلئے تباہ کن اور ویران کنندہ ہے اور نیک لوگوں کیلئے تیرے عطیئے ان کو سیر و سیراب کرنے والے ہیں۔

۳۔ "سجع متوازی" سجع مرصع کے مقابل میں ہے یعنی جس کے دونوں قرینوں میں سے ایک میں وہ چیز نہ ہو جو دوسرے قرینہ کے مقابل ہو، سوائے آخری حصہ کے۔ کیونکہ جس طرح سجع مرصع میں وزن اور قافیہ میں ایک جیسا ہونا شرط ہے اس میں شرط نہیں ہے۔ اس (متوازی) کی تین قسمیں ہیں:

اول۔ جو دو قرینوں میں سے ایک ہے اپنے دوسرے قرینے کے خلاف ہو، وزن میں بھی اور قافیہ میں بھی۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "جَعَلَهُ اللّٰهُ رِيًّا لِعَطَشِ الْعُلَمَاءِ وَ رَبِيْعًا لِقُلُوْبِ الْفُقَهَاءِ وَ مَحَاجَّ لِطُرُقِ الصُّلَحَاءِ" (خطبہ ۱۹۷) اللہ نے اسے عالموں کی تشنگی کیلئے سیرابی، فقیہوں کے دلوں کیلئے بہار اور نیکوں کی راہ گذر کیلئے شاہراہ قرار دیا ہے۔

دوم۔ زیادہ حصے میں مخالفت اور کم حصے میں موافقت ہو۔

سوم۔ نصف مخالف ہو اور نصف موافق ہو۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ وَ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ" (الغاشیہ / ۱۳۔۱۴) اس میں خوبصورت اور بلند تخت ہونگے اور پیالے جو اُن چشموں کے پاس رکھے ہوں گے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "غُرُوْرٌ حَائِلٌ وَ ضَوْءٌ آفِلٌ وَ ظِلٌّ زَائِلٌ وَ سِنَادٌ مَائِلٌ" (خطبہ ۸۲) یہ ایک مٹ جانے والا دھوکہ، غروب ہونے والی روشنی ڈھل جانے والا سایہ اور جھکا ہوا ستون ہے۔

پھر مذکورہ تین اقسام میں:

یا تو وزن اور قافیہ میں اکٹھے اختلاف ہوگا، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

یا صرف وزن میں اختلاف ہوگا، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: "وَ الْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا" (المرسلات / ۱۔۲) قسم ہے ان فرشتوں کی جنہیں پے در پے بھیجتا ہے اور انکی جو تیز ہوا کی طرح چلتے ہیں۔ اسی طرح امیرؑ فرماتے ہیں: "حَتّٰى اِذَا تَصَرَّمَتِ الْاُمُوْرُ وَ تَقَضَّتِ الدُّهُوْرُ" (خطبہ ۸۲) یہاں تک کہ جب تمام معاملات ختم ہو جائیں گے اور دنیا کی عمر تمام ہو جائے گی۔

یا صرف قافیہ میں اختلاف ہوگا، جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں "مِنْ مُسْتَمْتِعٍ خَلَاقِهِمْ وَ مُسْتَفْسِحٍ خِنَاقِهِمْ" (خطبہ ۸۲) ایسے لوگ جو اپنے حظ و نصیب سے لطف اندوز تھے اور کھلے بندوں آزاد پھرتے تھے۔

سعد الدین تفتازانی شرح تلخیص میں کہتے ہیں کہ: "یا دونوں قرینوں میں سے ہر ایک کے مقابل میں مذکورہ چیزوں میں سے کوئی بھی چیز نہیں ہو گی۔ جیسے خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" (کوثر / ۱۔۲) ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا فرمائی، اب تو اپنے پروردگار کیلئے نماز پڑھ اور قربانی دے۔

چند ضروری باتیں

۱۔ بعض علمائے سجع میں دو فاصلوں کے درمیان قافیہ کی ہم آہنگی اور اتفاق کی شرط عائد نہیں کی بلکہ صرف وزن کے اتفاق پر اکتفا کیا ہے۔ ان علماء میں سے ایک مطرزی بھی ہیں جنہوں نے شرح مقامات میں سجع کی ایک اور قسم بھی بیان کی ہے اور اس کا نام "سجع متوازن" رکھا ہے اور شارح بحرانی بھی انہی کے ہم نوا ہیں۔ اور انہوں نے "سجع متوازن" کی تعریف یوں کی ہے کہ: "ان دونوں فاصلوں کے آخری حروف کی تعداد میں اتفاق ہو"۔ تو گویا انہوں نے اس تعریف کے مطابق سجع متوازن کو "مطرف" کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ اور "مطرف" کی تعریف یہ کی ہے دونوں فاصلے تعداد میں مختلف اور حرف آخر میں متفق ہوں۔ جبکہ مطرزی نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ: "آخری دونوں کلموں میں دونوں قرینوں سے وزن کی رعایت کی جائے گی اور ان دونوں کے آخری حرف مختلف ہوں گے۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ" (الغاشیہ / ۱۵۔۱۶) اب دیکھئے مصفوفہ اور مبثوثہ دو ایسے الفاظ ہیں جو وزن میں تو برابر ہیں لیکن ان کا قافیہ آپس میں نہیں ملتا کیونکہ پہلے لفظ کا قافیہ 'فا' ہے اور دوسرے کا 'ثا' البتہ تانیث کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جیسا کہ علم قوافی میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اسی طرح حضرت امیرؑ کا قول ہے: "وَ دَاعِيَةٍ بِالْوَيْلِ جَزَعًا وَلَادِمَةٍ لِلصَّدْرِ قَلَقًا" (خطبہ ۸۲) بے چینی سے فریاد کرنے والی ماں اور بے قراری سے سینہ کوٹنے والی بہن۔

اگر دو قرینوں میں سے ایک کے تمام یا اکثر الفاظ اسی طرح ہیں جو دوسرے قرینے میں ہیں تو اسے "مماثلت" کا نام دیا جائے گا اور مماثلت تمام میں ہو گی، جس طرح کہ اوپر مثالیں ذکر کی جا چکی ہیں۔ یا اکثر میں ہو گی جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ وَ هَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (صافات / ۱۱۷۔۱۱۸) ہم نے ان دونوں کو واضح (آسمانی) کتاب عطا فرمائی اور ہم نے انہیں راہ راست کی ہدایت کی۔

۲۔ سجع کے آخری الفاظ مبنی بر سکون اور موقوف ہوتے ہیں، کیونکہ سجع کی غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ فاصلوں کو ملایا جائے اور یہ اس صورت میں ہو گا جب وقوف کیا جائے اور مبنی بر سکون مانا جائے۔ اس لئے کہ بعض اوقات کلمہ کے آخر کی حرکتیں مختلف ہوتی ہیں اگر ان پر وقوف نہ کیا جائے تو جوڑ والی بات ختم ہو جائے گی۔ مثلاً عرب کہتے ہیں "مَا اَبْعَدَ مَا فَاتْ وَمَا اَقْرَبُ مَا هُوَ اٰتْ" جو چیز ہاتھ سے نکل گئی کتنا دور چلی گئی اور جو چیز آنے والی ہے وہ کس قدر قریب ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ "فَاتَ" کی 'تا' مفتوحہ ہے کیونکہ فعل ماضی ہے اور "اٰتٍ" کی 'تا' مکسور اور با تنوین ہے کیونکہ اسم فاعل ہے۔ لہٰذا ان کو اگر حرکت دی جاتی ہے تو مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کلام امیرؑ ہے، فرماتے ہیں: "دَلِيْلُهَا مَكِيْثُ الْكَلَامْ بَطِيْءُ الْقِيَامْ سَرِيْعٌ اِذَا قَامْ" (خطبہ ۹۹) اس پرچم کی رہنمائی کرنے والا وہ ہے جو بات کرنے میں جلد بازی نہیں کرتا، (پوری طرح غور کرنے کیلئے) اپنے اقدام میں تاخیر کرتا ہے اور جب کسی امر کو لے کر کھڑا ہو جائے تو پھر تیز گام ہے۔ پہلے دو کلموں کی میم مکسورہ ہے اور آخری کی مفتوحہ ہے۔ اگر ان کو متحرک پڑھا جاتا ہے تو سجع والی بات ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے مطرزی کہتے ہیں: "عرب جب کلموں کو اپنی تشاکل اور جوڑ ا ہونے کی صورت سے نکلتا دیکھتے ہیں تو ان میں مناسب تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں "آتِيْكَ بِالْغَدَايَا وَ

الْعَشَایَا "میں تمہارے پاس صبح یا شام کو آیا کروں گا۔یا" هَنَأَنِي الطَّعَامُ وَ مَرَّأَنِي "کھانا مجھے گوارا اور ہضم ہوا۔یا"أَخَذَهُمْ مَا قَدَمَ وَ حَدَثَ "انہیں پرانے اور تازہ غموں نے آلیا۔جبکہ ان کا مقصد "اَلْغَدَاوَةُ "، "اَمْرَأَنِي "اور" حَدُثَ "ہوتا ہے۔حالانکہ ایسا کرنے سے وہ لغوی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

۳۔سب سے بہترین سجع وہ ہوتا ہے جو مختصر ترین ہو۔اس لئے کہ سجع کے فاصلے سامع کی سماعت کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متکلم کو کلام پر کس حد تک عبور حاصل ہے۔جیسا کہ امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں: "أَخْلَاقُكُمْ دِقَاقٌ وَعَهْدُكُمْ شِقَاقٌ وَدِيْنُكُمْ نِفَاقٌ وَمَاءُ كُمْ زُعَاقٌ"(خطبہ ۱۳) تم پست اخلاق و عہد شکن ہو، تمہارے دین کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ اور تمہاری سرزمین کا پانی تک شور ہے۔

۴۔ابن نفیس کہتے ہیں کہ: "سجع کی خوبصورتی کیلئے قرآن مجید میں اس کا ورود ہی کافی ہے۔اور اگر بعض قرآنی آیات سجع سے خالی ہوتی ہیں تو یہ بھی ایک حسن ہے کیونکہ مقام انتقال اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کلام کو اس سے احسن کی طرف موڑا جائے۔

ابن حازم کہتے ہیں: "قرآن مجید، کلام عرب کے مختلف فصیح اسلوبوں کے مطابق نازل ہوا ہے۔لہذا اس کے "فواصل" ان مختلف فصیح اسلوبوں کے مطابق ہیں کہ جہاں پر مختلف "اسجاع" وارد ہوئے ہیں۔کیونکہ کلام کا حسن یہ نہیں ہوتا کہ وہ صرف ایک ہی نہج پر جاری رہے۔کیونکہ اس طرح سے اس میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے اور طبیعتوں میں اچاٹ آجاتا ہے اور اس لئے بھی کہ فصاحت کے مختلف فنون کا اختیار کرنا، ایک ڈگر پر چلنے سے زیادہ بہتر ہے۔اسی لئے قرآن مجید کی بعض آیات ایک دوسرے سے متماثل ہوتی ہیں اور بعض غیر متماثل۔

تشطیر

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ شاعر اپنے کلام کے ابتدائی اور آخری بیت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے پھر ان میں سے ہر ایک حصے کو سجع کی صورت میں لے آتا ہے لیکن سجع کی صورت میں ابتدائی حصہ اس کے آخری حصہ کے مخالف ہوتا ہے۔مثلاً شاعر کا یہ قول ہے؛

تَدْبِيْرُ مُعْتَصِمٍ بِاللهِ مُنْتَقِمٍ لِلّٰهِ مُرْتَغِبٍ فِی اللهِ مُرْتَقِبِ

یہ معتصم کی تدبیر ہے جو اللہ کے لطف کے ساتھ خطاؤں سے بچنے والا، اللہ کیلئے انتقام لینے والا، اللہ کے بارے میں ڈرنے والا اور ہر وقت اس سے خوف رکھنے والا ہے۔اسی طرح ابوصیری کہتے ہیں؛

كَالزُّهْرِ فِيْ تَرَفٍ وَ الْبَدْرِ فِيْ شَرَفٍ وَ الْبَحْرِ فِيْ كَرَمٍ وَ الدَّهْرِ فِيْ هِمَمٍ

نرمی میں کلی کی مانند، قدر و منزلت اور عز و شرف میں چودھویں کے چاند، جود و سخا میں سمندر اور عزم و ہمت میں زمانے کی مانند ہے۔

قول شارح: اگر مذکورہ تعریف کو صرف نظم تک ہی محدود نہ رکھا جائے تو ہم نثر میں مولا علی علیہ السلام کے اس کلام کو پیش کر سکتے ہیں: "وَ أَعْظَمُ مَاهُنَالِكَ بَلِيَّةً نُزُلُ الْحَمِيْمِ وَ تَصْلِيَةُ الْجَحِيْمِ وَ فَوْرَاتُ السَّعِيْرِ وَ سَوْرَاتُ الزَّفِيْرِ لَا فَتْرَةٌ مُرِيْحَةٌ وَ

لاَ دَعَةٌ مُرِيْحَةٌ وَ لاَقُوَّةٌ حَاجِزَةٌ وَ لاَ مَوْتَةٌ نَاجِزَةٌ "(خطبہ ۸۲)اور پھر وہاں کی سب سے بڑی آفت کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی، جہنم میں دخول، دوزخ کی لپیٹیں اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تیزیاں ہیں۔ نہ اس میں راحت کیلئے کوئی وقفہ ہے، نہ سکون وراحت کیلئے کچھ دیر کیلئے چارہ اور نہ روکنے والی موت ہے۔

تضمین مزدوج

اس کی تعریف یہ ہے کہ : "متکلم نثر کے قرینوں یا بیت کے دو حصوں میں سے ایک میں سجع اور قافیہ کی رعایت کرتے ہوئے دو مسجع الفاظ لے آئے۔ جیساکہ قرآن مجید میں ہے : "وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاءٍ بِنَبَاءٍ يَقِيْنٍ "(نمل / ۲۲)میں سرزمین سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں۔ اسی طرح : "وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًاوَّرَهَبًا "(انبیا / ۹۰) رحمت کے شوق اور عذاب کے خوف کی وجہ سے ہمیں پکارتے ہیں۔ اسی طرز پر امیر المؤمنینؑ کا کلام مقدس ہے : "فِيْ نَارٍ لَهَا كَلَبٌ وَلَجَبٌ وَلَهَبٌ سَاطِعٌ وَقَصِيْفٌ هَائِلٌ "(خطبہ ۱۰۸)اورایسی آگ میں ہوں گے جس میں تیز شرارے بھڑکنے کی آوازیں، اٹھتی ہوئی لپیٹیں اور ہولناک چیخیں ہوں گی۔ یا "وَالْجَحُوْدُ الْكَنُوْدُ وَالْعَنُوْدُ الصَّدُوْدُ وَالْحَيُوْدُ الْمَيُوْدُ "(خطبہ ۱۹۱)اور ہٹ دھرمی ناشکری ہے اور سیدھی راہ سے مڑنے اور رخ پھیرنے والی اور کجرو پیچ وتاب کھانیوالی ہے یا : "دَارُ حَرَبٍ وَسَلَبٍ وَنَهَبٍ وَعَطَبٍ وَاَهْلُهَا عَلٰى سَاقٍ وَسِيَاقٍ وَلِحَاقٍ وَ فِرَاقٍ " (خطبہ ۱۹۱) یہ غارتگری وتباہ کاری ہلاکت وتاراجی کا گھر ہے۔ اس کے رہنے والے پادر رکاب چل چلاؤ کے منتظر وصل وہجر کی کشمکش میں گرفتار ہیں۔

نظم میں اس کی مثال صاحب بن عباد کے مرثیہ کی صورت میں شاعر کہتا ہے ؛

مَضَى الصَّاحِبُ الْكَافِيْ وَ لَمْ يَبْقَ بَعْدَهٗ   كَرِيْمٌ يُرَوِّى الْاَرْضَ فَيْضُ غَمَامِهٖ

فَقَدْنَاهُ لَمَّا تَمَّ وَ اعْتَمَّ بِالْعُلٰى   كَذَاكَ خُسُوْفُ الْبَدْرِ عِنْدَ تَمَامِهٖ

بے نیاز کردینے والا صاحب بن عباد ہم سے رخصت ہو گیا، اس کے بعد کوئی اور سخی ایسا نہیں رہا جس کے بادل کی برسات ساری زمین کو سیراب کردے۔ ہم نے اسے اس وقت کھو دیا جب وہ ہر طرح سے کامل ہو چکا تھا اور اس نے بلندی مرتبہ کی دستار اپنے سر کرلی تھی چودھویں کا چاند بھی اسی طرح اپنے پورا ہو جانے کے بعد گہن جاتا ہے۔

لزوم مالایلزم

اسے "الزام"، "تشدید"، "تضییق" اور "اعنات" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ : نظم یا نثر میں حرف روی یا فاصلے سے پہلے ایک یا دو حروف ایسے لائے جائیں کہ جن کو سجع میں لانا واجب نہیں ہوتا۔ جیساکہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ "فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلاَ تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلاَ تَنْهَرْ "(ضحٰی / ۹ ـ ۱۰) اب جبکہ یہ بات ہے تو یتیم کو حقیر نہ جان، سوال کرنے والے کو نہ دھتکار۔ جبکہ یہاں فاصلوں کے ختم ہونے سے پہلے "ھا" کو لایا گیا ہے جبکہ اس کا لانا لازمی نہیں تھا کیونکہ سجع اس کے بغیر بھی واقع ہو گیا ہے۔ اور یہ کہا جاسکتا تھا کہ "فَلاَ تَسْخَرْ "(تحقیر نہ کر) اور "فَلاَ تَزْجُرْ "(اذیت نہ کر)۔ اسی طرح خداوند عالم کا یہ فرمان ہے : "فِيْ سِدْرٍ

مَخْضُوْدٍ وَطَلْحٍ مَنْضُوْدٍ "(واقعہ / ۲۸-۲۹) وہ بیری کے پرخار درختوں کے سائے میں مقیم ہوں گے اور پربرگ درخت طلح کے سائے میں رہتے ہوں گے۔ اسی طرز پر امیر المؤمنین کا کلام ہے فرماتے ہیں: "فَاِنَّهٗ اَرْجَحُ مَا وُزِنَ وَ اَفْضَلُ مَا خُزِنَ" (خطبہ ۲) یہ حمد اور طلب امداد وہ ہے جس کا ہر وزن میں آنے والی چیز سے پلہ بھاری ہے اور ہر گنج گراں مایہ سے بہتر و برتر ہے۔ یہاں پر "زا" مکسورہ کو ضرور لایا گیا ہے جبکہ سجع اس کے بغیر بھی رونما ہو سکتا ہے وہ یوں کہ "خُزِنَ" کی بجائے "رُکِنَ" کہا جاتا۔

اسی طرح نظم میں بھی ہے ....

حذف

"حذف" یہ ہوتا ہے کہ متکلم اپنے کلام سے حرف تہجی میں سے کسی ایک یا اس سے زیادہ حرفوں کو حذف کر دے یا اپنے کلام کو ایسے حروف سے مرتب کرے جن میں نقطے نہیں ہوتے اور اسے ایسے انداز میں ترتیب دے کہ کوئی بھی منقوط حرف درمیان میں نہ آنے پائے بشر طیکہ نہ تو کلام کی روانی متاثر ہو اور نہ ہی اس میں تکلف پایا جائے۔

علی بن ابی طالب علیہ السلام اس میدان کے شہسوار اور منبر سلونی کے ایسے تاجدار ہیں کہ اس نابغہ روزگار شخصیت نے ایک موقع پر فی البدیہہ اور فوری طور پر ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جسے "خطبہ مونقہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس کی عبارت شائستہ، کلمات شیریں، تجنیس مرصع، سجع ملیح، موعظے ایسے کہ بیماروں کو شفا ملے، نصیحتیں ایسی کہ پیاسے سیراب ہوں اگر اسے..... کلام معجز نظام کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس یکتائے زمانہ خطیب نے ایک اور خطبہ ارشاد فرمایا جو حروف منقوط سے خالی لیکن ہر طرح کے قواعد فصاحت وبلاغت سے معمور ہے۔ ان دونوں خطبات کو علامہ سید رضی مرحوم نے اس کتاب میں درج نہیں فرمایا لیکن میں چاہتا ہوں کہ انہیں یہاں پر ذکر کر دوں تا کہ صاحبان عقل کے ذہنوں کو جلا ہو اور دنیا کو معلوم ہو کہ باب مدینۃ العلم ہر باب میں پیشگام ہیں۔ اپنوں اور بیگانوں نے ہشام بن محمد سائب کلبی سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ اصحاب پیغمبرؐ میں یہ بحث چل نکلی کہ حروف تہجی میں سے کس حرف کو روز مرہ کی گفتگو میں زیادہ عمل دخل حاصل ہے؟ تو سب کا اس بات پر اجماع ہوا کہ "الف" کلام میں زیادہ دخیل ہے۔ یہ سن کر آپؑ نے بڑی فصاحت، بلاغت اور روانی کے ساتھ یہ خطبہ ارشاد فرمایا جسے "خطبہ مونقہ" (محیر العقول خطبہ) کا نام دیا۔ ارشاد فرماتے ہیں:

خطبہ مونقہ

حَمِدْتُ مَنْ عَظُمَتْ مِنَّتُهٗ، وَ سَبَغَتْ نِعْمَتُهٗ، وَ سَبَقَتْ رَحْمَتُهٗ، وَ تَمَّتْ كَلِمَتُهٗ، وَنَفَذَتْ مَشِيَّتُهٗ، وَبَلَغَتْ حُجَّتُهٗ،	میں نے (رب کی) حمد کی جس کی جود و بخشش مجھ پر عظیم تر ہو گئی نیز میرے معبود کی نعمتیں بھی مجھ پر بھرپور ہیں۔ جس کی حمد، جس کے غضب پر غالب ہے اور جس کا کلمہ تکمیل شدہ ہے۔ اس رب کی مشیت نافذ ہو کر رہی ہے۔ جس کی حجت مجھ تک پہنچ چکی ہے۔

وَعَدَلَتْ قَضِيَّتُهُ، حَمِدْتُهُ حَمْدَ مُقِرٍّ
بِرُبُوْبِيَّتِهِ مُتَخَضِّعٍ لِعُبُوْدِيَّتِهِ مُتَنَصِّلٍ
مِنْ خَطِيْئَتِهِ مُعْتَرِفٍ بِتَوْحِيْدِهِ مُؤَمِّلٍ
مِنْ رَبِّهِ رَحْمَةً تُنْجِيْهِ يَوْمَ يَشْغَلُ كُلٌّ
فَصِيْلَتِهِ وَبَنِيْهِ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَرْشِدُهُ وَ
نَسْتَهْدِيْهِ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ
شَهِدْتُ لَهُ شُهُوْدَ مُخْلِصٍ مُوْقِنٍ وَ
فَرَّدْتُهُ تَفْرِيْدَ مُؤْمِنٍ مُتْقِنٍ وَوَحَّدْتُهُ
تَوْحِيْدَ عَبْدٍ مُذْعِنٍ لَيْسَ لَهُ شَرِيْكٌ فِي
مُلْكِهِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ فِيْ صُنْعِهِ جَلَّ
عَنْ مُشِيْرٍ وَوَزِيْرٍ وَ تَنَزَّهَ عَنْ مِثْلٍ وَنَظِيْرٍ
عَلِمَ فَسَتَرَ وَ بَطَنَ فَخَبَرَ وَ مَلَكَ فَقَهَرَ وَ
عُصِيَ فَغَفَرَ وَ عُبِدَ فَشَكَرَ وَ حَكَمَ فَعَدَلَ
(وَ تَكَرَّمَ وَتَفَضَّلَ لَنْ يَزُوْلَ وَلَمْ يَزَلْ) لَمْ
يَزَلْ وَ لَنْ يَزُوْلَ وَلَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ
قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَبَعْدَ كُلِّ شَيْءٍ رَبٌّ مُتَفَرِّدٌ
بِعِزَّتِهِ مُتَمَلِّكٌ بِقُوَّتِهِ مُتَقَدِّسٌ بِعُلُوِّهِ
مُتَكَبِّرٌ بِسُمُوِّهِ لَيْسَ يُدْرِكُهُ بَصَرٌ وَ لَمْ
يُحِطْ بِهِ نَظَرٌ قَوِيٌّ مَنِيْعٌ بَصِيْرٌ سَمِيْعٌ
حَلِيْمٌ حَكِيْمٌ رَؤُوْفٌ رَحِيْمٌ عَجَزَ فِيْ
وَصْفِهِ مَنْ يَصِفُهُ وَضَلَّ فِيْ نَعْتِهِ

جس کے فیصلے میں عدل ہے۔ میں اس کی حمد یوں کرتا ہوں کہ جیسے کوئی ربوبیت کو تسلیم کرنے کے بعد کرے نیز بندگی کیلئے ہمیشہ سر تسلیم خم کیا ہوا ہو، اپنی خطاؤں سے دور رہے معترف توحید ہوں۔ اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہوں جو اسے نجات دے۔ جس دن ہر شخص اپنے بے شیروں، فرزندوں سے پیٹھ موڑے ہوئے ہوگا۔ ہم رب کریم سے مدد لیتے ہیں اور اسی سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ وہی ہے جس سے ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اس کی عظیم مرتبہ ہستی پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ اس کی جلیل ہستی پر توکل بھی کرتے ہیں۔ میں کسی مخلص یقین پرور کی طرح گواہی دیتا ہوں اور پختہ یقین مومن کی طرح میں اس منفرد ہستی کو منفرد ہی تسلیم کیے ہوئے ہوں۔ اور اس کی توحید کو میں یقین رکھنے والے بندے کی طرح ایک مانتا ہوں۔ اس کے ملک میں کوئی شریک نہیں۔ اور اس کی صنعت گری میں کسی قسم کی مدد کرنیوالا کوئی نہیں۔ وزیر و مشیر کے مشوروں سے بلند تر ہے اور ہر مثل و نظیر سے منزہ ہے۔ علم رکھنے کے باوجود بھی پردہ پوش ہے۔ چھپی ہوئی خبروں سے باخبر ہے، ہر شئے اس کی ملکیت میں اور وہ غالب ہے۔ جب اس کی معصیت کی گئی تو معاف کر دیا اور جب اس کی بندگی کی گئی تو اس نے قدر بھی کی، جب فیصلے کئے تو عدل سے، کرم کیا، فضل سے نوازا۔ ہمیشہ کیلئے ہے نیز ہمیشہ سے ہے۔ کوئی چیز اس کی مثل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اور ہر شے سے پہلے ہے اور ہر شے کے بعد بھی رہے گا وہ رب جو عزت میں یگانہ ہے، جس کی تمکنت اس کی قدرت کے ذریعہ ہے۔ اپنی بلندی کی وجہ سے مرکز تقدس ہے۔ متکبر ہے بلندی شان کے سبب۔ جسے دیدہ وری چھو نہیں سکتی اور نظر جس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ قوی، طاقتور، سمیع، حلیم و حکیم ہے اور رؤف و رحیم ہے۔ جو رب جلیل کی وصف کرے وہ حق گفتگو میں عدل کرنے سے معذور ہے۔ جو اس کی تعریف کرے وہ حق ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے بھٹک جاتا ہے۔

مَنْ يُعَرِّفُه، قَرُبَ فَبَعُدَ وَبَعُدَ فَقَرُبَ يُجِيْبُ
دَعْوَةَ مَنْ يَدْعُوْهُ وَيَرْزُقُ عَبْدَه، وَ يَحْبُوْهُ
ذُوْ لُطْفٍ خَفِيٍّ وَ بَطْشٍ قَوِيٍّ وَ رَحْمَةٍ
مُوْسِعَةٍ وَ عُقُوْبَةٍ مُوْجِعَةٍ رَحْمَتُه، جَنَّةٌ
عَرِيْضَةٌ مُوْنِقَةٌ وَ عُقُوْبَتُه، جَحِيْمٌ مُؤْصَدَةٌ
مُوْبِقَةٌ وَ شَهِدْتُ بِبَعْثِ مُحَمَّدٍ عَبْدِهٖ وَ
رَسُوْلِهٖ وَ صَفِيِّهٖ وَ حَبِيْبِهٖ وَ خَلِيْلِهٖ بَعَثَه،
فِيْ غَيْرِ عَصْرٍ وَفِيْ حِيْنِ فَتْرَةٍ وَ كُفْرٍ رَحْمَةً
لِعَبِيْدِهٖ وَمِنَّةً لِمَزِيْدِهٖ خَتَمَ بِهٖ نُبُوَّتَه، وَقَوّٰى
بِهٖ حُجَّتَه، فَوَعَظَ وَ نَصَحَ وَ بَلَّغَ وَ كَدَحَ
رَؤُوْفٌ بِكُلِّ مُؤْمِنٍ وَلِيٌّ سَخِيٌّ زَكِيٌّ رَضِيٌّ
عَلَيْهِ رَحْمَةٌ وَتَسْلِيْمٌ وَ بَرَكَةٌ وَ تَكْرِيْمٌ مِنْ
رَبٍّ غَفُوْرٍ رَحِيْمٍ قَرِيْبٍ مُجِيْبٍ وَصَّيْتُكُمْ
مَعْشَرَ مَنْ حَضَرَنِيْ بِتَقْوٰى رَبِّكُمْ
وَذَكَّرْتُكُمْ بِسُنَّةِ نَبِيِّكُمْ فَعَلَيْكُمْ بِرَهْبَةٍ
تُسَكِّنُ قُلُوْبَكُمْ وَ خَشْيَةٍ تُذْرِئُ دُمُوْعَكُمْ
وَ تَقِيَّةٍ تُنْجِيْكُمْ يَوْمَ يُذْهِلُكُمْ وَ يُبْلِيْكُمْ يَوْمَ
يَفُوْزُ فِيْهِ مَنْ ثَقُلَ وَزْنُ حَسَنَتِهٖ وَ خَفَّ
وَزْنُ سَيِّئَتِهٖ وَلْتَكُنْ مَسْئَلَتُكُمْ مَسْئَلَةَ ذُلٍّ
وَخُضُوْعٍ وَشُكْرٍ وَخُشُوْعٍ وَتُوْبَةٍ وَ نُزُوْعٍ وَ
نَدَمٍ وَ رُجُوْعٍ وَ لْيَغْتَنِمْ كُلُّ مُغْتَنِمٍ مِنْكُمْ

قریب تر بھی ہے اور دور بھی۔ وہ دور بھی ہے اور قریب تر بھی۔ جو
اسے پکارتا ہے اسے جواب دیتا ہے۔ اپنے بندوں کو رزق دیتا ہے اور
عطاؤں سے نوازتا ہے، لطفِ خفی کا مالک بھی ہے سخت طریقے سے
گرفت بھی کرتا ہے۔ بہت ہی وسیع رحمت کا مالک ہے اور دردناک
عذاب دیتا ہے، اور اس کی رحمت وسیع و عریض اور پر رونق بہشت کی
شکل میں موجود ہے۔ اس کا عذاب دلوں پر چڑھ جانیوالا اور تباہ کن
ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کی، جو اس کے
بندے، رسول، صفی، حبیب اور خلیل ہیں۔ جن کی بعثت بہترین
وقت پر ہوئی کہ جس وقت رسولوں کی بعثت رکی ہوئی تھی اور کفر
خیمہ زن تھا۔ یہ وہ ہستی ہے جو بندوں کیلئے رحمت ہے اور رب کی
نعمتوں کیلئے خود بھی نعمت ہے جن کے ذریعے نبوت ختم ہو گئی اور
حجت قوی ہو گئی۔ پس اس نے وعظ و نصیحت بھی کی اور تبلیغ کا فریضہ
انجام دیا اور مشقتیں اٹھائیں۔ کُل مؤمن پر رؤوف و ولی ہے، سخی
ہے، زکی ہے، رضی ہے۔ ان پر رب کی رحمت اور سلام بھی ہے، نیز
ربِ غفور و رحیم کی طرف سے برکت بھی ہے اور تکریم بھی۔ وہ رب
جو قریب بھی ہے اور مجیب بھی۔ اے وہ لوگو! جو میرے نزدیک
موجود ہو میں تمہیں اپنے رب سے خوف رکھنے کی نصیحت کرتا ہوں،
نیز تم کو تم لوگوں کے نبیؐ کی سنت کی طرف توجہ دلاتا ہوں تاکہ
تمہارے دلوں کو سکون حاصل ہو۔ اور اس کی خشیت بھی ضروری
ہے جو آنسوؤں کو جاری رکھے اور وہ ڈر بھی جو ہنر ہول اور پرسش کے
دن تم کو نجات دے۔ اس شخص کی کامیابی جس کی نعمتوں کا پلڑا
بھاری ہوگا اور برائیوں کا وزن خفیف ہوگا، پس تم لوگوں کی اس سے
طلب وہ طلب ہو جو کسی ذلیل، قصور زدہ، شکر ریز، مصروف خشوع
مشغول توبہ، تڑپتے ہوئے، شرمندہ و رجوع کنندہ کی ہوتی ہے۔ تم
میں سے ہر غنیمت پسند شخص صحت کو مرض سے پہلے غنیمت سمجھ،

صِحَّتَه، قَبْلَ سُقْمِهٖ وَ شَبِيْبَتَه، قَبْلَ هِرَمِهٖ وَ
سِعَتَه، قَبْلَ فَقْرِهٖ وَ خَلْوَتَه، قَبْلَ شُغْلِهٖ وَ
حَضَرَه، قَبْلَ سَفَرِهٖ قَبْلَ هُوَ يَكْبُرُ وَ يَهْرُمُ وَ
يَمْرُضُ وَ يَسْقُمُ وَ يَمُلُّه، طَبِيْبُه، وَ يُعْرِضُ
عَنْهُ حَبِيْبُه، وَيَتَغَيَّرُ عَقْلُه، وَ يَنْقَطِعُ عُمْرُه، ثُمَّ
قِيْلَ هُوَمَوْعُوْكٌ وَجِسْمُه، مَنْهُوْكٌ ثُمَّ جَدَّفِيْ
نَزْعٍ شَدِيْدٍ وَ حَضَرَه، كُلُّ قَرِيْبٍ وَ بَعِيْدٍ
فَشَخِصَ بِبَصَرِهٖ وَ طَمَحَ بِنَظَرِهٖ وَ رَشَحَ
جَبِيْنُهُ وَسَكَنَ حَنِيْنُه، جُذِبَتْ نَفْسُه، وَبَكَتْه،
عِرسُه، وَ حُفِرَ رَمْسُه، وَ يَتِمَ وَلَدُه، وَ تَفَرَّقَ
عَنْهُ عَدَدُه، وَقُسِّمَ جَمْعُه، وَ ذَهَبَ بَصَرُه، وَ
سَمْعُه، وَغُمِّضَ وَمُدِّدَوَوُجِّهَ وَجُرِّدَوَغُسِّلَ
وَنُشِّفَ وَ سُجِيَ وَ بُسِطَ لَهٗ وَ هُيِّئَ وَ نُشِرَ
عَلَيْهِ كَفَنُه، وَ شُدَّ مِنْهُ ذَقَنُه، وَقُمِّصَ وَعُمِّمَ
وَلُفَّ وَوُدِّعَ وَسُلِّمَ وَ حُمِلَ فَوْقَ سَرِيْرٍ وَ
صُلِّيَ عَلَيْهِ بِتَكْبِيْرٍ وَنُقِلَ مِنْ دُوْرٍ مُزَخْرَفَةٍ وَ
قُصُوْرٍ مُشَيَّدَةٍ وَ حُجُرٍ مُنَضَّدَةٍ فَجُعِلَ فِيْ
ضَرِيْحٍ مَلْحُوْدٍ وَ لَحَدٍ ضَيِّقٍ مَرْصُوْصٍ
بِلَبِنٍ مَنْضُوْدٍ مُسَقَّفٍ بِجُلْمُوْدٍ وَ هِيلَ عَلَيْهِ
عَفَرُه، وَحُشِيَ عَلَيْهِ مَدَرُه، فَتَحَقَّقَ حَذَرُه،
وَ نُسِيَ خَبَرُه، وَرَجَعَ عَنْهُ وَلِيُّه، وَنَسِيبُه،

جوانی کو ضعیفی سے پہلے اور وسعت رزق کو غربت سے پہلے۔ نیز فرصت کو مشغولیت سے پہلے اور سکونت کو سفر سے قبل اس سے پہلے کہ بوڑھا اور ضعیف ہو جائے یا بیمار اور مریض ہو جائے، طبیب تنگ دل ہو جائے اور رفیق بھی منہ موڑ لیں جبکہ عقل متغیر ہو چلے اور عمر کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ پھر کہا جانے لگے کہ وہ ایسا شخص ہے جو شکستہ دل ہے اور دیکھو کہ اس کا جسم بھی نحیف ہے، یہ کہ اس نے موت سے شدید جنگ بھی کی ہے اور عزیز، قریب و دور سے گرد جمع ہو گئے پس آنکھیں پتھرا گئیں اور نگاہیں ٹھہر گئیں پیشانی پر پسینے کے قطرے آنے لگے اور شوق سب شکستہ ہو گئے، سانسیں کھینچ لی گئیں۔ اس پر دلہن رونے لگی جبکہ قبر بھی کھد گئی، فرزند و دختر بھی یتیم ہو گئے اور اس سے لوگ برگشتہ ہونے لگے نیز جمع کردہ دولت تقسیم ہونے لگی پھر سننے دیکھنے کی سب قوتیں سلب ہو گئیں، آنکھیں بند کر دی گئیں اور سارے جسم کو دراز کر دیا گیا۔ چہرہ قبلہ کی طرف پھیر دیا گیا، نہلانے کیلئے کپڑے اتار لئے گئے پھر غسل دیا گیا خشک کیا اور کفن لایا گیا، اس کیلئے پلنگ اور کفن کھول دیئے گئے، پھر کفن پوشی بھی کی گئی، پھر ٹھوڑی تک کو باندھ دیا گیا، پھر قمیض و پگڑی پہنائی گئی۔ کفن میں لپیٹ دیا گیا الوداع کہی گئی اور آخری سلام کیا گیا۔ پھر پلنگ کو کندوں پر اٹھالیا گیا۔ پھر اس پر تکبیر کہہ کر نماز پڑھی گئی پھر اسے سجے ہوئے گھروں، پختہ محلوں، نفیس سجے ہوئے حجروں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا اور اسے لحد کے گڑھے میں تنگ جگہ پر کچی اینٹوں اور گارے سے ڈھانک دیا گیا اور اس کی چھت پتھر سے مضبوط کی گئی اور اس پر قبر ہی کی مٹی بکھیر دی گئی اور ڈھیلے اطراف میں پھیلا دیئے گئے لوح قبر قطعی محفوظ ہے جبکہ مردہ کی خبر گیری مفقود ہے، اس سے اس کے سارے کے سارے دوست، رشتہ دار لوٹ گئے۔

وَ تَبَدَّلَ بِهٖ قَرِيْبُه وَ حَبِيْبُه وَصَفِيُّه وَنَدِيْمُه
فَهُوَحَشْوُقَبْرٍوَرَهِيْنُ قَفْرٍيَسْعٰى فِيْ جِسْمِهٖ
دُوْدُقَبْرِهٖ وَيَسِيْلُ صَدِيْدُهٗ مِنْ مِنْخَرِهٖ وَ
يُسْحَقُ بَدَنُهٗ وَ لَحْمُهٗ وَ يَنْشِفُ دَمُه وَ يَرِمُّ
عَظْمُه وَ يُقِيْمُ فِيْ قَبْرِهٖ حَتّٰى يَوْمِ حَشْرِهٖ
فَيَنْشُرُ مِنْ قَبْرِهٖ حِيْنَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ
يُدْعٰى بِحَشْرٍ وَ نُشُوْرٍ فَثَمَّ بُعْثِرَتْ قُبُوْرٌ وَ
حُصِّلَتْ سَرِيْرَةُ صُدُوْرٍ وَ جِيْٓءَ بِكُلِّ نَبِيٍّ وَ
صِدِّيْقٍ وَشَهِيْدٍوَ نَطِيْقٍ وَ تَوَلّٰى لِفَصْلٍ عِنْدَ
رَبٍّ قَدِيْرٍ بِعَبْدِهٖ خَبِيْرٍ بَصِيْرٍ فَكَمْ مِنْ زَفْرَةٍ
تُضْنِيْهِ وَ حَسْرَةٍ تُنْضِيْهِ فِيْ مَوْقِفٍ مَهُوْلٍ
عَظِيْمٍ وَمَشْهَدٍجَلِيْلٍ جَسِيْمٍ بَيْنَ يَدَيْ مَلِكٍ
كَرِيْمٍ بِكُلِّ صَغِيْرَةٍ وَ كَبِيْرَةٍ عَلِيْمٍ فَحِيْنَئِذٍ
يُلْجِمُه عَرَقُه وَ يَحْفِزُه قَلَقُه عَبْرَتُه غَيْرُ
مَرْحُوْمَةٍوَصَرْخَتُه غَيْرُمَسْمُوْعَةٍ وَ حُجَّتُه
غَيْرُ مَقْبُوْلَةٍ وَ قُوْبِلَ صَحِيْفَتُه وَ تَبَيَّنَ
جَرِيْرَتُه وَ نَطَقَ كُلُّ عُضْوٍ مِنْهُ بِسُوْءِ عَمَلِهٖ
فَشَهِدَتْ عَيْنُهٗ بِنَظَرِهٖ وَيَدُهٗ بِبَطْشِهٖ وَرِجْلُهٗ
بِخَطْوِهٖ وَجِلْدُهٗ بِمَسِّهٖ وَفَرْجُهٗ بِلَمْسِهٖ وَ
يُهَدِّدُهٗ مُنْكَرٌ وَ نَكِيْرٌ وَ كَشَفَ عَنْهُ بَصِيْرٌ
فَسُلْسِلَ جِيْدُه وَ غُلَّتْ يَدُه وَ سِيْقَ

اس کے سب قریبی لوگ محبوب ساتھی، ہم نشین سب بدل دیئے گئے جبکہ مردہ لقمہ قبر اور بیابان کا رہین ہے نیز جسم میں قبر کے کیڑے گردش کر رہے ہیں۔ نتھنوں سے پیپ بہہ رہی ہے۔ اس کے بدن اور گوشت کو مہین پیسا جا رہا ہے۔ اس کا خون خشک ہو رہا ہے، نیز مردے کی ہڈیوں کو حشر کے دن تک پیستی ہی رہے گی اور اپنے اندر قائم رکھے گی۔ پھر وہ قبر سے روز محشر صور پھونکنے کے وقت نکالا جائے گا۔ پھر حشر و نشر کیلئے بلایا جائے گا۔ پھر قبریں شق ہوں گی۔ پھر سینوں کے بھید کھلیں گے۔ پھر ہر نبی، صدیق، شہید اور بولنے والے موجود ہوں گے نیز فیصلے کیلئے رب کریم کے حضور جو بندوں پر خبیر و بصیر ہے، وحشت کی کیفیت میں کھڑا ہوگا۔ پھر روز محشر کس قدر گریہ و بین ہوں گے جو مردہ کو مزید درد و رنج دیں گے۔ نیز کتنی حسرتیں ہوں گی جو بشر کو بوسیدہ کر دیں گی۔ یہ کیفیت عظیم یوم ہول میں، نیز اہم منزل پر ملک کریم کے ہاں ہوں گی، جو ہر چھوٹے بڑے گناہ کو جانتا ہے، اس وقت بہتا ہوا پسینہ منہ بند کر دے گا بے چینی اسے ہر طرف سے گھیر لے گی، اس کے آنسوؤں پر رحم نہیں ہوگا۔ اس کی فریادیں سننے کے درجے تک نہیں پہنچیں گی۔ اسکی حجت قبولیت کے درجے سے دور ہوں گی، اس کا اعمالنامہ سامنے لایا جائے گا، سارے جرائم کھل کر سامنے آجائیں گے، ہر عضو اپنی برائی کے متعلق خود بولے گا، اس کی نظر کے متعلق چشم عینی تصدیق کرے گی، اس کے ہاتھ بتائیں گے کہ کیا پکڑا، پاؤں بولیں گے کہ کہاں گئے، جلد بتائے گی کہ کسے مس کیا، مخفی عضو بتائیں گے کہ کسے اور کس سے لمس کیا، منکر و نکیر کی دھمکیاں علیحدہ ہوں گی، اسکی گردن شکنجے میں ہوگی اور ہاتھ ہتھکڑی میں، اور اسے گھسیٹتے ہوئے لے چلیں گے، سب کچھ سامنے آجائے گا، پس وہ کرب و شدت

بِسَحْبٍ وَحِدَّةٍ فَوَرَدَ جَهَنَّمَ بِكَرْبٍ وَشِدَّةٍ
فَظَلَّ يُعَذَّبُ فِيْ جَحِيْمٍ وَ يُسْقَىٰ شَرْبَةً مِنْ
حَمِيْمٍ تَشْوِيْ وَجْهَهُ وَ تَسْلَخُ جِلْدَهُ يَضْرِبُهُ
زِبْنِيَتُهُ بِمَقْمَعٍ مِنْ حَدِيْدٍ وَ يَعُوْدُ جِلْدُهُ بَعْدَ
نُضْجِهِ بِجِلْدٍ جَدِيْدٍ يَسْتَغِيْثُ فَتُعْرِضُ عَنْهُ
خَزَنَةُ جَهَنَّمَ وَ يَسْتَصْرِخُ فَيَلْبَثُ حُقْبَةً بِنَدَمٍ
نَعُوْذُ بِرَبٍّ قَدِيْرٍ مِنْ شَرِّ كُلِّ مَصِيْرٍ وَنَسْئَلُهُ
عَفْوَ مَنْ رَضِيَ عَنْهُ وَمَغْفِرَةَ مَنْ قَبِلَ مِنْهُ فَهُوَ
وَلِيُّ مَسْئَلَتِيْ وَمُنْجِحُ طَلِبَتِيْ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنْ
تَعْذِيْبِ رَبِّهِ سَكَنَ فِيْ جَنَّتِهِ بِقُرْبِهِ وَ خُلِّدَ فِيْ
قُصُوْرٍ مُشَيَّدَةٍ وَمَلِكَ حُوْرٍ عِيْنٍ وَحَفَدَةٍ طِيْفَ
عَلَيْهِ بِكُئُوْسٍ وَ سَكَنَ حَظِيْرَةَ فِرْدَوْسٍ وَ
تَقَلَّبَ فِيْ نَعِيْمٍ وَ سُقِيَ مِنْ تَسْنِيْمٍ وَ شَرِبَ
مِنْ عَيْنٍ سَلْسَبِيْلٍ مَمْزُوْجَةٍ بِزَنْجَبِيْلٍ
مَخْتُوْمَةٍ بِمِسْكٍ وَ عَبِيْرٍ مُسْتَدِيْمٌ لِلْحُبُوْرِ
مُسْتَشْعِرٌ لِلسُّرُوْرِ يَشْرَبُ مِنْ خُمُوْرٍ فِيْ
رَوْضٍ مُغْدِقٍ لَيْسَ يُصَدَّعُ مِنْ شُرْبِهِ وَ
لَيْسَ يَنْزِفُ هٰذِهِ مَسْئَلَةُ مَنْ خَشِيَ رَبَّهُ وَ
حَذَّرَ نَفْسَهُ وَتِلْكَ عُقُوْبَةُ مَنْ جَحَدَ مُنْشِئَهُ وَ
سَوَّلَتْ لَهُ نَفْسُهُ مَعْصِيَةَ مُبْدِئِهِ ذٰلِكَ قَوْلٌ
فَصْلٌ وَحُكْمٌ عَدْلٌ خَيْرُ قَصَصٍ قُصَّ وَوَعْظٍ

کے ساتھ جہنم میں پہنچے گا۔ اور اس کی جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے
سکونت ہو گی۔ پینے میں گرم پانی ہوگا جس سے چہرہ جھلسے گا اور
جلد سلگنے لگے گی، نیز زینت کی جگہ پر لوہے کے گرز سے چوٹ
پڑے گی، پھر جلد جلنے کے بعد نئی جلد میں تبدیل ہونے لگے گی
اگر وہ مدد کیلئے چیخے گا تو داروغہ اس سے منہ موڑ لے گا۔ اگر وہ شور و
غل کرے گا بھی تو کم سے کم ایک حقبہ (اسّی برس) ندامت کے
ساتھ مکین بن کر رہنے پر مجبور ہوگا، ہم رب کریم سے گوشۂ
رحمت طلب کرتے ہیں ہر نتیجہ کے شر سے اور عفو و درگزر طلب
کرتے ہیں اس کی جو خوشنودی کے ساتھ ہو، وہ مغفرت بھی جو
قبول کر لی گئی ہو، پس وہ میرے سوالوں کا ولی ہے نیز میری
ضرورت پوری کرنیوالا بھی ہے۔ پس جو تعذیب رب سے دور رہا
وہ اسکی جنت و قربت میں ساکن ہو گیا۔ اس کی جنت کے مضبوط
محلوں میں ہمیشہ کی سکونت ہو گی اور حورِ عین و نوکروں کی ملکیت
بھی مل گئی اور اس کے گرد کوثر کے جام گردش کر رہے ہوں گے
اور اس کی ہمیشہ کیلئے فردوس کی منزل میں سکونت ہے، نعمتوں
میں زندگی گزرتی رہے گی، تسنیم بہشت پینے میں ملتی رہے گی اور
سلسبیل کے چشمے سے پینے میں وہ مشروب کہ جس میں زنجبیل
(سونٹھ) کی طرح کا مزہ ہوگا، جو مشک و عبیر سے مہر شدہ ہوں گی،
جس کیلئے اس کی ملکیت مستقل نیز لذت و سرور ہر وقت پیہم۔ وہ
جنت کے گھنے باغات میں مشروب پی رہا ہوگا، اسے جو بھی پیے گا
کبھی درد سر میں نہ پڑے گا اور نہ کسی کمزوری میں۔ سوال اس
شخص کا ہے جو کا ہے جو اپنے رب سے ڈرتا اور اپنے کو ڈراتا ہے،
دوسری قسم کی سزائیں اس شخص کیلئے ہیں جو اپنے رب کا منکر ہے
کہ جس کے نفس نے پیدا کرنے والے کی معصیت کو زینت دی،
پس وہ صحیفہ، قولِ فیصل اور حکم عدل ہے نیز وہ بہترین قصے ہیں

نُصَّ تَنْزِيْلٌ مِنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ نَزَلَ بِهٖ رُوْحُ قُدُسٍ مُبِيْنٍ عَلٰى قَلْبِ نَبِيٍّ مُهْتَدٍ مَكِيْنٍ صَلَّتْ عَلَيْهِ رُسُلٌ سَفَرَةٌ مُكَرَّمُوْنَ بَرَرَةٌ عُذْتُ بِرَبٍّ رَحِيْمٍ مِنْ شَرِّ كُلِّ رَجِيْمٍ فَلْيَتَضَرَّعْ مُتَضَرِّعُكُمْ وَ لْيَبْتَهِلْ مُبْتَهِلُكُمْ فَنَسْتَغْفِرُ رَبَّ كُلِّ مَرْبُوْبٍ لِيْ وَلَكُمْ۔

جو بیان کئے گئے ہیں۔ وہ بہترین وعظ ہیں جن کی تلقین کی گئی ہے جو حکیم و حمید کی طرف سے نازل کردہ ہے کہ جسے امین روح القدس لے کر نازل ہوئے۔ با تمکین ہادی و مہدی نبیؐ کے قلب پر جس پر گزشتہ شریعتوں کے پیغمبروں نے جو مکرم و نیک تھے درود بھیجے۔ میں نے رب رحیم سے گوشہ سکون کی طلب کی، رجیم کے شر سے بچتے ہوئے۔ پس تم میں ہر روتے ہوئے بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ رب کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرے، ہر بے چین شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس کی طرف پوری توجہ دے، پس ہم ہر مربوب کے رب سے مغفرت طلب کرتے ہیں اپنے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی۔

شارحؒ کہتے ہیں: یہ خطبہ کئی ذرائع سے مروی ہے۔ اور علامہ مجلسیؒ نے اسے "مصباح کفعمی" سے بحار الانوار کی سترہویں جلد میں کافی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ہم نے ان اختلافی جملوں کو اسی خطبہ کے حواشی میں تحریر کر دیا ہے۔

علامہ مجلسیؒ مرحوم نے بحار کی نویں جلد میں تحریر کیا ہے کہ: "کلبی نے ابو صالح سے اور ابو جعفر بن بابویہؒ نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے انہوں نے اپنے آباؤ اجداد علیہم السلام سے روایت کی ہے کہ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکٹھے ہوئے اور اس بات پر گفتگو چل نکلی کہ روزمرہ کی گفتگو میں حرف "الف" زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ تو اس پر علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فوراً اور فی البدیہہ ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "حَمِدْتُ مَنْ عَظُمَتْ مِنَّتُهٗ وَ سَبَغَتْ نِعْمَتُهٗ" آخر تک۔ اس کے بعد فوراً ہی ایک اور خطبہ ارشاد فرمایا جس میں کوئی بھی منقوطہ حرف استعمال نہیں کیا۔ جس کے ابتدائی کلمات یہ ہیں: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَهْلِ الْحَمْدِ وَ مَأْوَاهُ وَ اَوْكَدُ الْحَمْدِ وَ اَحْلَاهُ وَ اَسْرَعُ الْحَمْدِ وَ اَسْرَاهُ وَ اَطْهَرُ الْحَمْدِ وَ اَسْمَاهُ وَ اَكْرَمُ الْحَمْدِ وَ اَوْلَاهُ.........." تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جو حمد کا اہل اور اس کی جائے پناہ ہے محکم و شیریں، سریع ترین، جلد آنے والی، پاکیزہ، بلند شان، با تکریم اور اولی حمد...... اور اسے میں نے کتاب "المخزون المکنون" میں درج کیا ہے۔

شارحؒ فرماتے ہیں: مجھے ابھی تک آپؑ کا یہ مکمل خطبہ نہیں مل سکا، خداوند عالم سے امید ہے کہ اسے ہمارے لئے ظاہر کر دے گا۔ اور چھان بین اور تلاش کے بعد ہمارے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا۔

سید شارح حبیب اللہ خوئی، خدا ان کے گناہوں کو معاف فرمائے؛ کہتے ہیں: "میں نے ساٹھ سے اوپر انواع بدیع کو یہاں پر ذکر کیا ہے، اور ان کی مثالیں امامؑ کے کلام سے پیش کی ہیں۔ اور یہ مقدمہ تحریر کیا ہے اور ان انواع کو مقدمۃً ذکر کیا ہے اور ان کی اجناس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاکہ آپ حضرات ان سے مانوس ہو کر امامؑ کے فائق و رائق اور سابق و لاحق کلام سے واقف ہوں اور اس میں بیان ہونے والے نکات، لطیف و نادر محسنات اور خوش گوار کلام کے نظم و ترتیب سے آگاہ ہوں۔ اور مجھے یہ اعتراف بھی ہے کہ میں نے یہ سب کچھ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق آپؑ کے بحر بیکراں کی مانند کلام سے صرف چلو ہی بھرا ہے، اس لئے کہ آپؑ کا

کلام بارش سے زیادہ موسلادھار اور نجوم و اشجار کی تعداد سے بے شمار ہے اور اسے جمع کرنے والا اس کے تمام اطراف کا کس طرح احاطہ کر سکتا ہے اور اس کی گہرائیوں تک اس کی کہاں تک رسائی ہو سکتی ہے ؟ کیونکہ یہ حد و حساب سے باہر اور انتہا تک پہنچنے کیلئے ناقابل عبور ہے۔ اور پھر یہ کہ اس کے بعض حصوں تک بھی صرف اس کی رسائی ہو سکتی ہے جو علم معانی و بیان کا شہسوار اور اس میدان میں اپنے مد مقابل افراد میں نمایاں ہو۔ خداوند عالم ہمیں ان حقائق کے پختہ کرنے کی توفیق مزید عطا فرمائے، ان دقائق پر یقین رکھنے میں ہمیں ثابت قدم رکھے قول اور عمل میں ہمیں سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے غلطی، خطا اور بے راہ روی سے ہم اس کی پناہ مانگتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے مناسب سمجھا ہے کہ تبرکاً امیر المؤمنین علیہ السلام کے مکارم اخلاق اور محاسن خصال کا تھوڑا سا تذکرہ کروں، آپؑ کے کچھ روشن فضائل کو بیان کروں، قدرے خاندانی شرافت اور بزرگی کا ذکر کروں اور پھیلی ہوئی نورانی شعاعوں سے اقتباس کروں، بقول شاعر:

مَآثِرُ صَافَحَتْ شُعَبَ النُّجُوْمِ مُشَيَّدَةٌ قَدْ سَمَتْ قَدْرًا عَلىٰ زُحَلِ

وَ سُنَّةٌ شَرَّعَتْ سُبُلَ الْهُدىٰ وَالنَّدىٰ اَقَامَ لِلطَّالِبِ الجَدْوىٰ عَلَى السُّبُلِ

اس کی یادگار کے طور پر رہ جانے والی نیکیاں اس قدر بلند مرتبہ ہیں کہ انہوں نے روشن ستاروں کے ساتھ جا کر ہاتھ ملایا ہے، اس قدر پائیدار ہیں کہ اپنی قدر و منزلت کے لحاظ سے ستارۂ زحل سے بھی آگے جا چکی ہیں۔ اس کا طور طریقہ ایسا ہے جس سے ہدایت کی راہیں کھل گئیں ہیں اور اس کی سخاوت ایسی ہے کہ جس نے مانگنے والوں کیلئے راستوں پر ہمیشہ کیلئے عطیات رکھ چھوڑے ہیں۔

اللہ کے نام کا سہارا لیتے ہوئے اس کی توفیق کے ساتھ عرض گزار ہوں:

امیر المؤمنینؑ کی نورانی ولادت

آپؑ کی ولادت باسعادت، مکہ معظمہ میں خدا کے محترم گھر (خانہ کعبہ) میں خدا کے مہینے رجب المرجب ۳۰ عام الفیل بروز جمعۃ المبارک ہوئی۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس سے اللہ نے صرف اور صرف آپؑ ہی کو نوازا ہے کیونکہ بیت اللہ میں نہ تو کوئی شخص آپؑ سے پہلے پیدا ہوا ہے اور نہ ہی آج تک اس میں کسی کی ولادت ہوئی ہے، چنانچہ اسی سلسلے میں آپؑ کے والد گرامی حضرت ابو طالبؑ ارشاد فرماتے ہیں:

أَنْتَ الَّذِيْ فَرَضَ الإِلٰهُ وِلَائَهُ وَ نَطَقْتَ حَقًّا بِالْجَوَابِ الصَّائِبِ

أَنْتَ الَّذِيْ رَفَعَ الإِلٰهُ مَحَلَّهُ وَ عَلاَ عُلاَكَ عَلَى الشِّهَابِ الثَّاقِبِ

وَ وُلِدْتَ فِى الْبَيْتِ الْحَرَامِ وَ خَصَّكَ الْبَارِيْ بِكُلِّ مَكَارِمٍ وَ مَوَاهِبِ

جَائَتْ نِسَاءُ الْمُصْطَفِيْنَ جَمِيْعُهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِعَجَائِبِ

تو وہ ذات والا صفات ہے کہ جس کی محبت معبود حقیقی نے سب پر واجب قرار دی ہے، اور تو نے ہمیشہ صحیح جواب کے ساتھ برحق گفتگو کی ہے، تو وہ عظیم ذات ہے کہ جس کے مقام و مرتبے کو خداوند عالم نے بلند قرار دیا ہے اور تیری بلندی کی گرد پا کو شہاب

ثاقب کی بلندی بھی نہیں چھو سکتی۔ تو اللہ کے حرمت والے گھر (کعبہ) میں پیدا ہوا اور خالق نے تجھے ہر بزرگی اور بخشش کے ساتھ مخصوص فرمایا تمام برگزیدہ لوگوں (انبیاء و اوصیاء) کی بیبیاں آئیں، وہ بہت مسرور ہو رہے ہیں کیونکہ تو ان کے پاس حیران کر دینے والی چیزیں لایا۔

بحار الانوار میں تہذیب الاحکام سے روایت کی گئی ہے: "آپؑ کی ولادت (باسعادت) مکہ، بیت الحرام میں جمعہ کے دن ہوئی جبکہ عام الفیل کا تیسواں سال رجب کی تیرہ تاریخ تھی اور کوفہ میں جمعہ کی رات شہادت ہوئی جبکہ ۴۰ھ کے ماہ رمضان کی نو راتیں باقی تھیں اور اس وقت آپؑ کی عمر شریف ۶۳ برس تھی"۔

کتاب "مصباح الزائر" میں عتاب بن سعید سے روایت ہے کہ: "امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت باسعادت مکہ بیت الحرام میں ہوئی۔ جمعہ کے دن اور رجب کی تیرہ تاریخ تھی آپؑ کی ولادت نبوت سے بارہ سال قبل ہوئی جبکہ حضرت رسول خدا کی عمر مبارک اس وقت ۲۸ برس تھی"۔ اس بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں جو انشاء اللہ ۱۳۱ ویں خطبہ کی شرح میں بیان ہوں گی۔ اسی کتاب میں علل الشرائع، معانی الاخبار، امالی صدوقؒ اور روضۃ الواعظین سے روایت کی گئی ہے کہ یزید بن قعنب کہتا ہے: "میں عباس بن عبد المطلب کے ساتھ خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور عبد العزی کے کچھ اور لوگ بھی وہاں پر موجود تھے کہ اچانک امیر المؤمنینؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد تشریف لے آئیں اس وقت نو ماہ کا بچہ ان کے شکم مبارک میں تھا۔ انہیں درد زہ لاحق ہو چکی تھی اور یہ دعا کی "رَبِّ اِنِّي مُؤْمِنَةٌ بِكَ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِكَ مِنْ رُسُلٍ وَكُتُبٍ وَاِنِّي مُصَدِّقَةٌ لِكَلَامِ جَدِّيْ اِبْرَاهِيْمَ الْخَلِيْلِ وَاَنَّهُ بَنَى الْبَيْتَ الْعَتِيْقَ فَبِحَقِ الَّذِيْ بَنَى الْبَيْتَ وَبِحَقِّ الْمَوْلُوْدِ الَّذِيْ فِيْ بَطْنِيْ لَمَّا يَسَّرْتَ عَلَيَّ وِلَادَتِي" "بار الہا! میں تجھ پر اور تیری طرف سے آنے والے رسولوں اور کتابوں پر ایمان رکھتی ہوں اور اپنے جد حضرت ابراہیم خلیلؑ کے کلام کی تصدیق کرتی ہوں، انہوں ہی نے اس بیت عتیق (خانہ کعبہ) کو بنایا تجھے اس کے حق کا واسطہ جس نے اس گھر کو بنایا اور اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے، میرے لئے ولادت کو آسان کر دے۔

راوی کہتا ہے: اسی اثناء میں ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ کی دیوار سے دروازہ کھل گیا اور حضرت فاطمہ اس میں داخل ہوئیں اور ہماری نظروں سے غائب ہو گئیں اور دیوار پھر سے مل گئی۔ ہم نے دروازے کا قفل کھولنا چاہا لیکن وہ کھلنے میں نہ آیا۔ جس سے ہم نے سمجھ لیا کہ یہ ایک خدائی راز ہے۔ پھر آپ چوتھے دن کعبہ سے باہر تشریف لائیں اس وقت آپ کے ہاتھوں پر امیر المؤمنینؑ تھے، انہوں نے یہ بھی فرمایا: مجھے گزشتہ عورتوں پر فضیلت عطا ہوئی ہے کیونکہ آسیہ بنت مزاحم نے وہاں پر چھپ کر خدا کی عبادت کی جہاں خدا کو کسی کی عبادت مجبوری کے سوا پسند نہیں ہے۔ مریم بنت عمران نے کھجور کے خشک درخت کو ہلایا جس پر سے تازہ کھجوریں گریں اور انہوں نے وہ کھجوریں کھائیں۔ جبکہ میں خدا کے محترم گھر میں داخل ہوئی اور وہاں پر بہشت کے میووں سے میری تواضع کی گئی۔ اور مجھے ہاتف غیبی نے آواز دی کہ اس کا نام "علیؑ" رکھو! پس وہ علیؑ ہے۔ اور خداوند علی و اعلیٰ فرماتا ہے: "میں نے اس کا نام اپنے نام سے مشتق کیا ہے، اسے اپنے آداب تعلیم کئے ہیں، اسے اپنے دقیق اور پیچیدہ علم سے نوازا ہے۔ یہ وہی ہے جو میرے گھر میں موجود بتوں کو توڑے گا۔ یہ وہی ہے جو میرے گھر کی چھت پر اذان دے گا۔ میری تقدیس و تمجید بیان کرے گا۔ لہذا خوشخبری ہے

اس کیلئے جواس سے محبت کرے گااور اس کی فرمانبرداری کرے گااور عذاب ہے اس کیلئے جو اس سے دشمنی رکھے گااور نافرمانی کرے گا"

کتاب "کشف الغمہ" میں، کتاب "بشائر المصطفیٰ" سے نقل کیا گیا ہے جس کا سلسلہ سند یزید بن قعنب تک جا پہنچتا ہے اس میں بھی روایت کو اسی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن آخر میں اس بات کا اضافہ ہے کہ: حضرت فاطمہ بنت اسد فرماتی ہیں: "علیؑ کی ولادت اس وقت ہوئی جب پیغمبر خدا کی عمر تیس سال تھی، رسول پاک انہیں بہت دوست رکھتے تھے اور آپؐ فرماتے تھے 'اس کا گہوارہ میرے بستر کے نزدیک رکھا کرو' علیؑ کی اکثر تربیت کا کام خود پیغمبر خداؐ انجام دیتے تھے۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے خود نہلاتے اپنے ہاتھوں سے ہی انہیں دودھ پلاتے ان کا جھولا خود جھلاتے، انہیں لوریاں دیتے، انہیں اپنے سینے اور گردن پر بٹھاتے اور کہتے 'یہ میرا بھائی، میرا ولی، میرا ناصر، میرا صفی میرا ذخیرہ، میری پناہ، میرا داماد، میرا وصی، میری شریف بیٹی کا شوہر، میری وصیتوں کا امین اور میرا خلیفہ ہے' آنحضرتؐ ہمیشہ اسے اٹھائے رہتے، مکہ کے پہاڑی اور میدانی علاقوں میں لے جاتے اور وادیوں اور گھاٹیوں کی سیر کراتے رہتے تھے"۔
اللہ کا درود ہو دونوں بزرگوں پر۔

اسکافی کہتے ہیں؛

نَطَقَتْ دَلاَئِلُهٗ بِفَضْلِ صِفَاتِهٖ بَيْنَ الْقَبَائِلِ وَ هُوَ طِفْلٌ يَرْضَعُ

ابھی آپ شیر خوار بچے ہی تھے کہ تمام قبائل عرب میں آپ کے فضائل کی شہرت ہوگئی۔ محمد بن منصور سرخسی کہتے ہیں؛

وَلَدَتْهُ مُنْجَبَةٌ وَ كَانَ وِلاَدُهَا فِيْ جَوْفِ كَعْبَةَ اَفْضَلَ الاَكْنَانِ
وَ سَقَاهُ رِيْقَتَهُ النَّبِيُّ وَ يَالَهَا مِنْ شُرْبَةٍ تُغْنِيْ عَنِ الاَلْبَانِ
حَتّٰى تَزَعْزَعَ سَيِّدًا سَنَدًا رِضىً اَسَدًا شَدِيْدَ الْقَلْبِ غَيْرَ جَبَانِ
عَبَدَ الاِلٰهَ مَعَ النَّبِيِّ وَ اَنَّهٗ قَدْ كَانَ بَعْدُ يُعَدُّ فِى الصِّبْيَانِ
فَلِذٰلِكَ زَوَّجَهُ الرَّسُوْلُ بَتُوْلَهٗ وَ غَدَا وَصِيَّ الاِنْسِ ثُمَّ الجَانِّ
شَهِدَتْ لَهٗ آيَاتُ سُوْرَةِ هَلْ اَتٰى بِمَنَاقِبَ جَلَّتْ عَنِ التِّبْيَانِ

ایک شریف اور نجیب خاتون نے آپؑ کو خانہ کعبہ کے اندر جنم دیا جو اطراف عالم سے افضل ترین جگہ ہے پیغمبرؐ نے اپنے لعاب سے انکی غذا دی کہ آپؑ کو کسی کے دودھ پینے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اسی سے آپؑ کی ایسی پرورش ہوئی کہ آپؑ سید سند، رضائے الٰہی کے طالب، شیر اور دل کے مضبوط ہوئے۔ پیغمبرؐ کے ساتھ مل کر اس وقت خدا کی عبادت کی کہ ابھی بچے تھے اسی لئے تو رسول خداؐ نے اپنی بتول بیٹی کا عقد آپؑ سے کر دیا اور پھر پیغمبرؐ انس و جان کے وصی قرار پائے۔ سورہ ہل اتی کی آیات آپؑ کے ایسے فضائل و مناقب کی شاہد ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔

اسم مبارک

آپؑ کا مشہور و معروف اسم مبارک تو "علیؑ" ہے جو اللہ جل شانہ کے مقدس نام "علی اعلیٰ" سے مشتق ہے، جیسا کہ آپؑ

کے والد گرامی جناب ابو طالبؑ فرماتے ہیں :

سَمَّيْتُهٗ بِعَلِيٍّ كَيْ يَدُوْمَ لَهٗ عِزُّ الْعُلُوِّ وَ فَخْرُ الْعِزِّ اَدْوَمُهٗ

میں نے اس کا نام علی رکھا ہے تاکہ اس کیلئے بلندی کی عزت اور عزت کا فخر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قائم ودائم رہے۔

بحار الانوار میں مناقب ابن شہر آشوب سے نقل کیا گیا ہے کہ ابو علی بن ہمام، مرفوع سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ :

"جب علی علیہ السلام پیدا ہو چکے تو ابو طالبؑ نے حضرت فاطمہ بنت اسدؑ کا ہاتھ پکڑا جبکہ علیؑ کو سینے سے لگایا ہوا تھا، اسی حالت میں وادیٔ بطحا کی جانب چل دیئے اور ان الفاظ کے ساتھ خدا سے مناجات کی :

يَا رَبَّ ذَا الْغَسَقِ الدَّجِيِّ ، وَ الْقَمَرِ الْمُبْتَلِجِ الْمُضِيْءِ

بَيِّنْ لَنَا مِنْ حُكْمِكَ الْمَقْضِيِّ مَاذَا تَرٰى فِيْ اِسْمِ ذَا الصَّبِيِّ

اے تاریک سے تاریک ترراتوں اور روشن وخوبصورت چاند کے مالک! تو اپنے واضح حکم کے ساتھ ہمیں بتا کہ اس بچے کے نام کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟

راوی کا بیان ہے کہ اتنے میں بادل کی مانند ایک چیز زمین پر چلتی ہوئی حضرت ابو طالبؑ کے سینے سے آکر مل گئی آپ نے اسے اور علیؑ کو اپنے سینے سے لگالیا جب غبار چھٹا تو معلوم ہوا سبز رنگ کی ایک لوح ہے جس پر یہ مکتوب تھا :

خُصِّصْتُمَا بِالْوَلَدِ الزَّكِيِّ وَ الطَّاهِرِ الْمُنْتَجَبِ الرَّضِيِّ

فَاسْمُهٗ مِنْ شَامِخٍ عَلِيٍّ عَلِيٌّ اشْتُقَّ مِنَ الْعَلِيِّ

تم دونوں کو خصوصیت کے ساتھ ایک پاکیزہ بچہ ہوا ہے جو طاہر ہے، منتجب ومنتخب ہے اور رضی ہے۔ اس کا نام خدا کے بلند وبالاترین نام سے ہے، پس یہ علیؑ ہے جو "علی اعلیٰ" سے مشتق ہے۔

روایت میں ہے کہ اس لوح کو خانہ کعبہ کے ساتھ لٹکا دیا گیا، اور ہشام بن عبد الملک کے دور تک اس کے ساتھ لٹکتی رہی یہاں تک کہ اس نے وہاں سے اتار لیا۔ اہل بیتؑ کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ لوح خانہ کعبہ کے ساتھ دائیں زاویئے پر ایک کونے میں تھی۔

پاکیزہ فرزند، پاکیزہ نسل سے پاک وپاکیزہ جگہ میں پیدا ہوا۔ یہ شرف علیؑ کے سوا اور کس کو حاصل ہے؟ اس لئے کہ روئے زمین کا باشرف ٹکڑا حرم ہے، حرم کا باشرف حصہ مسجد الحرام ہے، مسجد الحرام کا شرف یافتہ مقام خانہ کعبہ ہے اور اس گھر میں سوائے علیؑ کے کوئی اور ولادت کا شرف حاصل نہ کر سکا، لہذا اس مولود مسعود کا کیا مقام ہوگا؟ دنیا میں آج تک کوئی بچہ سید الایام (جمعہ) کے دن، ماہ حرام (رجب) اور بیت الحرام (کعبہ) میں پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

شارح معتزلی کہتے ہیں: "آپؑ کا پہلا نام آپؑ کی والدہ نے اپنے والد "اسد بن ہاشم" کے نام پر "حیدر" رکھا، حیدر "شیر" کو کہتے ہیں پھر آپؑ کے والد نے وہ نام تبدیل کر کے "علیؑ" رکھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قریش آپؑ کو "حیدرؑ" کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس پر خود علیؑ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ : "اَنَا الَّذِيْ سَمَّتْنِيْ اُمِّيْ حَيْدَرَةً" "میں وہ ہوں کہ جس کا نام ماں نے حیدر رکھا۔ آئندہ ذکر ہونے والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کا نام "زید" بھی تھا۔ تو اس میں اس لئے کوئی

منافات نہیں ہے کہ "اسماء کا ایک ہونا مسمیٰ کے کمال کی دلیل ہوتا ہے"۔

آپؑ کا نورانی سلسلہ نسب

اخطب خوارزمی کہتے ہیں ؛

نَسَبُ الْمُطَهَّرِ بَيْنَ اَنْسَابِ الْوَرىٰ كَالشَّمْسِ بَيْنَ كَوَاكِبِ الْاَنْسَابِ

وَ الشَّمْسُ اِنْ طَلَعَتْ فَمَا مِنْ كَوْكَبٍ اِلاَّ تَغِيْبُ فِيْ نِقَابِ حِجَابِ

اس مقدس انسان کا پاکیزہ سلسلۂ نسب دوسرے لوگوں کے نسبوں کے درمیان ایسے ہے جیسے ستاروں کے درمیان سورج ہوتا ہے۔ کیونکہ جب سورج طلوع کرتا ہے تو تمام ستارے حجابوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس لئے کہ علیؑ کے آباؤاجداد وہی ہیں جو رسول خداؐ کے ہیں علیؑ کی مائیں بھی پیغمبر کی مائیں ہیں، ان کا گوشت اور خون پیغمبرؐ کے خون اور گوشت میں مخلوط تھا۔ علیؑ کی طینت نبیؐ کی طینت، علیؑ کی فطرت نبیؐ کی فطرت اور علیؑ کا نور اور نبی کا نور ایک تھا۔ دونوں ہی ایک ایسے شجرے تھے جس کی شاخیں طویل اور پھل نا قابل رسائی تھا، جو حرم میں اگا اور عزوکرم میں پروان چڑھا۔ عالم اور آدمؑ سے پہلے اللہ نے ان کے نور کو خلق فرمایا، پھر یہ نور برگزیدہ مردوں کی صلبوں اور مقدس، مطہر اور مہذب خواتین کے ارحام میں منتقل ہوتا رہا اور زمانے پر زمانہ گزرتا رہا یہاں تک کہ اللہ نے یہ نور عبدالمطلبؑ تک پہنچادیا اور ان سے ان کے دو فرزندوں، عبداللہؑ اور ابوطالبؑ میں تقسیم کردیا، پہلے نور سے سید الانبیاء کو اور دوسرے سے سید الاوصیاءؑ کو قرار دیا، وہ پہلا ہے اور یہ دوسرا، وہ "مُنذِر" ہے تو یہ "ہادی"!

"غایۃ المرام" میں شیخ صدوقؒ سے اسناد کے ساتھ روایت ہے کہ : حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام بصرہ کے منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا : "لوگو! میرے نسب کو پہچانو!! جو پہچانتا ہے سو پہچانتا ہے جو نہیں پہچانتا میں اسے شناخت کرائے دیتا ہوں، میں زید بن عبد مناف بن عامر بن عمرو بن مغیرہ بن زید بن کلاب ہوں"۔ اسی اثناء میں ابن کوا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "اے فلاں! ہم تو آپؑ کا نسب اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے کہ آپؑ علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب ہیں"۔ آپؑ نے فرمایا "او کمینے پست فطرت! میرے والد نے میرا نام 'زید' اپنے دادا 'قصی' کے نام پر رکھا ہے، میرے والد کا نام 'عبد مناف' ہے جبکہ ان کی کنیت ان کے نام پر غالب آگئی۔ عبد المطلب کا نام 'عامر' ہے ان کا لقب ان کے نام پر غالب آگیا۔ قصی کا نام زید ہے اور عربوں نے ان کا نام 'مجمع' رکھا ہے کیونکہ انہوں نے عربوں کو دور دراز کے شہروں سے لاکر مکہ میں جمع کردیا، اسی لئے لقب اسم پر غالب آگیا"۔

خوارزمی کتاب مناقب میں لکھتے ہیں کہ "حضرت ابو طالب کے چار فرزند تھے۔ طالب، کہ جن کی اولاد نہیں ہے، عقیل، جعفر اور علیؑ۔ ان میں سے ہر ایک بالترتیب دس سال دوسرے سے بڑا ہے اور علیؑ ان سب سے چھوٹے ہیں۔ ان کی بہن ام ہانی سمیت سب کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی ہیں۔ اور آپؑ وہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جن سے ہاشمی فرزند پیدا ہوا"۔

ابن ابی الحدید معتزلی کہتے ہیں : "فاطمہ بنت اسد دس مسلمانوں کے بعد اسلام لے آئیں اور گیارہویں مسلمان آپ ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ آپ کی بہت عزت و تکریم کیا کرتے تھے اور انہیں "ماں" کہہ کر پکارتے تھے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وصیتیں کیں اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی وہ وصیتیں قبول فرمائیں۔ ان پر نماز جنازہ پڑھی، ان کی لحد میں اترے، وہاں پر لیٹے اور انہیں اپنی قمیص کا کفن پہنایا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! ہم نے آج تک آپؐ کو ایسے کرتا نہیں دیکھا، آپؐ نے یہ کس لئے کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "حضرت ابو طالب کے بعد ان سے بڑھ کر کوئی اور مجھ پر مہربان نہیں تھا۔ انہیں میں نے اپنی قمیص اس لئے پہنائی ہے تاکہ بہشت کے لباس سے مزین ہوں، ان کی قبر میں اس لئے لیٹا ہوں تاکہ ان پر قبر کی سختی آسان ہو جائے"۔

اب ہم آتے ہیں حضرت ابو طالبؑ کے اسلام کی طرف، تو یاد رہنا چاہئے کہ اس پر تمام شیعوں کا اتفاق ہے کہ آپ پکے مسلمان اور مؤمن تھے۔ اس میں صرف آنکھوں ہی کے نہیں دل کے بھی اندھے عامہ نے اختلاف کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم شاید کسی مناسب مقام پر سیر حاصل بحث کریں گے، یہاں پر صرف احتجاج طبرسیؒ کی ایک روایت پر اکتفاء کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے: "حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن امیر المؤمنین علیہ السلام مقام "رحبہ" میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ آپؑ کے گرد جمع تھے، اسی دوران ایک شخص کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "یا امیر المؤمنینؑ! آپؑ تو اس مقام پر براجمان ہیں جو خدا نے آپؑ کو عطا فرمایا ہے لیکن آپؑ کے والد جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں!" حضرتؑ نے یہ سن کر فرمایا: "خاموش ہو جاؤ، خدا تمہارا منہ توڑے! مجھے اس ذات کی قسم جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اگر میرے والد روئے زمین پر موجود تمام گنہگاروں کی شفاعت بھی کریں تو خدا ان کی شفاعت کو قبول فرمائے گا۔ میرے والد جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوں جبکہ ان کا بیٹا جنت و دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہے؟" پھر فرمایا "اس خدا کی قسم جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے، قیامت کے دن میرے والد کا نور پانچ انوار کے سوا تمام نوروں کو بجھا دے گا۔ وہ پانچ نور یہ ہیں، رسول خداؐ کا، میرا، حسنؑ و حسینؑ کا اور حسینؑ کے نو بیٹوں کا، کیونکہ ابو طالب کا نور ہمارے اس نور سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدمؑ سے دو ہزار سال قبل خلق فرمایا تھا۔

نورانی کنیت

آپؑ کی کنیت ابو الحسن، ابو الحسین، ابو ریحانتین، ابو سبطین اور ابو تراب ہے۔

بحار الانوار میں مناقب ابن شہر آشوب سے اور انہوں نے خرکوشی سے نقل کیا ہے، شیرویہ نے الفردوس میں اسناد کے ساتھ اس بات کو ذکر کیا ہے کہ: امام حسن اور امام حسین علیہما السلام، پیغمبر خداؐ کی زندگی میں آپؑ کو "یَا اَبَہ" (میرے بابا) کہہ کر نہیں پکارتے تھے بلکہ حسن علیہ السلام "یَا اَبَا الْحُسَیْنِ" (حسینؑ کے بابا) اور حسین علیہ السلام "یَا اَبَا الْحَسَنِ" (حسنؑ کے بابا) کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن جب پیغمبر خداؐ کی رحلت ہو گئی تو ہر ایک آپؑ کو "یَا اَبَانَا" (ہمارے بابا) کہہ کر پکارتے تھے۔

کشف الغمہ میں خوارزمی سے روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "پیغمبر خداؐ کی زندگی میں مجھے حسنؑ 'اَبَا حُسَیْنِ' اور حسینؑ 'اَبَا حَسَنِ' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ اپنا باپ رسول خداؐ کو سمجھتے تھے۔ لیکن جب سرکار رسالتمآبؐ کی رحلت

ہو گئی تو مجھے 'اپنابابا' کہہ کر پکارتے تھے"۔ کشف الغمہ ہی میں کتاب مناقب ابن مردویہ سے نقل کیا گیا ہے انہوں نے جابر سے روایت کی ہے کہ: "میں نے رسول خداؐ سے ان کی وفات کے تین روز قبل علی بن ابی طالبؑ کو مخاطب ہو کر فرماتے ہوئے سنا: 'سلام ہو آپؑ پر اے "اَبُو الرَّيْحَانَتَيْنِ" (دو پھولوں کے باپ) میں آپ کو اپنے دنیا کے ان دو پھولوں کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، اور عنقریب آپؑ کے دو رکن (ستون) گر جائیں گے۔ میری طرف سے خدا ہی تمہارا نگہبان ہے'۔ تو جب حضرت رسول خداؐ کی رحلت ہوئی تو علی علیہ السلام نے فرمایا: 'وہ پہلا ستون گرا ہے جس کے بارے میں پیغمبرؐ نے مجھ سے فرمایا تھا'۔ جب حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شہادت ہو گئی تو علی علیہ السلام نے فرمایا: 'اب دوسرا ستون بھی گر گیا جس کے بارے میں پیغمبرؐ فرما گئے تھے"۔

کتاب "غایۃ المرام" میں ہے کہ شیخ صدوقؒ نے اپنی سند کے ساتھ "عبایۃ بن ربعی" سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: "میں نے عبداللہ بن عباس سے پوچھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کو کس بنا پر "ابوتراب" کی کنیت سے نوازا؟ تو انہوں نے جواب دیا: 'اس لئے کہ علیؑ مٹی (زمین) کے مالک ہیں اور ان کے بعد اہل زمین پر خدا کی حجت ہیں، انہی کے ذریعہ زمین کی بقا ہے اور زمین کو سکون و قرار حاصل ہے اور میں نے حضرت رسول خداؐ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: 'جب قیامت کا دن ہو گا اور کافر ان چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا جو خداوند عالم شیعیان علیؑ کیلئے مقرر کی ہوئی ہیں یعنی ثواب، قرب الٰہی، عزت و کرامت، تو وہ کہے گا "اے کاش کہ میں مٹی ہوتا" یعنی علیؑ کے شیعوں میں سے ہوتا۔ اور یہ بات قرآن مجید میں موجود ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: 'وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَالَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا' (نبا/۴۰) اور کافر کہے گا اے کاش! کہ میں مٹی ہوتا"۔ اس بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے؛

اَنَا وَ جَمِيْعُ مَنْ فَوْقَ التُّرَابِ   فِدًا لِتُرَابِ نَعْلِ اَبِيْ تُرَابٖ

اِمَامٌ مَدْحُهٗ ذِكْرِيْ وَ دَأْبِيْ   وَ قَلْبِيْ نَحْوَهٗ مَا عِشْتُ صَابٖ

میں اور روئے زمین پر رہنے والا ہر کوئی، ابوتراب (علیؑ) کے جوتوں کی خاک پر قربان۔ وہ ایسے امام ہیں کہ جن کی مدح میری یاد اور عادت ہے اور میرا دل زندگی بھر ان کا مشتاق ہے۔

بحار الانوار میں مناقب ابن شہر آشوب سے نقل کیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے کتاب 'الرد علی التبدیل' میں دیکھا ہے کہ 'مصحف امیر المؤمنینؑ' میں ہے 'وَ يَقُوْلُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابِيًّا' کافر کہے گا کہ اے کاش! میں 'ترابی' ہوتا یعنی اصحاب علیؑ سے ہوتا۔ اور یہ بھی کہا کہ قرآن مجید میں دشمنان آل محمدؐ کیلئے یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے: 'وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ' (فرقان/۲۷) جس دن ظالم (سخت حسرت کے باعث) اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا......۔ اس ظالم سے مراد بنی عدی کا ایک شخص ہے جسے حضرت علیؑ عذاب میں ڈالیں گے تو وہ اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا...... اور بنی تمیم کا ایک شخص کہے گا 'يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابِيًّا' اے کاش! میں 'ترابی' ہوتا یعنی شیعہ ہوتا"۔

نورانی القاب

آپؑ کے القاب اس قدر زیادہ ہیں کہ اسے کوئی شمار نہیں کر سکتا، ہم یہاں پر جن چند ایک کو ذکر کر رہے ہیں وہ یہ ہیں؛

اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَعْسُوْبُ الدِّيْنِ وَ مُبِيْرُ الشِّرْكِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَقَاتِلُ النَّاكِثِيْنَ وَالْقَاسِطِيْنَ وَالْمَارِقِيْنَ وَ مَوْلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ ذُوْ الْقَرْنَيْنِ وَ نَفْسُ الرَّسُوْلِ وَ اَخُوْهُ وَ زَوْجُ الْبَتُوْلِ وَ سَيْفُ اللهِ الْمَسْلُوْلِ وَ اَمِيْرُ الْبَرَرَةِ وَقَاتِلُ الْفَجَرَةِ وَالصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرِ وَ قَسِيْمُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَ الْمُرْتَضٰى وَصَاحِبُ اللِّوَاءِ وَ سَيِّدُ الْعَرَبِ وَ كَشَّافُ الْكَرْبِ وَخَاصِفُ النَّعْلِ وَشَبِيْهُ هَارُوْنَ وَ الدَّاعِيُّ وَ الْفَارُوْقُ وَ بَابُ الْمَدِيْنَةِ وَ بَابُ الْحِكْمَةِ وَ بَيْضَةُ الْبَلَدِ وَ الشَّاهِدُ۔

مؤمنوں کا امیر، دین کا سردار، شرک اور مشرکین کو تباہ کرنے والا، ناکثین، قاسطین اور مارقین کو قتل کرنیوالا، مؤمنوں کا مولا ذوالقرنین، نفس رسول، برادر پیغمبرؐ، شوہر بتول، خدا کی سونتی ہوئی تلوار، نیک لوگوں کا سربراہ، برے لوگوں کا قاتل، صدیق اکبر، جنت و دوزخ کا تقسیم کرنے والا، برگزیدہ، علمبردار، عربوں کا سردار، مصیبتوں کا دور کرنے والا، اپنا جوتا آپ گانٹھنے والا، ہارونؑ کی شبیہ، ہادی، داعی (دعوت دینے والا) فاروق، شہر علم کا باب، حکمت کے گھر کا دروازہ، شہر کا سب سے بڑا آدمی (نبوت کا) گواہ۔

تو یہ ہیں وہ القاب جو صحیح روایات میں آپؑ کیلئے پایۂ ثبوت تک پہنچے ہوئے ہیں۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ: "شیعوں کا گمان ہے کہ آپؑ کو رسول خداؐ کے زمانے میں "امیر المؤمنین" کے خطاب سے نوازا گیا اور اسی کے ساتھ مہاجرین و انصار آپؑ کو مخاطب کیا کرتے تھے، لیکن محدثین کی روایات میں یہ بات ثابت نہیں ہے"۔ تو میرا جواب یہ ہے کہ: اس انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے کہ اس پر کثیر تعداد میں بلکہ تواتر کی حد تک روایات موجود ہیں۔ چنانچہ "غایۃ المرام" میں اس بارے میں ۴۲ سنی ذرائع سے اور ۸۳ شیعہ طرق سے احادیث ملتی ہیں۔ انشاء اللہ ہم اس بارے میں ان میں سے بعض کو اپنی اس کتاب میں ذکر کریں گے۔ اور ان بعض احادیث سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آنجنابؑ کے مخصوص القاب میں سے ہے اور کسی دوسرے شخص کیلئے اس کا استعمال جائز بھی نہیں، چنانچہ اس بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے جسے ابن شہر آشوب نے نقل کیا ہے، راوی کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا: "يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ!" تو آپؑ نے اس سے کہا "خاموش رہو! کیونکہ جو بھی اس نام سے خوش ہوتا ہے وہ ابو جہل والی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے"۔

قول شارحؒ: ابو جہل کی بیماری یہ تھی کہ وہ "مخنث" تھا۔ کیونکہ وہ پیغمبر خداؐ سے دشمنی رکھتا تھا۔ اسے خود شارح معتزلی ابن ابی الحدید نے بھی روایت کیا ہے۔

اسی کتاب میں تفسیر عیاشی سے نقل کیا گیا ہے کہ محمد بن اسماعیل رازی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک اور شخص سے روایت کرتے ہیں کہ: "ایک آدمی امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا 'اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ!' آپؑ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: 'خاموش رہو! یہ ایک ایسا نام ہے جس سے اللہ نے امیر المؤمنین (علیؑ) ہی کو موسوم کیا ہے۔ ان کے علاوہ جس کسی کو بھی اس نام سے پکارا جائے اور وہ اس پر راضی ہو تو وہ 'منکوح' (......) ہے۔ اگر نہ بھی ہو تو ہو جاتا ہے۔ اور یہی خدا کا قول ہے کہ 'اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اِنَاثًا اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيْدًا' (نساء / ۱۱۷) وہ خدا کو چھوڑ کر صرف مؤنثوں ہی

کو پکارتے ہیں اور وہ صرف سرکش شیطان ہی کو پکارتے ہیں"۔ راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا" پھر آپؑ کے قائم (آل محمدؑ) کو کس نام سے پکارا جائے گا؟" امام علیہ السلام نے فرمایا: "انہیں کہا جائے گا' اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَاابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ!"

قول شارحؒ: اس لقب کے بارے میں شارح معتزلی کے انکار اور ضیاء الدین بن ابی المؤید موفق بن احمد خوارزمی کے مذکورہ القاب کے اثبات میں کس قدر فرق ہے!!

مذکورہ القاب تو کشف الغمہ سے نقل کئے گئے ہیں، جو میں بیان کر رہا ہوں وہ یہ ہیں:

هُوَ اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ وَيَعْسُوْبُ الْمُسْلِمِيْنَ وَ غُرَّةُ الْمُهَاجِرِيْنَ وَصَفْوَةُالْهَاشِمِيِّيْنَ وَ قَاتِلُ الْكَافِرِيْنَ وَ النَّاكِثِيْنَ وَ الْقَاسِطِيْنَ وَ الْمَارِقِيْنَ الْكَرَّارُ غَيْرُ الْفَرَّارِ نَصَّالُ فِقَارِكُلِّ ذِيْ خَتَرٍ بِذِي الْفَقَارِوَ قَسِيْمُ الْجَنَّةِوَ النَّارِ مُقَعِّصُ الْجَيْشِ الْجَرَّارِ لَاطِمُ وُجُوهِ اللُّجَيْنِ وَ النُّضَارِ بِيَدِ الْاِحْتِقَارِ اَبُوْتُرَابٍ مُجَدِّلُ الْاَتْرَابِ مُعَفِّرِيْنَ مُمَرِّقِيْنَ فِي الْعَفَرِرَجُلُ الْكَتِيْبَةِوَ الْكِتَابِ وَ الْمِحْرَابِ وَ الْحِرَابِ وَ الطَّعْنِ وَ الضِّرَابِ وَالْخَيْرِالْحِسَابِ بِلَاحِسَابٍ وَمُطْعِمُ السِّغَابِ بِجِفَانٍ كَالْجَوَابِ رَادُّالْمُعْضِلَاتِ بِالْجَوَابِ الصَّوَابِ مُضَيِّفُ النُّسُوْرِوَالذِّيَابِ بِالتَّبَارِ الْمَاضِي الذُّبَابِ هَازِمُ الْاَحْزَابِ وَ قَاصِمُ الْاَصْلَابِ قَاسِمُ الْاَسْلَابِ جَزَّازُ الرِّقَابِ بَايِنُ الْقِرَابِ ثَابِتُ اللُّبِّ فِي مَدْحَضِ الْاَلْبَابِ مَفْتُوْحُ الْبَابِ اِلَى الْمِحْرَابِ عِنْدَ سَدِّ سَايِرِ اَبْوَابِ الْاَصْحَابِ جَدِيْدُ الرَّغَبَاتِ فِي الطَّاعَاتِ بَالِي الْجِلْبَابِ رَثُّ الثِّيَابِ رَقَّاصُ الصِّعَابِ مَعْسُوْلُ الْخِطَابِ عَدِيْمُ الْحِجَابِ

مؤمنوں کا امیر مسلمانوں کا سردار، مہاجرین کی پیشانی کا جھومر، بنی ہاشم کا سہرا، کفار و ناکثین و قاسطین اور مارقین کا قاتل، بڑھ چڑھ کر حملے کرنے والا، کبھی نہ بھاگنے والا، ہر غدار کی ریڑھ کی ہڈی میں ذوالفقار کی نوک چبھونے والا، جنت و جہنم کا تقسیم کرنیوالا، لشکر جرار کو یکدم تہہ تیغ کرنیوالا، سونے چاندی کے منہ پر حقارت کے تھپڑ مارنے والا، ابوتراب، بڑے بڑے بہادروں کو زمین پر پٹخنے والا، ان کی ناکوں کو خاک میں رگڑنے والا، مرد میدان اور کتاب خدا کا علم رکھنے والا محراب عبادت میں بہترین عابد اور میدان جنگ کا شہسوار، نیزے اور تلوار کا دھنی، بے حساب خیرات کرنیوالا، قحط زدہ بھوکوں کو بڑے بڑے پیالوں میں کھلانے والا، مشکل امور کو جواب با صواب سے حل کرنے والا، گدھوں اور بھیڑیوں کو تیز دھار مہلک تلوار کے ذریعہ خوراک کھلانیوالا، گروہ در گروہ لشکروں کو شکست فاش دینے والا، سخت جان لوگوں کی گردنوں کو توڑنے والا، لوٹے ہوئے مال کو تقسیم کرنیوالا، گردنوں کو کاٹنے والا، دشمن کے قریبیوں میں جدائی ڈالنے والا، عقلوں کے پھسلنے کے مقامات پر اپنی عقل کو ثابت و برقرار رکھنے والا، جب مسجد نبویؐ کی طرف کھلے تمام اصحاب کے دروازے بند کر دیئے گئے تو اس کا دروازہ کھلا رہا، اطاعت الٰہی کیلئے نت نئی راہیں تلاش کرنیوالا، پرانی چادر والا، پھٹے لباس والا، سختیوں پر قابو پانے والا، شیریں بیان، حجابوں اور دربانوں سے بے نیاز، خیر کا جڑواں بھائی اور

وَ الْحُجَّابِ شَقِيْقُ الْخَيْرِ وَ رَفِيْقُ الطَّيْرِ صَاحِبُ الْقَرَابَةِوَالْقُرْبَةِوَكَاسِرُاَصْنَامِ الْكَعْبَةِ وَ مُنَاوِشُ الْحَتُوفِ وَ قَتَّالُ الأُلُوْفِ وَ مُخَرِّقُ الصُّفُوْفِ وَ ضَرْغَامُ يَوْمِ الْجَمَلِ وَالْمَرْدُوْدُلَهُ الشَّمْسُ عِنْدَالطَّفَلِ وَتَرَّاكُ السَّلْبِ وَ ضَرَّابُ الْقُلَلِ وَ حَلِيْفُ الْبِيْضِ وَالأَسَلِ وَشُجَاعُ السَّهْلِ وَالْجَبَلِ زَوْجُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ سَيِّدَةِ النِّسَاءِ وَمُذَلِّلُ الأَعْدَاءِ وَ مُعِزُّ الأَوْلِيَاءِ اَخْطَبُ الْخُطَبَاءِ قُدْوَةُ اَهْلِ الْكِسَاءِ اِمَامُ الأَئِمَّةِ الأَتْقِيَاءِ الشَّهِيْدُ اَبُو الشُّهَدَاءِ اَشْهَرُ اَهْلِ الْبَطْحَاءِ مُضَمِّخُ مَرَدَةِ الْحُرُوْبِ بِالدِّمَاءِ صَفَرُ الْيَدَيْنِ عَنِ الصَّفْرَاءِ وَ الْحَمْرَاءِ وَالْبَيْضَاءِ مُثَكِّلُ اُمَّهَاتِ الْكَفَرَةِوَمُفَلِّقُ هَامَاتِ الْفَجَرَةِ وَ مُقَوِّي اَعْضَادِ الْبَرَرَةِ وَ ثَمْرَةُ بَيْعَةِ الشَّجَرَةِوَفَاقِئُ عُيُوْنِ السَّهَرَةِوَدَاحِي اَرْضِ الدِّمَاءِ وَ مُطَلِّعُ شُهَبِ الأَسِنَّةِ فِيْ سَمَاءِ الْقَتْرَةِ الْمُسَمِّيْ نَفْسَهُ يَوْمَ الْغَبْرَةِ بِحَيْدَرَةَ خَوَّاضُ الْغَمَرَاتِ حَمَّالُ الْوِلاَيَةِوَ الرَّايَاتِ مُمِيْتُ الْبِدْعَةِ مُحْيِي السُّنَّةِ وَ كَاتِبُ جَوَائِزِاَهْلِ الْجَنَّةِوَمُصَرِّفُ الأَعِنَّةِوَاللاَّعِبُ بِالأَسِنَّةِسَادُّ اَنْفَاقِ النِّفَاقِ شَاقُّ جَمَاجِمِ ذَوِي الشِّقَاقِ سَيِّدُ الْعَرَبِ مَوْضِعُ الْعَجَبِ الْمَخْصُوْصُ بِاَشْرَفِ النَّسَبِ الْهَاشِمِيِ الأُمِّ وَ الأَبِّ الْمُفْتَرِعُ اَنْوَاعِ اَبْكَارِ الْخُطَبِ نَفْسُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

پرندوں کا دوست، پیغمبرؐ کی قرابت اور قربت کا حامل، خانہ کعبہ کے بتوں کو توڑنے والا موت سے پنجہ آزمائی کرنیوالا، ہزاروں کے ساتھ اکیلا لڑنے والا، صفوں کو الٹ کر رکھ دینے والا، جنگ جمل کا شیر، جس کیلئے غروب کے موقع پر سورج کو واپس پلٹایا گیا دوسروں کے کئے ہوئے شکار کو منہ نہ لگانے والا انسانی کھوپڑیوں پر تابڑ توڑ حملے کرنیوالا۔ خودوں اور نیزوں کا ساتھی، زمین اور پہاڑوں پر لڑی جانے والی جنگوں میں داد شجاعت دینے والا، فاطمہ زہرا سیدۃ النساء کا شوہر، دشمنوں کا ذلیل کرنے والا، دوستوں کو عزت عطا کرنے والا، خطیبوں کا خطیب، اصحاب کساء کا سرخیل، متقی ائمہ کا امام، خود شہید اور شہدا کا باپ، اہل بطحا میں سب سے زیادہ شہرت رکھنے والا، جنگ میں سرکش لوگوں کو خون سے نہلانے والا سنہری روپہلی دنیا سے ہاتھوں کو خالی رکھنے والا، کفار کی ماؤں کو سوگ میں بٹھانے والا، فاجروں کی کھوپڑیوں کو چیر کر رکھ دینے والا، نیک لوگوں کا قوت بازو، شجرہ رضوان کی بیعت کا ثمر، دشمن بیدار رہنے والی آنکھوں کو پھوڑ دینے والا، زمین پر خون کی چادر بچھانے والا، غبار کے آسمانوں میں نیزوں کے ستارے چمکانے والا، جنگ کے موقع پر اپنا نام حیدر (شیر) جتانے والا، موت کی سختیوں میں گھس جانے والا، ہر جنگ میں لشکر کا علمدار، بدعتوں کو فنا کرنیوالا، سنت کا احیا کرنیوالا، اہل بہشت کو بہشت کا پروانہ عطا کرنیوالا، شہ زور گھوڑوں کے منہ موڑ دینے والا، نیزوں سے کھیلنے والا نفاق کے سوراخوں کو بند کرنیوالا، دشمنوں کے دماغ کی کھوپڑیوں کو چیرنے والا، عرب کا سردار، حیرت کا مقام، نسب کی عظیم شرافت سے مخصوص، ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی نسب، نت نئے خطبوں کی راہیں نکالنے والا، مباہلہ کے دن نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مقابلے کے دن ان کا قوت

عَلَيْهِ وَ آلِه يَوْمَ الْمُبَاهلَةِ وَسَاعِدُه الْمُسَاعِدُ يَوْمَ
الْمُصَاوَلَةِ وَ خَطِيْبُه' الْمُصْقَعُ يَوْمَ الْمُقَاوَلَةِ وَ
خَلِيْفَتُه' فِيْ مِهَادِه وَ مَوْضِعُ سِرِّه فِيْ اِصْدَارِه وَ
اِيْرَادِه وَ مُلَيِّنُ عَرَايِكِ اَضْدَادِه وَ اَبُوْ اَوْلَادِه وَ
وَاسِطَةُ قِلَادَةِ الْفُتُوَّةِ وَنُقْطَةُ دَايِرَةِ الْمُرُوَّةِ وَعِتْقِي
شَرَفَيِ الْأُبُوَّةِ وَ الْبُنُوَّةِ وَ وَارِثُ عِلْمِ الرِّسَالَةِ وَ
النُّبُوَّةِ وَ سَيْفُ اللهِ الْمَسْلُوْلِ وَ جَوَادُ الْخَلْقِ
الْمَامُوْلِ لَيْثُ الْغَابَةِ وَ اَقْضَى الصَّحَابَةِ وَ
الْحِصْنُ الْحَصِيْنُ وَ الْخَلِيْفَةُ الْاَمِيْنُ اَعْلَمُ مَنْ
فَوْقَ رُقْعَةِ الْغَبْرَاءِ وَ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ
الْمُسْتَانِسُ بِالْمُنَاجَاةِ فِيْ ظُلْمَةِ اللَّيْلَةِ اللَّيْلَاءِ
رَاقِعُ مَدْرَعَتِه وَالدُّنْيَا بِاَسْرِهَا قَائِمَةٌ بَيْنَ يَدَيْهِ
حَتّٰى اسْتَحْلٰى مِنْ رَاقِعِهَا مُنَزَّهٌ نَفْسُه' النَّفِيْسَةُ
عَنِ الدُّنْيَا الدَّنِيَّةِ وَ مَصَارِعِهَا وَ مُثَبِّتُهَا بِلِجَامِ
تَقْوَاهُ عَنْ مَطَامِعِهَا وَفَاطِمُهَا بِتَهَجُّدِهَا عَنْ وَثِيْرِ
مَضَاجِعِهَا اَخُوْ رَسُوْلِ اللهِ وَابْنُ عَمِّه وَ كَشَّافُ
كَرْبِه وَغَمِّه وَ مُسَاهِمُه' فِيْ طَمِّه وَ رَمِّه بَعْضُه'
بَعْضُ الْبَتُوْلِ وَوُلْدُه' وُلْدُ الرَّسُوْلِ هُوَ مِنْ رَسُوْلِ
اللهِ دَمُه' دَمُه' وَعَظْمُه' عَظْمُه' وَ عِلْمُه' عِلْمُه' وَ
سِلْمُه' سِلْمُه' وَ حَرْبُه' حَرْبُه' وَ حِزْبُه' حِزْبُه' وَ
فَرْعُه' فَرْعُه' نَبْعُه' نَبْعُه' وَنَجْرُه' نَجْرُه' وَفَخْرُه' فَخْرُه'
وَ جَدُّه' جَدُّه' وَ حَدُّه' حَدُّه' اَنْهَارُ فَضَائِلِه فِيْ
الدُّنْيَا مِنْ بُحُوْرِ فَضَائِلِه وَ رِيَاضُ التَّوْحِيْدِ وَ

بازو، سخت مقابلے کے موقع پر پیغمبرؐ کا قادر الکلام خطیب، رسول
کی جگہ پر ان کا جانشین، ہر آمد و رفت کے موقع پر ان کے رازوں
کا امین، ان کے دشمنوں کی نخوت کو خاک میں ملانیوالا، اولاد
رسولؐ (حسنینؑ) کا باپ، جوانمردی کے ہار کی لڑی، مروت کے
دائرے کا مرکزی نقطہ، باپ اور بیٹا ہونے کے رشتہ کا مایۂ افتخار،
علوم نبوت و رسالت کا وارث، خدا کی سونتی ہوئی تلوار، کائنات
کیلئے سخاوت کی جائے امید، بیشۂ شجاعت کا شیر، صحابہ میں سے
قاضی القضاۃ، مضبوط ترین قلعہ امین خلیفہ، روئے زمین پر اور
آسمان کے نیچے رہنے والوں میں سے سب سے زیادہ عالم، تاریک
ترین راتوں کی تاریکیوں میں مناجات سے انس رکھنے والا، اپنی
زرہ کو ٹانکنے والا جبکہ دنیا پورے جلووں کیساتھ سامنے کھڑی دیکھ
رہی ہوتی اور شرم محسوس کر رہی ہوتی، جس کا پاکیزہ نفس دنیا کی
پستیوں اور لغزشوں سے منزہ و مبرا رہا، دنیا کی لالچوں کو تقویٰ کی
لگام کے ساتھ اپنے قابو میں رکھنے والا، جس کی شریک زندگی
فاطمہ زہراؑ تہجد میں مشغول رہ کر نرم و گرم بستر سے کنارہ کش
رہتیں، پیغمبرؐ کا بھائی اور عم زاد، ان کے ہر رنج و غم کا دور کرنیوالا
ان کے تمام چھوٹے بڑے امور میں برابر کا شریک، بتولؑ کی
زندگی کا حصہ، جس کی اولاد رسولؐ کی اولاد، جس کا خون رسولؐ کا
خون، جس کا گوشت رسولؐ کا گوشت، جس کا استخوان رسولؐ کا
استخوان، جس کا علم رسولؐ کا علم جس کی صلح رسولؐ کی صلح، جس
کی جنگ رسولؐ کی جنگ، جس کا گروہ رسولؐ کا گروہ، جس کی فرع
رسولؐ کی فرع جس کی اصل رسولؐ کی اصل جس کا حسب رسولؐ
کا حسب، جس کا جد رسولؐ کا جد، جس کی حد رسولؐ کی حد، دنیا میں
بہنے والی فضائل کی نہریں جس کے دریائے فضائل سے فیضیاب
ہیں، توحید و عدل کے گلستانوں کی فضائیں جس کے خطبات و
مکتوبات کے بوستانوں سے عطر بیز ہیں، اہل عراق و شام و حجاز کا

الْعَدْلِ مِنْ بَسَاتِيْنِ خُطَبِهٖ وَ رَسَائِلِهٖ وَ كَشُّ اَهْلِ الْعِرَاقِ وَالشَّامِ وَالْحِجَازِ وَشَجِى حُلُوْقِ الْاَبْطَالِ عِنْدَ الْبِرَازِ وَ ابْنُ عَمِّ الْمُصْطَفٰى وَ شَقِيْقُ النَّبِيِّ الْمُجْتَبٰى لَيْثُ الثَّرٰى غَيْثُ الْوَرٰى مِفْتَاحُ النَّدٰى قُطْبُ رَحَى الْهُدٰى مِصْبَاحُ الدُّجٰى جَوْهَرُ النُّهٰى بَحْرُ اللُّهٰى مَسْعَرُ الْوَغَا قَطَاعُ الطُّلٰى شَمْسُ الضُّحٰى اَبُوْ الْقِرٰى فِيْ اُمِّ الْقُرٰى الْمُبَشَّرُ بِاَعْظَمِ الْبُشْرٰى مُطَلِّقُ الدُّنْيَا مُؤَثِّرُ الْاُخْرٰى عَلَى الْاُوْلٰى رَبُّ الْحِجٰى بَعِيْدُ الْمَدٰى مُمْتَطِي صَهْوَةِ الْعُلٰى مُسْتَنَدُ الْفَتْوِيْ مَثْوَى التُّقٰى نَدِيْدُ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى مَوْلٰى كُلِّ مَنْ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَوْلٰى كَثِيْرُ الْجَدْوٰى شَدِيْدُ الْقُوٰى سَالِكُ الطَّرِيْقَةِ الْمُثْلٰى الْمُعْتَصِمُ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى الْفَتٰى اَخُوْ الْفَتٰى الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ هَلْ اَتٰى اَكْرَمُ مَنِ ارْتَدٰى وَ اَشْرَفُ مَنِ احْتَذٰى اَفْضَلُ مَنْ رَاحَ وَ اغْتَدٰى اَشْجَعُ مَنْ رَكِبَ وَ مَشٰى اَهْدٰى مَنْ صَامَ وَ صَلّٰى مُرَاقِبُ حَقِّ اللّٰهِ اِنْ اَمَرَ اَوْنَهٰى الَّذِيْ مَاصَبَا فِي الصِّبٰى وَ سَيْفُهٗ عَنْ قِرْنِهٖ مَا نَبَا وَ نُوْرُ هُدَاهُ مَا خَبَا وَ مُهْرُ اَقْدَامِهٖ مَا كَبَا دَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى التَّوْحِيْدِ فَلَبّٰى وَجَلَا ظُلَمَ الشِّرْكِ وَجَلَا وَسَلَكَ الْمَحَجَّةَ الْبَيْضَاءَ وَ اَقَامَ الْحُجَّةَ الزَّهْرَاءَ

سربر آوردہ سردار میدان جنگ میں مدمقابل کے حلق میں اٹک جانے والا کانٹا، پیغمبر مصطفیؐ کا چچازاد اور نبی مجتبیٰؐ کا بھائی، زمین پر خدا کا شیر، کائنات کیلئے باران رحمت، دشمنوں کیلئے پیغام اجل جود و سخا کی کلید، ہدایت کی چکی کی کیلی، تاریک راتوں میں چراغ ہدایت عقلوں کا جوہر، قوت گویائی کا سمندر، جنگ کی شعلہ سامانیوں میں حشر برپا کر دینے والا، لذتوں کو منقطع کرنیوالا، چمکتا آفتاب، ام القریٰ (مکہ) میں مہمان نواز سردار، عظیم ترین خوشخبری عطا کیا ہوا، دنیا کو طلاق دینے والا، آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے والا، عقلوں کو پروان چڑھانے والا، طولانی ہمت والا، ہر بلندی کی سواری کی زین پر سوار ہونے والا، جس کا فتویٰ مستند، تقویٰ کو جس کی پناہ ملتی ہے، موسیٰ کے ہارونؑ کی مثل، ہر اس کا مولا جس کا رسولؐ مولا، کثرت سے عطا کرنے والا، مضبوط بازوؤں والا، فاضل ترین اور برگزیدہ ترین (انبیاء) کے رستوں پر چلنے والا، خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے والا، خود بھی جوانمرد اور جوانمرد کا بھائی، جس کے بارے میں سورۂ ھل اتی نازل ہوئی، ہر چادر اوڑھنے والے سے زیادہ کریم اور ہر جوتا پہننے والے سے زیادہ شریف، ہر صبح و شام کرنے والے سے زیادہ افضل، ہر سوار و پیادے سے زیادہ شجاع، ہر روزے دار نمازی سے زیادہ ہدایت یافتہ، جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے تو خدا کے حقوق کا خیال کرتا ہے، جس نے بچپن ہی سے دین اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین نہیں اپنایا، جس کی تلوار مدمقابل پر وار سے کبھی اچاٹ نہیں ہوئی، ہدایت کا نور کبھی نہیں بجھا اور قدم کبھی نہیں ڈگمگائے، جسے رسولؐ نے توحید کی دعوت دی تو فوراً لبیک کہا، جس نے شرک کی تاریکیوں کو کافور کر دیا جو واضح اور روشن رستوں پر گامزن رہا، جس نے واضح ترین دلیلیں قائم کیں، جس کے علمی چمن سے نصرت

جُنِيَتْ ثِمَارُ النَّصْرِ مِنْ عِلْمِهِ وَ الْتَقَتْ جَوَاهِرُ
الْعِلْمِ مِنْ قَلَمِهِ وَ نَشَأَتْ ضَرَاغِمُ الْمَعَارِكِ فِيْ
اَجَمِهِ وَ بَأسَ كُيُوْنَ اَقْدَامِ هِمَمِهِ وَاخْضَرَّتْ رُبَى
الآمَانِيْ مِنْ دَيْمِ كَرَمِهِ نَعَمْ هُوَ اَبُوْ الْحَسَنِ الْقَلِيْلُ
الْوَسَنِ الَّذِيْ لَمْ يَسْجُدْ لِلْوَثَنِ هُوَ عَصْرَةُ الْمَنْجُوْدِ
هُوَ مِنَ الَّذِيْنَ اَحْيَوْا اَمْوَاتَ الآمَالِ بِحَبَا الْجُوْدِ وَ
هُوَ مِنَ الَّذِيْنَ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ
السُّجُوْدِ هُوَ مُحَارِبُ الْكَفَرَةِ وَ الْفَجَرَةِ بِالتَّاوِيْلِ وَ
التَّنْزِيْلِ هُوَ الَّذِيْ مِثْلُه' مَذْكُوْرٌ فِي التَّوْرَاةِ وَالاِنْجِيْلِ
هُوَ الَّذِيْ كَانَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيًّا حَفِيًّا وَلِلرَّسُوْلِ بَعْدَه'
حَفِيًّا هُوَ الَّذِيْ كَانَ لِجُنُوْدِ الْحَقِّ سَنَدًا وَلِاَنْصَارِ
الدِّيْنِ يَدًا وَ عَضُدًا وَ مَدَدًا وَ لِضُعَفَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ
مُجِيْرًا وَلِصَنَادِيْدِ الْكَافِرِيْنَ مُبِيْرًا وَلِكُئُوْسِ الْعَطَاءِ
عَلَى الْفُقَرَاءِ مُدِيْرًا حَتّٰى اُنْزِلَ فِيْهِ وَفِيْ اَهْلِ بَيْتِهِ
الَّذِيْنَ طَهَّرَهُمُ اللّٰهُ تَطْهِيْرًا 'وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ
عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَيَتِيْمًا وَاَسِيْرًا' وَهُوَ عَلِيُّ الْعَلِيُّ وَ
الْوَصِيُّ الْوَلِيُّ الْهَاشِمِيُّ الْمَكِّيُّ الْمَدَنِيُّ الاَبْطَحِيُّ
الطَّالِبِيُّ الرَّضِيُّ الْمَرْضِيُّ الْمُنَافِيُّ الْقَوِيُّ الْجَرِيُّ
اللَّوْذَعِيُّ الاَرْيَحِيُّ الْمَوْلَوِيُّ الصَّفِيُّ الْوَفِيُّ الَّذِيْ
بَصَّرَهُ اللّٰهُ حَقَائِقَ الْيَقِيْنِ وَ رَتَقَ بِهِ فُتُوْقَ الدِّيْنِ
الَّذِيْ صَدَّقَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ صَدَقَ وَ بِخَاتِمِهِ فِي
الرُّكُوْعِ تَصَدَّقَ وَ اعْتَصَبَ بِالسَّمَاحَةِ وَ
الْحَمَاسَةِ وَ تَطَوَّقَ وَ دَقَّقَ فِيْ عُلُوْمِهِ وَ مَعَارِفِهِ وَ

کے پھل چنے جاتے ہیں اور قلم سے علمی جواہر پارے
حاصل کئے جاتے ہیں، جس کے بیشہ شجاعت میں جنگجو شیر
پرورش پاتے ہیں، جس کے دائمی باران کرم سے آرزوؤں
کے بلند ٹیلے سر سبز و شاداب ہوتے ہیں، جی ہاں! وہی ابو
الحسن ہی تو ہے جو زیادہ جاگنے والا اور کم سونے والا ہے، جس
نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، غم زدوں کی پناہ گاہ، مایوس
اور پژمردہ لوگوں کی مردہ آرزوؤں کو اپنی بارانی کرم سے زندہ
کرنیوالا، اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے چہروں پر
سجدوں کے نشانات ہیں، قرآن کی تاویل اور تنزیل پر کفار
اور فجار سے جنگ کرنیوالا جس کی مثال توریت وانجیل میں
ہے، مؤمنوں کا ولی اور دوست رسول کا وصی، حق کی سپاہ کا
سہارا، دین کا ناصر و مددگار ضعیف و ناتوان، مسلمانوں کی پناہ
گاہ، کفار کے بڑے بڑے بہادر سرداروں کا ستیاناس کرنیوالا،
جس کی عطاو بخشش کے جام ہمیشہ غریبوں کیلئے گردش میں
رہتے تھے یہاں تک کہ ان کی اور ان کے اہل بیتؑ کہ جن کو
باری تعالی نے ایسا پاک کیا ہے جس طرح پاک کرنے کا حق
ہے کی شان میں نازل فرمایا 'وَيُطْعِمُوْنَ......' (اور اس کی
محبت میں مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں)۔
وہ علیؑ علی ہی ہے، رسول کا وصی، اور ولی، ہاشمی ہے، مکی،
مدنی، ابطحی، طالبی ہے، وہ رب سے راضی اور رب اس سے
راضی ہے، عبد مناف کی اولاد کا قوی انسان بہادر خوش بیان
خوش کلام مولا والا برگزیدہ وفا کا پیکر جسے اللہ نے حق الیقین
کی دولت سے مالا مال کیا، اسی یقین کے ذریعہ جس نے دین
میں پیدا ہو جانے والی خرابیوں کو دور کیا، جس نے رسول کی
تصدیق کی اور اور سچ کہا، رکوع میں انگشتری زکوٰۃ میں دیدی،
سخاوت اور شجاعت کے ساتھ، جس نے اپنے علوم و معارف

حقّق وذكرنا بقتل الوليد بدرًا و بقتل عمرو الخندق و مزّق من ابناء الحروب ما مزّق وغرّق في لجّة سيفه من اسود الهياج من غرّق وحرّق بشهاب صارمه من شياطين العراك من حرّق حتّى استوسق الاسلام و اتّسق هو اطول بني هاشم باعًا و امضاهم زماعًا و ارحبهم ذراعًا واكثرهم اشياعًا واخلصهم اتباعًا واشهرهم قراعًا و احدّهم سنانًا و اعربهم لسانًا و اقواهم جنانًا هو حيدر و ما ادريك ما حيدر هو الكوكب الازهر والصارم المذكر صاحب براءة وغدير خمّ و راية خيبر و كمي احد و حنين والخندق وبدر الاكبر هو ساقي و رادّ الكوثر يوم المحشر ابو السبطين ومصلّي القبلتين وانسب من في الاخشبين واعلم من في الحرمين۔

میں دقت نظر سے کام لیا اور انہیں پایۂ تحقیق تک پہنچایا، ہمارے دلوں میں ولید کے قتل سے بدر کی اور عمرو بن عبدود کے قتل سے خندق کی یاد تازہ رکھی، بہت سے جنگجو بہادروں کا تیاپانچہ کر دیا، بڑی تعداد میں مردان جنگ کو اپنی تلوار کی موجوں میں غرق کر دیا کثیر تعداد میں معرکہ آرائی کرنے والے شیاطین کو اپنی تیغ شرربار کے شعلوں سے جلا کر راکھ کر دیا، آخر کار اسلام کے امور کو یکجا اور منظم کر دیا، اولاد ہاشم کا فیاض ترین انسان شجاعت میں پیشگام، قدرت و طاقت میں سب سے آگے، ان میں سے سب سے زیادہ پیروکار اور فرمانبردار اسی کے ہیں جس کی ڈھال شہرہ آفاق، نیزے کی انی سب سے تیز، زبان سب سے زیادہ فصیح دل سب سے زیادہ قوی ہے، وہ حیدر ہے، تمہیں کیا معلوم کہ حیدر کیا ہے وہ درخشندہ ستارہ ہے جرأت کی لازوال داستانیں چھوڑنے والا، جسے رسول نے سورت برائت دے کر مشرکین کی طرف بھیجا، جسے غدیر خم کے میدان میں پیغمبرؐ نے 'من کنت مولاہ......' کے ساتھ متعارف کرایا، جسے جنگ خیبر میں رسول خداؐ نے علم عطا فرمایا، اُحد و حنین و خندق و بدر کبریٰ میں داد شجاعت دینے والا، بروز محشر دوستوں کو حوض کوثر سے سیراب کرنے والا اور دشمنوں کو وہاں سے مار بھگانے والا، حسنینؑ شریفین کا والد، دو قبلوں (بیت المقدس، خانہ کعبہ) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والا، مکہ کے دو پہاڑوں (یعنی اَخشَبَین) کے رہنے والوں میں سے سب سے روشن نسب کا مالک، حرم مکہ اور مدینہ میں رہنے والوں میں سے سب سے زیادہ عالم۔

چنانچہ اس بارے میں خوارزمی کہتے ہیں ؛

هذا المكارم لا قعبان من لبن شيبا بماء فصار بعد ابوالا

یہ شرف اور بزرگی کے کارنامے ہیں اور دودھ کے ایسے پیالے نہیں ہیں جن میں پانی ملایا گیا ہو اور پھر وہ خراب ہو گئے ہوں۔

صاحب کشف الغمہ کہتے ہیں ؛

أساميا لم تزده معرفة و انما لذة ذكرناها

اے بلند مرتبہ سردار! ہماری معرفت تیری عظمت بلند نہیں کرتی، بلکہ تیری معرفت حاصل کر کے ہم خود لطف اٹھاتے ہیں۔

شارح منہاج البراعہ کہتے ہیں ؛

مَكَارِمُ لُجَّتْ فِيْ عُلُوٍّ كَأَنَّمَا تَحَاوِلُ ثَأْرًا عِنْدَ بَعْضِ الْكَوَاكِبِ

مَحَاسِنُ مِنْ مَجْدٍ مَتَى يُقْرَنُوْا بِهَا مَحَاسِنَ أَقْوَامٍ تُعَدُّ كَالْمَعَايِبِ

اس کی بزرگی کے کارنامے بلندی مرتبہ میں اس قدر سموئے گئے ہیں گویا وہ کسی ستارے سے کسی خون کا بدلہ لینے کا قصد رکھتے ہیں ،اس کی رفعت کی خوبیاں ایسی ہیں کہ جب لوگ اس کا موازنہ دوسرے لوگوں کی خوبیوں سے کرتے ہیں تو یہ (لوگوں کی خوبیاں) عیب بن کر نظر آنے لگتی ہیں۔

شارح کہتے ہیں : مجھے اپنی جان کی قسم ! یہ الفاظ ایسے ہیں جنہیں نور کی روشنائی کے ساتھ حوروں کے رخسار پر اور سونے کے پانی سے آسمان، کرسی، عرش اور حجاب پر تحریر کیا جائے اور لوح محفوظ اور ام الکتاب میں ثبت کیا جائے نہ یہ کہ قلم اور سیاہی کے ساتھ کاغذ اور کتاب میں قلمبند کیا جائے۔ پھر بھی یہی کہوں گا :

إِذَا مَا الْكَرَامَاتُ اعْتَلىٰ قَدْرَ رَبِّهَا وَ حَلَّ بِهَا أَعْلىٰ ذَرِيْ عَرَفَاتِهِ

فَإِنَّ عَلِيًّا ذَا الْمَنَاقِبِ وَ النُّهىٰ كَرَامَاتُهُ الْعُلْيَا دُوْنَ صِفَاتِهِ

جب کرامات کی یہ شان ہے کہ ان کے مالک کی قدر و منزلت بلند ہو جاتی ہے اور وہ ان کی وجہ سے اپنے مقامات کی بلند ترین چوٹی پر فروکش ہوتا ہے تو عقل و مناقب کے مالک علیؑ کی شان یہ ہے کہ ان کی بلند ترین کرامات ان کے کمترین اوصاف شمار ہوتے ہیں۔

نورانی سراپا

کتاب کشف الغمہ میں خوارزمی سے نقل کیا گیا ہے وہ ابو اسحاق سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ : "میں نے علیؑ کے سر اور ریش اقدس کو سفید رنگت، شکم کچھ نکلا ہوا اور درمیانی قد والا دیکھا"۔ ابن مندہ کہتے ہیں کہ : "آپؑ کا رنگ گندم گوں، آنکھیں بڑی اور کشادہ، شکم (پیٹ) کچھ نکلا ہوا اور قد درمیانہ تھا"۔ محمد بن حبیب بغدادی کہتے ہیں کہ : "آپؑ کا رنگ گندمی، چہرہ خوبصورت اور ہر جوڑ کی ہڈیاں پُر گوشت تھیں"۔

بعض محدثین کا بیان ہے کہ "آپؑ کی قامت میانہ، آنکھیں سیاہ اور کشادہ، چہرہ جیسے چودھویں رات کا چمکتا چاند ہو، پیٹ کچھ نکلا ہوا، شانے کشادہ، ہتھیلیاں مضبوط، کندھے نرم، گردن صراحی کی مانند چاندی کی طرح چمکدار اور جھکی ہوئی، سر کے اگلے حصے کے بال کم، داڑھی گھنی، کندھے کی ہڈیاں گودے سے بھری ہوئی ایسے جیسے شکاری شیر کے کاندھے ہوتے ہیں، بازو اس قدر مستحکم کہ کلائیوں سے علیحدہ دکھائی نہیں دیتے تھے، اگر کسی شخص کے بازو سے پکڑا تو اس کے سارے جسم کو اوپر اٹھالیا اور اسے سانس لینے کی بھی فرصت نہ ملتی، ہاتھ اور کلائیاں مضبوط تھیں، جب میدان جنگ میں قدم رکھتے تو تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے، مضبوط دل کے مالک، طاقتور اور بہادر تھے، میدان وغا میں جس کا بھی سامنا کیا اسی پر نصرت و فتح حاصل کی"۔

صاحب کشف الغمہ کہتے ہیں کہ : "آپؑ کی ایک شہرت 'الأَنْزَعُ الْبَطِيْنُ' بھی ہے، تو اس کے دو طرح کے معنی بنتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا معنوی۔ ظاہری معنی کے لحاظ سے "انزع" اس شخص کو کہتے ہیں جس کے سر کے بال پیشانی کی دونوں اطراف

سے جھڑ چکے ہوں، اور وہ جگہ صاف ظاہر ہو۔ اور "بطین" کے معنی ہیں بڑے پیٹ والا، لیکن معنوی لحاظ سے "انزع" کا تعلق "نزع" سے ہے جسے اگر "الی" کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس کے معنی "اشتیاق" پیدا کرنے کے ہوں گے اور اگر "عن" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی ہوں گے "کسی چیز سے کنارہ کشی اختیار کرنا"۔ اسی بنا پر آپؑ کو "انزع" کہتے ہیں کہ آپؑ نے اپنے پاکیزہ نفس کو خواہشات نفسانی سے دور رکھا اور ان سے کنارہ کش رہے۔ اور برائیوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کی راہوں کو بند کر دیا اور اطاعت الٰہی کا اشتیاق پیدا کر کے اس پر عمل پیرا رہے، نیکیوں کا شوق دل میں بسا کر انہیں اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اسی طرح "بطین" کا باطنی معنی ہے "جو علم سے بھر پور ہو"۔ اسی لئے آپؑ کو بطین کہا جاتا ہے کہ آپؑ کا باطن علم سے بھر پور تھا کچھ علم کو ظاہر کیا اور کچھ کو باطن میں رہنے دیا۔ جس علم کو آپؑ نے ظاہر فرمایا وہ تو اظہر من الشمس ہے اور جس کو باطن میں رہنے دیا تو اس کے بارے میں فرمایا "بَلِ انْدَمَجْتُ عَلٰى مَكْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بُحْتُ بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمْ اضْطِرَابَ الْاَرْشِيَةِ فِي الطَّوِيِّ الْبَعِيْدَةِ" (خطبہ ۸) البتہ ایک علم پوشیدہ میرے سینے کی تہوں میں لپٹا ہوا ہے کہ اسے ظاہر کر دوں تو تم اس طرح پیچ و تاب کھانے لگو گے جس طرح گہرے کنویں میں رسیاں لرزتی اور تھر تھراتی ہیں۔

اسی چیز کو کسی شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

مَنْ كَانَ قَدْ عَرَفَقَتْهُ مِدْيَةُ دَهْرِهٖ ۔۔۔ وَ مَرَتْ لَهٗ اَخْلَافُ سَمٍّ مُنْقَعٖ

فَلْيَعْتَصِمْ بِعُرَى الدُّعَاءِ وَ يَبْتَهِلْ ۔۔۔ بِاِمَامِهِ الْهَادِيْ الْبَطِيْنِ الْاَنْزَعِ

نُزِعَتْ عَنِ الْآثَامِ طُرًّا نَفْسُهٗ ۔۔۔ وَرَعًا فَمَنْ كَالْاَنْزَعِ الْمُتَوَرِّعِ

وَ حَوَى الْعُلُوْمَ عَنِ النَّبِيِّ وِرَاثَةً ۔۔۔ فَهُوَ الْبَطِيْنُ بِكُلِّ عِلْمٍ مُوْدَعِ

وَ هُوَ الْوَسِيْلَةُ فِى النَّجَاةِ اِذِ الْوَرٰى ۔۔۔ رَجِفَتْ قُلُوْبُهُمْ لِهَوْلِ الْمُجْمَعِ

جس شخص کا زمانے کی چھریوں نے ہڈیوں سے گوشت اُتار لیا ہو اور زہر ہلاہل کے تھنوں سے اس کیلئے دودھ ٹپکایا گیا ہو، تو اسے چاہئے کہ وہ دعا کے دستے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور اپنے اس امام کا واسطہ دے کر اللہ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرے جو امام بھی ہے اور ہادی بھی، علم سے شکم پر اور کشادہ پیشانی والا ہے، جس نے اپنے آپ کو خوف خدا سے تمام گناہوں سے دور کر رکھا ہے، پس کون ہے جو اس کشادہ پیشانی والے اور خوف خدا رکھنے والے کی برابری کر سکتا ہے۔ جس نے تمام علوم کو نبی سے ورثے میں پایا، پس وہ ہر ودیعت کردہ علم کو اپنے بطن میں رکھنے والا ہے اور وہی وسیلہ نجات ہے جبکہ تمام مخلوقات کے دل ہول محشر سے لرزاں ہوں گے۔

شارح کہتے ہیں: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کے شرف و جمال کے پاکیزہ تذکرہ کو یہیں تک کافی سمجھا جائے اور انشاء اللہ ہم تیسرے خطبہ میں جو "خطبہ شقشقیہ" کے نام سے معروف ہے، آپؑ کے علم، زہد، سخاوت، شجاعت، فصاحت، اور دیگر اوصاف کو اجمالی طور پر بیان کریں گے اور کتاب میں مناسب مواقع پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ اگرچہ قلم آپؑ کے فضائل و مناقب کے شیریں تذکرے کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہے اور اس کی حلاوت اسے مسلسل چلنے پر آمادہ کر رہی ہے، لیکن اسے روکنا پڑ رہا ہے اس لئے کہ .... اس امام عالیمقام کے فضائل و مناقب کس طرح حیطہ تحریر میں لائے جا سکتے ہیں جس کے بارے میں سید

الانام علیہ وآلہ التحیۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے "لَوْاَنَّ الرِّیَاضَ اَقْلَامٌ وَ الْبَحْرَ مِدَادٌ وَ الْجِنَّ حُسَّابٌ وَ الْاِنْسَ کُتَّابٌ مَا اَحْصَوْا فَضَائِلَ عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ "۔اگر روئے زمین کے باغات قلم بن جائیں سمندر روشنائی بن جائیں جن حساب کرنے والے اور انسان لکھنے والے ہوں تو بھی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے فضائل کو شمار نہ کر سکیں۔

اس کے مفاخر و مناقب کو شمار کرنا کیونکر ممکن ہے جس کا گھر شرافت اور افتخار کی منزل ہے، جہاں پر فضائل کی انتہا ہے، جس سے بعد میں آنے والی دنیا پہلے آنے والوں سے نقل روایات کرتی ہے اور وہ خود اللہ کی عظیم نشانی، اس کا مقرر کردہ دروازہ ہے جہاں سے ہو کر خدا تک رسائی ہوتی ہے، خدا کا وہ نور ہے جس سے روشنی حاصل کر کے ہدایت پائی جاتی ہے، خدا کا وہ مضبوط دستہ ہے جس نے اسے پکڑ لیا وہ حق سے کبھی نہ بھٹکا اور ہدایت پا گیا، جو خدا کے بندوں پر اس کی حجت ہے اور ایسا سیدھا راستہ ہے جس کو اختیار کر کے روز قیامت کی ہلاکتوں سے بچا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سلسلہ کلام کو طول دیا بھی جائے پھر بھی آپؑ کے اوصاف کمال تک پوری طرح رسائی نہیں ہو سکتی اور اگر سلسلہ گفتگو کو لمبا بھی کر دیا جائے تاہم آپؑ کے فضل و فضائل تک پہنچنا ممکن ہے تو پھر بہتر ہے کہ اب تک شرف و کمال کا جو تذکرہ ہو چکا ہے اسے کافی سمجھا جائے۔

جامع نہج البلاغہ علامہ سید رضیؒ کا مقدس تذکرہ

سلسلۂ نسب:

جامع نہج البلاغہ علامہ سید رضی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب کچھ اس طرح ہے :ابو الحسن محمد بن ابی احمد الحسین بن موسیٰ بن محمد بن موسیٰ بن ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر صادق علیہما السلام۔اسی طرح ابن ابی الحدید اور شارح نہج البلاغہ علامہ بحرانی نے بھی آپ کا یہی سلسلۂ نسب بیان کیا ہے جبکہ کتاب "مجالس المؤمنین"، کتاب "لؤلؤۃ البحرین" اور مقدس امین کاظمی کی کتاب "مشترکات الرجال" میں "محمد بن موسیٰ" کو درمیان میں ذکر نہیں کیا گیا۔واللہ اعلم۔

شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی کہتے ہیں کہ آپ کی ولادت ۳۵۹ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد معظم، نقیب ابو احمد، بنی عباس اور بنی بویہ کی حکومتوں میں جلیل القدر اور عظیم المرتب سمجھے جاتے تھے۔اور "طاہر ذی المناقب" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، جبکہ بہاؤ الدولۃ ابو نصر بن بویہ آپ کو "طاہر اوحد" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ آل ابو طالب کی نقابت کے عہدہ پر پانچ مرتبہ فائز ہوئے۔جب آپ نے ستانوے برس کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو اس وقت بھی اسی منصب پر فائز تھے۔

"مجالس المؤمنین" میں "تاریخ مصر و قاہرہ" کے مؤلف سے نقل کیا گیا ہے کہ "شریف ابو احمد عظیم الشان سید تھے کہ جن کی لوگ اطاعت کیا کرتے تھے، ان کی ہیبت کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، بہاؤ الدولہ کے نزدیک ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور انہیں "اَلطَّاهِرُ الْاَوْحَدُ ذِي الْمَنَاقِبِ" کا لقب دیا، آپ میں ہر قسم کی نیک خصلتیں پائی جاتی تھیں۔ مگر وہ رافضی تھے اور وہ بھی اور ان کی اولاد بھی اپنی قوم کے مذہب پر تھے"۔ شارح کہتے ہیں کہ درحقیقت یہ استثناء "مدح کے بعد ذم" کے قبیل سے ہے، جبکہ ان کا "رافضی" ہونا ان کے عظیم صفات کمال میں سے ہے۔

ابن ابی الحدید کہتے ہیں : "سید رضی علیہ الرحمہ کی والدہ محترمہ کا نام فاطمہ بنت الحسین بن الحسن الناصر الاصم صاحب دیلم ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب یوں ہے : ابو محمد حسن بن علی بن الحسن بن علی بن عمر بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام۔ آل ابو طالب کے سردار، زاہد، ادیب اور شاعر تھے بلاد دیلم اور جبل پر ان کی حکمرانی تھی۔ "ناصر للحق" کے لقب سے ملقب تھے۔ سامانیوں کے ساتھ اس کی کافی جنگیں ہوئی ہیں۔ ۳۰۴ھ میں طبرستان میں ۷۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔

لؤلؤۃ البحرین میں کتاب "الدرجات الرفیعہ" سے نقل کیا گیا ہے کہ : ابو الحسن، شریف مرتضی کے بھائی ہیں جن کا لقب "رضی ذی الحسبین" ہے اور یہ لقب انہیں بہاؤالدولہ نے دیا تھا۔ اور انہیں "شریف الاجل" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ۳۵۹ھ میں سرزمین بغداد میں پیدا ہوئے۔ عالم فاضل، شاعر اور مشہور شخصیت کے مالک تھے۔ ثعالبی نے اپنی کتاب "الیتیمۃ" میں لکھا ہے کہ : جب دس سال کے ہوئے تو شعر کہنا شروع کئے اور اس وقت وہ اپنے دور کے نادر ترین افراد میں شمار ہوتے ہیں اور سادات عراق کے نجیب ترین بزرگوار سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی ذاتی شرافت، بلند پایہ فخر، واضح فضیلت، روشن ادب اور تمام خوبیوں کے مالک ہونے کی بنا پر شہرت تامہ کی منزل پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ آل ابو طالب کے گزشتہ اور آئندہ شعراء میں سے بلند درجہ کے شاعر بھی ہیں اور ان کا شمار بلند پایہ اور ماہر ترین شعراء میں ہوتا ہے، بلکہ ان سب پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ قریش کے بہت بڑے شاعر تھے تو سچ ہی ہوگا۔ ان کے والد آل ابو طالب کی نقابت پر فائز تھے جو انتہا رفیع و اعلی عہدہ تھا کہ نقیب کو حدود کے اجراء، امور شرعیہ کے نفاذ، باہمی تنازعات کے تصفیئے اور حج کی امارت کے تمام اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ پھر یہ سب کچھ کو آپ اپنے والد ہی کی زندگی میں ۳۸۰ھ میں تفویض ہو گیا۔

سید رضی علیہ الرحمہ کی تصانیف کا سلسلہ بہت وسیع ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں ؛

۱۔ المتشابہ في القرآن ۲۔ حقائق التنزیل ۳۔ تفسیر القرآن ۴۔ مجازات آثار نبویہ ۵۔ حاشیہ خلاف الفقہا ۶۔ ابو علی کی کتاب الایضاح پر حاشیہ ۷۔ خصائص ۸۔ نہج البلاغہ کی تالیف ۹۔ تلخیص البیان فی مجازات القرآن ۱۰۔ الزیادات فی شعر ابی تمام ۱۱۔ اپنے والد سید طاہر کی سیرت ۱۲۔ انتخاب شعر ابن الحجاج ۱۳۔ مختار شعر ابی اسحاق صابی ۱۴۔ اپنے اور ابی اسحاق صابی کے درمیان ہونے والی گفتگو پر مشتمل تین جلدوں میں کتاب ۱۵۔ اپنے اشعار کا دیوان، چار جلدیں۔

ابو الحسن عمری کہتے ہیں کہ : "میں نے اس تفسیر کو دیکھا ہے جسے احسن تفاسیر پایا، جس کا حجم ابو جعفر طوسی کی تفسیر کے برابر بلکہ زیادہ ہے"۔ ان میں ہیبت و جلالت اور زہد و ورع پایا جاتا تھا۔ اپنے عزیزوں رشتہ داروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آل ابو طالب کے پہلے فرد ہیں جو بلند ہمت اور شریف النفس سید تھے کسی سے کبھی کوئی صلہ اور جائزہ نہیں لیا حتی کہ اپنے والد سے بھی قبول نہیں کیا، اس سے آپ کی عزت نفس اور رفعت شان کا پتہ چلتا ہے۔

شارح معتزلی کہتے ہیں : "تیس سال کی عمر کے بعد مختصر سی مدت میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور فقہ و فرائض کے کافی مضبوط قواعد یاد کر لئے۔ وہ عالم، ادیب، فصیح شاعر، بہترین انشاء پرداز اور بلند پایہ سخن طراز تھے۔ ایسا کلام پیش کیا ہے جو شوکت الفاظ میں، سلاست، حسن ترکیب اور بلندی اسلوب میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔............"۔

صاحب لؤلؤۃ البحرین کہتے ہیں کہ ابو الفتوح ابن جنی نے اپنے ایک مجموعے میں ذکر کیا کہ: "ایک دن سید رضیؒ، سیرافی نحوی کے حلقہ درس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سیرافی نے نحوی اعراب کی مشق کراتے ہوئے سید رضیؒ سے پوچھا" اذا قُلْنَا رَأیتُ عُمَرَ فماعلَامَۃُ نَصْبِ عُمَرَ؟" جب ہم رایتُ عُمَرَ کہیں تو اس میں عمر کے نصب کی کیا وجہ ہے؟ تو سید رضیؒ نے برجستہ جواب دیا 'بُغْضُ عَلِيٍّ' اس جواب پر سیرافی اور دوسرے لوگ ان کی ذہانت اور طباعی پر دنگ رہ گئے حالانکہ ابھی آپ کا سن دس برس کا بھی نہ تھا"۔(از مترجم: یاد رہے کہ "نصب" ایک اعرابی علامت ہے اور اس کے معنی "ناصبیت" کے بھی ہیں اور علامہؒ نے اسے دوسرے معنی پر محمول کیا)

ابو الحسن عامری بیان کرتے ہیں کہ میں شریف مرتضیٰؒ کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے مجھے دو اشعار دکھائے جن پر انہوں نے طبع آزمائی کی تھی؛

سَرىٰ طَيْفُ سُعْدىٰ طَارِقًا فَاسْتَفَزَّنِيْ هُوَيْنًا وَ صَحْبِيْ بِالْفَلَاةِ رَقُوْد

فَقُلْتُ لِعَيْنِيْ عَاوِدِ النَّوْمَ وَ اهْجَعِيْ لَعَلَّ خِيَالاً طَارِقًا سَيَعُوْد

سعدیٰ کی صورت رات کو خواب میں آن پہنچی، تو اس نے مجھے نرمی کے ساتھ مضطرب کر دیا جبکہ میرے ساتھی جنگل میں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھ سے کہا کہ دوبارہ نیند کی طرف پلٹ جا اور بند ہو جا شاید کہ وہ صورت دوبارہ لوٹ آئے۔

یہ سن کر میں ان کے برادر خورد شریف رضیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہی دو اشعار ان کے سامنے پڑھے، یہ سن کر انہوں نے فی البدیہ فرمایا؛

رَدَدْتُ جَوَابًا وَالدُّمُوْعُ بَوَادِرُ وَ قَدْ آنَ لِلشَّمْلِ الْمُشِتِّ وَرُوْد

فَهَيْهَاتُ مَنْ لُقِيَا حَبِيْبٍ تَعَرَّضَتْ لَنَا دُوْنَ لُقْيَاهُ مَهَامَةُ بَيْد

میں نے اس حال میں جواب لوٹایا کہ آنسو تیزی سے امڈ آئے تھے اور شیرازہ کے ٹوٹنے کا وقت پہنچ گیا۔ پس اس محبوب کی ملاقات بہت بعید ہے اور اس کے آگے لق و دق صحرا حائل ہیں۔

یہ شعر میں نے سید مرتضیٰؒ کو جا کر سنائے اور کہا کہ انہوں نے یہ فی البدیہ کہے ہیں، تو سید مرتضیٰؒ نے فرمایا "میرے بھائی کیلئے اب زیادہ دیر زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے، انہیں تیز ہوشی نے قتل کر دیا ہے"۔ اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سید رضیؒ اس دنیا سے کوچ فرما گئے۔ خدا ان سے راضی ہو اور انہیں راضی رکھے۔ آمین۔

شارح معتزلی کہتے ہیں: "شریف رضیؒ نے کسی سے کوئی صلہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا حتیٰ کہ اپنے والد تک کے صلہ کو قبول نہیں فرمایا۔ اسی سے آپ کی عزت نفس اور ذاتی شرافت کا پتہ چلتا ہے۔ جبکہ آل بویہ کی یہ پوری کوشش رہی ہے کہ آپ کسی طرح ان کے ہدیئے کو قبول کر لیں لیکن ان میں سے کسی سے بھی کچھ قبول نہ کیا اس لئے کہ وہ اس طرح سے اپنی عزت نفس اور حمیت و خودداری کو اندار نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کو عزت و احترام دینا چاہتے تھے، خلیفہ طائع للہ کا آپ کی طرف رجحان خلیفہ قادر باللہ کی نسبت زیادہ تھا اور آپ بھی اس سے قادر باللہ کی نسبت زیادہ محبت کرتے تھے چنانچہ ایک قصیدہ میں 'طائع' کی تعریف

کرتے ہوئے کہتے ہیں :

عطفًا امیرَ المُؤمنین فاننا فيْ دوْحة العُلْیاءِ لاَ نتفرّق
ما بیْننا یوْمَ الفخار تفاوُتٌ ابدًا كلانا فی العُلاءِ مُعرّق
الاَّ الخلافة شرّفتك فاننيْ انا عاطلٌ منْها وَ انْتَ مُطوّق

اے امیر المؤمنین! مہربانی کرو کیونکہ ہم بلندی کے شجر ہیں اور ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے باہمی مفاخرت کے دن ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے اور بلندی مرتبہ میں ہم ہمیشہ سے ایک ہی اصل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ خلافت نے آپ کو شرف عطا کیا ہے اور میں اس سے محروم ہوں اور آپ کے گلے میں اس کا طوق پڑا ہوا ہے۔

کتاب "رجال ابی علی" میں "تاریخ اتحاف الوری باخبار ام القری" سے نقل کیا گیا ہے کہ ۳۸۹ھ کے حالات کے تحت درج ہے کہ :"اس سال شریف رضیؒ اور شریف مرتضیٰؒ نے حج کی سعادت حاصل کی اثناء سفر میں ان سے ابن جراح طائی کی ملاقات ہو گئی، تو انہوں نے اپنے مال سے نو ہزار دینار عطا کئے"۔ شارح معتزلی کہتے ہیں کہ میں نے شیعہ فقیہ محمد ابن ادریس حلی کی تحریر میں پڑھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ شافعی فقیہ ابو حامد احمد بن محمد اسفرائینی روایت کرتے ہیں کہ :ایک دن میں بہاؤالدولہ کے وزیر فخر الملک ابو غالب محمد بن خلف اور ان کے بیٹے سلطان الدولہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں ابوالحسن شریف رضیؒ تشریف لے آئے، فخر الملک نے ان کی بڑی عزت و تکریم کی، عزت و احترام سے پیش آئے اور جو خط و خطوط ان کے پاس تھے ان سے لئے، ان سے باتیں کیں اور وہ چلے گئے۔ پھر سید رضیؒ کے بھائی ابوالقاسم شریف مرتضیٰؒ آئے لیکن موصوف نے ان کا اتنا اسی قدر احترام نہ کیا جتنا کہ سید رضیؒ کا کیا، انہوں نے کچھ خطوط وغیرہ پیش کئے وزیر نے ان سے لے لئے جن پر دستخط کرنے تھے کر دیئے تھوڑی دیر بیٹھے ان کا جو کام تھا کر دیا وہ بھی چلے گئے۔ ابو حامد کہتے ہیں :"میں وزیر کے پاس گیا اور ان سے کہا :'خدا آپ کا بھلا کرے، سید مرتضیٰؒ جو فقیہ بھی ہیں اور متکلم بھی ساتھ ہی صاحب علم و فن بھی ہیں وہ زیادہ قابل احترام اور اپنے بھائی سے افضل ہیں، جبکہ ابوالحسن سید رضیؒ صرف شاعر ہیں، آپ نے شریف مرتضیٰؒ کی نسبت سید رضیؒ کا زیادہ احترام کیا آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟'

انہوں نے کہا :'جب لوگ چلے جائیں گے اور خلوت ہو جائے گی تب آپ کو اس کا جواب دوں گا'۔ چنانچہ جب مجلس برخواست ہوئی اور لوگ آہستہ آہستہ واپس جانے لگے اور سوائے ان کے نوکروں چاکروں کے کوئی باقی نہ رہا تو اس نے کھانا منگوایا، ہم نے مل کر کھانا کھایا جب کھانا کھا کر اور ہاتھ دھو کر فارغ ہوئے سب نوکر چاکر بھی چلے گئے تو میرے سوا ان کے پاس کوئی باقی نہ رہا تو انہوں نے ایک نوکر کو بلا کر کہا :'وہ دو خط لے کر آؤ جو میں نے تمہیں فلاں جگہ پر رکھنے کیلئے دیئے تھے'۔ چنانچہ وہ خطوط لے آیا اور وزیر نے مجھے ایک خط دے کر کہا 'یہ پڑھو' یہ سید رضیؒ کا خط ہے جو مجھے ملا ہے، اور اس کا ماجرا یہ ہے کہ چند دن پہلے ان کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی اور میں نے انہیں ایک ہزار دینار بھجوائے کہ یہ دایہ کیلئے ہیں، کیونکہ ہمارا رواج ہے کہ ایسے موقعوں پر دوستوں کو اس قسم کے تحفے دیا کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ خط لکھ کر واپس بھیج دیئے۔ یہ خط آپ بھی پڑھئے۔ میں نے وہ خط پڑھا جس میں ان الفاظ کے ساتھ رقم قبول کرنے سے معذرت خواہی کی گئی تھی :'ہم اہل بیت ہیں، ہمارے ہاں کا دستور نہیں ہے کہ غیر عورتیں ہمارے حالات پر

مطلع ہوں، اس لئے کہ دوسری عورتوں سے یہ خدمت متعلق نہیں کی جایا کرتی، بلکہ ہمارے گھر کی بڑی بوڑھیاں اسے سر انجام دے لیا کرتی ہیں اور وہ اس کیلئے کوئی ہدیہ واجرت قبول کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہو سکتیں'۔

فخر الملک نے کہا: 'یہ تو ہیں شریف رضیؒ اب آیئے شریف مرتضیٰؒ کی طرف، تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک مرتبہ 'نہر عیسیٰ' کھودنے کیلئے ہم نے علاقہ کے زمینداروں پر ہر ایک کے حصہ کے مطابق کچھ رقم کی ادائیگی لازم کردی اور وا ہر یہ کے موضع پر بیس درہم لگان عائد کیا جس میں شریف مرتضیٰؒ کا رقبہ بھی ہے اور ان کے حصہ میں بیس درہم بنتے تھے جن کی قیمت ایک دینار ہے، اس پر انہوں نے مجھے یہ خط لکھا ہے، آپ بھی پڑھیے'؛ میں نے وہ خط دیکھا جو سو سے زیادہ سطروں پر مشتمل تھا، اس میں بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ مذکورہ رقم نہ لینے کا سوال کیا گیا تھا۔ وزیر نے کہا: 'اب آپ ہی بتایئے کہ کس کی زیادہ تعظیم و تکریم کی جائے؟ آیا عالم، متکلم اور فقیہ اوحد کی کہ جن کی کیفیت یہ ہے یا اس شخص کی جو صرف اشعار کی وجہ سے شہرت یافتہ ہیں لیکن ان کی غنائے نفس کی یہ حالت ہے؟ اس پر میں نے کہا: 'خدا آپ کا بھلا کرے اور ہمیشہ اپنی توفیقات آپ کے شامل حال رکھے، آپ نے ہر ایک کو اس کی شان کے مطابق قدر و منزلت عطا کی ہے'۔ یہ کہا اور چلا آیا"۔

شارح معتزلی، فخار بن معد علوی موسوی سے نقل کرتے ہیں کہ: شیعہ فقیہ ابو عبداللہ محمد بن نعمان المعروف شیخ مفیدؒ نے خواب میں دیکھا کہ جناب فاطمہ زہراؑ، حسن اور حسین علیہما السلام کے ہمراہ مسجد کرخ میں تشریف لائیں اور ان سے خطاب کر کے فرمایا "اے شیخ! میرے ان بچوں کو علم فقہ و دین پڑھاؤ"۔ شیخ جب خواب سے بیدار ہوئے تو حیرت و استعجاب نے گھیر لیا۔ اسی عالم میں صبح ہوئی تو دیکھا کہ فاطمہ بنت ناصر کنیزون کے جھرمٹ میں تشریف لا رہی ہیں اور ان کے دونوں بیٹے سید رضیؒ اور سید مرتضیٰؒ ان کے ہمراہ ہیں۔ شیخ انہیں دیکھ کر تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ جب وہ قریب آئیں تو فرمایا: "اے شیخ! میں ان بچوں کو آپ کے سپرد کرنے آئی ہوں آپ انہیں علم فقہ و دین پڑھائیں"۔ یہ سن کر رات کا منظر ان کی نظروں میں پھرنے لگا۔ مجسم تعبیر نگاہوں کے سامنے آگئی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان سے رات کا خواب بیان کیا۔ شیخ نے اسی دن سے انہیں اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا خدا نے انہیں اپنی نعمتوں سے نوازا اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر علم و فضل میں وہ بلند مقام حاصل کیا کہ آج تک شہرہ آفاق ہے اور رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ کتاب لؤلؤۃ البحرین کے مطابق شریف رضیؒ کی وفات اتوار کے دن صبح کے وقت ۶ محرم الحرام ۴۰۶ھ میں ہوئی۔ جبکہ شارح معتزلی کہتے ہیں کہ ۴۰۴ھ میں ہوئی۔ آپ کے جنازے میں وزیر فخر الملک، تمام اعیان و اشراف اور علماء و قضاۃ نے شرکت کی اور محلہ کرخ کی مسجد انباریین کے پاس اپنے گھر میں دفن کیے گے۔ ان کے بڑے بھائی سید مرتضیٰؒ نے جب اپنے بھائی کی موت کا روح فرسا منظر دیکھا تو تاب و توانائی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور درد و غم کی شدت سے بے قرار ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور اپنے جد حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حرم میں آکر بیٹھ گئے۔ چنانچہ نماز جنازہ وزیر ابو غالب فخر الملک نے پڑھائی۔ اس کے بعد سید مرتضیٰؒ علم الھدیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی مشکلوں سے انہیں واپس لے جانے میں کامیاب ہوئے اور وہ چھڑی کے سہارے گھر پہنچے۔ پھر سید رضی علیہ الرحمہ کے تابوت کو کربلا معلی لے جایا گیا اور اپنے جد کے قریب روضہ سید الشہداؑ میں دفن کر دیا گیا۔ کتاب مجالس المؤمنین میں ہے کہ آپ کے بعد نقابت اور امارت حج کا منصب ان کے بڑے بھائی سید مرتضیٰؒ کو

تفویض کیا گیا۔ آپ کی وفات پر سید مرتضیٰؒ علم الھدیٰ، ابو العلاء معری اور بہت سے دیگر فاضل شعراء نے مرثیے کہے، جن میں سے چند ایک مرثیوں کو ہم بھی یہاں پر اختصار کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔

آپ کے بھائی سید مرتضیٰؒ علم الھدیٰ کے مرثیہ کے چند اشعار ؛

يَا لَلرِّجَالِ لَفَجْعَةٍ جَزَمَتْ يَدِيْ ۔۔۔ وَ وَدِدْتُ لَوْ ذَهَبَتْ عَلَيَّ بِرَاسِيْ

مَازِلْتُ اَحْذَرُ وِرْدَهَا حَتّٰى اَتَتْ ۔۔۔ فَحَسَوْتُهَا فِيْ بَعْضِ مَا اَنَا حَاسِيْ

وَ مَطَلْتُهَا زَمَنًا فَلَمَّا صَمَّمَتْ ۔۔۔ لَمْ يُثْنِهَا مَطْلِيْ وَ طُوْلُ مَكَاسِيْ

لِلّٰهِ عُمْرُكَ مِنْ قَصِيْرٍ طَاهِرٍ ۔۔۔ وَ لَرُبَّ عُمْرٍ طَالَ بِالْاَدْنَاسِ

اے لوگو! اس صدمہ میں میرا ہاتھ بٹاؤ کہ جس نے میرا بازو کاٹ کر رکھ دیا ہے اور میں تو یہ چاہتا تھا کہ کاش میرا سر لے جاتا۔ میں ہمیشہ اسی سے ڈرتا رہا تھا بالآخر وہ آکر رہا اور مجھے اور چیزوں کے ساتھ اسے بھی چکھنا پڑا۔ میں اسے ایک عرصے تک ٹالتا رہا لیکن اس نے عزم مصمم کر لیا تو پھر میرے طویل ٹال مٹول اور مول تول بھی اسے نہ ٹال سکے۔ خداوند عالم نے تیری مختصر لیکن پاک و پاکیزہ زندگی میں برکت عطا فرمائی ہے جبکہ بہت سی طویل اور لمبی عمریں میل کچیل سے آلودہ ہوتی ہیں۔

سید رضیؒ کے شاگرد مہیار بن مردویہ کاتب کے چند اشعار ؛

مَنْ جَبَّ غَارِبَ هَاشِمٍ وَ سَنَامَهَا ۔۔۔ وَ لَوَى لُوَيًّا وَ اسْتَزَلَّ مَقَامَهَا

وَ غَزَا قُرَيْشًا بِالْبِطَاحِ فَلَفَّهَا ۔۔۔ بِيَدِ (عَجْلَاخٍ)وَ قَوَّضَ عِزَّهَا وَ خِيَامَهَا

کس نے بنو ہاشم کے کندھے اور کوہان کو کاٹ ڈالا ہے اور بنو لوی کو جھکا دیا ہے اور ان کے قیام میں لغزش پیدا کر دی ہے؟ اور کس نے قریش کے ساتھ سنگریزوں والی وادی میں جنگ لڑی ہے اور انہیں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور ان کے عزو شرف حتی کہ خیام تک کو اکھاڑ ڈالا ہے؟ اور کہتے ہیں ؛

بَكَرَ النَّعِيُّ مِنَ الرَّضِيِّ بِمَالِكٍ ۔۔۔ غَايَاتُهَا مُتَعَوِّدٌ اَقْدَامَهَا

تقدیر کے انتہا کے مالک اور اس کے اقدام کی عادت رکھنے والے پر ہر حال میں راضی رہنے والے کی موت کی خبر صبح صبح آن پہنچی۔

سید علی صدر الدین کہتے ہیں کہ : یہ مرثیہ سید رضیؒ کے حاسدوں کو شاق گزرا تو انہوں نے "براعت استہلال" کی نوع سے ایک اور مرثیہ کہا۔ ابو العلاء معری نے ساٹھ بیتوں سے زیادہ پر مشتمل ایک مرثیہ کہا جن کے آخر میں سید رضیؒ کے آباو اجداد کی مدح اور ان کے گھر کی فضیلت اور ان کے جود و سخا کو سراہا گیا۔ جن میں سے چند ایک اشعار یہاں پر درج کیے جاتے ہیں :

اَوْدَى فَلَيْتَ الْحَادِثَاتِ كِفَافٌ ۔۔۔ مَالُ الْمُسِيْفِ وَ عَنْبَرُ الْمُسْتَافِ

الطَّاهِرُ الْآبَاءِ وَ الْاَبْنَاءِ وَ ۔۔۔ الْآرَابِ وَ الْاَثْوَابِ وَ الْآلَافِ

پسر مردہ کا سرمایہ اور سونگھنے والے کا عنبر سے ہاتھ جاتا رہا۔ کاش کہ حوادثات زمانہ رک جاتے۔ پاک آباو اجداد، پاکیزہ اولاد، نیک

مقاصد، مقدس لباس اور بے آلائش محبتوں والا ہم سے جدا ہو گیا۔

اَنْتُمْ ذَوُوْ النَّسَبِ الْقَصِيْرِ فَطَوْلُكُمْ بَادٍ عَلَى الْكُبَرَاء وَ الْاَشْرَافِ

تمہارے اور امامؑ کے درمیان بہت تھوڑے سے واسطے حائل ہیں اور تمہاری بلندیاں اکابر واشراف پر نمایاں ہیں۔

اب ہم اپنی کتاب کے دیباچے کو نہج البلاغہ اور منہاج البراعہ کی شان میں کہے جانے والے قصائد اور تقریضات کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ ابو یوسف یعقوب بن احمد کتاب نہج البلاغہ کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں، جن میں سے ایک شعر یہ ہے ؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ نَهْجٌ مُهَيَّعٌ جُدَدٌ لِمَنْ يُرِيْدُ عُلُوًّا مَالَهٗ اَمَدٌ

نہج البلاغہ، بلندی کا قصد کرنے والے کیلئے واضح، کشادہ اور ہموار راستہ ہے اور اس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ ان کے فرزند حسن نے اسی کتاب کے آغاز میں کہا جن میں سے ایک شعر یہ ہے ؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ دُرَجٌ ضِمْنَهٗ دُرَرٌ نَهْجُ الْبَلاَغَةِ رَوْضٌ جَادَهٗ دُرَرٌ

نہج البلاغہ وہ صندوق ہے جس کے اندر موتی بھرے ہوئے ہیں، نہج البلاغہ وہ سبزہ زار ہے جس کی راہیں نغمات کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ انہی کی اقتدا میں ادیب عبدالرحمان نے اس کتاب کے لکھنے کے بعد چند اشعار تحریر کئے جن میں سے ایک یہ ہے ؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ نَهْجُ الزُّخْرِ وَ السَّنَدِ وَ فِيْهِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ الْخَيْرُ وَ الرُّشْدُ

نہج البلاغہ افتخار اور اعتماد کا راستہ ہے اور اس میں مومنین کیلئے بھلائی اور رہنمائی ہے۔ اسی طرح ایک اور صاحب نہج البلاغہ کے نسخ و تحریر سے فارغ ہوئے تو کہا؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ هٰذَا سَيِّدُ الْكُتُبِ تَاجُ الرَّسَائِلِ وَ الْاَحْكَامِ وَ الْخُطَبِ

یہی نہج البلاغہ کتابوں کی سردار کتاب، خطوط ورسائل اور احکام کا تاج ہے۔

قطب الدین تاج الاسلام محمد بن حسین الحیدری کہتے ہیں ؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ نَهْجٌ كُلُّ مُسْتَدِّدٍ نَهْجُ الْمَرَامِ لِكُلِّ قَوْمٍ اَمْجَدٍ

نہج البلاغہ ہر ہدایت یافتہ کیلئے راہ مستقیم ہے اور تمام بلند مرتبہ شریف قوموں کیلئے منزل مقصود ہے۔

اسی طرح ایک اور شاعر کہتے ہیں ؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ مَنْهَجُ الْبُلَغَاءِ وَ مَلاَذُ ذِيْ حَصْرٍ وَ ذِيْ اَعْيَاءِ

نہج البلاغہ بلیغ لوگوں کا راستہ ہے اور بول نہ سکنے والوں اور بولنے میں دشواری محسوس کرنے والوں کی جائے پناہ ہے۔

سید عزالدین مرتضیٰ بن سید ضیاء الدین کہتے ہیں ؛

نَهْجُ الْبَلاَغَةِ نَهْجَةٌ لِذَوِى الْبَلاَغَةِ وَاضِحٌ وَ كَلاَمُهٗ لِكَلاَمِ اَرْبَابِ الْفَصَاحَةِ فَاضِحٌ

نہج البلاغہ اہل بلاغت کیلئے واضح راستہ ہے اور اس کا کلام ارباب فصاحت کے کلام کو مغلوب کر دیتا ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے :

نَهْجُ الْبَلَاغَةِ نَهْجُ الْعِلْمِ وَ الْعَمَلِ   فَاسْلُكْهُ يَا صَاحِ تَبْلُغْ غَايَةَ الأَمَلِ

نہج البلاغہ علم و عمل کا راستہ ہے تو اے ساتھی! اس پر گامزن رہ کہ اپنی منتہائے آرزو کو پالے گا۔

علی بن سعد طیب کہتے ہیں :

نَهْجُ الْبَلَاغَةِ مَشْرَعُ الْفُصَحَآءِ   وَ مُعَشْشُ الْبُلَغَآءِ وَ الْعُلَمَآءِ

نہج البلاغہ صاحبان فصاحت کیلئے گھاٹ ہے اور صاحبان علم وبلاغت کیلئے آشیانہ ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے :

نَهْجُ الْبَلَاغَةِ يَهْدِي السَّالِكِيْنَ اِلىٰ   مَوَاطِنَ الْحَقِّ مِنْ قَوْلٍ وَ مِنْ عَمَلٍ
فَاسْلُكْهُ تَهْدِيْ اِلىٰ دَارِ السَّلَامِ غَدًا   وَ تَحُظُّ فِيْهَا بِمَا تَرْجُوْهُ مِنْ أَمَلٍ

نہج البلاغہ اپنے پر گامزن لوگوں کو حق بات و حق کار کے مراکز کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پس تو بھی اس پر گامزن ہو جا کہ تجھے سلامتی کے گھر (بہشت) کی طرف رہنمائی کرے گا اور اس گھر کیلئے تجھے جو بھی آرزو ہے اس سے بہرہ ور ہوگا۔

ایک اور شاعر کہتا ہے :

كِتَابٌ كَاَنَّ اللّٰهَ رَصَّعَ لَفْظَهٗ   بِجَوْهَرِ آيَاتِ الْكِتَابِ الْمُنْزَلِ
حَوىٰ حِكَمًا كَالدُّرِّ تَنْطِقُ صَادِقًا   فَلَاَ فَرْقَ اِلَّا اَنَّهٗ غَيْرُ مُنْزَلِ

نہج البلاغہ ایسی کتاب ہے گویا اللہ نے اس کے لفظوں کو آسمان سے اتاری ہوئی کتاب (قرآن) کی آیات کے جواہر کے ساتھ مرصع کر دیا ہے۔ اس نے موتی جیسی حکمتوں کو جمع کیا ہے جو سچ کے ساتھ گویا ہوتی ہیں، پس کتاب اللہ (قرآن مجید) اور نہج البلاغہ میں صرف یہی فرق ہے کہ قرآن آسمان سے نازل کردہ ہے اور نہج البلاغہ نازل کردہ نہیں ہے۔

فاضل ادیب نواب مستطاب عبدالحسین میرزا شرح نہج البلاغہ (منہاج البراعہ) کے بارے میں کہتے ہیں :

أَيَا طَالِبَ مِنْهَاجِ رُشْدٍ وَ حِكْمَةٍ   يَرُوْمُ اِقْتِنَاءَ الذُّخْرِ مِنْ رَحْمَةِ الْبَارِيْ
وَ يَا تَائِهًا ظَمْآنَ فِيْ قَفْرِ حَيْرَةٍ   يُرِيْدُ ارْتِوَآءَ الْعَقْلِ بِالْمَنْهَلِ الْجَارِيْ
عَلَيْكَ بِمِنْهَاجِ الْبَرَاعَةِ اَنَّهٗ   لَمِنْهَاجُ فَضْلٍ لِلْهُدىٰ ثُمَّ تِذْكَارِ

اے ہدایت و حکمت کی راہوں کے طلبگار! کہ جو خالق کی رحمت سے ذخیرہ اکٹھا کرنے کا قصد رکھتا ہے اور اے حیرت کے بیابانوں میں سرگردان پیاسے! کہ جو عقل کو بہتے گھاٹ سے سیراب کرنا چاہتا ہے!! تو تمہیں چاہئے کہ "منہاج البراعہ" کو مضبوطی سے تھام لو کہ یہ بے شک ہدایت اور فہم و فراست اور حفظ و یادداشت کا راستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے منہاج البراعہ شرح نہج البلاغہ کا دیباچہ یہیں پر ختم ہوتا ہے، اب خداوند عالم کی تائید و حسن توفیق سے اس کی شرح کا آغاز کیا جاتا ہے وہی بہترین توفیق عطا کرنے والا معاون اور مددگار ہے اور درود و سلام ہو حضرات محمدؐ و آل

محمدؐ پر خاص کر میرے لئے ذخیرہ اور میرے سردار اور دنیاو آخرت میں میری امیدوں کے ملجاء وماوی امیر المؤمنینؑ اور سید الوصیینؑ پر بہت زیادہ درودو سلام۔

منهاج البراعه

فی شرح

نہج البلاغه

جلد اول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ الْحَمْدَ مِفْتَاحًا لِّذِكْرِهٖ
وَاَنْطَقَ الْخَلَائِقَ كُلَّهَا بِحَمْدِهٖ وَ شُكْرِهٖ وَ جَعَلَهٗ
سَبِيْلاً لِلْمَزِيْدِ مِنْ اِحْسَانِهٖ وَ بِرِّهٖ وَ وَسِيْلاً اِلٰى
خَلَاصِ الْعَبْدِ مِنْ مَسْكَنَتِهٖ وَ ضُرِّهٖ وَ اِنْ مِنْ
شَيْءٍ اِلاَّ يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ جَلاَلِهٖ طَلَبًا لِلزُّلْفٰى
لَدَيْهِ وَ شَوْقًا اِلٰى وِصَالِهٖ وَ الصَّلاَةُ وَ السَّلاَمُ
عَلٰى عَبْدِهٖ وَ رَسُوْلِهِ الْهَاشِمِيِّ النَّسَبِ وَ
الْعَدْنَانِيِّ الْاُمِّ وَالْاَبِ سَيِّدِ الْاُمَمِ وَبَاسِطِ الْكَرَمِ
وَ صِفْوَةِ الْجَلِيْلِ وَ سُلاَلَةِ الْخَلِيْلِ مُحَمَّدِ
الشَّرِيْفِ الرَّضِيِّ وَ حَبِيْبِ اللّٰهِ الصَّفِيِّ
الْمَرْضِيِّ وَ عَلٰى آلِهِ الَّذِيْنَ نَفَوْا عَنِ الدِّيْنِ
انْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ حَلُّوْا بِبَنَانِ بَيَانِهِمْ تَاوِيْلَ
الْجَاهِلِيْنَ بَعْدَ مَا هَدَرَتْ شَقَاشِقُ الْجَهَالَةِ وَ
الشِّقَاقِ وَ انْتَشَرَتْ آثَارُ الضَّلاَلَةِ فِي الْآفَاقِ
حَتّٰى انْهَارَتْ بِهِمْ عَلَيْهِمُ السَّلاَمُ دَعَائِمُ
الْجَهْلِ وَدَحَضَتْ قَوَائِمُهٗ وَ انْدَرَسَتْ آثَارُهٗ وَ
تَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهٗ وَانْطَمَسَتْ اَعْلاَمُ النَّصْبِ وَ
خَبَتْ نِيْرَانُهٗ وَ قَوِيَ اَسَاسُ الْاِيْمَانِ وَ شُيِّدَ
بُنْيَانُهٗ وَ اسْتَقَرَّ اَرْكَانُهٗ وَ اَلْقٰى جِرَانَهٗ سِيَّمَا
اَخْطَبِ الْخُطَبَاءِ وَقُدْوَةِ الْبُلَغَاءِ وَمُنْيَةِ الْفُصَحَاءِ

ہر قسم کی تعریف مخصوص ہے اس اللہ کیلئے جس نے حمد کو
اپنے ذکر کی کنجی قرار دیا اور تمام مخلوق کو اپنی حمد و شکر بیان کرنے
کیلئے قوت گویائی عطا کی اور اسے اپنے احسان اور نیکیوں کے
اضافے کا موجب بنایا اور بندے کیلئے غربت اور نقصانات سے
بچنے کا ذریعہ قرار دیا، جو بھی چیز اس دنیا میں ہے اس کے حمد و جلال
کی تسبیح بیان کر رہی ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل
کرنے اور اس کے وصل کے شوق میں۔ درود و سلام ہو اس کے
بندے اور رسولؐ پر جو نسب کے اعتبار سے ہاشمی، ماں باپ کے
اعتبار سے عدنانی اور تمام امتوں کے سردار ہیں، جن کے کرم و
سخا کا دائرہ وسیع ہے، رب جلیل نے جنہیں اپنے لئے چن لیا ہے،
جو ابراہیم خلیل کے خانوادہ سے ہیں، یعنی حضرت محمد مصطفیٰؐ پر جو
صاحب شرف اور خدا کے پسندیدہ ہیں، اللہ کے برگزیدہ اور
محبوب دوست ہیں، اور درود و سلام ہو ان کی آلؑ پر جنہوں نے
دین کا غلط دعوی کرنے والوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور
جاہلوں کی ناروا تاویلوں کی گرہیں اپنے بیان کے ہاتھوں سے کھولیں
جبکہ جہالت اور مخالفت و دشمنی اپنے عروج پر تھی اور گمراہی کے
آثار چار وانگ عالم میں پھیل چکے تھے، آخر کار انہی کی وجہ سے
جہالت کے ستون گر گئے، اس کی بنیادیں ہل گئیں، اس کے آثار
مٹ گئے، اس کی راہوں کے نشانات ناپید ہو گئے، نصب و
ناصبیت کے گڑے ہوئے جھنڈے سرنگوں ہو گئے اور اس کی
آگ بجھ گئی۔ ایمان کی اساس پختہ ہو گئی، اس کی بنیاد مستحکم ہو گئی،
اس کے ستون مستحکم ہو گئے اور قدم جم گئے، خاص طور پر درود و
سلام ہو دنیا کے عظیم ترین خطیب، ارباب بلاغت کے مقتداء،

عَلِيٌّ العَلِيِّ الاَمِيْنِ وَ الوَصِيِّ الْوَلِيِّ الْمَكِيْنِ جَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرَ جَزَاءِ الْعَالَمِيْنَ بِمَا سَهَّلَ لَنَا نَهْجَ الْحَقِّ الْمُبِيْنِ وَ اَبَانَ مَنْهَجَ الْعِرْفَانِ وَ الْيَقِيْنِ وَ اَبْلَجَ لَنَا سِرَاجَ الْمَذْهَبِ بِكَلَامِهِ الْجَامِعِ لِلْعُجَابِ وَ الْعَجَبِ حَتّٰى صَارَ بَلَاغَةَ لِسَانِهِ لِلسُّرٰى نُوْرًا وَهَّاجًا وَبَدِيْعُ بَيَانِهِ لِلْهُدٰى شَرِيْعَةً وَمِنْهَاجًا وَفَصْلُ خِطَابِهِ لِلْعُلٰى مِرْقَاةً وَ مِعْرَاجًا وَ فَضْلُ خِطَابِهِ لِلْبَلَاغَةِ اَنْشَاجًا وَ نَسِيْجًا وَحْدَهُ وَ لِلْفَصَاحَةِ نَسَّاجًا صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ عَلَيْهِمْ مَادَامَتْ سَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ وَ حُجُبٌ ذَاتُ اَرْتَاجٍ وَ لَيْلٌ دَاجٍ وَ بَحْرٌ سَاجٍ۔

اصحاب فصاحت کی آرزوؤں کے محور، علی اعلیٰ، امین، وصی وولی باتمکین پر، خداوند عالم انہیں ہماری طرف سے اس سے بہتر جزا دے جو عالمین میں سے کسی کو دیتا ہے، کیونکہ انہوں نے ہمارے لئے حق مبین کے راستے آسان کردیئے اور عرفان ویقین کی راہیں صاف طور پر بتادیں۔ ہمارے لئے اپنے اس کلام کے ذریعہ دین کی راہ پر چراغ روشن کئے جو نہایت ہی تعجب آور ہے، حتی کہ ان کی زبان کی بلاغت تاریکیوں میں چلنے والوں کیلئے منارہ نور ہے اور نیرنگ بیان ہدایت کیلئے واضح اور کھلا رستہ ہے، ان کا فصل خطاب بلندیوں کیلئے زینہ اور معراج ہے جس کی کتاب کی فضیلت بلاغت کی ہم نوا ہے اور بلاغت و فصاحت سب کو آراستہ کرنے والا اور بے مثال ولاثانی ہے، خدا کا درود و سلام ہو آپ پر بھی اور آپکی اولاد پر بھی، جب تک کہ برجوں والا آسمان، بڑے بڑے دروازوں والے حجاب، تاریک راتیں اور سمندر کی پرسکون موجیں باقی ہیں۔

بعد از حمد و صلوٰۃ یہ منہاج البراعہ شرح نہج البلاغہ کی پہلی جلد ہے جسے اپنے بے نیاز رب کی معافی کے امیدوار حبیب اللہ بن محمد بن ہاشم ہاشمی علوی موسوی نے تحریر کیا ہے، خدا اسے آرزوؤں میں کامیاب کرے اور قول و عمل کی اصلاح کی توفیق عطا کرے اور عقائد کی خرابی سے محفوظ رکھے اور مبدا و معاد کے بارے میں کجروی اور گمراہی سے بچائے رکھے۔ (آمین)۔

اس وقت ہم سب سے پہلے نہج البلاغہ کے دیباچے کی شرح کا آغاز کرتے ہیں اور اس کیلئے چند فصول مقرر کرتے ہیں، اور خداوند عالم کی توفیق کے ساتھ اس کا بیان شروع کرتے ہیں۔

(قول مترجم: دعا ہے کہ پروردگار عالم اس حقیر پر تقصیر کو بھی کتاب منہاج البراعہ کے ترجمہ کی توفیق عطا فرمائے اور اسے دنیا و آخرت میں صلاح و فلاح کا موجب قرار دے۔ آمین بحق محمدؐ و آلہ الطاہرین۔

الاحقر: محمد علی فاضل مدیر مسئول جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام راجن پور)

پہلی فصل

سید رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَمَّا بَعْدَ حَمْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ الْحَمْدَ ثَمَنًا لِنَعْمَآئِهٖ وَ مَعَاذًا مِنْ بَلَآئِهٖ وَ سَبِيْلاً اِلٰى جِنَانِهٖ وَ سَبَبًا لِزِيَادَةِ اِحْسَانِهٖ وَ الصَّلَاةُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ وَ اِمَامِ الْاَئِمَّةِ وَ سِرَاجِ الْاُمَّةِ الْمُنْتَجَبِ مِنْ طِيْنَةِ الْكَرَمِ وَ سُلَالَةِ الْمَجْدِ الْاَقْدَمِ وَمَغْرَسِ الْفِخَارِ الْمُعْرِقِ وَ فَرْعِ الْعَلَاءِ الْمُثْمِرِ الْمُوْرِقِ وَ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ مَصَابِيْحِ الظُّلَمِ وَ عِصَمِ الْاُمَمِ وَ مَنَارِ الدِّيْنِ الْوَاضِحَةِ وَ مَثَاقِيْلِ الْفَضْلِ الرَّاجِحَةِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ صَلَاةً تَكُوْنُ اِزَاءً لِفَضْلِهِمْ وَ مُكَافَاةً لِعَمَلِهِمْ وَ كِفَاءً لِطِيْبِ فَرْعِهِمْ وَاَصْلِهِمْ مَا اَنَارَ فَجْرٌ سَاطِعٌ وَ خَوٰى نَجْمٌ طَالِعٌ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و ستائش اس اللہ کیلئے ہے جس نے حمد کو اپنی نعمتوں کی قیمت، ابتلاؤں سے بچنے کا طریقہ، جنت کا وسیلہ اور اپنے احسانات کے بڑھانے کا سبب قرار دیا، درود ہو اس کے رسولؐ پر جو نبی رحمت پیشواؤں کا پیشوا، امت کا چراغ دودمان شرافت کا انتخاب، قدیم ترین بزرگوں کا نچوڑ، رگ و پے میں سمائے ہوئے فکر کی کھیتی، رفعت و بلندی کی برگ پوش و ثمر دار شاخ، آپؐ کے اہل بیتؑ پر رحمت ہو جو تاریکیوں کے چراغ، امت کیلئے سامان حفاظت، دین کے روشن مینار اور فضل و کمال کا بلند معیار ہیں، اللہ ان سب پر رحمت نازل کرے ایسی رحمت جو ان کے فضل و کمال کے شایان شان ان کے عمل و کردار کی جزا اور ان کی ذاتی خاندانی پاکیزگی کے ہم پلہ ہو جب تک صبح درخشاں لو دیتی رہے اور جگمگاتے ستارے ابھر کر ڈوبتے رہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے فضائل :

تشریح حضرت علامہ شریف رضی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب کا آغاز اللہ سبحانہ کے مقدس نام کے ساتھ فرمایا ہے کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے۔ سب سے پہلے فرماتے ہیں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور ہر چھوٹے بڑے کام کا آغاز اسی ہی نام سے کرنا چاہئے۔ چنانچہ کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ فرماتے ہیں : "بسم اللہ...... کو ترک نہ کرو خواہ اس کے بعد شعر ہی کیوں نہ ہو"

کتاب التوحید میں آپؑ ہی سے روایت ہے کہ : "شیعیان علیؑ میں سے جو بھی اسے ترک کرے گا اللہ تعالیٰ اسے کسی ناگوار چیز سے آزمائے گا تاکہ اسے شکر و ثناء کیلئے متنبہ کرے اور اسے اس کے ترک کرنے کی کوتاہی کی پاداش کی صورت میں اس نقص کی تلافی کرے"۔

تفسیر امام میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں: "اگر کسی معاملے کے آغاز میں ہمارے کسی شیعہ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا ترک کیا تو اللہ تعالیٰ اسے کسی ناگوار امر سے آزمائے گا تاکہ شکر خدا اور اس کی ثنا کیلئے متنبہ کرے اور اسے اس کے ترک کرنے کی کوتاہی کی پاداش کی صورت میں اس نقص کی تلافی کرے، چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ بن یحییٰ حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا آپ کے سامنے کرسی رکھی ہوئی تھی آپؑ نے اسے اس پر بیٹھنے کا حکم دیا وہ اس پر بیٹھا ہی تھا کہ کرسی ڈھلکی اور وہ سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے سر کی ہڈی پر چوٹ آگئی جس سے خون بہنے لگا۔ امیر المؤمنین علیہ السلام نے پانی منگوایا جس سے اس کا خون صاف کیا، پھر فرمایا "میرے نزدیک آؤ" وہ نزدیک آیا، آپؑ نے اس کے زخم کے مقام پر ہاتھ رکھا، درد اس کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ آپؑ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنا لعاب لگایا جس سے اس کا زخم مندمل ہو گیا، گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پھر امیر المؤمنینؑ نے فرمایا "عبداللہ! اس خدا کی حمد ہے جو ہمارے شیعوں کے گناہ اس دنیا میں ہی انہیں تکلیف دے کر مٹا دیتا ہے تاکہ ان کی اطاعت ان کیلئے صحیح سالم حالت میں بچی رہے اور وہ اس پر ثواب کے مستحق ہوں"۔ عبداللہ نے عرض کیا "یا امیر المؤمنین! تو کیا ہمیں اپنے گناہوں کی سزا اس دنیا ہی میں مل جاتی ہے؟" فرمایا: "ہاں! کیا تم نے حضرت رسول خداؐ کا یہ فرمان نہیں سنا کہ: دنیا مؤمن کیلئے قید خانہ اور کافر کیلئے جنت ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے شیعوں کے گناہوں کو اس دنیا میں آزمائش اور ابتلاء کے ساتھ پاک صاف کر دیتا ہے اور انہیں معاف کر دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَ يَعْفُوْ عَنْ كَثِيرٍ (شوریٰ / ۳۰) جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ خود تمہارے کئے ہوئے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ اللہ بہت سے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ تو جب بندہ مؤمن عرصہ محشر میں قدم رکھے گا تو اس کی نیکیوں اور عبادات میں کچھ بھی کم نہیں ہوگا"۔ عبداللہ نے کہا: "امیر المؤمنین! آپؑ نے مجھے تو بہت کچھ سمجھایا اور تعلیم دیا ہے، اگر آپؑ مناسب سمجھیں تو ازراہ کرم یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ میرا کونسا گناہ تھا کہ اس کی پاداش میں مجھے یہاں پر سزا ملی؟ تاکہ میں باز رہوں اور آئندہ ایسا نہ کروں!" فرمایا: "جب تم یہاں بیٹھنے لگے تھے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہیں پڑھا تو اللہ نے تمہاری اس بھول کی وجہ سے اس بات پر متنبہ کیا ہے اور تمہارے بسم اللہ نہ کہنے کے گناہ کا کفارہ اس صورت میں کر دیا ہے۔ آیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول خداؐ نے مجھ سے خداوند عالم کی طرف سے بیان کیا ہے کہ: ہر ذی شان امر جس میں بسم اللہ نہ کہی جائے وہ ابتر اور نامکمل ہوتا ہے"۔ عبداللہ نے کہا یقیناً ایسا ہی ہے میرے ماں باپ آپؑ پر قربان جائیں میں آئندہ اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا"۔ آپؑ نے فرمایا: "تو اس وقت تم بڑے ہی روسفید ہو گے اور خدا کا قرب حاصل کر پاؤ گے"۔ پھر عبداللہ نے پوچھا: "یا امیر المؤمنینؑ! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی کیا تفسیر ہے؟" فرمایا: "جب بندہ اسے پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے یا کوئی عمل بجا لاتا ہے اور بسم اللہ کہتا ہے تو گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں اس کے نام کے ساتھ یہ عمل بجا لا رہا ہوں تو جو بھی عمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ شروع کیا جائے وہ مبارک ہوتا ہے"۔

اسی کتاب میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام، حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے اپنے بھائی سے انہوں نے امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ: ایک شخص علی علیہ السلام کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا: "یا علیؑ! آپ ہمیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بارے میں بتائیے کہ اس کا کیا معنی ہے؟" اس پر حضرتؑ نے

ارشاد فرمایا: "اللہ" خداوند تعالی کے تمام اسماء میں سے اسم اعظم ہے اور وہ ایسا نام ہے جس کے ساتھ کسی اور کو موسوم نہیں کر سکتے اور نہ ہی مخلوق میں سے کوئی شخص اس نام کا سزاوار ہے۔ اس شخص نے کہا: "اللہ" کی کیا تفسیر ہے؟" فرمایا: "اللہ" وہ ذات ہے کہ جس کی طرف مشکلات و مصائب میں تمام مخلوق رجوع کرتی ہے اور جب ہر ایک سے امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں تو صرف اسی سے ہی وابستہ کر لی جاتی ہیں، جب ہر قسم کے اسباب منقطع ہو جاتے ہیں تو وہی ذات باقی رہ جاتی ہے کہ اس کا سہارا لیا جائے وہ یوں کہ اس دنیا میں ہر بڑا بننے والا ریاست کا مالک خواہ وہ جس قدر بھی بڑا بن جائے اور اس کی تونگری و بے نیازی اور طغیانی و سرکشی جس قدر بھی عروج کو پہنچ جائے، دنیا کے لوگ جس قدر بھی اس کے پاس اپنی حاجات لے کر جائیں پھر بھی ان لوگوں کی حاجات اور مشکلات کا حتی کہ اپنی حاجات اور مشکلات کا ازالہ نہیں کر سکتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور احتیاج کے وقت ساری کائنات سے کٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی سے اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کی درخواست کرتا ہے، لیکن جب اس کی حاجت، روا اور مشکل، آسان ہو جاتی ہے تو پھر اپنے اسی مشرکانہ انداز کو اپنا لیتا ہے۔ کیا تم نے خدا کا یہ فرمان نہیں سنا کہ فرماتا ہے: "قُلْ اَرَئَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰیکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ اَغَیْرَ اللّٰہِ تَدْعُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَاءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِکُوْنَ" (سورہ انعام / ۳۹۔۴۰) کہہ دو کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے اگر خدا کا عذاب تم پر نازل ہو جائے یا قیامت آجائے تو کیا تم اپنی مشکلات کے حل کیلئے خدا کے سوا کسی اور کو بلاؤ گے اگر تم سچے ہو؟ نہیں! بلکہ تم صرف اسی کو بلاؤ گے اور اگر وہ چاہے گا تو اس مشکل کو جس کیلئے تم نے اسے بلایا ہے برطرف کر دے گا اور جسے تم آج خدا کا شریک قرار دیتے ہو اسے اس دن بھول جاؤ گے۔

تو خداوند تعالی اپنے بندوں سے کہتا ہے: "اے میری رحمت کے حاجت مندو! میں نے تم پر لازم قرار دے دیا ہے کہ ہر حاجت اور ضرورت کے موقع پر مجھ ہی سے مانگو اور میری ہی طرف رجوع کرو اور ہر وقت تمہارے اوپر اپنی عبودیت کی ذلت لازم قرار دے دی ہے۔ لہذا جب بھی تمہیں کوئی حاجت اور ضرورت در پیش ہو تو میری بارگاہ ہی میں گڑ گڑاؤ! اور اسے پورا ہونے کیلئے میری ہی ذات ہی سے امیدیں وابستہ رکھو کیونکہ اگر میں تمہیں دینا چاہوں تو دنیا کی کوئی بھی طاقت تم سے روک نہیں سکتی اور اگر میں روکنا چاہوں تو کائنات کا کوئی بھی فرد نہیں دے سکتا۔ لہذا تم ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہا کرو، جس کا مقصد اور مطلب یہ ہے کہ تم یہ کہہ رہے ہوتے ہو کہ میں اس معاملے میں اس خدا سے مدد طلب کر رہا ہوں جس کے علاوہ کوئی بھی لائق عبادت نہیں جب اس سے مدد مانگی جاتی ہے تو مدد کرتا ہے جب دعا مانگی جاتی ہے تو قبول کرتا۔ وہ ایسی رحمت کا مالک ہے جو ہم پر اپنا رزق عام کر کے رحم کرتا ہے۔ اور ایسا رحیم ہے جو ہمارے دین، دنیا و آخرت کے بارے میں رحمت کرتا ہے، اس نے ہمارے لئے دین کو آسان بنایا ہے اور اسے سہل اور خفیف قرار دیا ہے، وہ ہمارے دشمنوں کو چھوڑ کر ہم پر خصوصی رحم و کرم فرمائے گا۔ اور پھر رسول خدا کا بھی فرمان ہے کہ: "جس شخص کو غم واندوہ نے گھیر لیا ہو اور وہ خلوص دل کے ساتھ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کہے اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو تو اسے یقیناً دو چیزوں میں سے ایک ضرور ملے گی، یا تو اس کی دنیوی حاجت پوری ہو گی یا پھر یہ چیز خدا کے پاس ذخیرہ کر لی جائے گی اور جو چیز خدا کے پاس ہوتی ہے وہ مؤمنین کیلئے بہتر اور پائیدار ہوتی ہے"۔

حمد باری تعالی کے فضائل :

سید رضی علیہ الرحمہ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز حمد باری تعالی سے کیا ہے۔ کیونکہ حمد کے بارے میں بہت سی روایات میں تاکید کی گئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا بھی فرمان ہے جو فریقین کے درمیان مسلم ہے کہ ہر کام کا آغاز حمد باری تعالی سے کیا جائے۔ اسی لئے سید رضی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے (اَمَّا بَعْدَ حَمْدِ اللّٰہِ) یعنی خداوند سبحانہ کی عظمت و ثناء کے بعد، اور حمد کا تحقیقی معنی اور حمد، مدح اور شکر کے درمیان فرق کے بارے میں تفصیلی گفتگو انشاء اللہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے پہلے خطبہ کی پہلی فصل میں ہو گی۔

چونکہ حمد افضل اطاعت، احسن عبادت اور کامل ترین ذریعہ قربت ہے جس کے بے شمار ثمرات حاصل ہوتے ہیں اسی لئے مصنف نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے (اَلَّذِیْ جَعَلَ الْحَمْدَ ثَمَنًا لِنَعْمَائِہٖ) یہاں پر موصول کو لانا اور پھر اس کے بعد کئی معطوف جملوں کو ذکر کرنا حمد کی عظمت اور شرف کی طرف اشارہ اور اس کی جلالت قدر سے آگاہ کرتا ہے۔ اور مصنف کا "ثَمَنًا لِنَعْمَائِہٖ" کہنا ایک لطیف استعارہ ہے۔

شارح بحرانیؒ کہتے ہیں کہ "وجہ مشابہت یہ ہے کہ ثمن (قیمت) چونکہ بائع (بیچنے والے) کی رضامندی کیلئے لازم ہوتی ہے، اس بیچی ہوئی چیز کے عوض میں۔ اسی طرح حمد بھی رضائے حق سبحانہ کیلئے لازم ہوتی ہے، اس کی نعمتوں کے بدلے میں۔ اسی لئے ضروری ہو گیا کہ اسے ثمن کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور اسے اس کیلئے استعارہ کے طور پر استعمال کیا جائے"۔ ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے: بندہ حمد کے ذریعہ خداوند سبحانہ کی طرف سے فیوض و نعمات کا مستحق قرار پاتا ہے اور خداوند عالم کی طرف سے اس کی قبولیت کا شرف حاصل کرتا ہے جس طرح کہ خریدار قیمت ادا کر کے بیچنے والے سے بیچی ہوئی چیز کا حق دار بن جاتا ہے اور یہی چیز ان دونوں کے درمیان جامع ہے۔ تاکہ وہ جس کا ذکر دوسرے لوگوں نے اوپر کیا ہے۔ کیونکہ استعارہ میں وجہ شبہ کا اظہار ہونا ضروری ہوتا ہے اور یہ کہ یہ مشبہ بہ کے اظہر خواص میں سے ہے، اسی چیز کو میں نے بیان کیا ہے۔

حمد نعمت کے استحقاق کا سبب کیسے بنتی ہے؟ اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس پر قرآن مجید دلالت کر رہا ہے اور ساتھ ہی ایک سے زیادہ اخبار و احادیث بھی اس پر دال ہیں۔ جن میں ایک روایت وہ ہے جو کتاب عیون اخبار الرضا میں محمد بن قاسم کے توسط کے ساتھ امیر المؤمنینؑ سے اور آپؑ رسول خداؐ سے اور آنحضرتؐ خداوند عالم سے بیان کرتے ہیں کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "میں نے سورہ فاتحۃ الکتاب (حمد) کو اپنے اور بندے کے درمیان میں تقسیم کر دیا ہے جس کا نصف میرے لئے اور نصف بندے کیلئے ہے۔ اور بندہ جو مانگتا ہے اسے ملتا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میرے نام سے ابتدا کی ہے۔ اور مجھ پر یہ حق بنتا ہے کہ میں اس کے تمام امور کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں اور اس کے معاملات میں برکت عطا کروں۔ اور جب کہتا ہے "الحمد للہ رب العالمین" تو رب کہتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی ہے اور یقین سے کہہ رہا ہے کہ اسے ملنے والی نعمتیں میری طرف سے ہیں اور اس سے دور ہونے والی بلائیں میرے فضل و احسان سے ہیں۔ میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں اس کیلئے دنیوی نعمتوں

کے ساتھ اخروی نعمتوں کا بھی اضافہ کر رہا ہوں اور جس طرح اس سے دنیوی بلائیں دور کی ہیں آخرت کی بلائیں بھی اسی طرح دور کروں گا.........." حدیث کے آخر تک۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ حمد نعمتوں کے فیضان کا سبب بنتی ہے جس طرح کہ اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ وہ بلاؤں کے دور ہونے کا موجب ہوتی ہے۔ اور سید علیہ الرحمہ نے بھی اسی بات کی طرف اس قول کے ساتھ اشارہ کیا ہے (وَ مَعَاذاً مِنْ بَلَائِهِ) یہ بات معلوم ہے کہ نعمت اور نقمت (عذاب)، منحت (بخشش) اور محنت (مشقت) اسی طرح متضاد ہیں جس طرح شکران نعمت اور کفران نعمت! تو جب کفران نعمت عذاب، ابتلاء، اور مشقتوں کا سبب ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے "وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ" (سورہ ابراہیم / ۷) اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔ اسی طرح شکر اور ثنائے پروردگار ان مصیبتوں سے بچاؤ کا سبب اور پناہ کی حیثیت میں ہوتے ہیں اور یہ ایک واضح سی بات ہے۔

دعا کی فضیلت:

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے جو گزشتہ دونوں وجوہات سے زیادہ لطیف ہے وہ یہ ہے کہ: جب بندہ کہتا ہے "الحمد للہ" تو وہ نمازیوں کی دعا میں شامل ہو جاتا ہے اور دعا، بلاؤں اور مصیبتوں سے ڈھال ہوتی ہے اور مؤمن کیلئے دشمن کے مقابلہ میں زرہ کا کام دیتی ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ نمازیوں کی دعا میں شمولیت کیونکر ہوتی ہے؟ تو اس بارے میں اس حدیث کی طرف توجہ فرمائیے جسے کافی میں محمد بن یحییٰ سے اسناد کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے مفضل کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپؑ پر قربان جاؤں! مجھے کوئی جامع دعا تعلیم فرمایئے گا" تو امامؑ نے فرمایا "خدا کی حمد کیا کرو کیونکہ اس طرح سے ہر نمازی تمہارے لئے دعا کرے گا، کیونکہ وہ نماز میں کہتا ہے "سمع اللہ لمن حمدہ"۔

رہی یہ بات کہ "دعا بلاؤں کو دور کرتی ہے تو اس بارے میں سن لیجئے! یہ روایت بھی محمد بن یحییٰ ہی سے کافی میں منقول ہے وہ اسناد کے ساتھ امام موسی کاظم علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں انکی اولاد کہتے ہیں کہ حضرت موسی کاظم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں "تمہیں دعا مانگنی چاہئے کیونکہ خدا سے دعا اور اس سے درخواست ان بلاؤں کو دور کر دیتی ہے جو قضا و قدر میں مقرر ہو چکی ہوتی ہے اور ان کا صرف اجرا باقی ہوتا ہے۔ جب بندہ دعا مانگتا ہے تو وہ دور کر دی جاتی ہے"۔ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک اور روایت ہے کہ حضرت رسول پاکؐ نے فرمایا۔ "دعا مومن کا ہتھیار دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔ انہی اسناد کے ساتھ حضرت امیر المو منین علیہ السلام سے روایت ہے "دعا نجات کی چابی اور کامیابی کی کنجی ہے اور بہترین دعا وہ ہے جو صاف ستھرے سینے اور پاک و پاکیزہ دل سے نکلے اور مناجات میں نجات کا سبب ہے۔ اخلاص کے ذریعہ خلاصی ملتی ہے پس جب پریشانی شدت اختیار کر جائے تو خدا کے حضور پناہ اختیار کی جائے"۔ ان روایات اور ان سے ملتی جلتی دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعا کا ثمرہ اگرچہ دعا مانگنے والے ہی کو ملتا ہے لیکن اس میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ مطلق کو مقید کر دیا جائے اور مطلق کو اطلاق سے روک دے۔ یعنی اس کا فائدہ عمومی بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دعا کے کئی ایسے اور ثمرات ہوتے ہیں جو ان لوگوں کو بھی ملتے ہیں جن کے لئے دعا مانگی جائے خواہ کوئی اپنے لئے

مانگے یا اپنے کسی مومن بھائی کے لئے۔ بلکہ کسی کا اپنے مومن بھائی کے لئے اس کے پس پشت دعا مانگنا قبولیت کے زیادہ نزدیک اور جلد اجابت کا موجب ہوتا ہے۔ اور اخبار اہل بیت علیہم السلام سے بھی یہی چیز ثابت ہوتی ہے۔

مصنف علیہ الرحمہ نے (وَ وَسِيْلاً اِلىٰ جِنَانِهِ) کہہ کر اسے سابقہ جملے پر عطف کیا ہے اس کی حیثیت "عطف الخاص علی العام" کی ہے گویا اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا گیا ہے، جیسا کہ اس کی مثال قرآن مجید میں ہے: "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ" (سورہ بقرہ / ۱۸۹) لوگ آپؐ سے مہینے میں چاند کی مختلف صورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہیئے کہ یہ تقسیم اوقات اور طبعی تقویم کا مظہر ہیں نیز یہ لوگوں کے نظام زندگی کیلئے اور حج کے وقت کے تعین کیلئے ہیں۔ وہ یوں کہ حمد اگر نعمت کی قیمت ہے تو یقیناً جنت کا سبب بھی ہے، کیونکہ بہشت عظیم ترین نعمت اور اعلیٰ ترین بخشش ہے اس کے علاوہ دوسری تمام نعمتیں ہیچ ہیں اور اس کے مقابلے میں ہر عطیہ کم قیمت ہے۔ کیونکہ حمد، اللہ کے نزدیک افضل ترین عبادت اور محبوب ترین عمل ہے اور کافی کی روایت اسی بات پر اشارہ کرتی ہے، کافی میں محمد بن مروان سے اسناد کے ساتھ منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا کہ: "اللہ کو کونسا عمل زیادہ محبوب ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا: "خدا کی حمد کیا کرو" گویا حمد عبادت ہوئی اور عبادت جنت کا وسیلہ ہوتی ہے۔ (اور) یہ کہ وہ (سَبَبًا لِزِيَادَةِ اِحْسَانِهِ) اس کے احسان اور نعمتوں کے اضافے کا سبب کیونکر ہوتی ہے؟ تو اس بارے میں بھی قرآن کہتا ہے "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ" (سورہ ابراہیم / ۷) اگر شکر گزاری کرو گے تو تم پر نعمت کا اضافہ کر دوں گا۔

پیغمبرؐ پر صلوات:

پھر سید علیہ الرحمہ نے حمد کے ساتھ ہی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و صلوات کا ذکر کیا ہے، ایک تو آداب شرعیہ کے تحت، دوسرے دینی رسومات کے پیش نظر کہ جس کا سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے اور تیسرے باب خطابہ میں عادت متشرعہ کا احترام کرتے ہوئے۔ لہذا انہوں نے فرمایا (وَ الصَّلٰوةُ عَلىٰ رَسُوْلِهِ) صلوٰۃ کے معنی، کیفیت، فضیلت اور اس سے متعلق دوسرے کئی امور تحقیق کے ساتھ انشاء اللہ العزیز خطبہ ۷۱ کی شرح میں بیان ہوں گے۔ جیسا کہ رسول کا تحقیقی معنی اور نبی اور رسول میں فرق، انشاء اللہ خطبہ اول کی پندرھویں فصل میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا۔

یہاں پر سید علیہ الرحمہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سات اوصاف بیان فرمائے ہیں:۔

۱۔ آپؐ (نَبِيُّ الرَّحْمَةِ) ہیں، یعنی آپؐ اللہ کی طرف سے اس کی مخلوق پر نبی رحمت ہیں۔ اور یہ مخلوق پر خدا کا احسان ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ" (سورہ انبیاء / ۱۰۷) اے رسولؐ ہم نے تجھے عالمین کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں "رحمت" سے مراد "نعمت" ہے۔ یعنی آپؐ عالمین کیلئے نعمت ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیک اور بدکار، مؤمن اور کافر سب کیلئے رحمت ہیں۔ مؤمن کیلئے تو دنیا و آخرت میں رحمت ہیں لیکن کافر کیلئے اس لئے رحمت ہیں کہ وہ اس دنیا میں مسخ و خسف جیسے عذابوں سے محفوظ ہے۔ جبکہ سابقہ امتوں کے کفار یا تو

مسخ ہو جایا کرتے تھے یا پھر کسی اور عذاب کی لپیٹ میں آجایا کرتے تھے"۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سرکار رسالتؐ نے حضرت جبرائیل امین سے پوچھا کہ "تمہیں بھی اس رحمت سے کوئی حصہ ملا ہے؟" انہوں نے کہا "جی ہاں! میں پہلے تو اپنے انجام سے خائف تھا کہ میری عاقبت کیسی ہو گی! لیکن آپؐ کی وجہ سے اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے میری ان الفاظ کے ساتھ تعریف فرمائی ہے: 'ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِيْ الْعَرْشِ مَكِيْنٍ' (سورہ تکویر / ۲۰) جو صاحب قوت ہے اور صاحب عرش اللہ کے ہاں بلند مقام کا حامل ہے۔ آپؐ کے رحمت ہونے کی ایک اور صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ آپؐ کی ذات بابرکات کی وجہ سے امت سے عذاب اٹھالیا گیا ہے، جیسا کہ خداوند جل شانہ فرماتا ہے "وَ مَاكَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ......" (سورہ انفال / ۳۳) جب تک تم (اے پیغمبرؐ) ان کے درمیان ہو اللہ ان پر عذاب نہیں بھیجے گا۔ آپؐ کے رحمت ہونے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ آپؐ علت غائیہ ممکنات یا سبب وجود عالم ہیں۔ اور عالم میں موجود ہر قسم کی نعمتوں کا واسطہ اور وسیلہ ہیں خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، ظاہری ہوں یا باطنی، اصولی ہوں یا فروعی، دنیوی ہوں یا اخروی۔ اس کی تحقیق و تفصیل انشاء اللہ العزیز دوسرے خطبہ کی پانچویں فصل کی تشریح میں آئے گی۔ یہاں پر بطور خلاصہ یہ سمجھ لیجئے کہ آنحضرتؐ اور آپؐ کی طیب و طاہر اور پاک اولاد (ان سب پر اللہ کا درود و سلام ہو) اولیائے نعمت، رحمت کی بنیادیں، نازل ہونے والی بھلائیوں، نیکیوں اور اچھائیوں کے اسباب اور مسلسل ملنے والے فیوضات کے واسطہ اور وسیلہ ہیں۔

۲۔ آپؐ (اِمَامُ الْاَئِمَّةِ) ہیں، یعنی آپؐ ایسے مقتدا، پیشوا، رہنما اور امام ہیں کہ دنیا کے امام آپؐ کی اتباع کرتے ہیں، آپؐ کے افعال کی پیروی کرتے ہیں۔ یہاں پر "ائمہ" سے مراد یا تو تمام وہ لوگ ہیں جن کی اقتدا اور اتباع کی جاتی ہے، یعنی سردار اور رئیس لوگ یا خصوصی طور پر انبیاء ہیں کیونکہ تمام لوگوں سے زیادہ امامت اور ریاست کے حقدار انبیاء ہی ہیں، یا پھر اصطلاحی طور پر امامت کے حقدار یعنی ائمہ اثنا عشر علیہم السلام ہیں۔ مراد خواہ کوئی بھی معنی ہو، آنحضرتؐ سب کے امام، ولی اور مقتدا ہیں۔ اس لئے کہ آپؐ شمس فلک رسالت و ولایت ہیں اور آپؐ کی ذریت سے ائمہ علیہم السلام بمنزلۂ چاند ہیں۔ قارئین کرام کو آئندہ چل کر معلوم ہو گا کہ ہم خطبہ اول کی چودھویں اور سولہویں فصل میں تفصیل اور تحقیق کے ساتھ یہ بات ثابت کریں گے کہ اس بات کا میثاق تمام انبیاء بلکہ تمام خلق خدا سے لیا گیا۔ البتہ یہاں پر اس بات کی طرف تھوڑا سا اشارہ کیا جاتا ہے۔

بحار الانوار میں روایت ہے کہ راوی کہتا ہے: "میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ جمعہ کو جمعہ کیوں کہتے ہیں؟" تو امامؑ نے جواباً فرمایا: "کیونکہ اللہ نے اس روز تمام مخلوق کو محمدؐ و اہل بیت محمدؐ کی ولایت کیلئے جمع فرمایا"۔ تفسیر عیاشی میں ہے ابی عبداللہ حلبی امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: "مَاكَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا" کہ ابراہیم نہ تو یہودی تھے کہ مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، نہ ہی نصرانی تھے کہ شرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے، "وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا" بلکہ محمد مصطفیٰؐ والے دین پر تھے۔ (سورہ آل عمران / ۶۷)

۳۔ آپؐ (سِرَاجُ الْاُمَّةِ) ہیں۔ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا" (سورہ احزاب / ۴۵-۴۶) اے پیغمبرؐ! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا

اور انذار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور تجھے اللہ کے حکم سے اسی کی طرف دعوت دینے اور روشنی عطا کرنے والا چراغ بنایا ہے۔ آنحضرتؐ کیلئے لفظ "سراج" (چراغ) اس بات کا استعارہ ہے کہ چونکہ امت، ضلالت و جہالت کی تاریکیوں میں آپؐ کی ذات سے اسی طرح ہدایت حاصل کرتی ہے جس طرح رات کی تاریکی میں چراغ کی روشنی کے ساتھ رستہ کیلئے رہنمائی ہوتی ہے۔

۴۔ آپؐ (الْمُنْتَخَبُ مِنْ طِيْنَةِ الْكَرَم) ہیں یعنی شرافت کی منتخب طینت یابالفاظ دیگر عزت و شرف کی اصل سے برگزیدہ اور کرامت و تخلیق کی جبلت سے منتخب کئے گئے ہیں۔

۵۔ آپؐ (سُلَالَةُ الْمَجْدِ الْاَقْدَم) یعنی قدیم ترین بزرگی کی نسل سے برگزیدہ ہیں، اس کی تشریح شارح بحرانیؒ یوں فرماتے ہیں کی لفظ "سُلالۃ" کو "المجد" کی طرف اس بنا پر مضاف کیا گیا ہے کہ یا تو اس میں ایک اور مضاف کو مقدر مانا گیا ہے یعنی "سُلالة اهل المجد" یا پھر لفظ "المجد" پیغمبرؐ کی اصل کیلئے استعارہ لیا گیا ہے۔ گویا یہ خیال کیا گیا ہے کہ آپؐ کی اصل مکمل مجد ہے۔ اس لئے استعارہ کے بعد لفظ مجد کو مضاف الیہ بنایا گیا ہے۔

اگر دوسری صورت مراد لی جائے تو لفظ "مجد"، "استعارہ بالکنایہ" ہوگا اور ایسے انسانی شخص کے ساتھ تشبیہ کی گئی ہے جس کا سلالہ اور نسل ہوتی ہے اور سلالہ کا اثبات تخییلی ہوگا پھر "المجد" کی صفت "الاقدم" بیان کی گئی ہے۔ اس لئے کہ مجد اقدم، مجد حادث سے افضل ہے۔

۶۔ آپؐ (مَغْرِسُ الْفِخَارِ الْمُعْرِقِ) یعنی رگ و پے میں سمائے ہوئے فخر کی کھیتی ہیں۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ مختلف انداز میں مایۂ ناز شخصیت اور افتخار کی شاخوں کی بنیاد ہیں۔ تو اس اثبات اور ظہور کو زمین میں لگائے گئے درخت کے ثبات واستحکام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ لہذا لفظ "غرس" کو ثبات کیلئے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے اور اس کی جامع وجہ استحکام ہے۔ اور "مغرس" درخت کے لگائے جانے کی جگہ کو "استعارہ تبعیہ" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے اور "فخار" کو "معرق" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے جو اس جانب متوجہ کر رہا ہے کہ اس میں کمال کا استحکام پایا جاتا ہے۔

۷۔ آپؐ (فَرْعُ الْعَلَاءِ الْمُثْمِرِ الْمُوْرِقِ) ہیں۔ رفعت وبلندی کی ثمر آور اور برگ سے آراستہ شاخ ہیں۔ درخت کی فرع سے مراد اس کی شاخ ہے جو آنحضرتؐ کیلئے بطور استعارہ مراد لی گئی ہے۔ اس لئے کہ آپؐ شجر رسالت کی شاخ اور اس کا شعبہ ہیں۔ یہاں پر "استعارہ اصلیہ" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر شاخ کو مُثمر (ثمر آور) اور مُورِق (برگ پوش) کہا گیا ہے، کیونکہ جو شاخ برگ وبار سے خالی ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، وہ حسن وطراوت سے بھی خالی ہوتی ہے۔ لہذا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ "عَلاء" (بلندی) سے مراد رسالت اور نبوت ہے۔ البتہ یہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد آپؐ کے آباؤ اجداد ہوں جو شرف اور بلندی کے ساتھ موصوف و معروف ہیں اور ان میں اس حد تک بلندی پائی جاتی ہے کہ وہ بذات خود بلندی ور فعت قرار پاگئے ہیں۔ جس طرح کہ "زَيْدٌ عَدْلٌ" کی مشہور مثال ہے۔ رہا شارح بحرانیؒ کا یہ احتمال کہ اس جملے میں لفظ "اہل" مقدر ہے جو مضاف ہے یعنی "فَرْعُ اَهْلِ الْعَلَاءِ" ہے جیسا کہ "سُلَالَةِ الْمَجْدِ" میں بیان ہو چکا ہے، تو یہ ایک کمزور احتمال ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم کلام کو نچلی اور عوامی سطح پر لے آئیں جس کا نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ ہی ذوق سلیم اسے تسلیم کرنے کو تیار ہے۔

اس کی مزید تفصیل انشاءاللہ خطبہ ۹۳ کی تشریح میں آئے گی۔

چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ان کی آل پر درود و سلام نہ بھیجنا ظلم اور جفا ہے، نیز صلوات بھی ابتر اور ناقص ہوتی ہے۔ جیسا کہ کافی کی روایت ہے: ابن قداح کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: میرے والد گرامی نے ایک شخص کو خانہ کعبہ کا دروازہ پکڑے یہ کہتے سنا "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ" تو انہوں نے فرمایا: بندہ خدا! صلوات کو ابتر اور ناقص نہ کرو اور نہ ہی ہمارے حق میں ظلم کرو، بلکہ یہ کہو: "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ اَھْلِ بَیْتِہٖ"۔

اسی بنا پر سید علیہ الرحمہ نے پیغمبرؐ پر درود و صلواۃ کے بعد کہا ہے (وَ عَلیٰ اَھْلِ بَیْتِہٖ) اور آپؐ کے اہل بیتؑ پر بھی، کہ جن سے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی پلیدی کو دور کر رکھا اور انہیں مکمل طور پر پاک و پاکیزہ کیا، اہل بیتؑ وہی اہل کساء ہی ہیں یعنی علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ علیہم السلام اور ان کے بعد مذہب حقہ کے اجماع کے مطابق نو معصوم امام بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ یعنی پنجتن پاک کے ساتھ نو ائمہ اطہار کہ مجموعی طور پر چودہ معصوم بنتے ہیں۔

کشف الغمہ میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن پیغمبر خداؐ ہمارے پاس تشریف فرما تھے کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام تشریف لے آئیں اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک ہنڈیا تھی جس میں گھی سے خمیر کیا ہوا خشک آٹا تھا۔ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا کہ علیؑ اور ان کے دونوں بیٹے کہاں ہیں؟ فاطمہ زہراؑ نے کہا: "گھر میں ہیں!" فرمایا: "انہیں بلالاؤ!" جب سب آگئے تو حضورؐ نے خیبر سے آئی ہوئی چادر اپنے اوپر لے لی اور علیؑ، فاطمہؑ اور حسنین علیہم السلام کو بھی اپنے پاس چادر میں لے لیا، پھر کہا: "اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰؤُلَاۗءِ اَھْلُ بَیْتِیْ وَ اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَیَّ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَ طَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا" خدایا! یہی میرے اہل بیتؑ ہیں اور تمام مخلوق سے زیادہ مجھے پیارے ہیں، تو ان سے ہر قسم کی پلیدی کو دور کر دے اور انہیں مکمل طور پر پاک و پاکیزہ قرار دے۔ پیغمبرؐ کا دعا مانگنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ ...." ایک اور روایت کے مطابق صاحب کشف الغمہ لکھتے ہیں کہ بی بی ام سلمہؓ نے عرض کیا: "یارسول اللہ! آیا میں آپؐ کے اہل بیتؑ سے نہیں ہوں؟" آپؐ نے فرمایا: "تم خیر پر ہو" یا "تم خیر کی طرف ہو"۔

اسی لئے سید علیہ الرحمہ نے صلوات میں اہل بیتؑ کا ذکر کیا ہے اور ان کی چار اوصاف بیان کئے ہیں:۔

ا۔(مَصَابِیْحِ الظُّلَمِ) اندھیروں میں چراغ ہیں۔ اہل بیتؑ کیلئے مصابیح کا استعارہ استعمال کیا ہے اس لئے کہ خلق خدا جہالت کی تاریکیوں میں ان سے ویسی ہی ہدایت پاتی ہے جس طرح رات کی تاریکی میں چراغ سے راستہ تلاش کیا جاتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل انشاءاللہ چوتھے خطبہ کی پہلی فصل کی تشریح میں آئے گی۔

۲۔وہ (عِصَمِ الْاُمَمِ) امت کیلئے سامان حفاظت ہیں یعنی امت کو اپنی ہدایت کے سبب ہلاکتوں میں پڑنے سے بچائے رکھتے ہیں۔ کیونکہ جو انہیں چھوڑ دیتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

۳۔وہ (مَنَارُ الدِّیْنِ الْوَاضِحَۃِ) دین کے روشن مینار ہیں۔ کیونکہ ان کے انوار سے دین کے احکام اخذ کئے

جاتے ہیں اور ان کے آثار سے دین مبین حق کی راہوں پر چلا جاتا ہے، اور ان کی ہدایت کی وجہ سے سید المرسلینؐ کی شریعت مطہرہ کی راہوں کو اختیار کیا جاتا ہے۔

۴۔وہ (مَثَاقِيْلُ الْفَضْلِ الرَّاجِحَةِ) فضل و کمال کا بلند معیار ہیں۔ اگر "مثاقیل" کا معنی "موازین" (وزن کا آلہ) لیا جائے تو مراد یہ ہو گی کہ اہل بیت اطہارؑ مخلوق کے فضل و کمال کا آلہ وزن یعنی معیار، مدار اور کسوٹی ہیں، گویا انہی کے ذریعہ صاحبان فضل کی فضیلت کی پہچان ہوتی ہے اور انہیں دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اہل بیتؑ کی محبت وولایت سے مخلوق، سعادت اور نیک بختی کی منزلوں پر فائز ہوتی ہے اور ان سے بغض اور دشمنی کی وجہ سے ہلاک اور تباہ و برباد ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے:

"قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَائِهِ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلاَ نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا" (سورہ کہف / ۱۰۳تا ۱۰۵) کہہ دو کیا ہم تمہیں خبر دیں کہ زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں وہ لوگ کہ جن کی ساری کوششیں دنیوی زندگی میں بھٹک کررہ گئی ہیں اور اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے آیات ربانی اور اللہ کی ملاقات کا انکار کیا ہے۔ اسی بنا پر ان کے سارے اعمال اکارت ہو گئے ہیں، لہٰذا قیامت کے دن ہم ان کیلئے میزان حساب قائم نہیں کریں گے۔

صافی میں کتاب عیون اخبار الرضا سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے مامون کو جو خط تحریر فرمایا اس میں لکھا کہ: "خوش فہمی میں مبتلا ہونے والوں (ابو موسیٰ اشعری اور اس کے پیروکاروں) سے برائت واجب ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیوی زندگی میں ہی اکارت گئی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات یعنی ولایت امیر المؤمنین علیہ السلام اور خدا کے حضور پیش ہونے کو جھٹلایا کہ بغیر ان کی امامت کے اللہ کے حضور پیش ہوں گے ایسے لوگوں کے اعمال حبط و ضائع جائیں گے (خدا فرماتا ہے کہ) ہم ان کیلئے قیامت کے دن میزان قائم نہیں کریں گے، یہی لوگ جہنم کیلئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لاَ يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلاَلُ الْبَعِيْدُ" (سورہ ابراہیم / ۱۸) جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا، ان لوگوں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں جسے ایک طوفانی دن میں تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے تو ان میں یہ طاقت نہیں کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے وہ اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور یہ دور کی گمراہی ہے۔

بحار الانوار میں تفسیر علی بن ابراہیم سے روایت کی گئی ہے کہ "جو شخص امیر المؤمنین علیہ السلام کی ولایت کا اقرار نہیں کرتا، اس کے اعمال راکھ کی مانند ہوتے ہیں جسے ہوا اڑا کر لے جاتی ہے"۔ بحار الانوار ہی میں کتاب اعلام الدین دیلمی سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے علی بن ابی طالب علیہ السلام سے فرمایا: "اپنے شیعوں اور محبت کرنے والوں کو دس خوبیوں کی خوشخبری سنادو: ۱۔ ان کی ولادت پاکیزہ ہوتی ہے ۲۔ ان کا ایمان صحیح ہوتا ہے ۳۔ ان سے خدا محبت کرتا ہے ۴۔ ان کی قبر میں وسعت پیدا ہو گی ۵۔ (قیامت کے دن) ان کا نور ان کے آگے آگے ہو گا ۶۔ فقر و غربت ان کی آنکھوں سے دور کر دی جاتی ہے اور ان کے دل غنی ہوتے ہیں ۷۔ خدا ان کے دشمنوں پر ناراض ہوتا ہے ۸۔ برص اور جذام سے محفوظ رہتے ہیں ۹۔ ان کے گناہ اور برائیاں جھڑ

جاتی ہیں ۱۰۔ بہشت میں وہ میرے ساتھ ہوں گے اور میں ان کے ساتھ ہوں گا۔ پس ان کیلئے نوید مسرت اور بہترین رہائش گاہ ہے۔

اگر "مثاقیل" سے مراد اس کا وسیع معنی یعنی خود وزن شدہ ہو، جیسا کہ شارح بحرانیؒ نے اس کا احتمال دیا ہے تو پھر اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس سے مراد خود اہل بیتؑ ہیں جو راجح فضیلت کے مالک اور خدا کی تمام مخلوق سے افضل ہیں، اور اس میں شک بھی نہیں ہے اور متواتر احادیث واخبار بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے اور اس معنی کے درمیان کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ پہلے معنی میں ان کے ساتھ محبت اور ولایت کی وجہ سے فضیلت ان کے شیعوں کیلئے ثابت ہوتی ہے جبکہ اس معنی کے لحاظ سے خود ان کے اپنے لئے ثابت ہوتی ہے۔(صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ)خدا ان سب پر رحمت نازل کرے، یہ جملہ سابقہ جملے کی تاکید اور اس بات کی تمہید ہے کہ وہ درود وسلام اور رحمت کے تین وجوہات کی بنا پر مستحق ہیں:۔

ا۔ اپنے ذاتی اور نفسانی فضائل، مثلاً علم واخلاقِ فاضلہ وغیرہ اور اسی کی طرف سید علیہ الرحمہ نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے(صَلٰوةً تَكُوْنُ اِزَاءَ لِفَضْلِهِمْ)ایسی رحمت جو ان کے فضل وکمالات کے شایان ہو۔

۲۔ اپنے ظاہری اعمال، جیسے عبادات واطاعات پروردگار وغیرہ۔ اس کی طرف انہوں نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے (وَ مُكَافَاةً لِعَمَلِهِمْ)جو ان کے عمل وکردار کی جزا ہو۔

۳۔ اپنی پاک وپاکیزہ اور طیب وطاہر اصل، جس سے کئی پاکیزہ شاخیں پھوٹی ہیں۔ اس کی طرف انہوں نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے(وَ كِفَاءً لِطِيْبِ فَرْعِهِمْ وَ اَصْلِهِمْ)اور ان کی ذاتی وخاندانی پاکیزگی کے ہم پلہ ہو۔

یہ تو تھا ایک معنی، اس کا ایک اور معنی بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ پہلی دو تو ان کے استحقاق کی طرف اشارہ ہوں اور آخری اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ صلوات ورحمت، کامل اور اکمل طور پر ہو۔ یعنی ایسی پاکیزہ اور طیب صلوات جو ان کی اصل وفرع کی پاکیزگی کے مطابق ہو۔ اور یہی قول مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں(مَا اَنَارَ فَجْرٌ سَاطِعٌ وَ خَوىٰ نَجْمٌ طَالِعٌ)جب تک صبح درخشاں لو دیتی رہے اور جگمگاتے ستارے ابھر کر ڈوبتے رہیں، یعنی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جب تک کہ یہ دنیا باقی ہے۔

دوسری فصل

فَاِنِّيْ كُنْتُ فِيْ عُنْفُوَانِ السِّنِّ وَ غَضَاضَةِ الْغُصْنِ ابْتَدَأْتُ بِتَالِيْفِ كِتَابٍ فِيْ خَصَآئِصِ الْاَئِمَّةِ عليهم السلام يَشْتَمِلُ عَلىٰ مَحَاسِنِ اَخْبَارِهِمْ وَجَوَاهِرِ كَلَامِهِمْ حَدَانِيْ عَلَيْهِ غَرَضٌ ذَكَرْتُهٗ فِيْ صَدْرِ الْكِتَابِ وَ جَعَلْتُهٗ اَمَامَ الْكَلَامِ وَ فَرَغْتُ مِنَ الْخَصَآئِصِ الَّتِيْ تَخُصُّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيًّا

میں نے اوائل عمر اور شاخ جوانی کی شادابی میں ائمہ علیہم السلام کے حالات وخصائص میں ایک کتاب کی تالیف شروع کی تھی جو ان کے نفیس واقعات اور کلام کے جواہر ریزوں پر مشتمل تھی جس کا غرض تالیف میں نے اسی کتاب کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے اور اس میں وہ حصہ جو امیر المؤمنین علیؑ کے خصائص سے متعلق تھا پایہ تکمیل کو پہنچا لیکن زمانے کی

علیہ السلام وَ عَاقَتْ عَنْ اِتْمَامِ بَقِيَّةِ الْكِتَابِ مُعَاجَزَاتُ الزَّمَانِ وَمُمَاطِلَاتُ الْاَيَّامِ وَ كُنْتُ قَدْبَوَّبْتُ مَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ اَبْوَابًا وَ فَصَّلْتُه فُصُوْلاً فَجَآءَ فِيْ آخِرِهَا فَصْلٌ يَتَضَمَّنُ مَحَاسِنَ مَا نُقِلَ عَنْهُ علیہ السلام مِنَ الْكَلَامِ الْقَصِيْرِ فِي الْمَوَاعِظِ وَ الْحِكَمِ وَ الْاَمْثَالِ وَ الْآدَابِ دُوْنَ الْخُطَبِ الطَّوِيْلَةِ وَ الْكُتُبِ الْمَبْسُوْطَةِ فَاسْتَحْسَنَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْاَصْدِقَآءِ وَالْاِخْوَانِ مَا اشْتَمَلَ عَلَيْهِ الْفَصْلُ الْمُقَدَّمُ ذِكْرُه مُعْجَبِيْنَ بِبَدَائِعِهٖ وَمُتَعَجِّبِيْنَ مِنْ نَوَاصِعِهٖ وَسَاَلُوْنِيْ عِنْدَذٰلِكَ اَنْ اَبْدَاَ بِتَالِيْفِ كِتَابٍ يَحْتَوِيْ عَلٰى مُخْتَارِ كَلَامِ مَوْلَانَا اَمِيْرِ الْمُؤمِنِيْنَ علیہ السلام فِيْ جَمِيْعِ فُنُوْنِه وَ مُتَشَعِّبَاتِ غُصُوْنِه مِنْ خُطَبٍ وَكُتُبٍ وَمَوَاعِظَ وَاَدَبٍ عِلْمًا اَنَّ ذٰلِكَ يَتَضَمَّنُ مِنْ عَجَائِبِ الْبَلَاغَةِ وَغَرَائِبِ الْفَصَاحَةِ وَجَوَاهِرِ الْعَرَبِيَّةِ وَثَوَاقِبِ الْكَلِمِ الدِّيْنِيَّةِ وَالدُّنْيَوِيَّةِ مَالاَ يُوْجَدُ مُجْتَمِعًا فِيْ كَلَامٍ وَ لاَ مَجْمُوْعُ الْاَطْرَافِ فِيْ كِتَابٍ اِذْكَانَ اَمِيْرُالْمُؤمِنِيْنَ (ع) مَشْرَعَ الْفَصَاحَةِ وَمَوْرِدَهَا وَمَنْشَاَ الْبَلَاغَةِ وَمَوْلِدَهَا وَمِنْهُ ظَهَرَ مَكْنُوْنُهَا وَ عَنْهُ اُخِذَتْ قَوَانِيْنُهَا وَ عَلٰى اَمْثِلَتِهٖ حَذَا كُلُّ قَائِلٍ خَطِيْبٍ وَبِكَلَامِهٖ اسْتَعَانَ كُلُّ وَاعِظٍ بَلِيْغٍ وَ مَعَ ذٰلِكَ فَقَدْ سَبَقَ وَ قَصَّرُوْا وَ تَقَدَّمَ وَتَاَخَّرُوْا لِاَنَّ كَلَامَه الْكَلَامُ الَّذِيْ عَلَيْهِ مَسْحَةٌ مِنَ الْكَلَامِ الْاِلٰهِيِّ وَ فِيْهِ عَبَقَةٌ مِنَ الْكَلَامِ النَّبَوِيِّ فَاَجَبْتُهُمْ اِلَى الْاِبْتِدَاءِ

مزاحمتوں اور شب و روز کی رکاوٹوں نے بقیہ کتاب پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے دی جتنا حصہ لکھا گیا تھا اسے میں نے چند ابواب و فصول پر تقسیم کیا چنانچہ اس کی آخری فصل حضرت سے منقول شدہ پندو نصائح حکم و امثال اور اخلاقیات کے حسین و مختصر جملوں پر مشتمل تھی مگر طویل خطبات اور بسیط خطوط درج نہ تھے۔ احباب و برادران دینی کی ایک جماعت نے اس کے لطیف و شگفتہ کلمات پر اظہار تعجب و حیرت کرتے ہوئے فصل مذکور کے مندرجات پسند کئے اور مجھ سے خواہشمند ہوئے کہ میں ایک ایسی کتاب ترتیب دوں جو امیر المؤمنینؑ کے تمام اسالیب کلام اور اس کے متفرق شعبوں پر حاوی ہو از قبیل خطبات و خطوط، نصائح و آداب وغیرہ اس یقین کے ساتھ کہ وہ فصاحت و بلاغت کے عجائب و نوادر، عربیت کے گہرہائے تابدار اور دین و دنیا کے متعلق درخشندہ کلمات پر مشتمل ہو جو نہ کسی کلام میں جمع اور نہ کسی کتاب میں یکجا ہیں۔ چونکہ امیر المؤمنینؑ فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخرج و منبع تھے۔ فصاحت و بلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپؑ ہی سے ظاہر ہوئیں، آپؑ ہی سے اس کے قواعد و اصول سیکھے گئے، ہر خطیب و متکلم کو آپؑ کی مثالوں پر چلنا پڑا اور ہر واعظ بلیغ نے آپؑ کے کلام سے خوشہ چینی کی پھر بھی وہ آپؑ کے برابر کبھی نہ آ سکے اور سبقت و تقدم کا سہرا آپؑ ہی کے سر رہا اس لئے کہ آپؑ کا کلام وہ ہے جس میں علم الٰہی کا پرتو اور کلام نبویؐ کی بو باس ہے، چنانچہ اس فرمائش کو میں نے منظور کیا یہ جانتے ہوئے کہ اس میں نفع عظیم، نیک نامی اور ذخیرہ

بِذٰلِكَ عَالِمًا بِمَا فِيْهِ مِنْ عَظِيْمِ النَّفْعِ وَمَنْشُوْرِ الذِّكْرِ وَمَذْخُوْرِ الْأَجْرِ وَ اعْتَمَدْتُ بِهِ اَنْ اُبَيِّنَ بِهِ مِنْ عَظِيْمِ قَدْرِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ علیہ السلام فِيْ هٰذِهِ الْفَضِيْلَةِ مُضَافَةً اِلَى الْمَحَاسِنِ الدَّثْرَةِ وَ الْفَضَائِلِ الْجَمَّةِ وَ اَنَّهُ انْفَرَدَ بِبُلُوْغِ غَايَتِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّلَفِ الْاَوَّلِيْنَ الَّذِيْنَ اِنَّمَا يُؤْثَرُ عَنْهُمْ مِنْهَا الْقَلِيْلُ النَّادِرُ وَالشَّاذُّ الشَّارِدُ وَ اَمَّا كَلَامُهُ فَهُوَ الْبَحْرُ الَّذِيْ لَا يُسَاجَلُ وَ الْجَمُّ الَّذِيْ لَا يُحَافَلُ وَ اَرَدْتُ اَنْ يَسُوْغَ لِيَ التَّمَثُّلُ فِي الْاِفْتِخَارِ بِهِ بِقَوْلِ الْفَرَزْدَقِ :

اُولٰئِكَ آبَائِيْ فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ
اِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ

اجر ہے، اس تالیف سے مقصود یہ ہے کہ میں امیر المؤمنین کے فن بلاغت میں رفعت و برتری کو ظاہر کروں جو آپ کی بے شمار خوبیوں اور ان گنت فضیلتوں کے علاوہ ہے اور یہ کہ آپ اس فضیلت کے مقام منتہا تک پہنچے ہوئے ہیں ان تمام سلف اولین میں یکتا ہیں جن کا کلام تھوڑا بہت پاشان و پریشان نقل کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ کا کلام ایک ایسا امنڈ تا ہوا دریا ہے جس کے بہاؤ سے ٹکر نہیں لی جا سکتی اور اتنی خوبیوں کا مجموعہ ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ میرے لئے جائز و خوشگوار ہو گا کہ حضرت کی طرف اپنے نسبی استناد کی بنا پر فخر و ناز کرتے ہوئے فرزدق کا شعر بطور تمثیل پیش کروں کہ : یہ ہیں میرے آباواجداد، اے جریر! جب مجلسیں ہمیں ایک جا اکٹھا کریں ذرا ان کی مثال تو لاؤ!

نہج البلاغہ کی غرض تالیف :

تشریح سید رضی علیہ الرحمہ نے اپنے کلام کے اس حصہ میں نہج البلاغہ کی تالیف کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور فرمایا کہ (فَاِنِّيْ كُنْتُ فِيْ عُنْفُوَانِ السِّنِّ) میں اوائل عمر ہی میں تھا۔ یعنی جب جوانی کی شادابی اور تروتازگی کا دور تھا (وَ غَضَاضَةِ الْغُصْنِ) شاخ جوانی کی طراوت میں تھا۔ (اِبْتَدَاْتُ بِتَالِيْفِ الْكِتَابِ فِيْ خَصَائِصِ الْاَئِمَّةِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ) ائمہ علیہم السلام کے حالات و خصائص میں ایک کتاب کی تالیف شروع کی۔ ایسی کتاب جس میں ائمہ علیہم السلام کے مخصوص مناقب، مکارم اور کمالات ذکر ہوں جو کسی دوسرے میں نہیں پائے جاتے (يَشْتَمِلُ عَلىٰ مَحَاسِنِ اَخْبَارِهِمْ وَ جَوَاهِرِ كَلَامِهِمْ) جو ان کے نفیس واقعات اور ان کے کلام کے جواہر ریزوں پر مشتمل تھی (حَدَانِيْ) مجھے آمادہ کیا (عَلَيْهِ غَرَضٌ ذَكَرْتُهُ فِيْ صَدْرِ الْكِتَابِ وَ جَعَلْتُهُ اَمَامَ الْكَلَامِ وَ فَرَغْتُ مِنَ الْخَصَائِصِ الَّتِيْ تَخُصُّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيًّا علیہ السلام) اس بات نے کہ جس کی غرض تالیف میں نے اسی کتاب کے دیباچے میں ذکر کی ہے اور اس میں وہ حصہ جو امیر المؤمنین علیہ السلام کے خصائص سے متعلق تھا پایہ تکمیل تک پہنچایا (وَعَاقَتْ) اور مانع ہو گئیں (عَنْ اِتْمَامِ بَقِيَّةِ الْكِتَابِ مُحَاجَزَاتُ الزَّمَانِ) اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے زمانے کی رکاوٹیں۔ گویا زمانہ انہیں کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے روکتا رہا اور دو زمانے کی رکاوٹوں کا سدباب کرتے رہے۔ کیونکہ "ممانعت" اور "مدافعت" دو فریقوں کے درمیان ہوتی ہے۔ (وَ مُمَاطَلَاتُ

الاَیَّامِ) اور شب و روز کی مزاحمتیں۔ "مطل" کا معنی ہوتا ہے ٹال مٹول سے کام لینا۔ یہاں پر "مماطلات" کے لفظ کو زمانے کے مشغلوں کیلئے استعارہ تبعیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور ان میں وجہ جامع یہ ہے کہ ہر ایک، ایک دوسرے کو کام کرنے سے روکتا رہا، گویا زمانہ اس بات پر فریب دیتا رہا کہ ابھی وقت کافی ہے جلدی کی کیا ضرورت کیا ہے؟ آج نہیں تو کل کر لینا، اور وہ زمانے کو اس بات پر بہلاتے رہے کہ آرزوئیں طولانی ہیں عمل واقع ہو ہی جائے گا۔ غرض ہر ایک، دوسرے کو بہلانے میں مصروف رہا جس سے مزاحمت ایجاد ہوتی رہی۔ (وَكُنْتُ قَدْبَوَّبْتُ مَاخَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ) جتنا حصہ اس کتاب سے لکھا گیا تھا میں نے اسے تقسیم کیا (اَبْوَابًا وَ فَصَّلْتُه' فُصُوْلاً فَجَآءَ فِيْ آخِرِهَا) چند ابواب و فصول پر، چنانچہ اس کے آخر میں (فَصْلٌ يَتَضَمَّنُ مَحَاسِنَ مَا نُقِلَ عَنْهُ عليه (السلام) مِنَ الْكَلاَمِ الْقَصِيْرِ فِيْ الْمَوَاعِظِ) ایک فصل میں حضرتؑ سے منقول شدہ پند و نصائح کے مختصر جملے تھے کہ جو وعدہ وعید اور ثواب و عقاب کی یاد دلا کر دلوں کو نرم کر دیتے ہیں (وَ الْحِكَمِ) حکمت و دانائی کی وہ عملی باتیں جو انسان کو فعل قبیح کے ارتکاب سے بلند و بالا رکھتی ہیں (وَ الأَمْثَالِ) اور ضرب الامثال کہ جن کی تفصیل دیباچہ میں محاسن بدیعیہ کے ذیل میں گزر چکی ہے (وَ الآدَابِ) اور حسین اخلاق (دُوْنَ الْخُطَبِ الطَّوِيْلَةِ وَ الْكُتُبِ الْمَبْسُوْطَةِ فَاسْتَحْسَنَ جَمَاعَةٌ مِنَ الأَصْدِقَآءِ وَ الإِخْوَانِ مَااشْتَمَلَ عَلَيْهِ الْفَصْلُ الْمُقَدَّمُ ذِكْرُه') مگر طویل خطبات اور بسیط خطوط درج نہ تھے، احباب اور برادران دینی کی ایک جماعت نے آخری مذکورہ فصل کو سراہا (مُعْجَبِيْنَ بِبَدَايِعِهِ) خود بھی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اور دوسروں کو بھی تعجب میں ڈالتے ہوئے کہ اس کے الفاظ اور معانی لطیف اور شگفتہ ہیں (وَ مُتَعَجِّبِيْنَ مِنْ نَوَاصِعِهِ) اور اس کے صاف ستھرے مطالب و مقاصد پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے۔ (وَ سَأَلُوْنِي عِنْدَ ذٰلِكَ اَنْ اَبْدَءَ بِتَالِيْفِ كِتَابٍ يَحْتَوِي عَلٰى مُخْتَارِ كَلاَمِ مَوْلاَنَا اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلاَمُ) فصل مذکور کو سراہتے ہوئے مجھ سے خواہشمند ہوئے کہ میں ایسی کتاب ترتیب دوں جو مولا امیر المومنین علیہ السلام کے منتخب کلام سے ہو جس میں بلاغت اور خطابہ کے باب میں مزید شگفتگی ہو ورنہ آپ کا تمام کلام تو اس قدر زیادہ ہے کہ کسی ایک کتاب میں تالیف یا کسی ایک باب میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔

قطب الدین راوندی کہتے ہیں کہ میں نے حجاز کے ایک عالم سے سنا ہے کہ "میں نے مصر میں حضرت علی علیہ السلام کے ایک مجموعہ کلام کو دیکھا ہے جو بیس سے زیادہ جلدوں پر مشتمل ہے" (فِيْ جَمِيْعِ فُنُوْنِهِ) اس میں ہر قسم کے اسالیب ہوں (وَ مُتَشَعِّبَاتِ غُصُوْنِهِ) اور متفرق شعبوں پر حاوی ہو (مِنْ خُطَبٍ وَكُتُبٍ وَمَوَاعِظَ وَ اَدَبٍ) از قبیل خطبات، خطوط، نصائح اور آداب وغیرہ اور مجھ سے اس لئے خواہش کی کہ (عِلْمًا) وہ یہ یقین کرتے ہوئے (اَنَّ ذٰلِكَ) کہ وہ تالیف شدہ کلام (يَتَضَمَّنُ مِنْ عَجَائِبِ الْبَلاَغَةِ وَغَرَائِبِ الْفَصَاحَةِ وَجَوَاهِرِ الْعَرَبِيَّةِ) فصاحت و بلاغت کے عجائب و نوادر، اور اپنی عظمت و نفاست میں گوہر ہائے تابدار کی مانند عربی الفاظ پر مشتمل ہوگا (وَثَوَاقِبِ "يَوَاقِيْت (خ ل)" الْكَلِمِ الدِّيْنِيَّةِ وَ الدُّنْيَوِيَّةِ) اور ایسے کلمات پر مشتمل ہوگا جو ضیاء پاشی اور درخشندگی میں چمکتے ستاروں کی مانند ہوں یا اپنی قدر و منزلت کے لحاظ سے لعل و جواہر کی مثل (مَا لاَيُوْجَدُ مُجْتَمِعًا فِيْ كَلاَمٍ وَ لاَمَجْمُوْعُ الأَطْرَافِ فِيْ كِتَابٍ اِذْ كَانَ اَمِيْرُ الْمُوْمِنِيْنَ عليه (السلام) مَشْرَعَ الْفَصَاحَةِ وَ مَوْرِدَهَا) جو نہ کسی کلام

میں جمع اور نہ کسی کتاب میں یکجا۔ چونکہ امیر المؤمنین علیہ السلام فصاحت کا سرچشمہ تھے۔ سید علیہ الرحمہ نے فصاحت کو ایسے صاف و شفاف اور زلال پانی سے تشبیہ دی ہے جو پیاسوں کو سیراب کر دیتا ہے۔ فصاحت سے بھی ایک تو دل کو سکون ملتا ہے اور دوسرے لذت محسوس ہوتی ہے، جس طرح کہ پانی کے ساتھ اجسام کی حیات وابستہ ہے اور اسی سے پیاسے سیراب ہوتے ہیں۔ تو یہ استعارہ بالکنایہ ہے اور مَشرع و مَورد کا ذکر استعارہ تخییلیہ ہے۔ امامؑ کو فصاحت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ آپؑ ہی سے ایسے حاصل کی جاتی ہے جس طرح پانی دریا کے گھاٹ اور سرچشمہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔

شارح بحرانیؒ کہتے ہیں: اگر مؤلف (سید رضیؒ) "مَصْدَرَهَا وَ مَوْرِدَهَا" کہتے تو زیادہ بلیغ ہوتا کیونکہ "مَشرع" اور "مورد" مترادف یا قریب الترادف ہیں۔

حضرت علیؑ کی فصاحت وبلاغت:

شارح بحرانیؒ نے توجہ نہیں فرمائی، یہاں پر جو بات ہو رہی ہے وہ "وارد" ہونے کے متعلق ہے "صادر" ہونے کے نہیں، جیسا کہ مؤلف علیہ الرحمہ اسی بات کی طرف خود اشارہ فرماتے ہیں کہ (وَمَنْشَأَ الْبَلَاغَةِ وَ مَوْلِدَهَا) اور بلاغت کا مخرج و منبع تھے۔ بلاغت کو حضرت علی علیہ السلام کی اولاد قرار دیا ہے اس لئے کہ وہ آپؑ ہی سے معرض ظہور میں آئی، اسی لئے کہتے ہیں کہ (وَ مِنْهُ ظَهَرَ مَكْنُوْنُهَا) اس کی چھپی ہوئی باریکیاں آپؑ ہی سے ظاہر ہوئیں (وَ عَنْهُ اُخِذَتْ قَوَانِيْنُهَا) اور آپؑ ہی سے اس کے اصول و قواعد و ضوابط سیکھے گئے (وَ عَلىٰ اَمْثِلَتِهٖ حَذَا) اور آپؑ کی مثالوں پر چلا (كُلُّ قَائِلٍ خَطِيْبٍ وَ بِكَلَامِهٖ اسْتَعَانَ كُلُّ وَاعِظٍ بَلِيْغٍ وَ مَعَ ذٰلِكَ) ہر خطیب و متکلم اور واعظ بلیغ نے آپؑ کے کلام سے مدد و نصرت طلب کی اور ہر طرح کی اقتدا، استعانت اور اتباع کے باوجود بھی (فَقَدْ سَبَقَ) آپؑ ہی کو میدان فصاحت میں سبقت حاصل رہی۔ (وَقَصَّرُوْا وَتَقَدَّمَ) میدان بلاغت میں وہ آپؑ کے برابر کبھی نہ آسکے اور آپؑ ہی کو تقدم حاصل رہا۔ (وَتَاَخَّرُوْا) وہ پیچھے رہ گئے، آپؑ نے جواہر خطابت کو ایسے حسین سانچوں میں ڈھالا کہ کوئی بھی خطیب آپؑ کی برابری نہ کرسکا۔ آپؑ کے نقشِ قدم پر چلنے والے خواہ کتنا ہی تیز دوڑتے رہے لیکن آپؑ کی غبار راہ کو بھی نہ چھو سکے۔ (لِاَنَّ كَلَامَهٗ) کیونکہ آپؑ کا کلام ایسا ہے کہ جس میں ایسی انوکھی ترتیب اور ایسا حسن اسلوب ہے جو کانوں میں رس گھولتا ہے اور دلوں تک بغیر اجازت کے رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ جس سے عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں اور نفوس میں جادو جیسا اثر ہوتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ (اَلْكَلَامُ الَّذِيْ عَلَيْهِ مَسْحَةٌ) ایسا کلام ہے جس میں پرتو اور جمال ہے (مِنَ الْكَلَامِ الْاِلٰهِيِّ) خدائی کلام کا (وَفِيْهِ عَبْقَةٌ مِنَ الْكَلَامِ النَّبَوِيِّ) اور اسی میں خوشبو ہے نبوی کلام کی۔ بلکہ وہ اسی ہار کا ایک موتی ہے اور اسی نہر کی ایک شاخ ہے اور اسی دریا کی ایک نہر ہے، اسی لئے تو دوسرے تمام لوگوں کے کلام پر فائق و بالاتر ہے، جس میں الفاظ اور معانی کی خوبیاں ایک ہی جگہ جمع ہیں۔

اگر الفاظ کو دیکھا جائے تو ان میں ایسی چمک، دمک، ہیبت، عظمت، متانت، جزالت، حلاوت، طلاقت، رقت، اور سلاست پائی جاتی ہے کہ جس سے تعجب کی انتہا ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کا بیان کرنے والا کوئی عام معمولی شخصیت کا مالک نہیں بلکہ ایک قادر الکلام خطیب اور ملکوتی صفات متکلم ہے۔

اگر اس کے معانی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کی قدر و منزلت بہت عظیم، اس کی گہرائی بہت زیادہ، اس کا جوہر نہایت قیمتی ہے اور انواع اقسام کے علوم کا خزانہ ہے، مخفی رازوں سے پردہ اٹھا رہا ہے، موجودات کی پوشیدہ باتوں کو ظاہر کر رہا ہے، اس میں مشکلات کی توضیح ہے، مجملات کی تفصیل ہے اور معضلات کی تفسیر ہے۔

علیؑ کے علاوہ کون ایسا ہے جس میں کمال کی یہ صفت پائی جائے؟ جاہلیت کے جہلا اور عرب کے بدو کہ جن کی بات بلاغت کیلئے سند سمجھی جاتی ہے اور گہرے معانی میں جن سے استناد کیا جاتا ہے وہ کیا جانیں کہ فصاحت کیا ہوتی ہے اور بلاغت کیا چیز ہے؟ دور جاہلیت کے فصحآء کا منتہائے عروج یہی تھا کہ کسی اونٹ کی تعریف کر دی یا کسی گھوڑے کی، یا وحشی گدھے کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے یا پھر گائے بیل کی عظمت کے گیت گانے لگے۔ اگر زیادہ ترقی بھی کی تو یہی کہ پہاڑوں یا چٹیل میدانوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔

اسلامی دور کے ارباب فصاحت وبلاغت ہی کو لے لیجئے جن میں زیادہ مشہور بدیع الزمان، علامۂ ہمدان، ابو محمد حریری، ابن نباتہ اور سحبان بن وائل ہیں یا پھر ان کی بتائی ہوئی راہوں کے راہی ہیں اپنی شدید فہم وذکاء میں انتہائی شہرت کے باوجود ان کا کلام لغویات، خرافات، لہو ولعب، ہنسی مذاق اور غلط سلط باتوں پر مشتمل اور تکلف کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جہاں پر سجع وتجنیس پر مجبور ہوئے یا تطبیق وترصیع اور مقابلہ کی ضرورت پیش آئی تو معانی کو الفاظ کے تابع بنا دیا حالانکہ بلیغ انسان کا کام یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کو معانی کا قالب بنائے، کیونکہ لباس قدو قامت کے اندازے پر کاٹا جاتا ہے اور تلوار کی پیمائش کے مطابق ہی نیام کو تیار کیا جاتا ہے، کیونکہ جب معانی کو اختیار دیا جائے تو وہ اپنی فطرت اور طبیعت کا لباس ہی منتخب کریں گے اور وہی لباس زیب تن کریں گے جو انہیں زینت بخشے۔ اسی لئے تکلف سے کام لینے والوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علی امیر المؤمنین علیہ السلام کا کلام "فَوْقَ كَلَامِ الْمَخْلُوْقِ وَ دُوْنَ كَلَامِ الْخَالِقِ" (خالق کے کلام سے نیچے اور مخلوق کے کلام کے اوپر) ہے اور آپؑ کے کلام سے کسی کے کلام کو قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپؑ اس میدان کے یکتا شہسوار ہیں، ایسے سخنران ہیں کہ بوقت سخنرانی جس کے منہ سے فصاحت وبلاغت کے پھول جھڑتے ہیں۔ ایسے سمندر ہیں جن کی موجوں سے لعل وجواہر باہر آتے ہیں۔ ان کے اوامر ونواہی پر عمل کر کے دل مضبوط ہوتے ہیں، اپنی رغبتوں کے ذریعہ نیکیوں کی راہنمائی کرتے ہیں اور خوف دلانے والے کلام کے ذریعہ منکرات اور برائیوں سے روکتے ہیں خلاصہ کلام یہ کہ "آپؑ کے کلام کو امام الکلام کہا جائے جس طرح کہ آپؑ امام الانام ہیں" سید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں (فَاَجَبْتُهُمْ اِلَى الْاِبْتِدَآءِ بِذٰلِكَ عَالِمًا بِمَافِيْهِ مِنْ عَظِيْمِ النَّفْعِ) چنانچہ میں نے اس فرمائش کو منظور کر لیا، یہ جانتے ہوئے کہ اس میں طلب کرنے والے کیلئے عظیم فائدہ ہے۔ (وَمَنْشُوْرِ الذِّكْرِ) اور نیک نامی ہے یعنی دنیا میں ایک حسین یادگار ہے اور آنے والی نسلوں کیلئے سچی زبان ہے۔ (وَ مَذْخُوْرِ الْاَجْرِ) اور بہت بڑا اجر وثواب ہے جو آخرت کیلئے ذخیرہ کے طور پر موجود ہے۔ (وَاعْتَمَدْتُ بِهٖ) اور اس کے ذریعہ قصد کیا (اَنْ اُبَيِّنَ بِهٖ مِنْ عَظِيْمِ قَدْرِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عليه السلام فِيْ هٰذِهِ الْفَضِيْلَةِ) کہ امیر المؤمنینؑ کی فن بلاغت میں رفعت وبرتری کو ظاہر کروں (مُضَافَةً اِلَى الْمَحَاسِنِ الدَّثِرَةِ وَ الْفَضَائِلِ الْجَمَّةِ) جو آپؑ کی بے شمار خوبیوں اور ان گنت فضائل کے علاوہ ہے (و

اَنْ انْفَرَدَ بِبُلُوْغِ غَایَتِهَا) اور یہ کہ ظاہر کروں کہ آپؑ اس فضیلت کے مقام منتہا تک پہنچنے میں یکتا ہیں (مِنْ جَمِیْعِ السَّلَفِ الْاَوَّلِیْنَ الَّذِیْنَ اِنَّمَا یُؤْثَرُ عَنْهُمْ مِنْهَا الْقَلِیْلُ النَّادِرُ وَالشَّاذُ الشَّارِدُ) ان تمام سلف اولین میں سے (یکتا ہیں) جن کا کلام تھوڑا بہت پاشان و پریشان نقل کیا جاتا ہے۔ یہاں پر "شاذ" اور "شارد" دونوں الفاظ کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو کہ جانور کی صفات میں سے ہیں کیونکہ "شاذ" وہ جانور ہوتا ہے جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑا ہوا اور دور ہو اور 'شارد' اس اونٹ کو کہتے ہیں جو بدک کر اپنے نظام سے خارج ہو جائے، لہٰذا ان دونوں الفاظ کا استعمال ان بلیغ کلمات کیلئے کیا گیا ہے جو سلف اولین سے بڑی ندرت کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں یا وہ نظام بلاغت سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ (وَاَمَّا كَلَامُهُ فَهُوَ الْبَحْرُ الَّذِيْ لَا يُسَاجَلُ) لیکن آپؑ کا کلام ایک ایسا امنڈتا ہوا دریا ہے جس سے نہ تو ٹکر لی جا سکتی ہے نہ اس پر غلبہ پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے مقابل میں فخر کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر آپ کا کلام ایک ایسا سمندر ہے جس کا ساحل نہیں ہے (وَالْجَمُّ الَّذِيْ لَا يُحَافَلُ) اور اتنی خوبیوں کا مجموعہ ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا (وَ اَرَدْتُ اَنْ يَسُوْغَ لِيَ) میرے لئے جائز و خوشگوار ہوگا کہ میں پیش کروں، "یسوغ" کا ایک معنی تو ہے کہ جائز ہوگا اور دوسرا معنی بصورت استعارہ تبعیہ کے ہے کہ لفظ "سوغ" جو کہ پینے کی ایک صفت ہے اسے "تمثل" کیلئے استعارہ لیا جائے۔ اور یہ "استعارہ محسوس للمعقول" کہلاتا ہے، اور ان میں قدر جامع یہ ہے کہ مستعار منہ میں پینے والوں کیلئے لذت ہے اور مستعار لہ میں مثل پیش کرنے والے کیلئے لذت ہے۔ (اَلتَّمَثُّلُ فِي الْاِفْتِخَارِ بِهٖ بِقَوْلِ الْفَرَزْدَقِ: اُولٰئِكَ آبَائِيْ فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ اِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ) بطور مثل حضرتؑ کی طرف اپنی نسبی استناد کی بنا پر فخر و ناز کرتے ہوئے فرزدق کا یہ شعر کہوں :" یہ ہیں میرے آباؤ اجداد۔ اے جریر! جب مجلسیں ہمیں یکجا اکٹھا کریں تو ذرا ان کی مثالیں تو لاؤ"۔

شارحؒ کہتے ہیں کہ میں بھی سید علیہ الرحمہ کی طرح بطور مثل حضرتؑ پر فخر و ناز کرتے ہوئے یہی کہوں گا، کیونکہ ہم دونوں ایک ہی اصل کی فرع، ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی نسب کے حامل ہیں۔ میر اور سید کا نسب ایک ہے۔ جو عبد صالح حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ؛

مَنْ لَمْ يَكُنْ عَلَوِيًّا حِيْنَ تُنْسِبُهٗ ۔۔۔ فَمَا لَهٗ فِيْ قَدِيْمِ الدَّهْرِ مُفْتَخَرٗ

جس کا نسب علیؑ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا، اس کیلئے ساری زندگی میں کوئی فخر ہی نہیں ہے۔

فرزدق کا نام ہمام بن غالب بن صعصعہ بن ناجیہ بن عقال محمد بن سفیان بن مجاشع بن دارم بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم ہے۔ ابو فراس تمیمی بصری کے ہم عصر اور مقدم شعراء میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اور کتاب میں مذکورہ شعر اس قصیدے میں سے لیا گیا ہے جس میں اس نے اپنے ہم عصر شاعر "جریر" کی ہجو کی ہے۔ اس قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں :

فرزدق کا قصیدہ :

وَ مِنَّا الَّذِيْ اخْتِيْرَ الرِّجَالُ سَمَاحَةً ۔۔۔ وَجُوْدًا اِذَا هَبَّ الرِّيَاحُ الزَّعَازِعُ

وَ مِنَّا الَّذِيْ اَعْطَی الرَّسُوْلُ عَطِيَّةً ۔۔۔ أُسَارَیٰ تَمِيْمٍ وَ الْعُيُوْنُ دَوَامِعُ

وَ مِنَّا الَّذِيْ يُعْطِي الْمِئَيْنِ وَ يَشْتَرِيْ ۔۔۔ الْعَوَالِيْ وَ يَعْلُوْا فَضْلُهٗ مَنْ يُدَافِعُ

وَ مِنَّا الَّذِيْ اَحْيَی الْوَئِيْدَ وَ غَالِبٌ ۔۔۔ وَ عَمْرٌوْ وَ مِنَّا حَاجِبٌ وَ الْاَقَارِعُ

وَ مِنَّا الَّذِيْ قَادَ الْجِيَادَ عَلَی الْوَحَا ۔۔۔ لِنَجْرَانَ حَتّٰی صَبَّحَتْهُ النَّزَآئِعُ

وَ مِنَّا غَدَاةَ الرَّوْعِ فُرْسَانُ غَارَةٍ ۔۔۔ اِذَا مُتِّعَتْ بَعْدَ الزُّجَاجِ الْاَشَاجِعُ

وَ مِنَّا خَطِيْبٌ لَا يُعَابُ وَ حَامِلٌ ۔۔۔ اَغَرُّ اِذَا الْتَفَّتْ عَلَيْهِ الْمَجَامِعُ

أُوْلٰئِكَ آبَائِي فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ ۔۔۔ اِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ

بِهِمْ اَعْتَلِيْ مَا حَمَّلْتَنِيْهِ دَارِمٌ ۔۔۔ وَ اُصَرِّعُ اَقْرَانِي الَّذِيْنَ اُصَارِعُ

تَنَحَّ عَنِ الْبَطْحَآءِ اَنَّ قَدِيْمَهَا ۔۔۔ لَنَا وَ الْجِبَالُ الرَّاسِيَاتُ الْفَوَارِعُ

اَخَذْنَا بِآفَاقِ السَّمَآءِ عَلَيْكُمْ ۔۔۔ لَنَا قَمَرَاهَا وَ النُّجُوْمُ الطَّوَالِعُ

اِذَا قِيْلَ اَيُّ النَّاسِ شَرٌّ قَبِيْلَةً ۔۔۔ اَشَارَتْ كُلَيْبٌ بِالْاَكُفِّ الْاَصَابِعُ

فَوَا عَجَبًا حَتّٰی كُلَيْبٌ يَسُبُّنِيْ ۔۔۔ كَاَنَّ اَبَاهَا نَهْشَلٌ اَوْ مُجَاشِعُ

اَتَعْدِلُ اَحْسَابًا لِئَامًا اَدِقَّةً ۔۔۔ بِاَحْسَابِنَا اِنَّا اِلَی اللّٰهِ رَاجِعُ

اس قصیدے میں اس نے اپنی قوم کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ میری قوم تو وہ ہے جو جاڑے کے موسم میں جبکہ تخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں اور ملک میں قحط کی صورت پیدا ہو جاتی ہے جود و سخا کا فراخدلی سے مظاہرہ کرتی ہے۔ عربوں کا دستور ہے کہ "سردیوں میں کی جانے والی مہمان نوازی کی زیادہ تعریف کرتے ہیں کیونکہ اس موسم میں قحط پڑ جاتا ہے۔ رسولؐ کے عطیہ سے مراد جنگ حُنین کے بنو تمیم کے قیدی ہیں جو رسول خداؐ نے اقرع بن حابس کو عطا کئے، جیسا کہ ابن ابی الحدید نے اسے ذکر کیا ہے۔

"العَوَالِي"، "العَالِيَة" کی جمع ہے جس سے نیزے اور ناقہ کی صفت بیان کی جاتی ہے۔ اور زمین کے ایک خطے کا نام بھی ہے جو مکہ کے پیچھے، نجد سے بالاتر سرزمین تہامہ میں ہے۔ "احی الوئید" سے مراد اس کے دادا "صعصعہ" صحابی رسولؐ ہیں جن کے بارے میں "ابن ابی الدنیا" کہتے ہیں کہ بادیہ نشین اشراف عرب میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص متمول نہیں تھا، یہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ایک ہزار زندہ درگور لڑکیوں کو مرنے سے نجات دلائی اور ایک ہزار شہسوار ان کے پاس ہوتے تھے۔ انہی پر فرزدق فخر کر رہا ہے۔ "الوَحَا" کا معنی ہے "جلدی" اور "النَّزَائِع" جمع ہے "النزیعه" کی جس کا معنی ہے شریف خاندان کے لوگ۔ اس بیت سے اس کی مراد اقرع بن حابس کے وہ جنگجو ہیں جنہوں نے نجران میں بنی تغلب پر حملہ کیا تھا۔ اس کے قول "اِذَا مُتِّعَتْ.........." کے بارے میں ابن ابی الحدید کہتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ جب چھوٹے نیزوں کی تعداد ختم ہو جاتی ہے تو ان کی تعداد کو پورا کرنے کے لئے انگلیوں کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ اور مجمع البحرین میں "زُجَاج" کو "زُج" کی جمع بتایا گیا ہے جس کا معنی ہے

نیزوں کے پچھلے حصے میں لگا ہوا لوہا۔ "حَامِلٌ" سے مراد لوگوں کے "خون بہا" کو اپنے ذمہ لینے والا۔

"أُولٰئِكَ آبَائِي" میں اسم اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور علماء علم معانی کے بقول یہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب سننے والا غبی اور کند ذہن ہو جو اشارے کے بغیر بات نہ سمجھ سکتا ہو گویا اس طرح سے اس نے اپنے مخاطب (جریر) کو کند ذہن سمجھتے ہوئے اسم اشارہ کو استعمال کیا ہے۔

"جِئْنِی بِمِثْلِهِم" میں فعل امر مخاطب کے عاجز کرنے کیلئے استعمال کیا ہے "دَارِم" فرزدق کے قبیلے کا نام ہے "بَطْحَا" سے مراد مکہ معظمہ ہے "الرَّاسِیَاتِ" سے مراد آسمان کے اطراف ہیں۔ اور "قَمَرَاهَا" کے معنی شمس و قمر ہیں۔ اور اس سے مراد حضرت رسول خداؐ اور حضرت ابراہیم خلیلؑ ہیں اور "اَلنَّجُوْمُ الطَّوَالِعُ" سے مراد ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔

"کُلَیْب" جریر کے قبیلے کا نام ہے اور یہ لفظ مجرور ہے اس لئے کہ اس میں حرف جار "اِلٰی" محذوف ہے لیکن اس کا عمل برقرار ہے۔ یعنی دراصل "اِلیٰ کُلَیْبِ" ہے جبکہ "نَهْشَل" اور "مُجَاشِع" کا تعلق فرزدق کے قبیلے سے ہے جو دارم کے دو بیٹے ہیں اور "اَدِقَّة" جمع ہے جس کا مفرد "دَقِیْق" ہے۔ اور "جَلِیْل" کی ضد ہے یعنی بہت ہی ناچیز۔

تیسری فصل

وَ رَاَیْتُ كَلَامَهٗ يَدُوْرُ عَلٰى اَقْطَابٍ ثَلٰثَةٍ اَوَّلُهَا الْخُطَبُ وَ الْاَوَامِرُ وَ ثَانِيْهَا الْكُتُبُ وَ الرَّسَائِلُ وَ ثَالِثُهَا الْحِكَمُ وَ الْمَوَاعِظُ فَاَجْمَعْتُ بِتَوْفِيْقِ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَى الْاِبْتِدَآءِ بِاخْتِيَارِ مَحَاسِنِ الْخُطَبِ ثُمَّ مَحَاسِنِ الْكُتُبِ ثُمَّ مَحَاسِنِ الْحِكَمِ وَالْاَدَبِ مُفْرِدًا لِكُلِّ صِنْفٍ مِنْ ذٰلِكَ بَابًا وَ مُفَصِّلًا فِيْهِ اَوْرَاقًا لِتَكُوْنَ مُقَدِّمَةً لِاسْتِدْرَاكِ مَا عَسَاهُ يَشِذُّ عَنِّيْ عَاجِلًا وَيَقَعُ اِلَيَّ آجِلًا وَاِذَا جَآءَ شَيْءٌ مِنْ كَلَامِهِ الْخَارِجِ فِيْ اَثْنَاءِ حِوَارٍ اَوْ جَوَابِ سُؤَالٍ اَوْ غَرَضٍ آخَرَ مِنَ الْاَغْرَاضِ فِيْ غَيْرِ الْاَنْحَاءِ الَّتِيْ ذَكَرْتُهَا وَ قَرَّرْتُ الْقَاعِدَةَ عَلَيْهَا نَسَبْتُهَا اِلٰى اَلْيَقِ الْاَبْوَابِ بِهٖ وَاَشَدِّهَا مُلَامَحَةً لِغَرَضِهٖ وَرُبَّمَا جَاءَ فِيْمَا اَخْتَارُهٗ مِنْ ذٰلِكَ فُصُوْلٌ غَيْرُ مُتَّسِقَةٍ وَمَحَاسِنُ كَلِمٍ غَيْرُ

میری نظر میں حضرتؑ کا کلام تین بنیادی قسموں میں دائر ہے، اول خطبات و احکام دوسرے مکتوبات و رسائل تیسرے حکم و نصائح، میں نے بتوفیق ایزدی پہلے خطبات، پھر حکم و آداب کے انتخاب کا ارادہ کیا ہے اور ہر صنف کیلئے الگ الگ باب تجویز کیا ہے اور ہر باب کے بعد درمیان میں سادہ چند اوراق چھوڑ دیئے ہیں تاکہ جو کلام مجھ سے چھوٹ جائے اور بعد میں ہاتھ آئے اس کا اندراج ان میں ہو جائے اور ایسا کلام جو روزمرہ کی گفتگو یا کسی سوال کے جواب میں یا کسی دوسرے مقصد کیلئے ہو، جو اقسام مذکورہ اور میرے قرارداده قاعدے سے خارج ہو اسے اس باب میں درج کر دیا جائے جو اس کیلئے مناسب اور اس کے مقاصد سے نزدیک ہو، میرے اس انتخاب میں کچھ فصلیں اور کلمے ایسے بھی آگئے ہیں جن کے نظم و ترتیب میں انتشار ہے چونکہ میں رموز و دقائق اور درخشندہ کلمات کو صرف سمیٹ رہا ہوں، ربط و ترتیب نہیں

مُنْتَظِمَةٍ لِأَنِّي أُورِدُ النُّكَتَ وَ اللُّمَعَ وَ لَا أَقْصِدُ
التَّتَالِيَ وَالنَّسَقَ وَمِنْ عَجَائِبِهِ الَّتِي انْفَرَدَ بِهَا وَ
أَمِنَ الْمُشَارَكَةَ فِيهَا أَنَّ كَلَامَهُ الْوَارِدَ فِي
الزُّهْدِ وَالْمَوَاعِظِ وَ التَّذْكِيرِ وَالزَّوَاجِرِ إِذَا تَأَمَّلَهُ
الْمُتَأَمِّلُ وَفَكَّرَ فِيهِ الْمُتَفَكِّرُ وَخَلَعَ مِنْ قَلْبِهِ أَنَّهُ
كَلَامُ مِثْلِهِ مِمَّنْ عَظُمَ قَدْرُهُ وَنَفَذَ أَمْرُهُ وَأَحَاطَ
بِالرِّقَابِ مُلْكُهُ لَمْ يَعْتَرِضْهُ الشَّكُّ فِي أَنَّهُ كَلَامُ
مَنْ لَا حَظَّ لَهُ فِي غَيْرِ الزَّهَادَةِ وَلَا شُغْلَ لَهُ بِغَيْرِ
الْعِبَادَةِ قَدْ قَبَعَ فِي كِسْرِ بَيْتٍ أَوِ انْقَطَعَ إِلَى
سَفْحِ جَبَلٍ لَا يَسْمَعُ إِلَّا حِسَّهُ وَ لَا يَرَى إِلَّا
نَفْسَهُ وَ لَا يَكَادُ يُوقِنُ بِأَنَّهُ كَلَامُ مَنْ يَنْغَمِسُ
فِي الْحَرْبِ مُصْلِتًا سَيْفَهُ فَيَقُطُّ الرِّقَابَ وَ
يُجَدِّلُ الْأَبْطَالَ وَ يَعُودُ بِهِ يَنْطِفُ دَمًا وَ يَقْطُرُ
مُهَجًا وَهُوَ مَعَ تِلْكَ الْحَالِ زَاهِدُ الزُّهَّادِ وَبَدَلُ
الْأَبْدَالِ وَ هٰذِهِ مِنْ فَضَائِلِهِ الْعَجِيبَةِ وَ
خَصَائِصِهِ اللَّطِيفَةِ الَّتِي جَمَعَ بِهَا بَيْنَ
الْأَضْدَادِ وَأَلَّفَ بَيْنَ الْأَشْتَاتِ وَكَثِيرًا مَا أُذَاكِرُ
الْإِخْوَانَ بِهَا وَ أَسْتَخْرِجُ عَجَبَهُمْ مِنْهَا وَ هِيَ
مَوْضِعٌ لِلْعِبْرَةِ بِهَا وَالْفِكْرَةِ فِيهَا وَرُبَّمَا جَاءَ فِي
أَثْنَاءِ هٰذَا الْاِخْتِيَارِ اللَّفْظُ الْمُرَدَّدُ وَ الْمَعْنَى
الْمُكَرَّرُ وَ الْعُذْرُ فِي ذٰلِكَ أَنَّ رِوَايَاتِ كَلَامِهِ
تَخْتَلِفُ اخْتِلَافًا شَدِيدًا فَرُبَّمَا اتَّفَقَ الْكَلَامُ
الْمُخْتَارُ فِي رِوَايَةٍ فَنُقِلَ عَلَى وَجْهِهِ ثُمَّ وُجِدَ

ہے۔ امیر المؤمنینؑ کے ان عجائب و خوارق میں کہ جن میں بلا
شرکت غیرے آپؑ منفرد و یکتا ہیں یہ ہے کہ آپؑ کے وہ کلمات جو
زہد و پند، تذکیر و ارشاد اور زجر و توبیخ کے سلسلے میں ہیں، جب
فکر و تامل کرنے والا ان میں دقت نظر اور غور و فکر سے کام لے اور
دل سے یہ بات نکال ڈالے کہ یہ ارشادات اس ہستی کے ہیں کہ
جس کا مرتبہ عظیم، جس کے احکام جاری و ساری، جس کی
حکومت ایک دنیا کی گردنوں پر محیط ہے۔ تو اسے قطعاً اس میں شبہ
نہ ہوگا کہ ایسے شخص کا کلام ہے جو زہد و تقویٰ کے علاوہ کسی شئے
سے بہرہ مند نہیں اور اظہار عبودیت کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ
نہیں، وہ کسی جھونپڑے کے گوشہ میں سر بگریباں یا کسی پہاڑ کے
دامن میں دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہوا ہے۔ جس کے کانوں میں اپنی
حس و حرکت کے علاوہ آواز نہیں پہنچتی اور اپنے سوا کوئی دکھائی
نہیں دیتا۔ بھلا کیونکر اسے یقین آئے گا کہ یہ اس کا کلام ہے جو
تلوار سونت کر جنگ کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو گردنیں
کاٹ کر رکھ دیتا ہے، شہ زوروں کو زمین پر پچھاڑ دیتا ہے، تلوار لیکر
اس طرح پلٹتا ہے کہ اس سے لہو برستا ہوتا ہے اور خون دل کی
بوندیں ٹپک رہی ہوتی ہیں، اس کے باوجود آپؑ زاہدوں میں ممتاز
اور ولیوں میں فائق ہیں، یہ فضیلت آپؑ کی ان عجیب فضیلتوں اور
لطیف خصوصیتوں میں شامل ہے کہ جس کی وجہ سے آپؑ نے
متضاد صفتوں کو سمیٹ کر اور بکھرے ہوئے کمالات کو پیوند لگا کر
جوڑ دیا۔ اکثر برادران دینی سے اس کا ذکر کر کے انہیں حیرت و
استعجاب میں ڈالتا ہوں، یہ عبرت کی جگہ اور تفکر و تدبر کا مقام ہے
۔ اس انتخاب میں کہیں کہیں الفاظ و مطالب کا تکرار بھی ہو گیا جس
کیلئے یہ عذر ہے کہ آپؑ کے کلام کی مختلف صورتوں سے روایت کی
گئی تو کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک کلام منتخب کو ایک روایت میں جس
طرح پایا اسی طرح اسے نقل کر دیا، پھر وہی کلام کسی اور روایت

بَعْدَ ذٰلِكَ فِي رِوَايَةٍ أُخْرىٰ مَوْضُوعًا غَيْرَ وَضْعِهِ
الْأَوَّلِ اِمَّا بِزِيَادَةٍ مُخْتَارَةٍ اَوْ بِلَفْظٍ اَحْسَنَ عِبَارَةٍ
فَتَقْتَضِي الْحَالُ اَنْ يُعَادَ اسْتِظْهَارًا لِلْاِخْتِيَارِ وَ
غَيْرَةً عَلىٰ عَقَائِلِ الْكَلَامِ وَرُبَّمَا بَعُدَ الْعَهْدُ اَيْضاً
بِمَا اخْتِيرَ اَوَّلاً فَأُعِيدَ بَعْضُهُ سَهْواً وَ نِسْيَاناً لَا
قَصْداً وَ اِعْتِمَادًا وَمَا "لَا (خ ل)" اَدَّعِي مَعَ ذٰلِكَ
اَنِّي اُحِيطُ بِاَقْطَارِ جَمِيعِ كَلَامِهٖ حَتّىٰ لَا يَشِذَّ
عَنِّي مِنْهُ شَاذٌّ وَ لَا يَنِدُّ نَادٌّ بَلْ لَا اُبْعِدُ اَنْ يَكُونَ
الْقَاصِرُ عَنِّي فَوْقَ الْوَاقِعِ اِلَيَّ وَ الْحَاصِلُ فِي
رِبْقَتِي دُونَ الْخَارِجِ مِنْ يَدِي وَ مَا عَلَيَّ اِلَّا بَذْلُ
الْجُهْدِ وَ بَلَاغُ الْوُسْعِ وَعَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ نَهْجُ
السَّبِيلِ وَرَشَادُ الدَّلِيلِ اِنْشَاءَ اللّٰهُ وَ رَاَيْتُ مِنْ
بَعْدُ تَسْمِيَةَ هٰذَا الْكِتَابِ بِنَهْجِ الْبَلَاغَةِ اِذْ كَانَ
يَفْتَحُ لِلنَّاظِرِ فِيهِ اَبْوَابَهَا وَيُقَرِّبُ عَلَيْهِ طِلَابَهَا وَ
فِيهِ حَاجَةُ الْعَالِمِ وَ الْمُتَعَلِّمِ وَ بُغْيَةُ الْبَلِيغِ وَ
الزَّاهِدِ وَ يَمْضِي فِي اَثْنَائِهٖ مِنْ عَجِيبِ الْكَلَامِ
فِي الْعَدْلِ وَ التَّوْحِيدِ وَ تَنْزِيهِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَ
تَعَالىٰ عَنْ شِبْهِ الْخَلْقِ مَا هُوَ بِلَالُ كُلِّ غُلَّةٍ وَ
شِفَاءُ كُلِّ عِلَّةٍ وَ جِلَاءُ كُلِّ شُبْهَةٍ وَ مِنَ اللّٰهِ
سُبْحَانَهٗ اَسْتَمِدُّ التَّوْفِيقَ وَ الْعِصْمَةَ وَ اَتَنَجَّزُ
التَّسْدِيدَ وَ الْمَعُونَةَ وَ اَسْتَعِيذُهٗ مِنْ خَطَاءِ
الْجَنَانِ قَبْلَ خَطَاءِ اللِّسَانِ وَمِنْ زَلَّةِ الْكَلِمِ

میں دوسری وضع و صورت میں پایا گیا، یوں کہ اس میں کچھ قابل
انتخاب اضافہ تھا یا الفاظ کا اسلوب و نہج زیادہ حسین ودلکش تھا، لہذا
صورتحال اس کی مقتضی ہوئی کہ انتخاب کے مقصد کو زیادہ کامیاب
بنانے اور کلام نفیس وپاکیزہ کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنے کیلئے
اس کا پھر سے اعادہ کیا جائے ایسا بھی ہوا ہے کہ جو کلام پہلے نظر
انتخاب میں آچکا تھا اس سے بعید العہد ہو جانے کی وجہ سے اس کی
تکرار ہو گئی، یہ بھول چوک کی وجہ سے ہے جس میں قصد واختیار کو
دخل نہیں تھا، مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے حضرتؑ کا کلام ہر
طرف سے سمیٹ لیا ہے اور کوئی اکادکا جملہ اور بھولا بھٹکا فقرہ بھی
چھوٹنے نہیں پایا، بلکہ یہ بعید نہیں سمجھتا کہ جو مجھ سے رہ گیا ہے وہ
اس سے کہیں زیادہ ہو جو مجھ تک پہنچا ہو، اور جو میرے احاطہ علم و
تصرف میں ہے وہ اس سے کہیں کم ہو جو میرے دسترس سے باہر
ہے، میرا کام جدو جہد اور بقدر وسعت سعی وکوشش کرنا ہے یہ اللہ
سبحانہ کا کام ہے کہ وہ راہ سہل و آسان کرے اور منزل کی طرف
راہنمائی فرمائے، انشاء اللہ۔ اس جمع وانتخاب کے بعد میری رائے
ہوئی ہے کہ اس کتاب کا نام "نہج البلاغہ" رکھا جائے، اس لئے کہ
یہ کتاب دیکھنے والے کیلئے بلاغت کے بند دروازے کھولے گی اور
اس کیلئے راہ تلاش قریب کرے گی، اس سے عالم ومتعلم اپنی
ضرورتیں پوری کریں گے اور صاحب بلاغت اور تارک علائق
دنیا اپنے مقاصد پائیں گے۔ اس کتاب میں توحید، عدل اور خداوند
عالم کے جسم وجسمانیت سے منزہ ومبرا ہونے کے متعلق عجیب و
غریب کلام ملے گا جو ہر تشنگی کی سیرابی، ہر مرض کی شفا اور ہر شبہ
کا دافع ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے توفیق، بے راہ روی سے بچاؤ کا
طالب، عمل کی درستگی اور اعانت کا خواستگار ہوں۔ لغزش زبان
سے پہلے دل ودماغ کی لغزش اور لغزش قدم سے پہلے لغزش کلام

مِنْ زَلَّةِ الْكَلِمِ قَبْلَ زَلَّةِ الْقَدَمِ وَهُوَحَسْبِي وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ سے پناہ مانگتا ہوں۔وہی میرے لئے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

نہج البلاغہ کے تین محور :

تشریح سید علیہ الرحمہ نے اس فصل میں ان چند امور کی طرف متوجہ کیا ہے جن کا بتانا نہایت ضروری ہے کہ یہ کلام کس قدر عظمت کا مالک ہے امیر المؤمنین علیہ السلام کی کیا خصوصیات اور عجائبات ہیں، اس کتاب کا کیا نام اور اس کی کیا وجہ تسمیہ ہے؟ چنانچہ فرماتے ہیں کہ (وَرَاَيْتُ كَلاَمَه' يَدُوْرُ عَلى اَقْطَابٍ ثَلٰثَةٍ) اور میں نے دیکھا کہ آپؑ کا کلام تین بنیادی قسموں میں دائر ہے۔ تین امور کو "قطب" کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور قطب اس کیلی کو کہتے ہیں جو چکی کے نچلے پاٹ میں ہوتی ہے اور اوپر والا پاٹ اس کے گرد گھومتا ہے۔ تین امور کو قطب کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ آپؑ کے کلام کے تمام اجزاء و اقسام انہی تین امور کے گرد گھومتے ہیں اور یہی تین امور ان اجزا کا مدار و محور ہے اور انہی اقسام کا مرجع ہیں جیسا کہ قطب چکی کا مدار ہے اور چکی اس کے گرد گھومتی ہے پھر ان تین اجزا کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ (اَوَّلُهَا الْخُطَبُ وَالْاَوَامِرُ) اول خطبات و احکام ہیں۔ "خطبہ" عموماً اس کلام کو کہتے ہیں جو منظم و مرتب ہو جس میں بلاغت کی خوبیوں اور اوزان و فواصل کا خاص خیال رکھا جائے۔ اور "اوامر" عموماً وہ احکام ہوتے ہیں جن کا تعلق باشعور افراد کے افعال کے ساتھ ہوتا ہے جن میں ان کی دینی یا دنیوی بھلائی مضمر ہوتی ہے۔ مثلاً امور مدنیہ اور جنگی تدابیر ہیں۔ (وَثَانِيْهَا الْكُتُبُ وَالرَّسَائِلُ) دوسرے مکتوبات و رسائل۔ "مکتوبات" تو خیر معلوم ہی ہیں اور "رسائل" سے مراد یہاں پر چھوٹے چھوٹے خطوط ہیں یا وہ گفتگو ہے جو سفیروں اور قاصدوں کو کہیں روانہ کرتے وقت کی گئی یا جو کسی کی طرف سے کی گئی گفتگو کا جواب ہے۔ (وَ ثَالِثُهَا الْحِكَمُ وَالْمَوَاعِظُ) اور تیسرے حِکَم اور نصائح ہیں۔ "حِکَم" "حکمت" کی جمع ہے جس کی تفسیر اس علم کے ساتھ کی گئی ہے جو انسان کو فعل قبیح کے ارتکاب سے روکتا ہے۔ اور یہ لفظ "حکمت اللجام" سے مستعار لیا گیا ہے اور وہ لوہا ہے جو گھوڑے کی لگام میں ہوتا ہے اور اس کے منہ کے جبڑوں کی جانب ہوتا ہے جس سے لگام اس کے منہ سے باہر نہیں نکلتی۔ اور حکمت کی ایک اور تفسیر بھی کی گئی ہے اور وہ ہے معنی کو سمجھنا، کیونکہ اس سے ایک ایسی دانائی کی بات سمجھ میں آجاتی ہے جو جہالت کو روک دیتی ہے اور خداوند عالم کے اس قول میں حکمت کی یہی تفسیر کی گئی ہے کہ "وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا" (سورہ بقرہ / ۲۶۹) جسے حکمت و دانش دی گئی ہے اسے بہت بھلائی عطا کی گئی۔ تقویٰ کی نصیحت، اطاعت پر آمادہ کرنا، گناہوں سے ڈرانا، دنیا اور اس کی رنگینیوں کے دھوکے سے بچانے کو "موعظہ" کہتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بعض اوقات کتاب میں ان تین اقسام کا باہمی تداخل بھی ہو گیا ہے۔ اسی لئے سید علیہ الرحمہ نے ان میں سے ہر ایک قسم کے لئے حسن نظم اور عمدہ ترتیب قائم کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں (فَاَجْمَعْتُ) تو میں نے ارادہ کیا (بِتَوْفِيْقِ اللّٰهِ تَعَالىٰ) خدا کی توفیق اور تائید کے ساتھ (عَلَى الْاِبْتِدَاءِ بِاخْتِيَارِ مَحَاسِنِ الْخُطَبِ) پہلے احسن خطبات کو منتخب کرنے کا (ثُمَّ مَحَاسِنِ الْكُتُبِ) پھر احسن مکتوبات کو اختیار کرنے کا (ثُمَّ مَحَاسِنِ الْحِكَمِ وَالْاَدَبِ) پھر احسن حکم و آداب کو اختیار کرنے کا (مُفْرِدًا لِكُلِّ صِنْفٍ مِنْ ذٰلِكَ بَابًا) ان میں سے ہر ایک صنف کیلئے ایک علیحدہ و مستقل باب کا ارادہ کیا (وَ مُفَصِّلاً فِيْهِ اَوْرَاقًا) ہر باب میں چند

درج کردیا جائے۔(عَاجِلاً) جو تالیف کے دوران (وَيَقَعُ اِلَيَّ آجِلاً) یا تالیف کے بعد مل جائے۔

اس کلام سے سید علیہ الرحمہ کا مقصود یہ باور کرانا ہے جیسا کہ انہوں نے اسی کتاب کے آخر میں بھی ذکر کیا ہے کہ جب انہوں نے مولا علی علیہ السلام کے منتخب کلام کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تو اس کیلئے تین باب قائم کئے اور ہر باب کے آخر میں چند سفید اوراق خالی چھوڑ دیئے جو اصل نسخہ سے زائد تھے، تاکہ اس دوران جو چیزیں انہیں نہ مل سکیں اور بعد میں ہاتھ آئیں تو ہر ایک کو ان کی مناسب جگہ پر درج کریں چاہے کتاب کی تالیف کے دوران ملیں یا اس کی تکمیل کے بعد۔(وَ اِذَاجَآءَ شَيْءٌ مِنْ كَلَامِهِ الْخَارِجِ فِيْ اَثْنَاءِ حِوَارٍ اَوْجَوَابِ سُؤَالٍ اَوْغَرَضٍ آخَرَ مِنَ الْاَغْرَاضِ فِيْ غَيْرِ الْاَنْحَآءِ) اور ایسا کلام جو روز مرہ کی گفتگو یا کسی سوال و جواب میں یا کسی دوسرے مقصد کیلئے ہو، جیسے احتجاج کے موقع پر آپؑ کا پیش کردہ کلام یا وصیت یا پیغمبر خداؐ اور ان کی آل اطہار علیہم السلام کی مدح وثناء وغیرہ (اَلَّتِيْ ذَكَرْتُهَا وَ قَرَّرْتُ الْقَاعِدَةَ عَلَيْهَا) جو اقسام مذکورہ اور میرے قرار دادہ قاعدہ سے خارج ہو جس کا میں نے ذکر کیا ہے اور تین اقسام مقرر کی ہیں (نَسَبْتُهَا اِلىٰ اَلْيَقِ الْاَبْوَابِ بِهٖ وَ اَشَدِّهَا مُلَاَمَحَةً لِغَرَضِهٖ) اسے اس باب میں درج کر دیا ہے جو اس کیلئے مناسب اور اس کے مقاصد سے اشبہ ہے۔ جیسا کہ عُمّال حکومت کیلئے کچھ عہد نامے اور اپنے اہل بیتؑ واصحاب کو کی گئی چند وصیتیں منتخب مکتوبات میں درج ہیں اور جو احتجاجات اور دلائل وبرہان آپؑ نے پیش فرمائے ہیں یا پیغمبرؐ اور اولاد پیغمبرؐ کی مدح و ثناء کی ہے انہیں منتخب خطبات میں شامل کر دیا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی کافی چیزیں ہیں جو آپؑ کے کلام کے وسیع مطالعہ سے معلوم ہوں گی۔

پھر سید علیہ الرحمہ نے تقطیع والتقاط (کلام کا متعلقہ حصہ بے جا ہو گیا یا غیر متعلقہ حصہ اس میں شامل کر لیا گیا) یا درمیان کلام سے کوئی بات رہ گئی ہو تو اس بارے میں انہوں نے یہ کہہ کر عذر خواہی کی ہے کہ (وَرُبَّمَا جَاءَ فِيْمَااَخْتَارُهُ مِنْ ذٰلِكَ فُصُوْلٌ غَيْرُمُتَّسِقَةٍ) میرے اس انتخاب میں کچھ فصلیں نظم ونسق سے خارج ہیں (وَ مَحَاسِنُ كَلِمٍ غَيْرُمُنْتَظِمَةٍ) اور کچھ کلمات ربط وارتباط سے خالی ہیں اور ان میں برہمی وانتشار ہے۔(لِاَنِّيْ اُوْرِدُ النُّكَتَ وَاللُّمَعَ) چونکہ میں رموز ودقائق اور درخشندہ کلمات کو صرف سمیٹ رہا ہوں۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں کہ "نکتہ" کسی چیز میں موجود وہ اثر ہوتا ہے جس سے اس کی اجزا ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور اس کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے جسم میں کوئی نقطہ اور اثر ہوتا ہے جو نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنتا ہے اور کھجور کو اس وقت "رُطَبَةٌ مُنَكَّتَةٌ" کہتے ہیں جب اس پر رنگ آنا شروع ہوتا ہے۔ پھر اسے ایسے کلام اور مقولہ پر بولا جانے لگا جس کیلئے خصوصی غور وفکر اور دقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لئے کلام کے ایک خاص حصہ کو "نکتہ" کہا جاتا ہے۔ "لمعہ" زمین کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جہاں پر خشک گھاس ہوتی ہے اور دراصل یہ "لمعان" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "چمک" چونکہ جس زمین پر گھاس خشک ہو چکی ہوتی ہے وہ زمین کے دوسرے ٹکڑوں سے چمک دمک میں ممتاز نظر آتی ہے۔ پھر اس کا اطلاق خوبصورت اور بلیغ کلام پر ہونے لگا، کیونکہ اس سے ذہن منور ہوتے ہیں اور وہ کلام کو دوسرے کلاموں سے ممتاز کرتی ہے۔ گویا وہ خود بھی درخشندہ و تابندہ ہے۔ غرض موصوف کی مراد یہ ہے کہ وہ امیر المؤمنینؑ کے کلام کے وہ اجزا اکٹھے کر رہے ہیں جو بلاغت میں

خوبصورت اور بلیغ کلام پر ہونے لگا، کیونکہ اس سے ذہن منور ہوتے ہیں اور وہ کلام کو دوسرے کلاموں سے ممتاز کرتی ہے۔ گویا وہ خود ہی درخشندہ و تابندہ ہے۔ غرض موصوف کی مراد یہ ہے کہ وہ امیر المؤمنینؑ کے کلام کے وہ اجزا اکٹھے کر رہے ہیں جو بلاغت میں درخشندہ اور نمایاں مقام رکھتے ہیں اسی لئے انھوں نے فرمایا(وَ لاَ اَقْصِدَ التَّتَالِيَ وَ النَّسَقَ)اور ربط و ترتیب میرا مقصود نہیں ہے ۔اس کے بعد انھوں نے حضرت امیرؑ کے بعض عجیب خصائل کو بیان فرمایا ہے جو مجموعہ اضداد ہیں فرماتے ہیں(وَ مِنْ عَجَائِبِهٖ علیہ السلام الَّتِيْ انْفَرَدَبِهَا وَ اَمِنَ الْمُشَارَكَةَ فِيْهَا)اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے ان عجائب و خوارق میں کہ جن میں بلاشرکت غیرے آپؑ منفرد و یکتا ہیں اور وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی وہ یہ کہ (اَنَّ كَلاَمَهٗ الْوَارِدَ فِي الزُّهْدِ وَ الْمَوَاعِظِ وَ التَّذْكِيْرِوَالزَّوَاجِرِ) آپؑ کے وہ کلمات جو زہد و پند، تذکیر و ارشاد اور زجر و توبیخ کے سلسلے میں ہیں یعنی جن میں وعد و وعید اور بشارت و انذار پایا جاتا ہے(اِذَاتَاَمَّلَهٗ الْمُتَاَمِّلُ وَفَكَّرَفِيْهِ الْمُتَفَكِّرُ)جب فکر و تامل کرنے والا ان میں دقت نظر اور غور و فکر سے کام لے (وَخَلَعَ مِنْ قَلْبِهٖ اَنَّهٗ كَلاَمُ مِثْلِهٖ)اور دل سے یہ بات نکال ڈالے کہ یہ ارشادات اس ہستی کے ہیں، یعنی یہ فرض کرلے کہ یہ کلام آپؑ کا نہیں ہے اور اسے آپؑ کا کلام سمجھنے سے آنکھیں بند کرے اور یہ نہ سمجھے (مِمَّنْ عَظُمَ قَدْرُهٗ وَ نَفَذَ اَمْرُهٗ وَ اَحَاطَ بِالرِّقَابِ مُلْكُهٗ) کہ یہ کلام اس ہستی کا ہے جس کا مرتبہ عظیم، جس کے احکام جاری و ساری اور جس کی حکومت ایک دنیا کی گردنوں پر محیط ہے اور وہ سلطان البلاد اور خلیفۃ العباد ہے(لَمْ يَعْتَرِضْهُ الشَّكُّ) تو قطعاً اسے کوئی شبہ نہ ہوگا(فِيْ اَنَّهٗ كَلاَمُ)اس بات میں کہ یہ خدا کے ایسے خالص بندے کا کلام ہے(مَنْ لاَحَظَّ لَهٗ فِيْ غَيْرِالزَّهَادَةِوَلاَشُغُلَ لَهٗ بِغَيْرِالْعِبَادَةِ)جو غیر اللہ سے مکمل طور پر منہ موڑ چکا ہے اور زہد و تقویٰ کے علاوہ کسی شئے سے بہرہ مند نہیں اور اظہار عبودیت کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہیں۔(قَدْقَبَعَ فِيْ كِسْرِبَيْتٍ اَوِ انْقَطَعَ اِلىٰ سَفْحِ جَبَلٍ) کسی جھونپڑے کے گوشے میں سر بگریباں یا کسی پہاڑی کے دامن میں الگ تھلگ پڑا ہوا ہے یعنی دنیا سے مکمل طور پر منہ موڑے ہوئے گوشۂ گمنامی کو اختیار کئے ہوئے ہے ،(لاَيَسْمَعُ اِلاَّ حِسَّهٗ وَ لاَ يَرىٰ اِلاَّ نَفْسَهٗ)جس تارک الدنیا زاہد کے کانوں میں اپنی حس و حرکت کے علاوہ کوئی آواز نہیں پہنچتی اور اپنے سوا اسے کوئی دکھائی نہیں دیتا ،(وَ لاَيَكَادُيُوْقِنُ بِاَنَّهٗ كَلاَمُ مَنْ يَنْغَمِسُ فِي الْحَرْبِ) بھلا اسے کیونکر یقین آئے گا کہ یہ اس کا کلام ہے جو جنگ کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ یہاں پر استعارہ بالکنایہ سے کام لیا گیا ہے کیونکہ گہرائی کے اعتبار سے جنگ اور لڑنے والوں کے باہم گڈمڈ ہونے کو ایسے پانی سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی اوپر نیچے کئی موجیں ہوں۔اور جنگ کی گہرائی میں ڈوبنے کو ثابت کیا ہے جس طرح پانی کی گہرائیوں میں انسان ڈوب جاتا ہے، یہ استعارہ تخییلیہ ہے۔ اور اس کے فوراً بعد یہ فرمایا ہے(مُصْلِتًا سَيْفَهٗ) تلوار سونت کر(فَيَقُطُّ الرِّقَابَ) پس گردنیں کاٹ دیتا ہے۔ روایات کے مطابق امیر المؤمنینؑ کی تلوار کی کاٹ عجیب تھی وہ یوں کہ ”اِنْ ضَرَبَ عَرْضًا قَطَّ وَ اِنْ ضَرَبَ طُوْلاً قَدَّ“ اگر عرض میں تلوار چلاتے تو دشمن کا قط کر دیتے جس طرح قلم کا قط کیا جاتا ہے اور اگر طول میں وار کرتے تو برابر کے دو ٹکڑے کر دیتے۔(وَ يُجَدِّلُ الْاَبْطَالَ)اور شہ زوروں کو زمین پر پچھاڑ دیتا ہے،(وَيَعُوْدُبِهٖ يَنْطِفُ دَمًا وَ يَقْطُرُ مُهَجًا)اور تلوار لے کر اس طرح پلٹتا ہے کہ اس سے لہو رستا ہوتا ہے اور خون دل کی بوندیں ٹپک رہی ہوتی ہیں۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں: ”اگر ہم ’مُهَج‘ سے مراد خون لیں تو تلوار کی طرف قطروں کی نسبت حقیقی ہوگی اور اگر اس کی

میں ممتاز اور ابدال (ولیوں) میں فائق ہیں۔

فضائل علیؑ :

شارحؒ کہتے ہیں : "آپؑ کی شجاعت، دلاوری اور مد مقابل کے ساتھ پنجہ آزمائی کسی بیان کی محتاج نہیں، صاحب کشف الغمہ فرماتے ہیں ؛ جہاں بڑے بڑے بہادروں کے قدم لرز اٹھتے تھے اور فرار کو قرار پر ترجیح دینے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے وہاں پر امیر المؤمنینؑ سیسہ پلائی دیوار بن کر لڑتے اور اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے۔ جہاں پر بے تابی اور بے صبری کی وجہ سے دماغ پھٹنے لگتے وہاں آپؑ صبر و استقلال کا پیکر نظر آتے۔ جہاں پر صاحبان شجاعت کے دل کانپ رہے ہوتے وہاں آپؑ کی سطوت و عظمت قابل دید ہوتی، جہاں پر سورماؤں کے قدم ڈگمگا رہے ہوتے وہاں پر آپؑ کا استقرار قابل دید ہوتا، جہاں پر لوگوں کے کلیجے منہ کو آ رہے ہوتے وہاں آپؑ کی بلند ہمتی قابل نظارہ ہوتی۔ جہاں جنگ کی چکی گھوم رہی ہوتی، خون کے دریا بہہ رہے ہوتے اور نیزوں کی انیاں ستاروں کی مانند طلوع و غروب کر رہی ہوتیں وہاں پر آپؑ کی صولت و بسالت کی داد دینی پڑتی۔ آپؑ نے پیغمبر خداؐ کی ذات کی کیونکر حفاظت کی اور ان کے سر پر منڈلاتے ہوئے جنگ کے بادلوں کو کیونکر صاف کیا جبکہ آنحضرتؐ کے قریبی ساتھی اپنی جان بچا کر پا بہ فرار ہو چکے تھے اور آپؑ نے اپنی عزیز جان کی قربانی کیسے پیش کی؟ صرف اس لئے کہ آپؑ کو یقین تھا کہ اس کا نعم البدل خدا کے ہاں پہلے سے تیار رکھا ہے۔ سو یہ ایسے امور ہیں کہ جن کی شہرت نصف النہار کی مانند ہے کہ جسے کوئی چھپا نہیں سکتا اور ایسی کیفیت ہے جو اظہر من الشمس ہے، جسے ماضی اور حال کے لوگ جانتے ہیں، اخبار و سِیَر کی کتابیں اس سے چھلک رہی ہیں، دور و نزدیک کا ہر شخص جانتا ہے، دوست و دشمن اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے اور بیگانے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

آپؑ نے کفار کے جتھوں کو پراگندہ کیا، ان کی زندگی کی کھیتیوں کو ذوالفقار کے ساتھ کاٹ کر رکھ دیا، انہیں گھروں سے نکال کر جنگلوں اور بیابانوں میں منتشر کر دیا، جنگ اور لڑائی کے دنوں میں پرندوں کو اپنی میزبانی کا شرف عطا کیا، خدا کی چل جانے والی تلوار تھے، پیغمبر خداؐ کے نائب باوقار تھے، بدر نے آپؑ کی ثابت قدمی کو دیکھا، حنین نے آپؑ کی تلوار کے جوہر ملاحظہ کئے، احد کو ابھی تک آپؑ کی تلوار اور نیزے کے زخم نہیں بھولے، خیبر ابھی تک آپؑ کی فتح و کامرانی کے اعلان کر رہا ہے کہ خدا نے آپؑ کے دست حق پرست کو نصرت و فتح عطا فرمائی اور خندق کو ابھی تک عمرو بن عبدود کا ناک اور منہ کے بل گرنا نہیں بھولا۔ یہ ایسے جملے ہیں کہ جن کیلئے تفصیل درکار ہے اور ایسے مقامات ہیں جہاں پر رب رحمٰن کی رضا آپؑ کے شامل حال رہی۔ ایسی منازل ہیں کہ جہاں کفر و شرک کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا اور کفار و مشرکین کی ناک کو زمین پر رگڑ رگڑ کر انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ ایسے مواقع ہیں کہ جہاں جبرائیل آپؑ کے ہمرکاب رہے، میکائیل دست و بازو بنے، اللہ نے اپنی خاص عنایات سے نواز اور پیغمبرؐ نے اپنی دعاؤں سے سرفراز فرمایا۔

آپؑ کے زہد کی یہ کیفیت ہے کہ تمام روایات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زہد، عبادت اور ورع کی کوئی قسم ایسی نہیں تھی جس میں آپؑ کا وافر حصہ نہ ہو اور اس میں برابر کے شریک نہ ہوں بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیا ہو۔ جس خیر اور نیکی میں تمام اصحاب کا اجماع ہوتا وہاں پر آپؑ ان کے امام ہوتے، بلندی و شرافت کے جس زینے پر بھی وہ قدم رکھتے آپؑ ان کے پیشوا ہوتے۔ آپؑ

نے دنیا کو بعینہ دیکھ لیا تھا اور اسے اچھی طرح پہچان گئے تھے وہ دلہن کی طرح بن سنور کر آپؑ کے سامنے آئی لیکن آپؑ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اس لئے کہ اس کی برائیوں کو سمجھ چکے تھے، اس کے زوال سے آشنا ہو چکے تھے، اس لئے اس سے کنارہ کش رہے اور اس کے ہجر کو وصال پر ترجیح دی، اس کی رسی کو کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، اس کے انجام سے باخبر ہو چکے تھے اور اس کے گندے پانی کے گھاٹوں کی حقیقت آپؑ کے سامنے آچکی تھی۔ لہذا آپؑ نے اس کی رسی اس کے کندھے پر ڈال دی، اسے اس کے طلبگار کیلئے چھوڑ دیا اور اس کے یقینی نقصانات سے آگاہ ہو چکے تھے اسی لئے اسے تین طلاقیں دے کر ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا۔

آپؑ ولیوں میں فائق تھے، بدل الابدال تھے، اس لئے کہ "ابدال" ائمہ علیھم السلام ہی ہیں، جیسا کہ ہماری بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر اس سے مراد وہ صالح لوگ ہیں جن سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی، اگر ان میں سے کوئی رخصت ہو جاتا ہے تو خداوند عالم اس کی جگہ پر ایک اور کو لے آتا ہے، اور کتاب قاموس میں ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کی وجہ سے خدا نے زمین کو قائم رکھا ہوا ہے اور ان کی تعداد ستر ہے جن میں سے چالیس حضرات کا تعلق شام سے ہے اور باقی کا دوسرے علاقوں سے۔ ان میں جو بھی اس دنیا سے رخت سفر باندھتا ہے تو دوسرا اس کا قائم مقام ہوتا ہے۔

غرض، تعبیر خواہ کوئی بھی ہو آپؑ ان سب اولیاؑ و ابدال میں فائق ہیں۔ اسی طرح آپؑ قدوۃ الصالحین ہیں کہ جس کے نقش قدم پر خدا کے صالح اور نیک بندے چلتے ہیں۔ اور آپؑ اور آپؑ کی طیب و طاہر اولاد کے دم قدم سے زمین کا وجود باقی ہے اور یہ بات اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ کسی دلیل اور برہان کی محتاج نہیں۔ کیونکہ آپؑ امام الآئمہ اور خاتم الانبیاءؐ کے بعد سید الأمۃ ہیں۔ زمین کبھی امام امت کے وجود سے خالی نہیں رہی، اگر خالی ہو تو اپنے اہل سمیت دھنس کر رہ جائے، روایات نے اس بات کی نشاندہی کی ہے۔

جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ آپؑ کی ذات زہد اور شجاعت جیسے صفات کی جامع تھی جب کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور سید علیہ الرحمہ اسی کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں (وَهٰذِهٖ مِنْ فَضَآئِلِهِ الْعَجِيْبَةِ وَخَصَآئِصِهِ اللَّطِيْفَةِ الَّتِيْ جَمَعَ بِهَا بَيْنَ الْاَضْدَادِ وَاَلَّفَ بَيْنَ الْاَشْتَاتِ) اور یہ فضیلت آپؑ کی ان عجیب فضیلتوں اور لطیف خصوصیتوں میں شامل ہیں کہ جس کی وجہ سے آپؑ نے متضاد صفتوں کو سمیٹ کر اور بکھرے ہوئے کمالات کو پیوند لگا کر جوڑ دیا۔ (وَكَثِيْرًا مَّا اُذَاكِرُ الْاِخْوَانَ بِهَا وَ اَسْتَخْرِجُ عُجْبَهُمْ مِنْهَا) اکثر برادرانِ دینی سے اس کا ذکر کر کے انہیں حیرت و استعجاب میں ڈالتا ہوں۔ ان کا تعجب یا تو تحسین کی وجہ سے ہوتا ہے یا پھر کیفیت کو عجیب و غریب سمجھنے کی وجہ سے (وَهِيَ مَوْضِعٌ لِّلْعِبْرَةِ بِهَا وَالْفِكْرَةِ فِيْهَا) اور یہ عبرت کی جگہ اور تفکر و تدبر کا مقام ہے۔ کیونکہ اکثر بہادر اور جری لوگ دل کے سخت، لاپرواہ، سرکش اور جابرانہ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر زاہد اور تارک دنیا گوشہ نشین اور دنیا سے بے خبر ہوتے ہیں، اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا، انہیں معاد سے ڈرانا، موت کی یاد دلانا، ایک ایسا مشغلہ ہے جو نرم دل اور رقیق القلب لوگ ہی سر انجام دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں متضاد صفات صرف آپؑ ہی کی ذات میں جمع ہیں۔

اسی طرح عموماً ہوتا یہ ہے کہ شجاع اور میدان کارزار سے تعلق رکھنے والے کم ہی کسی کو معاف کرتے ہیں اور مشکل سے کسی سے درگزر کرتے ہیں، کیونکہ ان کے سینے غصے سے بھرے ہوتے ہیں اور دل میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے ہوتے ہیں اور

قوت غضب میں تیزی ہوتی ہے لیکن جنگ جمل میں آپؑ کا کردار سب پر عیاں ہے کہ اپنے مقابل میں آنے والوں کو کیسے معاف کر دیا اور کس قدر حلم و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اور کیونکر اپنی نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھا۔ یہ اور اس قسم کے ہزاروں دوسرے واقعات ایسے ہیں جو آپؑ کی عظمت کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔

اسی لئے تو شاعر نے آپ کی شان میں کہا ہے ؛

جُمِعَتْ فِيْ صِفَاتِكَ الْاَضْدَادُ فَلِهٰذَا عَزَّتْ لَكَ الْاَنْدَادُ

زَاهِدٌ حَاكِمٌ حَلِيْمٌ شُجَاعٌ فَاتِكٌ نَاسِكٌ فَقِيْرٌ جَوَادُ

ظَهَرَتْ مِنْكَ لِلْوَرٰى مُكْرَّمَاتٌ فَاَقَرَّتْ بِفَضْلِكَ الْحُسَّادُ

لَوْ رَاٰى مِثْلَكَ النَّبِيُّ لَآخَاهُ وَ اِلَّا فَاَخْطَأَ الْاِنْتِقَادُ

جَلَّ مَعْنَاكَ اَنْ يُحِيْطَ بِهِ الشِّعْرُ وَ يُحْصِيْ صِفَاتِكَ النُّقَّادُ

تیری صفات مجموعہ اضداد ہیں، اسی لئے تیرے ساتھ برابری کرنے والے ناپید ہیں، تو زاہد حکمران، بردبار بہادر، نڈر حملہ آور اور عبادت گذار اور نادار ہونے کے باوجود سخی ہے۔ تیری ذات سے خلق خدا کیلئے عزت و کرامت کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں اور تیرے حاسدوں کو بھی تیری فضیلت کا اعتراف ہے۔ اگر پیغمبر اکرمؐ کی نگاہ میں آپؑ جیسا کوئی ہوتا تو وہ اسے اپنا بھائی بناتے، ورنہ ان کے جانچ پڑتال میں فرق آجاتا۔ تیری ذات اس سے بالاتر ہے کہ یہ اشعار اس کا احاطہ کر پائیں، اور نقاد تیری صفات کو شمار کر پائیں۔

سید علیہ الرحمہ نے ایک بار پھر اس بات کی معذرت خواہی کی ہے کہ کتاب میں بعض مقامات پر اتفاق سے مکرر روایات ذکر ہوگئی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں (وَ رُبَّمَا جَآءَ فِيْ اَثْنَاءِ هٰذَا الْاِخْتِيَارِ اللَّفْظُ الْمُرَدَّدُ وَالْمَعْنَى الْمُكَرَّرُ) اس انتخاب میں کہیں کہیں الفاظ و مطالب کا تکرار بھی ہو گیا ہے جیسا کہ آپ انشاء اللہ اس کے مقام سے مطلع ہوں گے اور سید علیہ الرحمہ اس بات کی طرف اشارہ فرمائیں گے یا پھر ہم متوجہ کریں گے (وَ الْعُذْرُ فِيْ ذٰلِكَ اَنَّ رِوَايَاتِ كَلَامِهٖ تَخْتَلِفُ اخْتِلَافًا شَدِيْدًا) جس کیلئے عذر یہ ہے کہ آپؑ کے کلام کی مختلف صورتوں سے روایت کی گئی ہے جس میں کافی اختلاف نظر آتا ہے۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں اختلاف روایات کے دو اسباب ہو سکتے ہیں ؛

ا۔ بعض اوقات آپؑ نے ایک ہی معنی کیلئے دو یا اس سے زیادہ مرتبہ مختلف الفاظ استعمال فرمائے، جیسا کہ ارباب فصاحت و بلاغت کی شان ہے۔ تو اس وقت سامعین میں سے جس نے پہلا لفظ سنا اسے نقل کر دیا اور جس نے دوسرا لفظ سنا اسے بیان کر دیا، جس سے روایت کے الفاظ مختلف ہو گئے۔

ب۔ صدر اول کے لوگ جب کسی خطیب کی زبان سے کوئی لفظ سن لیتے تو اسی طرح اسے فوراً یاد کر لیتے اور بعض اوقات تمام الفاظ اور ان کی ترتیب کو یاد نہیں رکھ سکتے تھے، جس سے ترتیب میں اختلاف اور روایت میں نقص پیدا ہو گیا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ معنی کو تو پابندی کے ساتھ یاد کر لیا لیکن خطیب کے الفاظ کو پوری طرح یاد نہ کر سکے۔ جس سے الفاظ کی کمی بیشی واقع ہو گئی۔ (فَرُبَّمَا اتَّفَقَ الْكَلَامُ الْمُخْتَارُ فِيْ رِوَايَةٍ فَنُقِلَ عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ وُجِدَ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى مَوْضُوْعًا غَيْرَ

وَضْعِهِ الْاَوَّلِ) تو کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک کلام منتخب کو ایک روایت میں جس طرح پایا گیا اسی طرح اسے نقل کر دیا، پھر وہی کلام کسی اور روایت میں دوسری وضع وصورت میں پایا گیا (اِمَّا بِزِيَادَةٍ مُخْتَارَةٍ اَوْ بِلَفْظٍ اَحْسَنَ عِبَارَةٍ) یوں کہ اس میں قابل انتخاب اضافہ تھا یا الفاظ کا اسلوب و نہج پہلی روایت سے زیادہ حسین اور دلکش تھا (فَتَقْتَضِي الْحَالُ اَنْ يُعَادَ اسْتِظْهَارًا لِلْاِخْتِيَارِ وَ غَيْرَةً عَلٰى عَقَائِلِ الْكَلَامِ) لہذا صورتحال اس کی مقتضی ہوئی کہ انتخاب کے مقصد کو زیادہ کامیاب بنانے کیلئے اور نفیس و پاکیزہ کلام کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنے کیلئے اس کا پھر سے اعادہ کیا جائے۔ (وَرُبَّمَا بَعُدَ الْعَهْدُ اَيْضًا بِمَا اخْتِيرَ اَوَّلاً فَاُعِيدَ بَعْضُهُ سَهْوًا وَ نِسْيَانًا لَا قَصْدًا وَ اعْتِمَادًا) بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ جو کلام پہلے نظر انتخاب میں آ چکا تھا اس سے بعید العہد ہو جانے کی وجہ سے اس کی تکرار ہو گئی، یہ بھول چوک کی وجہ سے ہے جس میں قصد و اختیار کو دخل نہیں تھا۔ (وَ لَا اَدَّعِيْ مَعَ ذٰلِكَ اَنِّيْ اُحِيطُ بِاَقْطَارِ جَمِيعِ كَلَامِهِ حَتّٰى لَا يَشِذُّ عَنِّيْ مِنْهُ شَاذٌّ وَلَا يَنِدُّ نَادٌّ) مجھے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے حضرت کا کلام ہر طرف سے سمیٹ لیا ہے اور کوئی اکا دکا جملہ اور بھولا بھٹکا فقرہ بھی چھوٹنے نہیں پایا (بَلْ لَا اُبْعِدُ اَنْ يَكُونَ الْقَاصِرُ عَنِّيْ فَوْقَ الْوَاقِعِ اِلَيَّ وَ الْحَاصِلُ فِيْ رِبْقَتِيْ) بلکہ میں یہ بعید نہیں سمجھتا کہ جو مجھ سے رہ گیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہو جو مجھ تک پہنچا ہو۔ موصوف نے حاصل شدہ کلام کو اس چوپائے سے تشبیہ دی ہے جس کے سر کو رسی سے مضبوطی سے باندھا جائے، یہاں پر انہوں نے رسی کیلئے استعارہ بالکنایہ کا استعمال کیا ہے اور اسے مضبوطی کے ساتھ باندھنے کو استعارہ تخییلیہ سے تعبیر کیا ہے، جس سے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعید نہیں ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ لگا ہے (دُونَ الْخَارِجِ مِنْ يَدِيْ وَ مَا عَلَيَّ اِلَّا بَذْلُ الْجُهْدِ وَ بَلَاغُ الْوُسْعِ) وہ اس سے کہیں کم ہو جو میرے دسترس سے باہر ہو۔ میرا کام تو بس جدو جہد اور بقدر وسعت سعی و کوشش کرنا ہے۔ (وَعَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ نَهْجُ السَّبِيلِ وَ رَشَادُ الدَّلِيلِ) اور یہ اللہ سبحانہ کا کام ہے کہ وہ راہ کو سہل اور واضح کرے اور منزل کی طرف راہنمائی فرمائے اور استقامت عطا کرے، کیونکہ جو بندے کے بس میں ہے وہ مکمل طور پر جدو جہد اور سعی و کوشش ہے اور یہ خدا کا کام ہے کہ اپنے لطف و کرم سے صراط مستقیم اور منزل مقصود کی راہنمائی کرے (اِنْشَآءَ اللّٰهُ)۔

کتاب کی وجہ تسمیہ :

اس کے بعد انہوں نے اس کتاب کے نام رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وَ رَاَيْتُ مِنْ بَعْدُ) اور اس جمع و انتخاب کے بعد میری رائے یہ ہے کہ (تَسْمِيَةَ هٰذَا الْكِتَابِ بِنَهْجِ الْبَلَاغَةِ اِذْ كَانَ يَفْتَحُ لِلنَّاظِرِ فِيهِ اَبْوَابَهَا وَيُقَرِّبُ عَلَيْهِ طِلَابَهَا) اس کتاب کا نام "نہج البلاغہ" رکھا جائے۔ اس لئے کہ یہ کتاب دیکھنے والوں کیلئے بلاغت کے بند دروازے کھولے گی اور اس کیلئے راہ تلاش قریب کرے گی۔ بلاغت کا متلاشی اس کے ذریعہ اس کے لطائف تک جا پہنچے گا اور اس کی خوبیوں سے بہرہ مند ہونے کیلئے راہیں آسان ہو جائیں گی۔ جس طرح کہ صاف و واضح رستے پر چلنے سے مطلوب تک رسائی ہو جاتی ہے اور مقصود کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شارح علیہ الرحمہ بھی فرماتے ہیں کہ: اسی لئے ہم نے اپنی اس شرح کا نام "منہاج البراعہ" رکھا ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ

دیکھنے والوں کو اپنے جیسے دوسرے لوگوں پر غلبہ اور فوقیت حاصل ہوتی ہے اور وہ علم و فضل اور کمال کے فائق درجوں تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے گوئے سبقت لے جاتا ہے۔(وَفِيهِ حَاجَةُ الْعَالِمِ وَ الْمُتَعَلِّمِ وَ بُغْيَةُ الْبَلِيغِ وَ الزَّاهِدِ)اس سے عالم و متعلم اپنی ضرورتیں پوری کریں گے اور صاحبان بلاغت اور تارک علائق دنیا اپنے مقاصد پائیں گے۔

(وَ يَمْضِيْ فِيْ اَثْنَائِهِ مِنْ عَجِيبِ الْكَلَامِ فِي الْعَدْلِ وَ التَّوْحِيدِ)اور اس کتاب میں توحید اور عدل کے متعلق عجیب و غریب کلام ملے گا۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام سے توحید و عدل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا "توحید یہ ہے کہ تو خدا کو وہم و خیال میں نہ لے آئے اور "عدل" یہ ہے کہ تو اسے متہم نہ کرے۔ اور اسی بات کو سید علیہ الرحمہ کتاب کے آخر میں لے آئے ہیں(وَ تَنْزِيهِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰى عَنْ شِبْهِ الْخَلْقِ)اور خداوند عالم کا جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہونے کے بارے میں بھی عجیب و غریب کلام ملے گا۔ بنابرایں اس کا عطف سابقہ جملے پر ہوگا۔ اور اس بارے میں آپ کو خطبات امیر المؤمنین علیہ السلام سے سب کچھ مل جائے گا۔(مَا هُوَ بِلَالُ كُلِّ غُلَّةٍ وَ شِفَاءُ كُلِّ عِلَّةٍ وَ جِلَاءُ كُلِّ شُبْهَةٍ)جو ہر تشنگی کی سیرابی، ہر مرض کی شفا اور ہر شبہ کا دافع ہے یعنی شبہ کی تاریکیاں اس سے کافور ہو جائیں گی یا دلوں پر شکوک و شبہات کے زنگ ایسے اتریں گے جس طرح تلوار کو صیقل کرنے سے اس کا زنگ دور ہو جاتا ہے، اسی لئے حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "حدیث بیان کیا کرو کیونکہ حدیث دلوں کی جلاء کا سبب ہوتی ہے"۔ اس لئے کہ حدیث دلوں سے زنگ دور کر کے انہیں اسی طرح چمکا دیتی ہے جس طرح تلوار کو صیقل چمکدار بنا دیتا ہے۔(وَ مِنَ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ اَسْتَمِدُّ التَّوْفِيقَ وَ الْعِصْمَةَ)اور میں اللہ سے ہر نیکی کی توفیق اور ہر برائی سے بچنے کی توفیق کا طالب ہوں، یہاں پر ظرف کو حصر کیلئے مقدم کیا گیا ہے۔(وَ اَتَنَجَّزُ التَّسْدِيدَ وَ الْمَعُوْنَةَ) قول اور عمل کی درستگی اور منزل مقصود تک پہنچنے کی اعانت کا خواستگار ہوں(وَ اَسْتَعِيذُهُ مِنْ خَطَاءِ الْجِنَانِ قَبْلَ خَطَاءِ اللِّسَانِ)اور پناہ مانگتا ہوں لغزش زبان سے پہلے لغزش دل و دماغ سے، کیونکہ دل و دماغ کی لغزش بڑی عظیم اور اس کی ٹھوکر کی حسرت دائمی ہوتی ہے، اس لئے کہ دل تمام اعضاء کا رئیس اور تمام جوارح کا سلطان ہوتا ہے، اس کے فاسد ہو جانے سے سارے نظام میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی خطاؤں میں سے ایک کفر بھی ہے جو دائمی عذاب اور عظیم ذلت و خواری کا موجب ہوتا ہے(وَ مِنْ زَلَّةِ الْكَلِمِ قَبْلَ زَلَّةِ الْقَدَمِ)اور لغزش قدم سے پہلے لغزش کلام سے پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ قدم کی لغزش سے انسان سنبھل سکتا ہے اور اس کا علاج آسانی سے کیا جا سکتا ہے، لیکن زبان کی لغزش کا ازالہ بہت مشکل ہوتا ہے اور بعض اوقات اس سے ایک ایسا کلمہ نکل جاتا ہے جو چار دانگ عالم میں پھیل جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ناجائز طور پر خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور عزتیں اور ناموس تباہ و برباد ہو جاتے ہیں(وَ هُوَ حَسْبِيْ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ)وہی میرے لئے کافی اور اچھا کارساز ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" (سورہ طلاق / ۳) جو شخص اللہ پر توکل کرے تو اللہ اس کے امر کی کفایت کرتا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کیلئے ایک اندازہ مقرر فرمایا ہے۔

شارح علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: خداوند عالم کے فضل و کرم اور توفیق کے ساتھ یہاں پر نہج البلاغہ کا دیباچہ ختم ہو جاتا ہے اب امیر المؤمنین علیہ السلام کے خطبات کی شرح کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ خدا ہمارا ناصر و مددگار ہے، اور اسی پر ہمارا بھ[illegible]

(قول مترجم: خدا کے فضل وکرم اور معصومینؑ کی عنایات سے منہاج البراعہ مع نہج البلاغہ کے دیباچے کے ترجمہ کا مرحلہ طے پا گیا ہے اور انشاء اللہ امام المتقین امیر المؤمنین اسد اللہ الغالب حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام کے مقدس خطبات پر مشتمل حصہ کی تشریح کے ترجمہ کا آغاز کیا جارہا ہے۔ پروردگار عالم سے التجا ہے کہ اس مقدس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ وہی ہمارا ملجاء وماویٰ اور حامی وناصر ہے اور اسی سے ہی ہم طالب مدد ہیں۔ وانا الاحقر محمد علی فاضل مدیر جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام وجامعہ زینبیہؑ راجن پور، پنجاب، پاکستان)

آغاز شرح نہج البلاغہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَوْضَحَ لَنَا الْمَحَجَّةَ الْبَيْضَاءَ وَ النَّهْجَ الْقَوِيْمَ وَ هَدٰينَا اِلَى الْجَادَّةِ الْوُسْطٰى وَ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْمَبْعُوْثِ بِالنُّوْرِ السَّاطِعِ وَ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ وَ آلِهِ الَّذِيْنَ اتَّخَذْتُ سُنَّتَهُمْ شَرِيْعَةً وَ مِنْهَاجًا وَ طَرِيْقَتَهُمْ سُلَّمًا اِلٰى نَيْلِ الْمَطَالِبِ وَ مِعْرَاجًا وَ وِلَايَتَهُمْ عِلَاجًا لِدَاءِ زَلَّاتِيْ اِذَا اخْتَارَ كُلُّ قَوْمٍ عِلَاجًا۔

بعد از حمد و صلوٰۃ اپنے رب رحیم و کریم کی مغفرت کا محتاج شارح (اسی طرح اس کا حقیر و نالائق مترجم محمد علی فاضل، خدا ان دونوں کی خطاؤں سے در گذر فرمائے) عرض گزار ہے کہ شریف رضی ذوالحسبین ابوالحسن سید محمد بن ابی احمد حسین، اللہ انہیں ہمیشہ اپنی رحمت کے سائے میں رکھے اور بہشت برین کی نعمتوں سے نوازتا رہے فرماتے ہیں :

منتخب خطبات :

"بَابُ الْمُخْتَارِ مِنْ خُطَبِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ علیہ السلام وَ اَوَامِرِهٖ "امیر المؤمنین علیہ السلام کے منتخب خطبات و احکام کا باب۔ "وَيَدْخُلُ فِيْ ذٰلِكَ الْمُخْتَارُ مِنْ كَلَامِهِ الْجَارِيْ مَجْرَى الْخُطَبِ فِي الْمَقَامَاتِ الْمَحْصُوْرَةِ وَالْمَوَاقِفِ الْمَذْكُوْرَةِ وَالْخُطُوْبِ الْوَارِدَةِ "اس باب میں آپ کی وہ گفتگوئیں بھی درج ہیں جنہیں مختلف مجلسوں معرکوں اور پیش آنیوالے حادثوں میں خطبے کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔

فَمِنْ خُطْبَةٍ لَهٗ علیہ السلام يَذْكُرُ فِيْهَا ابْتِدَاءَ خَلْقِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَخَلْقَ آدَمَ علیہ السلام وَهِيَ الْخُطْبَةُ الْاُوْلٰى مِنَ الْمُخْتَارِ فِيْ بَابِ الْخُطَبِ

آپؑ کا خطبہ جس میں ابتدائے آفرینش زمین و آسمان اور پیدائش آدمؑ کا ذکر فرمایا ہے اور یہ آپؑ کے منتخب خطبات میں سے پہلا خطبہ ہے۔

اور اسی خطبہ میں حج اور اس کے وجوب کا بیان ہے اور اسی خطبے کا شمار آپؑ کے عظیم و مشہور خطبات میں ہوتا ہے جسے محدث اہل بیت علامہ مجلسی مرحوم نے اپنی کتاب بحار الانوار میں "اِلٰى يَوْمِ وَقْتِ مَعْلُوْمٍ" تک، محمد بن علی واسطی کی کتاب "عیون

الحکمت والمواعظ" کی گیارہویں فصل کے آخر سے نقل فرمایا ہے اور اس کی شرح چند فصلوں میں کی جائے گی۔

پہلی فصل

حمد و ثنائے باری تعالیٰ :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لاَ يَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُوْنَ وَلاَ يُحْصِيْ نَعْمَائَهُ العَادُّوْنَ وَ لاَ يُؤَدِّيْ حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُوْنَ.

حمد اس اللہ کیلئے ہے جس کی مدح تک بولنے والوں کی رسائی نہیں، جس کی نعمتوں کو گننے والے گن نہیں سکتے اور نہ کوشش کرنے والے اس کا حق ادا کر سکتے ہیں

تشریح حمد، مدح اور شکر قریب المعنی الفاظ ہیں اور ثنائے جمیل پر دلالت کرنے میں مشترک ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر تو حمد اور مدح کو ایک سمجھا جاتا ہے اور دونوں کو جڑواں بھائی تصور کیا جاتا ہے۔

صاحب کشاف فرماتے ہیں : "حمد اور مدح" دو برابر کے بھائی ہیں اور کسی جمیل پر ثنا کو کہتے ہیں وہ جمیل نعمت ہو یا کوئی اور چیز۔ جس طرح کہ کہا جاتا ہے "حَمِدْتُ الرَّجُلَ عَلیٰ اِنْعَامِهٖ "میں نے مرد کی حمد کی اس کے انعام دینے پر۔ یا "حَمِدْتُہٗ عَلیٰ حُسْنِهٖ وَ شُجَاعَتِهٖ "میں نے اس کی حمد کی اس کے حسن اور شجاعت پر۔

شارح معتزلی اکثر ادبا اور متکلمین کی طرف اس کی نسبت دیتے ہوئے مثالیں پیش کر کے فرماتے ہیں : "حَمِدْتُ زَیْدًا عَلیٰ اِنْعَامِهٖ "اور" مَدَحْتُہٗ عَلیٰ اِنْعَامِهٖ "یعنی میں نے زید کی حمد کی اس کے انعام دینے پر اور اس کی مدح کی اس کے انعام دینے پر۔ اسی طرح "حَمِدْتُہٗ عَلیٰ شُجَاعَتِهٖ "میں نے اس کے شجاعت کی حمد کی اور "مَدَحْتُہٗ عَلیٰ شُجَاعَتِهٖ "میں نے اس کے شجاعت کی مدح کی۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہیں اور ان کا عمل دخل انسانی افعال میں بھی ہوتا ہے اور غیر افعال میں بھی۔ جیسا کہ ابھی بیان کر چکے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ حمد، مدح سے چند وجوہات کی بنا پر خاص ہے۔

ا۔ حمد، علم اور حیات رکھنے والوں کے کمال پر تعریف کرنے کو کہتے ہیں جبکہ مدح کسی بھی چیز کے کمال پر ہوتی ہے خواہ وہ صاحب علم وحیات ہو یا نہ ہو، جیسا کہ کوئی کسی موتی یا کسی یاقوت کے حسن کی تعریف کرتا ہے تو یہ مدح ہوگی حمد نہیں ہوگی۔

۲ :۔ حمد، احسان کے بعد کی جاتی ہے جبکہ مدح کبھی احسان کے بعد ہوتی ہے اور کبھی اس سے پہلے۔

۳:۔ حمد، کسی کے اچھے فعل اختیاری کے بعد کی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے "حَمِدْتُهٗ عَلٰی کَرَمِهٖ" میں نے اس کے کرم کی تعریف کی، لیکن "حَمِدْتُهٗ عَلٰی حُسْنِهٖ" نہیں کہا جاتا۔ جبکہ مدح اختیاری اور غیر اختیاری دونوں طرح کے افعال پر ہوتی ہے۔

رہی شکر کی بات تو اس کی تعریف یوں کی گئی ہے "اِنَّهٗ تَعْظِیْمُ الْمُنْعِمِ مِنْ اَنَّهٗ مُنْعِمٌ عَلَی الشَّاکِرِ" یعنی نعمت پانے والا، نعمت دینے والے کی اس لئے تعظیم بجالا رہا ہے کہ اس نے شکر گزار کو نعمت دی ہے۔ تو اس طرح حمد اور شکر میں "عام خاص من وجہ" کی نسبت ہوگی اس لئے کہ:

ا۔ شکر، وہ نعمت کی ادئیگی پر ہوتا ہے، جبکہ حمد، نعمت اور غیر نعمت دونوں صورتوں میں ادا کی جاتی ہے۔

۲۔ حمد صرف زبان سے کی جاتی ہے جبکہ شکر دل، زبان اور اعضاً سے بھی کیا جاتا ہے، شارح کہتے ہیں: یہی فرق اور بھی بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہے جن میں "زمخشری"، "تفتازانی" اور بیضاوی" جیسے دوسرے لوگ شامل ہیں، لیکن میرے نزدیک حمد کو صرف زبان کے ساتھ خاص کر دینے میں اشکال ہے اس لئے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" (بنی اسرائیل / ۴۴) اور ہر موجود اس کی تسبیح و حمد کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح و حمد نہیں سمجھتے۔ ہاں البتہ اگر "لسان" (زبان) سے زبان حال اور زبان مقال مراد لی جائے۔ یعنی مجاز عمومی سے کام لیا جائے، کیونکہ خالق کائنات نے ممکنات کے تمام افراد کے لئے وجود کی بساط بچھائی ہے اور عالم موجودات کا ہر ذرہ اس کے خوان کرم اور الطاف بے پایاں سے مستفید ہو رہا ہے، لہذا وجود کا ایک ایک ذرہ زبان حال کے ساتھ اس کی حمد بجالاتا رہا ہے، جیساکہ سجود کی ظاہری تعریف تو پیشانی کو زمین پر رکھنا ہوتی ہے لیکن خضوع، تکوینی اور ذاتی احتیاج بھی اسی تعریف میں شامل ہیں، خداوند عالم کا ارشاد ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَ الدَّوَابُّ" (سورہ حج / ۱۸) آسمان و زمین میں رہنے والے سب ہی اللہ کیلئے سجدہ کرتے ہیں۔ اسی طرح سورج، چاند ستارے، پہاڑ، درخت اور چلنے والے جاندار۔ اس مقام پر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سب کچھ بجا لیکن خدا فرماتا ہے "وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" (تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اگر حمد اور تسبیح زبان سے بیان ہوگی تو اس کا سمجھنے سے تعلق ہوگا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خطاب "مشرکین" سے ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جب ان سے خالق ارض و سما کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ کون ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ "اللہ" ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود مانتے ہیں یعنی وہ خدا کا اقرار کرنے کے ساتھ بھی اس کا شریک ٹھہراتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ تو اس بارے میں فکر و نظر سے کام لیا اور نہ ہی اس کا اقرار کیا ہے، اس لئے کہ صحیح فکر و نظر اور پختہ اقرار کا نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے جس پر وہ قائم ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اور خدا کے خالق ہونے کی دلیل ان پر واضح نہیں، اور اسی طرح کا اشکال اور جواب قرآن مجید کے بارے میں بھی ہے "يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ" (سورہ رعد / ۱۳) گرج اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے۔ البتہ اس کی تفصیل خطبہ ۱۹۰ میں بھی آئے گی۔

"اللہ" کیا ہے؟

متقدمین کی بات۔

متاخرین اس بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی اصل "لاہ" ہے جس پر الف لام داخل کر کے "اللہ" بنا دیا گیا، اور پھر لفظ "الالہ" کے بارے میں زمخشری اور ان کی اتباع میں شارح معتزلی وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ اسم جنس ہے جو ہر معبود پر بولا جاتا ہے خواہ وہ حق ہو یا باطل، لیکن پھر غلبہ کے عنوان سے "معبود بر حق" کے لئے بولا جانے لگا اور اب معبود بر حق کے معنی میں ہوگا، جیسے لفظ "النجم" کا اطلاق "ثریا ستارے" پر اور "الکتاب" کا اطلاق "سیبویہ کی کتاب" اور "السنۃ" کا اطلاق "قحط کے سال" پر ہوتا ہے۔

بعض حضرات کا موقف ہے کہ یہ "مشتق" تو ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ "اَلَهَ يَاْلَهُ" سے ماخوذ ہے جس کا مصدر "اَلاهَةً"، "اُلُوهَةً" اور "اُلُوهِيَّةً" ہے۔ مَنَعَ يَمْنَعُ کے باب سے ہے، جس کا معنی ہے عبادت کرنا لہذا "اِلاہ" کا معنی "مَالُوہ" یعنی معبود ہوگا، جیسے کتاب بمعنی مکتوب اور بساط بمعنی مبسوط ہے۔ ارشاد باری ہے: "هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ" (سورہ زخرف / ۸۴) وہ اللہ تو وہی ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین پر بھی معبود ہے۔

بعض دوسرے حضرات کا موقف یہ ہے کہ یہ "اَلِهَ" بمعنی "تَحَيَّرَ" سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ عقلیں اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنے میں حیران و سرگردان ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ "اَلِهَ" بمعنی "سَكَنَ" سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کے ذکر سے دل کو اطمینان ملتا ہے اور روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے، یا پھر اس کو "اَلِهَ" بمعنی "فَزِعَ" سے مشتق مانا گیا ہے کیونکہ خوف اور غم سے گھبرا کر اس کی طرف پناہ لینے والوں کو پناہ دیتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ: "لَاهَ يَلِيْهُ لَيْهًا وَ لَاهَ" سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کا چھپنا اور بلند ہونا ہے۔ کیونکہ خداوند عالم نگاہوں سے پوشیدہ اور ہر چیز سے بالاتر ہے۔ اس بارے میں اور بھی بہت سے اقوال ہیں جنہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے

"اَلْقَائِلُوْنَ" پر الف لام استغراق کا ہے جنس کیلئے نہیں ہے، اس لئے کہ جمیع قائلین اس کی حمد سے عاجز ہیں اور الف لام جنس یہ معنی نہیں دیتا۔

سید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) تمام حمد اس اللہ کیلئے ہے۔ یعنی اچھی تعریف حق بنتا ہے اور مخصوص ہے اس ذات کیلئے جو جامع ہے جمال و جلال کی تمام صفات کو۔ تفسیر امامؑ میں ہے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "اللہ" وہ ذات ہے جس کی طرف مخلوق اپنی تمام حوائج اور شدائد میں اس وقت پناہ لیتی ہے جب ہر طرف سے امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور اسباب کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے"۔ آپؑ ہی فرماتے ہیں: "اللہ، خداوند کے ناموں میں اسم اعظم ہے لہذا کسی اور کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرے"۔ کتاب التوحید میں آپؑ ہی سے روایت ہے کہ: "اللہ کا معنی ایسا معبود ہے جس کے بارے میں مخلوق متحیر ہے، اس کے بارے میں مشتاق ہے، اسی کی پناہ کی تلاش میں ہے، آنکھوں کے ادراک سے پوشیدہ اور ہر قسم کے وہم و خدشات سے ماوراء ہے"۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "اللہ کے معنی ہیں وہ معبود کہ مخلوق جس کی ماہیت کو درک اور اس کی کیفیت کا احاطہ کرنے سے عاجز ہو" اس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے لہذا اس مقام پر پروردگار کی صفات بیان کرتے ہوئے سید

علیہ الرحمہ فرماتے ہیں (لَا يَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُوْنَ) جس کی مدح تک بولنے والوں کی رسائی نہیں۔ یعنی کوئی بھی بولنے والا صرف اور صرف اس کی مدح تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تو کوئی اس کی حمد تک کیونکر رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خداوند متعال جس حمد کا اہل اور حقدار ہے اسے کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں " لَاأُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ " خدایا! جیسے تو نے اپنی تعریف خود بیان فرمائی ہے میں اسی طرح کما حقہ بیان نہیں کر سکتا۔ البتہ یہاں پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ :" اللہ تعالی اپنے بندے کو جو بھی چھوٹی یا بڑی نعمت عطا کرتا ہے اور وہ اس پر 'الحمد للہ' کہتا ہے تو اس کا شکر ادا کر دیتا ہے" اس فرمان کو حضرت پیغمبر اکرمؐ کی حدیث کو اور نہج البلاغہ کے اس خطبہ کے الفاظ کو کیونکر جمع کیا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو باہم جمع کرنا ممکن ہے، کیونکہ اس سے مراد اسی حمد و ثنا سے عاجزی کا اظہار مراد ہے جو ذات ذوالجلال کے کما حقہ شایان شان ہے۔ جس کی طرف ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں اور شکر کے ادا کرنے سے مراد بندے کی طرف سے ایسی ادائیگی ہے جو اس کے حسب استطاعت ہے کہ جس کے ادا کرنے سے اس پر سے شکر کی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔ اور اسی حد تک کہنے سے بھی اس کریم ذات کا عمومی لطف و کرم شکر گزار کے شامل حال ہو کر اس کی رضا کا موجب بن جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اور حدیث ملاحظہ ہو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :" میرے والد بزرگوار کی سواری کا جانور گم ہو گیا، جس پر انہوں نے فرمایا 'جب اللہ تعالی وہ پلٹاوے گا تو میں اس کی اس قدر حمد کروں گا کہ جس سے وہ راضی ہو جائے گا' کچھ دیر کے بعد جانور مل گیا آپ اس پر سوار ہوئے اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر آسمان کی طرف منہ کر کے صرف یہی کہا 'الحمد للہ' پھر فرمایا 'حمد کی جو قسم بھی خدا کی ذات کے لئے ہے وہ میں نے ادا کر دی ہے اور کوئی بھی قسم باقی نہیں چھوڑی کیونکہ حمد کی جو بھی قسم ہے وہ اسی جملے میں جمع ہے جو میں نے کہا ہے"

اس بارے میں مزید تفصیل خطبہ ۱۷۷ میں بیان ہوگی۔ انشاءاللہ۔ (وَلَا يُحْصِي نَعْمَائَهُ الْعَادُّوْنَ) جس کی نعمتوں کو گننے والے گن نہیں سکتے۔ کیونکہ اس کی نعمتیں بے بہا، بے انتہا اور بے حد و حساب ہیں اور فیوض و برکات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ ارشاد باری ہے " وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا " (سورہ نحل / ۱۸) اور اگر تم نعمات خدا کو گننا چاہو تو ہر گز شمار نہیں کر پاؤ گے۔ (وَلَا يُؤَدِّيْ حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُوْنَ) اور کوشش کرنے والے اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ یعنی بندوں پر خدا کی طرف سے جو حق بنتا ہے وہ ادا نہیں کر سکتے خواہ وہ مقدور بھر اپنی طاقت صرف کر دیں۔ اور حق لازم سے اس کی نعمتوں کا شکر اور اس کے عطایا کی حمد مراد ہے۔ اسی طرف حضرت امیر علیہ السلام نے اشارہ کیا ہے کہ اس کی حمد کی ادائیگی کا جو حق بنتا ہے اسے کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ حمد بذات خود اس کی ایک نعمت ہے، جس کی وجہ سے وہ حمد اور شکر کا مستحق ہوتا ہے اور چونکہ اس کی نعمتیں غیر متناہی ہیں لہذا اس کی حمد کا استحقاق بھی لا متناہی ہے۔ اس بارے میں انسان جتنا حمد بجالاتا جائے گا اتنا ہی وہ اس کی نعمت حاصل کرتا جائے گا اور ہر نعمت اس کے شکر کا موجب بنتی جائے گی اور انسان کو اپنے عجز و ناتوانی کا اظہار کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ حضرت داؤد پیغمبرؑ کے بارے میں

روایت ہے کہ انہوں نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنے عجز کا اظہار یوں کیا : "پروردگارا! میں تیرا شکر کیسے ادا کروں جبکہ میرا شکر کرنا تیری ایک اور نعمت ہے جس سے مزید شکر کی بجا آوری مجھ پر واجب ہو جاتی ہے"۔ اس پر اللہ جل شانہ نے ان کی طرف وحی کی: "داؤد! جب تم نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ تمام نعمتیں میری طرف سے ہیں تو میں تمہارے اسی قدر شکر پر راضی ہوں"۔

عامۃ المسلمین کے مطابق حضرت رسول خداؐ کے مناجاتیہ کلمات ہیں : "پروردگارا! تو مجھے اپنی لگاتار نعمتوں سے نوازتا رہا اور میں اس کا شکر ادا کرتا رہا۔ اب مجھے بتا کہ تیرے اس شکر کا شکر کیونکر ادا کروں ؟" اللہ تعالی نے فرمایا : "تم نے وہ علم حاصل کر لیا ہے کہ اسے کوئی دوسرا علم ختم نہیں کر سکتا پس تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ سمجھتے ہو کہ یہ سب میری طرف سے ہے"۔

کافی میں ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام جب اس آیت "وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (سورہ نحل / ۱۸) کو تلاوت فرماتے تو کہا کرتے "پاک ہے وہ ذات جس نے کسی میں نعمتوں کی معرفت، سوائے اس معرفت کی تقصیر کی معرفت کے اور کچھ قرار نہیں دیا۔ جس طرح کہ اس نے کسی میں اپنے ادراک کی معرفت اس سے بڑھ کر قرار دی کہ یہ علم عطا فرمایا کہ اس کی ذات کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

پس خدا کا شکر عارف لوگوں کی اس بات کی معرفت ہے کہ اس کے شکر کی معرفت سے قاصر ہیں، لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کی شکر کی بجا آوری کی کوتاہی کو شکر قرار دیا ہے، جیسا کہ اس نے علماء کو یہ تعلیم دی کہ وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے، اور اس چیز کو اس نے ایمان قرار دیا ہے۔

دوسری فصل

حمد و ثنائے رب جلیل :

اَلَّذِيْ لَا يُدْرِكُهٗ بُعْدُ الْهِمَمِ وَلَا يَنَالُهٗ غَوْصُ الْفِطَنِ الَّذِيْ لَيْسَ لِصِفَتِهٖ حَدٌّ مَحْدُوْدٌ وَّ لَا نَعْتٌ مَوْجُوْدٌ وَ لَا وَقْتٌ مَعْدُوْدٌ وَ لَا اَجَلٌ مَمْدُوْدٌ.

نہ بلند پرواز ہمتیں اسے پا سکتی ہیں، نہ عقل و فہم کی گہرائیاں اس تک پہنچ سکتی ہیں، اس کے کمال ذات کی کوئی حد معین نہیں نہ اس کیلئے توصیفی الفاظ ہیں، نہ اس کی ابتدا کیلئے کوئی وقت ہے جسے شمار میں لایا جا سکے، نہ اس کی کوئی موت ہے جو کہیں پر ختم ہو جائے۔

تشریح

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں (اَلَّذِيْ لَا يُدْرِكُهٗ بُعْدُ الْهِمَمِ) نہ اسے بلند پرواز ہمتیں پا سکتی ہیں۔ یعنی صاحبان نظر کی ہمتیں اور ارباب فکر کے اوہام خواہ کتنا ہی بلند اور دور چلے جائیں پھر بھی اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ (وَ لَا يَنَالُهٗ غَوْصُ الْفِطَنِ) اور نہ عقل و فہم کی گہرائیاں اس کی تہہ تک پہنچ سکتی ہیں۔ یعنی صاحبان عقل و فہم اس کی معرفت اور کنہ حقیقت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر خواہ کتنا ہی گہرے چلے جائیں اس کی ذات کی حقیقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

صدر الدین شیرازی (ملا صدرا) کہتے ہیں : "غوص" کا لفظ "فطن" کی طرف اسناد بطور استعارہ ہے کیونکہ حقیقت میں اس کا

اسناد ذی روح کی طرف ہوتا ہے۔ اس لئے اس کیلئے لازم ہے کہ علوم عقلیہ کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور یہاں پر وجہ استعارہ، اس کے جلال و جمال کی صفات کا غیر متناہی ہونا اور ان کے حقائق تک نہ پہنچ سکنا ہے اسی لئے انہیں ایک ایسے اوقیانوس سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں کسی پیراک کو ساحل تک اور غوطہ لگانے والے کو اس کی تہہ تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی اور اس بحر او قیانوس میں گویا تیرنے والی یا غوطہ لگانے والی چیز عقلمندی ہی ہے، لہذا غوص (غوطہ خوری) کو اسی کی طرف نسبت دی گئی ہے جس کا معنی فکر کی گہرائیاں بنتا ہے۔ اور اسی کے قریب قریب "اِدْرَاكُ بُعْدِ الْهِمَمِ" کا معنی بنتا ہے۔ کیونکہ ادراک، حقیقت میں ایک جسم کا دوسرے جسم کے ساتھ ملنے کا نام ہے"۔ پھر "بُعْدُ الْهِمَمِ" اور "غَوْصُ الْفِطَنِ" کی اضافت کی ایک اور خوبصورت وجہ یہ بھی ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس قسم کا تعلق "موصوف کے ساتھ مصدر کے لفظ کے ساتھ صفت کی اضافت" کے باب سے ہے، یعنی ان کی اصل صورت "اَلْهِمَمُ الْبَعِيْدَةُ" اور "اَلْفِطَنُ الْغَائِصَةُ" کہنے کی بجائے "بُعْدُ الْهِمَمِ" اور "غَوْصُ الْفِطَنِ" کہا گیا ہے۔ اور ایسا کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ "عقلمندی" خواہ بذات خود "گہرائی" بن جائے اور "ہمت" بذات خود "بُعد" اور دوری بن جائے پھر بھی اس کی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کا تعلق مبالغہ کے ساتھ ہے، کیونکہ بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز زیادہ اہم ہے اسے پہلے ذکر کیا جائے۔ غرض ان دونوں جملوں کا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ تو ذات ذوالجلال کا ادراک ممکن ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک بھی نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل کافی میں اسناد کے ساتھ ہشام بن حکم سے روایت ہے فرمایا: "اشیاء کا ادراک دو ہی ذریعوں سے ہوتا ہے ایک حواس اور ایک دل سے۔ اور حواس سے ادراک کے تین ذرائع ہیں ادراک بالمداخلہ (ایسا ادراک جو اندر داخل ہونے کے ساتھ ہوتا ہے) اور ادراک بالمماسہ (ایسا ادراک جو چھونے کے ساتھ ہوتا ہے) اور ادراک بلامداخلہ وبلا مماسہ (ایسا ادراک جو مذکورہ دونوں کے برعکس ہے) ادراک بالمداخلہ میں آوازیں، سونگھی اور چکھی جانے والی چیزیں ہیں، ادراک بالمماسہ میں شکلوں کی معرفت ہے، جیسے مربع ہے، مثلث یا سختی و نرمی یا سردی و گرمی کی شناخت ہے، لیکن ادراک بلامداخلہ وبلا مماسہ کی مثال جیسے نگاہ اور دید ہے۔ کیونکہ یہ اشیاء کا اس طرح ادراک کرتی ہے کہ نہ تو کسی چیز کو مس کرتی ہے اور نہ ہی کسی "حیز" میں داخل ہوتی ہے۔ نگاہ کے ادراک کیلئے راستہ بھی ہے اور سبب بھی۔ اس کا راستہ ہوا ہے اور سبب روشنی۔ لہذا جب راستہ اس کے اور دیکھی جانے والی چیزوں کے درمیان ہموار ہو اور رابطہ بحال ہو اور سبب بھی قائم ہو تو وہ جس رنگ یا شخص سے گزرے گی اس کا ادراک کرے گی۔ لیکن اگر ایسی جگہ سے گزرے گی کہ جہاں راستہ ہموار نہ ہو تو جہاں تک پہنچ سکے گی پہنچے گی اور اس کے ماوراء کی کیفیت آکر بیان کرے گی۔ مثلاً کوئی شخص آئینے میں نگاہ کرتا ہے تو اس کی نگاہ آئینے کے پار نہیں جاتی اور چونکہ اس کے پار جانے کا راستہ نہیں ہوتا، لہذا واپس آکر اپنے ماوراء کی کیفیت بیان کرتی ہے، اسی طرح شفاف پانی میں نگاہ کرنے کی کیفیت ہے کہ اس میں سے بھی نگاہیں اندر ہی اندر سے واپس آکر اپنی ساری حالت بیان کر دیتی ہیں، اس لئے کہ ان سے پار ہونے کا آگے راستہ نہیں ہے لیکن جہاں تک دل کی صورت حال ہے تو اس کا ہوا (فضا) پر قبضہ ہے لہذا اس میں موجود چیزوں کا وہ ادراک بھی کرتا ہے اور اپنے وہم میں بھی لاتا ہے، لیکن جب دل ایسی حد تک جا پہنچتا ہے جہاں پر ہوا (فضا) نہیں ہے تو واپس لوٹ آتا ہے اور فضا میں موجود چیزوں کو آکر بیان کرتا ہے لہذا عقلمند کیلئے روا نہیں ہے کہ اپنے دل کو ایسے مقام تک لے جائے جو ہوا (فضا) سے ماوراء ہے جیسے توحید کا معاملہ

ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا بھی تو اس کے وہم و ادراک میں صرف وہی چیز ہی آئے گی جو فضا میں موجود ہے، جیسا کہ نگاہ اور دید کے بارے میں بتایا جا چکا ہے۔ خداوند عالم اس چیز سے بلند و برتر ہے کہ اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی جائے"۔

اقسام عالم :

اس کی توضیح یہ ہے کہ : جو بھی عوامل ادراک ہوں خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہوں دو امور میں منحصر ہیں، کائنات میں موجود "عوالم" اپنی کثرت کے باوجود "دو عالموں" میں ہی منحصر ہیں :۔

۱۔ عالم دنیا یا نظر آنے والا عالم

۲۔ عالم آخرت یا نظر نہ آنے والا عالم

عالم دنیا یا نظر آنے والے عالم میں موجود اشیاء کا ادراک، حواس خمسہ میں سے کسی ایک کے ساتھ کیا جاتا ہے، جبکہ عالم آخرت یا نظر نہ آنے والے عالم کا ادراک صرف دل کے ساتھ کیا جاسکتا ہے اور دل سے مراد باطنی شعور کے ذرائع کا مجموعہ ہے یعنی خیال، وہم اور عقل کے مجموعے کا نام دل ہے۔ اور جہاں تک خدا کی ذات کے ادراک کا محسوسات سے تعلق ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ محسوسات کا انحصار جسم و جسمانیت پر ہوتا ہے اور خداوند متعال اس سے منزہ و مبرا ہے، اور جن چیزوں کا دل سے ادراک کیا جاسکتا ہے ان کا تعلق ہوا کے ساتھ ہے اور ہوا سے مراد آسمان و زمین کے درمیان پھیلی ہوئی فضا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد طول و عرض پر مشتمل عالم امکان ہو اور اسے ہوا کے نام سے موسوم کرنا کُل کو جز کے نام سے موسوم کرنے کے باب سے ہے۔ ہم نے یہ اس لئے کہا ہے کیونکہ قلبی ادراکات کا دارومدار صرف حواس کے ادراکات پر نہیں ہے اور نہ ہی وہ حواس کے ادراکات کے ساتھ مشروط ہے، اسی لئے وہ ہوا میں موجود تمام چیزوں کا ادراک کرتا ہے کبھی تو وہم و خیال کو درمیان میں واسطہ لاتا ہے اور کبھی اسے واسطہ قرار دیئے بغیر یہ کام کرتا ہے۔ لہذا جب دل کسی ایسی چیز کے ادراک پر آمادہ ہوتا ہے جو ہوا میں موجود نہیں ہوتی تو وہ وہاں تک پہنچ کر واپس آجاتا ہے اور اپنی طرف سے کوئی صورت اختراع کر کے لاتا ہے جس کا کوئی عینی وجود نہیں ہوگا صرف وہم و خیال کی اختراع ہوتی ہے، اور یہی حال اس کا ڈراؤنے اور بھیانک مقامات پر جانے کا ہوتا ہے۔ بنابریں عقلمند کو چاہئے کہ اپنے دل کو اس چیز کے ادراک کیلئے نہ لے جائے جو سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور نہ ہی غیر محسوس چیزوں تک لے جائے تاکہ وہم و خیال میں کوئی غلطی پیدا ہی نہ ہو۔ اسی طرح جو شخص حواس کے ذرائع سے "ذات حق کا ادراک" کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ لغزشوں اور گمراہیوں کا شکار ہو جاتا ہے؛ کیونکہ خداوند ذوالجلال اس بات سے کہیں بلند و بالاتر ہے کہ اس تک حس یا خیال کے ذریعہ سے رسائی حاصل کی جاسکے۔ یہی تو وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں : "جب تم نے اسے اپنے اوہام کے ذریعۂ دقیق ترین معانی میں دوسروں سے ممتاز کیا تو اسے اپنی جیسی مخلوق سمجھا"۔

پس ہمارے اس تمام بیان کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس کے جلال کے سمندر میں ہر تیرنے والا غرق ہو جاتا ہے اور اس کے انوار کبریا تک پہنچنے والا ہر دعویدار جل کر رہ گیا۔ اور اس کی شان سب سے بلند و بالا ہے۔ (اَلَّذِيْ لَيْسَ لِصِفَتِهٖ حَدٌّ مَحْدُوْدٌ) اس کی

کمال ذات کی کوئی حد معین نہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ "صفت" سے مراد اس کی صفات ذاتیہ ہیں، جیسے : علم، حیات، قدرت، ارادہ اور اختیار وغیرہ اور حد سے مراد انتہا اور غایت ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "هٰذَا حَدُّ الاَرْضِ" یعنی اس سرزمین کا آخر ہے اس کے بعد کوئی زمین نہیں۔ "محدود چیز" کو اس لئے محدود کہا جاتا ہے کہ وہ معین اور مقرر ہو چکی ہوتی ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ جس کی صفات کیلئے کوئی حد مقرر اور انتہا معین نہیں ہے۔ اس بات کی شاہد کافی میں کابلی کی زبانی بیان ہونے والی وہ روایت ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ : "میں نے حضرت امام موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں دعائیہ انداز میں تحریر کیا کہ "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ مُنْتَهیٰ عِلْمِهِ" خدا کیلئے حمد ہے جہاں تک اس کے علم کی انتہا ہے۔ تو امام علیہ السلام نے میری طرف لکھا" خدا کے علم کی انتہا کی بات نہ کرو کیونکہ اس کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے" بلکہ کہو" جہاں تک اس کی رضا کی انتہا ہے"۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کی اس "حد" سے مراد "منطقی حد" یعنی تعریف مراد ہو، جس کا معنی یہ ہوگا کہ "اس ذات کے لئے کوئی ایسی تعریف نہیں ہے جسے محدود اشیاء پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے بیان کیا جائے" اس لئے کہ وہ مرکب نہیں اور جس کی تعریف کی جاتی ہے وہ مرکب ہوتا ہے۔ کافی میں ابو حمزہ ثمالیؒ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: ابو حمزہ! خدا کی محدودیت کے ساتھ تعریف بیان نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ اس کی کوئی حد نہیں اسے کیونکر تعریف کے دائرے میں محدود کیا جاسکتا ہے"

شارحؒ فرماتے ہیں :اس سے مراد وہ ذات ہے جس کی کوئی حد نہیں، کیونکہ وہ مختلف اجزا سے منزہ و مبرا ہے۔ جبکہ حد، تجزیہ اور مختلف کثرتوں کے مجموعہ کو چاہتی ہے اور یہ چیزیں اس کے ذاتی وجود اور عدم احتیاج کے منافی ہوتی ہے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ "حدٌّ محدود" کا شمار "مبالغہ اور تاکید" کی اقسام میں ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے "شِعْرٌ شَاعِرٌ" یا "حِجْرًا مَحْجُوْرًا" یا "نَسْيًا مَنْسِيًّا" وغیرہ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول بمعنی فاعل کے ہو جس طرح "حِجَابًا مَسْتُوْرًا" میں "مستور" بمعنی "ساتر" ہے اور "وَعْدًا مَاْتِيًا" میں "ماتی" بمعنی "آتی" ہے۔ (وَ لَا نَعْتٌ مَوْجُوْدٌ) اور نہ اس کیلئے توصیفی الفاظ ہیں، یعنی ایسی کوئی توصیف پہلے سے موجود نہیں کہ جس پر قیاس کر کے اس کی توصیف کی جائے ورنہ اس کی ذات محل حوادث ہو جائے گی اور وہ اس چیز سے بھی پاک و منزہ ہے۔ اور اسی پر کافی میں موجود روایت بھی دلالت کر رہی ہے، فضیل بن یسار کہتے ہیں : "خداوند عالم کی توصیف بیان نہیں ہو سکتی اور اس کی توصیف بیان ہو بھی تو کیسے جبکہ وہ خود اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے "وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" (سورہ انعام / ۹۱) انہوں نے جیسا اللہ کو جیسا پہچاننا چاہیئے تھا نہیں پہچانا پس 'قدر' کے ساتھ اس کی توصیف و تعریف نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ اس سے عظیم تر ہے"۔ ابو حمزہ (ثمالی) حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "اگر تمام اہل ارض و سما اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ خداوند عالم کی عظمت کی توصیف کریں تو ہرگز نہیں کر سکیں گے"۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ چونکہ ذات احدیت اور اس کی قیوم اصلیت ایسی چیز ہے جس کی نہ تو ماہیت ہے اور نہ ہی اس کی ذات کی کوئی جزو ہے، نہ تو اس کی کوئی حد ہے اور نہ ہی کوئی صورت کہ جو اس کی برابری کر سکے اور نہ ہی اس کی کوئی توصیف کی جاسکتی ہے۔ اور چونکہ اس کا وجود عین ذات ہے اور شدت نورانیت میں اس کی انتہا نہیں ہے، لہذا کسی دیکھنے والے کی نگاہیں اس پر جم نہیں

سکتیں اور نہ ہی کوئی ادراک کرنے والا ادراک کر سکتا ہے۔

(وَ لاَ وَقتٌ مَعْدُوْدٌ وَ لاَ اَجَلٌ مَمْدُوْدٌ) نہ اس کی ابتدا کیلئے کوئی وقت ہے جسے شمار میں لایا جاسکے اور نہ اس کی کوئی مدت ہے جو کہیں پر ختم ہو جائے۔ کیونکہ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، واجب الوجود ہے، کسی ایک وقت کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ خاص مدت کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ بلکہ وہ وقت اور اجل کا خالق ہے، نہ تو اس کے وجود کی کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی اس کی بقا کی کوئی انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی احادیث میں خدا کے بارے میں "متیٰ" (کب سے ہے) کے ساتھ سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے ، جیسا کہ کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک یہودی عالم حضرت امیرؑ کے پاس آیا اور سوال کیا کہ: "یَا اَمِیْرَالْمُؤمِنِیْنَ مَتٰی کَانَ رَبُّكَ؟" آپ کا رب کب سے ہے؟ یہ سن کر علیؑ نے فرمایا "تیری ماں تیرا سوگ منائے کب نہیں تھا؟ کہ کہا جائے کہ کب سے ہے! ہمارا رب تو اس قبل سے بھی پہلے ہے جبکہ اس سے پہلے کوئی قبل نہیں ہے، وہ بعد کے بھی بعد میں ہے کہ اس کے بعد کوئی بعد نہیں ہے۔ اس کی انتہا کیلئے کوئی انتہا نہیں ہے، سب انتہائیں اس پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں اور وہ ہر غایتوں کی انتہا ہے"۔ یہ سن کر اس نے کہا: "یا علیؑ آپؐ پیغمبر ہیں؟" مولا نے فرمایا: "تجھ پر افسوس ہے میں تو محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک ہوں"۔

تیسری فصل

قدرت خداوندی

فَطَرَ الْخَلاَئِقَ بِقُدْرَتِهٖ، وَنَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهٖ وَ وَتَّدَ بِالصُّخُوْرِ مَيَدَانَ اَرْضِهٖ اس نے مخلوقات کو اپنی قدرت سے پیدا کیا، اپنی رحمت سے ہواؤں کو چلایا اور تھرتھراتی ہوئی زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑیں،

تشریح (فَطَرَ الْخَلاَئِقَ) مخلوقات کو پیدا کیا گیا (بِقُدْرَتِهٖ) اپنی قدرت کے ساتھ "فَطَرَ" کا لفظ قرآن مجید سے لیا گیا ہے ارشاد باری ہے: "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ فَاطِرَ السَّمٰوٰاتِ وَ الاَرْضِ" (سورہ فاطر/۱) حمد وثناء مخصوص اس اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنیوالا ہے "اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰاتِ وَالاَرْضِ" (سورہ ابراہیم/۱۰) کیا اس اللہ کے بارے میں شک ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا "قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِياًفَاطِرِ السَّمٰوٰاتِ وَالاَرْضِ" (سورہ انعام/۱۴) کہہ دو کیا غیر خدا کو اپنا ولی بنالوں جبکہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ تو یہاں پر "فاطر" کے معنی "خالق" کے ہیں، اور بعض تفاسیر میں "ابتدا کرنے والا" اور "ایجاد کرنے والا" کے معنی میں ہے اور اس پر حضرت عبداللہ ابن عباس کے اس قول کو استشہاد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ: "مجھے نہیں معلوم تھا کہ 'فَاطِرَ السَّمٰوٰاتِ وَالاَرْضِ' کا کیا معنی ہے ، اس دوران دو اعرابیوں کی کنویں کے بارے میں لڑائی ہو گئی اور وہ میرے پاس فیصلہ کرانے آئے تو ان میں سے ایک نے کہا 'اَنَا

فَطَرَتُهَا یعنی اس تکوین کی ابتدا میں نے کی ہے "۔ایک قول کے مطابق "فاطر"، "فطر" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے شگافتہ ہونا ،جیساکہ قرآن مجید میں ہے "اِذَاالسَّمَاءُ انفَطَرَتْ" (سورہ انفطار /۱) جس وقت کُرات آسمانی پھٹ جائیں گے ،"اِنفَطَرَتْ" کے معنی ہیں "اِنشَقَّتْ"۔ شارح علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :اسی معنی پر حدیث خلقت بھی شاہد ہے، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو چہاردہ معصومینؑ کی تصویریں دکھائی گئیں اور ان کا تعارف کرایا گیا، تو حضرت فاطمہ زہراؑ کے تعارف کے سلسلے میں اللہ تعالی نے فرمایا :"هٰذِهِ فَاطِمَةُ وَاَنَافَاطِرُالسَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ، فَاطِمُ أَعْدَائِيْ مِنْ رَحْمَتِيْ يَوْمَ فَصْلِ قَضَائِيْ وَ فَاطِمُ أَوْلِيَائِيْ عَمَّا يُعَيِّرُهُمْ وَ يُشِيْنُهُمْ فَشَقَقْتُ لَهَا اِسْمًا مِنْ اِسْمِيْ...... "یہ فاطمہؑ ہیں اور میں آسمانوں اور زمین کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا ہوں، اور یہ فیصلے (قیامت) کے دن میرے دشمنوں کو میری رحمت سے اور میرے دستوں کو ہر باعث ننگ و عار چیزوں سے جدا کرنے والی ہیں اور میں نے ان کا نام (فاطمہؑ) اپنے نام (فاطر) سے شگافتہ کیا ہے"۔ یہ حدیث تفصیل کے ساتھ اسی خطبہ کی دسویں فصل میں بیان ہوگی۔ حضرتؑ نے "بِقُدْرَتِهٖ" کا لفظ ارشاد فرما کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خداوند عالم نے یہ اشیاء نفس قدرت سے پیدا کی ہیں، ایسی قدرت جو اس کی عین ذات ہے، کسی اور چیز کے ساتھ نہیں۔ جبکہ دوسرے صانع اور موجد اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ ان کی ایجادات و مصنوعات ذاتی نہیں بلکہ دوسری چیزوں کی محتاج ہوتی ہیں، مثلاً اوزار و آلات، ملکہ نفسانیہ ،مادہ، معدنیات اور اسی طرح کی بہت سی دوسری چیزیں ہیں جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک انسان کتاب کو معرض وجود میں لانا چاہتا ہے تو اسے ہاتھ اور قلم جیسے آلات کی ضرورت ہوگی، ملکہ کتابت کی احتیاج ہوگی، کسی معاون کی ضرورت ہوگی جو اس کا ہاتھ بٹا سکے، کاغذ اور روشنائی کی ضرورت ہوگی جو مادہ کی حیثیت رکھتے ہیں وغیرہ۔ لیکن صنعت و تخلیق پروردگار کیلئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ قدرت کاملہ خود ذات پروردگار ہی ہے۔

قدرت خداوندی کیا ہے؟

"قدرت" اصل میں قوت کو کہتے ہیں اور متکلمین ایسی صفت کو "قدرت" کہتے ہیں جس کے ذریعہ کوئی زندہ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کوئی فعل انجام دیتا ہے یا اسے ترک کرتا ہے۔ حکما کے نزدیک "قدرت" یہ ہے کہ فاعل اس کیفیت میں ہو کہ چاہے تو فعل کو انجام دے۔

قدرت باری تعالی کی تعریف یوں کی گئی ہے :اس کی ذات ازل ہی سے عین قدرت ہے۔ جبکہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد خداوند عالم کا نظام اکمل کے بارے یہ جاننا کہ اس (خدا) سے جو فعل صادر ہوتا ہے وہ صحیح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قدرت سے مراد ذات خدا سے عجز کی نفی ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد اشیاء کا اس کی مشیت سے فیض حاصل کرنا ہے جو کہ اس کی ذات سے علیحدہ نہیں ہے اور اسی کا نام "عنایت ازلی" ہے یاد رہے اس بارے میں تفصیل اور دیگر صفات ثبوتیہ کی تحقیق انشاء اللہ "کمال الاخلاص......" کی شرح میں بیان ہوگی۔

(وَ نَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهٖ) اور اس نے اپنی رحمت سے ہواؤں کو چلایا "ریاح" جمع ہے "ریح" کی اس میں "یا" اصل میں

"واؤ" تھی ما قبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے "یا" میں تبدیل ہو گئی۔ "ریح" اور "ریاح" میں فرق یہ ہے کہ "ریاح" کا تعلق خدا کی رحمت کے اسباب و آثار سے ہوتا ہے جبکہ "ریح" میں یہ معنی نہیں پایا جاتا۔ روایت میں بھی ہے کہ جب ہوا چلتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کرتے تھے کہ "اللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا" خداوندا سے ریاح قرار دے ریح نہ بنا ۔ چنانچہ اگر آیات ذیل میں استقرائی نگاہ ڈالی جائے تو اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد قدرت ہے "وَيُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ" (سورہ روم / ۴۶) اس کی عظمت و قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دہندہ بنا کر بھیجتا ہے۔ یا "وَ اَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ" (سورہ الحجر / ۲۲) ہم نے ہوائیں تلقیح کیلئے بھیجیں۔ اسی طرح "وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ" (سورہ الحاقہ / ۶) قوم عاد طغیانی کرنے والی ٹھنڈی، زور دار، تیز آندھی سے ہلاک ہوئی۔ یا "وَ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (سورہ احقاف / ۲۴) یہ وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس نے اپنی رحمت سے ہواؤں کو چلایا، یعنی انہیں اپنی رحمت واسعہ اور نعمت سابغہ کے ساتھ اطراف واکناف عالم میں پھیلایا اور ادھر ادھر تقسیم کر دیا، اس لئے کہ اس میں بے شمار فائدے اور لاتعداد منافع ہیں جن میں سے بعض کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "وَ هُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتّٰى اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ" (سورہ اعراف / ۵۷) وہ خدا وہ ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کی بارش سے آگے آگے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب بھاری بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھا لیتی ہیں تو ہم انہیں مردہ زمین کی طرف ہنکا دیتے ہیں، پھر ان سے پانی برساتے ہیں، پھر ان کے ذریعہ ہر طرح کے پھل اگاتے ہیں۔ اس میں موجود ایک کلمہ کی دو طرح کی قرائت ہے "نُشْرًا" اور "بُشْرًا" اگر تو اسے نُشْرًا پڑھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے ہواؤں کو زمین میں پھیلا دیا جاتا ہے اور اگر بُشْرًا پڑھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے، اس کی رحمت کے آگے آگے خوشخبری بن کر چلتی ہیں اور رحمت سے مراد بارش ہے حتی کہ جب وہ پانی سے لبریز بادلوں کو اپنی دوش پر سوار کر کے چلتی ہے تو خدا اسے مردہ علاقوں کی طرف بھیج دیتا ہے کہ جس سرزمین پر نہ تو گھاس ہوتی ہے اور نہ ہی پانی۔ اور پھر اس بادل سے مینہ برستا ہے۔ اور پانی کی وجہ سے طرح طرح کے میوے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اسی مضمون کی طرف سورہ فرقان، نمل اور روم میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

بہر حال ہوائیں خداوند متعال کی عظیم ترین نعمت اور کامل ترین عطیہ ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ سبزے لہلہاتے ہیں، کھیتوں میں ہریالی آتی ہے، ان میں پھل پھول لگتے ہیں، درخت بارآور ہوتے ہیں، پھلوں میں افزائش ہوتی ہے، فضائی کثافتیں دور ہوتی ہیں، موسم میں تبدیلی آجاتی ہے، گھاس اور پانی صاف ستھرے ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ ایسے پھل میوے حاصل ہوتے ہیں جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

ہوائیں کہاں سے چلتی ہیں؟

علل الشرائع میں شیخؒ، عرزمی سے روایت کرتے ہیں، عرزمی کہتے ہیں کہ: "میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے

ساتھ میزاب رحمت کے نیچے حجر اسماعیل میں بیٹھا ہوا تھا کہ دو آدمی آپس میں تکرار کر رہے تھے ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا خدا کی قسم تم تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہوا کہاں سے چلتی ہے؟ جب بات لمبی ہونے لگی تو امامؑ نے اس سوال کرنے والے سے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو کہ ہوا کہاں سے چلتی ہے؟" اس نے کہا: "میں تو نہیں جانتا لیکن سنا ہے کہ لوگ کہتے ہیں"۔ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ ہوا کہاں سے چلتی ہے؟ تو امامؑ نے فرمایا: "ہوا اس رکن شامی کے نیچے قید کی ہوئی ہے، جب اللہ تعالیٰ اسے کہیں بھیجنا چاہتا ہے تو نکالتا ہے، جنوب کی ہوا کو جنوب کی طرف، شمال کی ہوا کو شمال کی طرف اور پروا اور پچھوا ہواؤں کو ادھر روانہ کر دیتا ہے"۔ پھر فرمایا: "اس کی نشانی یہ ہے کہ یہ رات دن اور سردی گرمی کے موسم میں ہمیشہ ہلتا رہتا ہے"۔

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں رکن کی حرکت سے مراد شاید اس پر لٹکے ہوئے پردے کی حرکت ہو۔ "من لا یحضرہ الفقیہ" اور "کافی" میں ابو بصیر سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے چاروں شمالی، جنوبی، پروا اور پچھوا ہواؤں کے متعلق عرض کیا کہ اس بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ شمال کی ہوا بہشت سے ہے اور جنوب کی ہوا جہنم سے ہے (آیا صحیح کہتے ہیں؟) امامؑ نے فرمایا: "خدا کیلئے ہواؤں کے بھی لشکر ہیں جن کے ذریعہ وہ جب اور جس کو چاہتا ہے عذاب میں جکڑ لیتا ہے۔ ہر ہوا پر ایک فرشتہ مقرر ہے جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جس نوعیت کے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو اسی نوعیت کی ہوا پر مقرر فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ ہوا کے ذریعہ ان لوگوں کو عذاب میں جکڑ لے وہ یہ حکم پا کر ہوا کو حکم دیتا ہے اور وہ غضبناک شیر کی طرح چنگھاڑتی ہوئی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتی ہے"۔ پھر فرمایا "ہر ایک ہوا کا علیحدہ نام ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ" (سورہ والقمر / ۱۸۔۱۹) قوم عاد نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی تو دیکھو میرا عذاب اور تخویف کیسا تھے۔ ہم نے سرد تیز اور وحشتناک آندھی ایک ایسے منحوس دن ان کی طرف بھیجی جو بہت طویل تھا۔ کہیں پر فرمایا: "اَلرِّيْحَ الْعَقِيْمَ" (سورہ الذاریات / ۴۱) تند و تیز آندھی، بغیر بارش کے۔ کہیں فرمایا ہے: "رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (سورہ احقاف / ۲۴) یہ وحشتناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے۔ کہیں پر فرمایا: "فَاَصَابَهَا اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ" (سورہ بقرہ / ۲۶۶) ایسے میں آگ کا زبردست بگولہ اٹھے اور جلا ڈالے۔ اس کے علاوہ اور بھی ہوائیں ہیں جن کے ذریعہ خدا اپنے گناہگار بندوں کو سزا دیتا ہے۔

اسی طرح رحمت کی بار آور ہوائیں بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ رحمت بنا کر بھیجتا ہے جو بادلوں سے آگے آگے چلتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو بادلوں میں پانی بھرتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو بادلوں کو آسمان اور زمین کے درمیان اٹھائے پھر رہی ہیں، کچھ وہ ہیں جو بادلوں کو نچوڑ کر بارش برساتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو بادلوں کو ادھر ادھر پھیلائے رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ہوائیں ہیں جن کا خدا نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے"۔ یہ جو چار اطراف کی ہوائیں، شمال، جنوب، صبا اور دبور ہیں تو یہ نام دراصل ان فرشتوں کے ہیں جو ان پر مقرر ہیں چنانچہ جب اللہ تعالیٰ شمال کی ہوا کو چلانا چاہتا ہے تو اس فرشتے کو حکم دیتا ہے جس کا نام شمال ہے اور وہ بیت الحرام پر اترتا ہے اور رکن شامی پر کھڑے ہو کر اپنے پروں کو حرکت دیتا ہے جس سے شمال کی ہوا چلنے لگتی ہے اور حکم خدا سے بحر و بر میں پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح باقی تین ہواؤں کی کیفیت ہے جو "جنوب"، "صبا" اور "دبور" نامی فرشتوں کے پروں کی وجہ سے حرکت میں آتی اور بحر و بر

میں پھیل جاتی ہیں"۔ پھر امامؑ نے فرمایا: "آیا لوگوں سے نہیں سنتے کہ کہتے ہیں شمال کی ہوا، جنوب کی ہوا، صبا (پروا) کی ہوا اور دبور (پچھوا) کی ہوا"۔

شہید اول علیہ الرحمہ اپنی کتاب ذکریٰ میں فرماتے ہیں: "جنوب کی ہوا کا مرکز "سہیل ستارہ" کے مقام طلوع اور سورج کے مقام طلوع کے درمیان کا علاقہ ہے جبکہ "باد صبا" (پُرواہوا) کا مرکز طلوع شمس اور طلوع جدی کا درمیانی علاقہ ہے۔ باد شمال کا مرکز ستارہ جدی (قطبی ستارہ) سے لے کر سورج کے مقام تک کا درمیانی علاقہ ہے۔ "باد دبور" (پچھواہوا) کا مرکز سورج کے مقام غروب سے لے کر سہیل ستارہ کے مقام طلوع تک کا درمیانی علاقہ ہے"۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہید علیہ الرحمہ کی یہ تصریح سابقہ روایت کے منافی ہے کیونکہ روایت بتارہی ہے کہ تمام ہواؤں کا مرکز سمت قبلہ ہے جبکہ شہید علیہ الرحمہ نے اس سے ہٹ کر صراحت کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ظاہر میں ایسا ہی ہے لیکن اس کی تاویل کی جائے گی، اس لئے کہ مَلک کی اپنی عظمت اور اس کے پروں کی عظمت اس قدر ہوتی ہے کہ وہ جہاں سے اور جس جگہ سے چاہے اسے حرکت دے دے اور جہاں چاہے ہوا کو بھیج دے۔ خانہ کعبہ کے ساتھ اس کے قیام کا ذکر تو کعبہ کی عظمت کو ظاہر کرنے کیلئے ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ فرشتوں کے پروں کے ہلانے کا مقصد ہوا کو چلنے کا حکم دینا ہوتا ہے۔ بہر صورت ہمیں تاویل سے کام لینا ہوگا کیونکہ روایت سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تمام ہوائیں سمت قبلہ سے آتی ہیں حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

(وَوَتَّدَ بِالصُّخُورِ مَیَدَانَ اَرْضِہٖ) تھرتھراتی ہوئی زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑیں یعنی زمین کی تھرتھراہٹ اور اس کے لرزوں کو پہاڑوں کے ذریعہ قابو میں رکھا اور پہاڑ زمین کیلئے میخوں کی مانند ہیں جو اسے تھرتھراہٹ سے روکے ہوئے ہیں، جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: "وَ اَلْقٰی فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ" (سورہ نحل / ۱۵) اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑدیا تاکہ تمہیں اس کی حرکت اور لرزنے سے محفوظ رکھے یعنی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ تمہیں لے کر ادھر ادھر جھک جائے۔ یا جیسا کہ فرماتا ہے: "وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ" (سورہ لقمان / ۱۰) ہم نے زمین میں پہاڑ نصب کئے تاکہ زمین انہیں مضطرب اور متزلزل نہ کرے۔ اس مقام پر "رَوَاسٍ" جمع ہے "رَاسِيَة" کی جس کے معنی ہیں بلند اور جمے ہوئے پہاڑ۔ یا سورہ نباء میں ہے "اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا" (سورہ نبا / ۶۔۷) کیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے آرام اور سکون کی جگہ قرار نہیں دیا اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں نہیں بنایا؟

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب زمین کو پانی پر بچھادیا گیا تو وہ ساکنین سمیت اس پر ہچکولے کھانے لگی جیسے کشتی ہچکولے کھاتی ہے۔ تو اللہ تعالی نے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑدیں جس سے اس کے ہچکولے اور تھرتھراہٹ ختم ہوگئی۔

خصال صدوقؒ میں امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء واجداد کے ذریعہ سے حضرت رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ: "جب اللہ تعالی نے سمندروں کو خلق فرمایا تو وہ فخر میں آکر موجیں مارنے لگے اور غرور آمیز انداز میں کہنے لگے: ہم پر کون غالب آسکتا ہے؟ جس پر خداوند تعالی نے "فلک" کو خلق فرمایا اور اس نے سمندروں کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا اور

انہیں رام کردیا، پھر زمین فخر میں آ کر کہنے لگی 'مجھ پر کون غالب آسکتا ہے؟' جس پر اللہ تعالی نے پہاڑوں کو خلق کر کے اس پر میخیں بنا کر گاڑ دیا کہ ادھر ادھر ہلنے نہ پائے۔ چنانچہ زمین بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور اس کے ہوش بھی ٹھکانے آگئے"۔

اس بارے میں مزید روایات اسی خطبہ کی آٹھویں فصل میں بیان ہوں گی انشاء اللہ تعالی البتہ یہاں پر جو اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ پہاڑ، زمین کے سکون اور ٹھہراؤ کا سبب کیونکر ہوتے ہیں؟ اس بارے میں بہت سی توجیہات کو ذکر کیا گیا ہے جن میں چند ایک یہ بھی ہیں:

علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں "وہ یوں کہ جب کشتی کو پانی میں چھوڑا جاتا ہے تو وہ ادھر ادھر ہچکولے کھانے اور ایک طرف سے دوسری طرف ہلنے لگتی ہے، لیکن اگر اس پر بوجھ ڈالا جائے تو وہ سطح آب پر ٹک جاتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالی نے زمین کو سطح آب پر خلق فرمایا تو وہ ادھر ادھر ہلنے کانپنے اور ہچکولے کھانے لگی۔ جس پر اللہ تعالی نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور اس میں انہیں میخوں کی طرح گاڑ دیا جس سے زمین کی تھر تھراہٹ اور ہچکولے ختم ہو گئے اور وہ سطح آب پر جم گئی"۔

امام رازی کا اشکال

پھر کہتے ہیں کہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسا کرنا چند وجوہات کی بنا پر مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ توجیہ پیش کرنیوالا یہ کہے گا کہ اجسام کی حرکتیں یا تو طبعی اور فطری ہوتی ہیں یا نہ بلکہ کسی فاعل مختار کے پیدا کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔

پہلی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ اس میں شک نہیں ہے کہ زمین پانی سے زیادہ ثقیل ہے اور ثقیل چیز پانی میں ڈوب جاتی ہے اس پر تیرتی نہیں رہتی، لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب اسے پانی پر بچھایا گیا تو وہ تھر تھرا رہی تھی اور ہچکولے کھا رہی تھی جبکہ کشتی کا معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ لکڑی سے تیار کی جاتی ہے اور لکڑی کے اندر کھلے مسام ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ پانی پر تیرتی اور ہچکولے کھاتی ہے اور جب اس پر بھاری بھر کم بوجھ ڈالا جاتا ہے تو اس کی تھر تھراہٹ اور ہچکولے ختم ہو جاتے ہیں فرق صاف ظاہر ہے

دوسری صورت میں کہ اجسام کی حرکتیں فطری و طبعی نہیں بلکہ کسی فاعل مختار کے پیدا کرنے سے وجود میں آتی ہیں یہی کہا جائے گا کہ زمین طبعی طور پر ثقیل اور پانی طبعی صورت میں مائع نہیں بلکہ خداوند عالم نے ان کی طبیعت ایسی بنائی ہے کہ زمین پانی پر جمی ہوئی ہے اور پانی نے زمین کو احاطہ میں لیا ہوا ہے۔ پس اس صورت میں ہم یہی کہیں گے کہ اگر زمین پانی پر ساکن ہے تو اس لئے کہ خداوند عالم نے ہی اس کے اندر سکون کو خلق فرمایا ہے اور اگر متحرک اور لرزاں تھی تو بھی اس لئے کہ اللہ جل شانہ نے اس میں حرکت اور لرزہ پیدا کیا تھا البتہ یہ بات تو غلط ہو جاتی ہے کہ اللہ نے زمین کی حرکت کو پہاڑوں کے ذریعہ روکا ہوا ہے گویا دونوں مذکورہ صورتوں میں زمین کے سکون اور اس کی بے اطمینانی، تھر تھراہٹ اور ہچکولوں کے خاتمے کو پہاڑوں کا مرہون قرار دینا درست نہیں ہے"۔

اشکال کا جواب:

امام رازی نے اس مقام پر اور بھی بہت سے اشکالات پیش کیے ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے ہم یہاں پر ذکر نہیں کرتے۔ البتہ ان کے مذکورہ اشکالات کا جواب دیتے ہوئے کہیں گے ہمارا موقف یہ ہے کہ زمین طبعی طور پر مرکز کی طالب ہے اور وہ

اوائل میں اس قدر خفیف اور ہلکی تھی کہ پانی کی موجیں اسے ادھر ادھر دھکیل دیتی تھیں اور اسے اپنی طبعی جگہ سے آسانی کے ساتھ ہٹا دیتی تھیں۔ لہذا وہ بے سکونی اضطراب اور ہچکولوں کی صورت میں ادھر سے ادھر ماری ماری پھر رہی تھی کبھی اس کا ایک حصہ ڈوبتا تو دوسرا باہر نکل آتا یہ ڈوبتا تو وہ باہر ظاہر ہو جاتا، لیکن جب اللہ تعالی نے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور ان کے ذریعہ اسے ثقیل بنا دیا تو اس میں پانی اور اس کی موجوں کے مقابلے کی قوت پیدا ہو گئی اور پہاڑ اس کیلئے میخیں بن گئے۔ ہاں البتہ اس مقام پر امام رازی نے جو چیز بیان کی ہے اور اسے سراہا بھی ہے وہ یہ ہے: "اس مقام پر مجھے جو کچھ صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ: یہ بات تو یقینی دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ "زمین گول" ہے اور گیند کی مانند اس گول زمین کی سطح پر پہاڑی سلسلہ اس کے کھردرے پن اور نکلی ہوئی بلندیوں کے قائم مقام ہیں اور یہ بات جب ثابت ہو گئی تو ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ مذکورہ بلندیاں اور کھردرے نشیب و فراز اس پر سرے سے تھے ہی نہیں بلکہ بالکل صاف ستھری اور گول مٹول تھی تو ایسی صورت میں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ذرہ سے سبب سے بھی متحرک ہو جاتی، کیونکہ گول اور بسیط جسم کی خاصیت ہے کہ اگر اس کیلئے عقلی طور پر کوئی محرک نہ بھی ہو تو بھی ایک ادنیٰ سے سبب سے حرکت کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب زمین کی گول سطح پر یہ پہاڑ نصب ہو گئے اور اس کی سطح پر حقیقی معنوں میں کھردرا پن پیدا ہو گیا تو ان میں سے ہر ایک پہاڑ طبعی طور پر مرکز عالم کی طرف متوجہ ہوا۔ اور پہاڑوں کا اس قدر ثقل، بوجھ اور سنگینی نیز عظیم قوت و طاقت کے ساتھ مرکز عالم کی طرف متوجہ ہونا گویا گول زمین میں میخوں کا گڑ جانا ہے جو اسے ادھر ادھر ہچکولے کھانے سے روکے ہوئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر ان پہاڑوں کی تخلیق ایسے ہی ہے جیسے گیند میں میخیں گاڑ کر اسے ادھر ادھر ہونے سے روک دیا جائے اور پہاڑ بھی زمین کو گولائی میں حرکت کرنے سے روکے ہوئے ہیں۔ اس باب میں میری سمجھ میں تو یہی آیا ہے، ویسے خدا سب سے بہتر جانتا ہے"۔ لیکن ان کی اس گفتگو پر بھی اعتراض کیا گیا ہے، جسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں جو موقف پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ: "اگر پہاڑوں کی وجہ سے زمین میں تھرتھراہٹ اور اضطراب نہیں پایا جاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑ زمین کی گہرائیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسے جڑے اور ملے ہوئے ہیں جس طرح اس کے اوپر جال کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ ان کا سلسلہ قائم ہے، جس سے وہ زمین کو متفرق اور منتشر ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جس طرح پہلے زمانے میں دروازے کیلئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے تختے آپس میں ملا کر اور ان میں میخیں ٹھونک کر کواڑ تیار کئے جاتے تھے۔ ان میخوں سے ایک تو لکڑی کے تختے آپس میں خوب جڑ جاتے تھے اور پھر ان میں اس قدر مضبوطی پیدا ہو جاتی تھی کہ کسی صورت میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو پاتے تھے، اسی طرح پہاڑوں کی کیفیت ہے۔ اگر زمین میں گہرا کنواں کھودا جائے تو اس کے اندر سے بڑے بڑے سخت اور مضبوط پتھر نکلتے ہیں بلکہ بڑی بڑی چٹانوں تک رسائی ہو جاتی ہے۔ آپ زمین کے اکثر حصوں کو دیکھتے ہیں جو پہاڑوں کے درمیان گھری ہوتی ہیں اور ان کا یہ گھیراؤ جہاں زمین کے اوپر سے ہے وہاں اسے اندر سے بھی گھیرے ہوئے ہیں۔ اور یہ گویا اس کا ظرف بنے ہوئے ہیں جو اسے ہلنے جلنے، تھرتھرانے اور منتشر و متفرق ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں اور بھی وجوہات ہیں جو علماء نے بیان کی ہیں۔ لیکن امور کے اصل حقائق کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

چوتھی فصل

معرفت باری اور اس کے مراتب

اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُه، وَكَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيْقُ بِهِ وَكَمَالُ التَّصْدِيْقِ بِهِ تَوْحِيْدُه، وَ كَمَالُ تَوْحِيْدِهِ الإِخْلَاصُ لَه، وَ كَمَالُ الإِخْلَاصِ لَه نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوْفِ وَشَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوْفٍ اَنَّه غَيْرُ صِفَةٍ فَمَنْ وَصَفَ سُبْحَانَه، فَقَدْقَرَنَه، وَمَنْ قَرَنَه، فَقَدْ ثَنَّاهُ وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْجَزَّاَه، وَمَنْ جَزَّاَه فَقَدْ جَهِلَه،.

دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے، کمال معرفت اس کی تصدیق ہے، کمال تصدیق توحید ہے، کمال توحید تنزیہ واخلاص ہے اور کمال تنزیہ واخلاص یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے۔ کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ اپنے صفت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ لہذا جس نے ذات الٰہی کے علاوہ صفات مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا، جس نے اس کی ذات کا اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی، جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس کیلئے جزبناڈالا اور جو اس کیلئے اجزا کا قائل ہوا گویا کہ وہ اس سے بے خبر رہا۔

تشریح

(اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُه،) دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے۔ لفظ "اوّل" کے بارے میں جمہور بصری کہتے ہیں کہ اس کا اصل "اوءَ ل" بروزن "اَفعَل" "مہموز العین ہے دوسرے ہمزہ کو واو میں تبدیل کر کے واو میں ادغام کر دیا گیا "اوّل" بن گیا۔ اس کی جمع اوائل اور اوالی ہے۔ جبکہ کوفی اور کچھ بصریوں کا موقف ہے کہ اس کی اصل "وَوءَ ل" بروزن "فَوْعَلَ" ہے پہلی واو کو الف میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس کا لغوی معنی کسی چیز کی ابتدا ہے، کبھی اس کا "ثانی" ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ "دین" کے معنی ہیں اطاعت، فرمانبرداری، عبادت اور اسلام، جیساکہ خداوند متعال فرماتا ہے: "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الاِسْلَامُ" (سورہ آل عمران/۱۹) اللہ کے نزدیک بہترین دین اسلام ہے۔

علامہ طریحیؒ دین کی یوں تعریف فرماتے ہیں 'اَلدِّيْنُ وَضْعٌ اِلٰهِيٌّ لِاُولِي الْاَلْبَابِ يَتَنَاوَلُ الْاُصُوْلَ وَ الْفُرُوْعَ' دین خدا کی طرف سے صاحبان عقل کیلئے وضع کردہ اصول و فروع ہیں۔ "معرفت" کے معنی ہیں جاننا۔ اور علم اور معرفت کے درمیان فرق یہ ہے کہ معرفت، بسائط اور جزئیات کے ادراک کو کہتے ہیں جبکہ علم مرکبات اور کلیات کے ادراک کا نام ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے "عَرَفْتُ اللهَ" میں نے خدا کی معرفت حاصل کی، "عَلِمْتُ اللهَ" نہیں کہا جاتا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ "معرفت" تصورات کے ادراک کو کہتے ہیں جبکہ علم تصدیق کے ادراک کو کہتے ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ کسی چیز کو بھول جانے کے بعد پھر اس کا ادراک کرنا معرفت کہلاتا ہے، اسی لئے حق تعالیٰ کو "عالم" کہتے ہیں "عارف" نہیں کہتے۔ غرض معرفت کے بارے میں

یہ چند ایک مشہور اقوال تھے جو درج کئے گئے ہیں، اب یہاں اس خطبہ میں معرفت کا استعمال کس لئے کیا گیا ہے؟ اس لئے کہ خدا کی ذات کے ادراک کا تعلق یا تو "عالم ذر" کے ساتھ ہے یا پھر اس زمانے کے ساتھ جب اس نے عقول مجردہ سے عہدو پیمان لیا تھا۔ اس نکتہ کو خوب ذہن نشین کر لیں تاکہ آگے چل کر اس کی تفصیلی بحث سے آگاہی حاصل ہو۔

"توحید" کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک ماننا یعنی اس کی وحدانیت کا حکم لگانا۔ اور کبھی اس کا اطلاق دو چیزوں کے اتصال کے بعد ان کے جدا ہونے پر بھی ہوتا ہے اور کسی شخص کے کسی فعل کو اکیلے بجالانے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جبکہ اس کا اصطلاحی معنی ہے: "خدا کی ذات کیلئے وحدانیت کا ثابت کرنا" اور وحدانیت کے معنی ہیں وجود کے لحاظ سے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے اور نہ ہی مطلقاً اس کی عین ذات میں کثرت ہے اس لئے کہ نہ تو اس میں ترکیب پائی جاتی ہے اور نہ ہی اس کے اجزا ہیں نہ ہی اس کی ذات کے مرتبہ میں کثرت ہے اور نہ ہی اس کے اجزا ہیں، اس لئے کہ وجود ذات صرف ایک ہی ہے۔ اور نہ ہی ذات کے مرتبہ کے بعد کثرت ہے اس لئے کہ زیادتی صفات کی اس سے نفی کی گئی ہے اور کبھی اس سے یہ معنی بھی مراد لیا جاتا ہے کہ کمال کی کوئی چیز اس سے مفقود نہیں ہے بلکہ جو بھی چیز اس کے لائق شان ہے وہ اس کیلئے بالذات موجود ہے یا بالفعل۔

"اخلاص" مصدر ہے باب افعال سے اور یہ لفظ اس وقت کسی چیز کیلئے بولا جاتا ہے جب اسے ہر شائبہ سے خالی سمجھا جائے جیسا کہ پانی کیلئے اس وقت "خَلَصَ الْمَاءُ" بولا جاتا ہے جب وہ ہر قسم کے گدلے پن سے صاف ہو۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے: "مِنۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا" (سورہ نحل / ٦٦) ہضم شدہ غذا اور خون کے درمیان میں سے خالص اور پسندیدہ دودھ۔ یعنی دودھ میں نہ تو گوبر ہے اور نہ ہی خون ہے۔ اور طاعت میں "اخلاص" سے مراد ریاکاری کو ترک کرنا ہے اور دین میں اس سے مراد شرک کو ترک کرنا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پورے خطبہ میں سے یہ جملے اپنے اختصار کے باوجود اکثر علوم الٰہیہ کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ جن میں بہت سے واضح دلائل موجود ہیں، اسی لئے اس کے معانی کے ادراک کیلئے بہت سے صاحبان عقل و فہم حیران اور اس کے اصل مقصد تک پہنچنے کیلئے عقول و اوہام سرگردان ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رازوں کو بیان کیا جائے اور ان رازوں کے کچھ نورانی نمونے پیش کئے جائیں اور اس کے ساتھ ہی علمائے اعلام کے تفسیر کردہ کلام کو ذکر کیا جائے۔ چنانچہ آپؑ ارشاد فرماتے ہیں: (اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهٗ) دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے۔ یعنی طاعت اور عبادت کی ابتدا خدا کی معرفت ہے، کیونکہ بندہ اس وقت "عبد" کہلا سکتا ہے جب اسے معبود و مطاع کی معرفت ہو، کیونکہ اگر معرفت نہیں ہو گی تو پھر اس کی اطاعت اور عبادت ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے کسی غیر مسلم عالم نے یہ سوال کیا "آپؑ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں، کیا اسے دیکھا بھی ہے؟" ارشاد فرمایا: "افسوس ہے تم پر میں ایسے رب کی عبادت ہی نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو!"۔ پوچھا کہ "اسے کیسے دیکھا؟" فرمایا: "اسے آنکھیں اپنی نگاہوں کے ساتھ ادراک نہیں کر پاتیں بلکہ دل ایمان کی حقیقتوں کے ساتھ ادراک کرتا ہے"۔

اسی چیز کو کافی میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے اور سید رضی علیہ الرحمہ نے

قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ متن کتاب میں بھی درج کیا ہے اور وہ خطبہ ۸۷ میں مذکور ہے۔ معرفت خداوند متعال کبھی تو ناقص ہوتی ہے اور کبھی تام (مکمل)؛ ناقص معرفت کی مثال یہ ہے کہ انسان اس بات کی معرفت حاصل کرے کہ اس کائنات کو چلانے والا ایک صانع اور مدبر ہے، لیکن تام (مکمل) معرفت یہ ہے کہ جس کی طرف مولائے کائنات نے اشارہ فرمایا ہے (وَ کَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيْقُ بِهٖ) اور کمال معرفت اس کی تصدیق ہے۔ یعنی اس بات کا یقین کرنا کہ وہ موجود بھی ہے اور واجب الوجود بھی ہے۔ کیونکہ جب کسی چیز کا تصور شدت اختیار کر جائے تو وہ یقین اور حکم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ جب یہ بات واضح ہے کہ خداوند متعال کائنات کا خالق و صانع اور اس کا معبود ہے تو وہ واجب الوجود ہے یعنی موجود فی نفسہٖ ہے، اس لئے کہ جو موجود فی نفسہٖ نہیں ہوتا اس سے کسی دوسرے موجود کا اثر صادر ہونا محال ہوتا ہے۔ پس یہ حکم جو مذکورہ تصور کے لاحق ہو رہا ہے اس کی معرفت اور تصور کا کمال ہے۔ پھر یہ کہ تصدیق کبھی ناقص ہوتی ہے اور کبھی تام (مکمل) ناقص تصدیق یہ ہے کہ اس کی ذات کی تصدیق کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھا جائے کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے، لیکن تام اور مکمل تصدیق یہ ہے جیسا کہ خود امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں (وَ کَمَالُ التَّصْدِيْقِ بِهٖ تَوْحِيْدُهٗ) کمال تصدیق توحید ہے۔ یعنی اس کی وحدانیت کا حکم لگایا جائے کہ اس کے ساتھ اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں۔ کیونکہ واجب الوجود کی طبعی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس وجود کو دو شریکوں کے درمیان فرض کر لیا جائے تو ضروری ہوگا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز ہو جو ان دو کو آپس میں جدا کرے، تو اس طرح سے ان دونوں کی ذات کیلئے لازم ہو جائے گا کہ مرکب ہوں، اور اگر مرکب تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ممکن الوجود ہیں۔ اس کی مزید وضاحت کیلئے یوں سمجھئے کہ اگر ہم ایسے دو موجود تسلیم کرتے ہیں جو واجب الوجود ہیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ واجب الوجود ہونے میں دونوں برابر کے شریک ہیں اور ہیں ایک دوسرے کے غیر، اگر ایک دوسرے کے غیر نہ مانیں تو پھر دو وجود نہیں ہوں گے۔ اور پھر ان دونوں کو جو چیز ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے وہ یا تو عین حقیقت ہوگی یا عین حقیقت تو نہیں بلکہ اس کا جزو ہوگی۔ عین حقیقت تو یہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر یہ جدائی عین حقیقت ہو پھر ان کے وجود کا وجوب دونوں کے درمیان مشترک ہے، وہ ان دونوں کی عین حقیقت سے خارج ہو جائے گا اور یہ محال ہے۔ کیونکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وجوب وجود، واجب الوجود کی ذات کیلئے عین حقیقت ہے۔ اگر یہ تسلیم کریں کہ عین حقیقت کا جزو ہوگی تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دونوں وجود ایسی چیز سے مرکب ہیں جو ان کے درمیان مشترک بھی ہے اور ان سے جدا بھی ہے، تو پھر ایک مرکب دوسری جزو کا محتاج ہوگا جو اس کا غیر ہے، اور یہی چیز اسے ممکن کے دائرے میں لے آئے گی جو باطل ہے۔

پھر توحید بھی کبھی ناقص ہوتی ہے اور کبھی تام (کامل)۔ ناقص توحید یہ ہے کہ اسے تسلیم تو کیا جائے لیکن خلوص کے ساتھ نہیں اور تام و کامل یہ ہے جس کی طرف امام الموحدین علیہ السلام نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے (وَ کَمَالُ تَوْحِيْدِهِ الْاِخْلَاصُ لَهٗ) اور اس کی توحید کامل تنزیہ و اخلاص، یعنی اسے ہر قسم کے نقص سے خالی اور پاک و صاف تسلیم کیا جائے۔ اس سے جسم و عرض جیسے نقائص کو سلب کیا جائے کیونکہ یہ ناقص صفات ہیں۔ اس بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ "اخلاص" سے مراد اخلاص عمل ہے، یعنی اس کیلئے ہر عمل خالص طور پر بجالایا جائے۔ اس دوسرے معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے "اَلْاِخْلَاصُ لَهٗ" میں

لام کو تعلیل کیلئے ماننا ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے : "وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ "(سورہ بینہ / ۵) حالانکہ انہیں کوئی حکم اس کے سوا نہیں دیا گیا کہ وہ کمال اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔

شارح بحرانی اور صدرائے شیرازی حضرت کے اس قول "وَ كَمَالُ تَوْحِيْدِهِ الإِخْلاَصُ لَهُ" کے بارے میں فرماتے ہیں :"اس قول میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عارف کیلئے توحید مطلق تنزیہ واخلاص کے ساتھ مکمل اور کامل ہوتی ہے اور یہی زہد حقیقی ہے جو نام ہے حق کے ماسوا سے منہ موڑ لینے کا......"

اس کی وضاحت کیلئے یوں سمجھئے کہ "علم سلوک" میں یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ "عارف" جلال وعظمت الٰہی کو دیکھتے ہوئے جب تک اس کے ماسوا کی طرف متوجہ رہے گا تو وہ مقام وصول تک نہیں پہنچ پائے گا، خدا کے ساتھ دوسروں کو ملا رہا ہے حتیٰ کہ اہل اخلاص تو اسے شرک خفی سمجھتے ہیں، جیسا کہ ایک اہل اخلاص کا قول ہے ؛

مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ خَرْدَلَةٍ   سِوىٰ جَلاَلِكَ فَاعْلَمْ أَنَّهُ مَرَضٌ

جس کے دل میں تیرے جلالِ عظمت کے سوا رائی برابر کوئی اور بستا ہے تو یقین جان کہ وہ دل مریض ہے۔

وہ اخلاص کو مخصوص معنوں میں اس وقت اخلاص سمجھتے ہیں کہ جب عارف جلال الٰہی کو دیکھ رہا ہو تو اپنے آپ کو بھول جائے، خود کو گم کر دے اور دیکھے بھی تو اس نقطہ نظر سے کہ وہ جلال الٰہی ہے، نہ اس لحاظ سے کہ زینت حق سے مزین ہے۔ اسی چیز کا نام "توحید مطلق" ہے کہ اس کے ساتھ مطلقاً غیر کو قابل اعتبار نہ سمجھا جائے............

پھر اخلاص، ناقص بھی ہوتا ہے اور تام بھی۔ ناقص یہ ہے کہ اسے نقص کی تمام صفات سے پاک تو سمجھا جائے لیکن ساتھ ہی اس کیلئے کمال کی صفات بھی ثابت کی جائیں۔ جبکہ تام وہ ہے جسے حضرتؑ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے (وَ كَمَالُ الإِخْلاَصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ) کمال تنزیہ واخلاص یہ ہے کہ اس کی صفتوں کی نفی کی جائے۔ یعنی ان صفات کی کہ جن کا وجود، اس کی ذات کے وجود کے علاوہ ہے، وگرنہ ذات اقدس الٰہی تو بذات خود تمام صفات کمالیہ اور اوصاف الٰہیہ کی جامع ہے اور کوئی بھی کمال کی صفت زائد بر ذات نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا علم وارادہ، قدرت وحیات اور سمع وبصر تمام کی تمام اس کی ذات احدیت کے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ البتہ ان کا مفہوم جدا گانہ اور ان کے معانی مختلف ہیں۔ کیونکہ حقیقت وجودیہ کا کمال اسی میں ہے کہ وہ "وحدت الوجود" رکھتے ہوئے کمال کے کثیر معانی کی جامع ہو۔

عرفان کے مراتب

غرض حضرت امیر علیہ السلام کے اس ارشاد مبارک سے "عرفان" کے پانچ مراتب حاصل ہوتے ہیں

۱:۔ مرتبہ تصور۔ اور یہ اس بات کو درک کرنا ہے کہ اس کائنات کے لئے ایک مؤثر ہے۔ اور یہی وہ مرتبہ ہے کہ تمام مخلوق اسی فطرت پر خلق ہوئی اور اسی کی جبلت اور سرشت میں یہی چیز شامل ہے، اور سرکار رسالتؐ پناہ کا یہ فرمان بھی اسی چیز کی نشاندہی

کرتا ہے کہ "كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ اِلَّا اَنَّ اَبَوَيْهِ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْيُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ" ہر بچہ فطرت الٰہی (دین اسلام) پر پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیں۔

۲:۔ مرتبہ تصدیق۔ یعنی براہین ساطعہ اور دلائل قاطعہ کے ساتھ اس کے وجود اور وجوب کا یقین کر لینا، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" (سورہ ابراہیم / ۱۰) کیا اس اللہ کے بارے میں شک ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

۳:۔ مرتبہ توحید۔ یعنی اسے ہر قسم کے شریک سے وحید و فرید سمجھنا جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" (سورہ توحید / ۱) کہہ دیجئے کہ اللہ یکتا و یگانہ ہے۔ یا "قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" (سورہ کہف / ۱۱۰) کہہ دو کہ میں تو تم جیسا بشر ہوں البتہ میری خصوصیت یہ ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی ہے۔

۴:۔ مرتبہ اخلاص۔ یعنی اسے ہر طرح کے عیب و نقص سے مبرا سمجھنا۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے: "اَللّٰهُ الصَّمَدُ" (توحید / ۲) اللہ ہی ہے جس کی طرف تمام حاجتمند رخ کرتے ہیں یعنی وہ کون و فساد سے بلند و بالاتر ہے۔ یا "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ" (توحید / ۳) نہ تو اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ یا اس کیلئے خالصانہ طور پر اعمال بجا لائے جائیں، جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے: "فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا" (کہف / ۱۱۰) پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہئے کہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔

۵:۔ مرتبہ نفی صفات۔ اور یہ عرفان کی آخری حد اور قوت انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ آپؑ کے اس ارشاد مبارک سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ پہلے چار مراتب میں سے ہر ایک بالترتیب دوسرے مرتبہ کیلئے مبداء کی حیثیت رکھتا ہے اور آخری چار مرتبے بالترتیب اپنے سے پہلے مرتبے کیلئے کمال کی حیثیت رکھتے ہیں اگر ان پانچوں مراتب کو ملا کر ایک مثال دی جائے تو اسے یوں سمجھئے جیسے اخروٹ کی چھال ہوتی ہے، اس کے بعد اس کا چھلکا ہوتا ہے، اس کے بعد گودا ہوتا ہے اس کے بعد گری ہوتی ہے اور آخر میں اس کے مغز سے نکلنے والا تیل ہوتا ہے۔ پس پہلا مرتبہ ایسے ہے جیسے اخروٹ کی چھال ہوتی ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اگر اسے کھایا جائے تو اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے جسے دور پھینک دیا جاتا ہے، لیکن وہ اس کے بعد والے سخت چھلکے کی حفاظت ضرور کرتی ہے۔ دوسرا مرتبہ اس سخت چھلکے کی مانند ہے جو چھال کے نیچے ہوتا ہے اس کا فائدہ صاف ظاہر ہے کہ وہ گودے کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے مکمل طور پر پکنے تک اسے ہر طرح کی خرابی سے بچائے رکھتا ہے۔ لیکن گودے کی نسبت اس کی وہ قدر و قیمت نہیں اور نہ ہی وہ گودے کا کسی طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔ تیسرا مرتبہ اس گودے کا ہوتا ہے جو گری کے ارد گرد ہوتا ہے اور گری کے ساتھ ساتھ اسے بھی کھا لیا جاتا ہے۔ جبکہ چوتھا مرتبہ خود اس کی گری کا ہوتا ہے اور اس کا فائدہ اور مقام واضح اور صاف ظاہر ہے۔ پانچواں اور آخری مرتبہ گری سے نکلے ہوئے تیل کا ہوتا ہے جو ہر قسم کے شائبہ سے پاک صاف اور خالص ہوتا ہے۔ اس قدر صاف ستھرا اور چمکدار گویا اس سے نورانی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔

معرفت باری کی عرفانی تفسیر

بعض عرفاء نے آپؑ کے کلام کی ایک اور انداز میں جو تفسیر کی ہے جسے درج کرنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ: دین کا معنی ہے اطاعت اور فرمانبرداری اور اطاعت کے لئے معرفت کو اس لئے اوّلیت حاصل ہے کیونکہ یا تو اطاعت، معرفت پر موقوف ہے یا اس کے لئے پہلا زینہ ہے۔ کیونکہ معرفت سے مراد یا تو تصور ہے یا اس پر قلبی عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ موعظہ حسنہ سے حاصل ہوتا ہے، لیکن جو تصدیق کمال معرفت کہلاتی ہے وہ حکمت اور برہان سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس تصدیق سے مراد شاید وہی علم الیقین کا مرتبہ ہے اور کمال تصدیق سے مراد عین الیقین کا مرتبہ ہے اور اخلاص سے مراد حق الیقین کا مرتبہ ہے۔ اور یہ فنا کے وقت حاصل ہوتا ہے۔ اور "کمال اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے" یہی تو فنا سے فنا ہے یہی وہ مراتب ہیں جو سالک تارک کے حاصل کرنے کے لئے ترتیب دیئے گئے ہیں اور ہر بعد میں آنے والا مرتبہ اپنے سے پہلے مرتبہ کیلئے غرض وغایت ہوتا ہے اسی لئے ہر بعد میں آنے والے مرتبہ کو پہلے مرتبہ کی نسبت " کامل " سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعد والا پہلے سے خاص ہوتا ہے اور پہلے والا بعد سے عام ہوتا ہے۔ اور عام کا وجود چونکہ خاص کے وجود سے ترتیب پاتا ہے لہذا وہ اس کے لئے کمال کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرتؑ نے جو یہ ارشاد فرمایا ہے "کمال توحید یہ ہے کہ اسے خالص مانا جائے" یعنی اس کیلئے کمال کے صفات ثابت کر کے ان کے مقابل کے نقص کے صفات کو سلب کیا جائے جیسے "علم" کو ثابت کر کے "جہل" سلب کیا جائے "قدرت" ثابت کر کے "عجز" کو سلب کیا جائے۔ اسی طرح باقی صفات ہیں اور اسی چیز کا نام "کمال توحید" ہے، کیونکہ یہ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ وحدت باری تعالیٰ ناقص وحدت نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وحدت ایسی وحدت حقہ ہے جو اس کے حقہ ہونے کا حق ہے۔

جب اس کیلئے اخلاص اس کی صفات کی اثبات کیلئے لازمی بن جاتا ہے تو مولا علیؑ فرماتے ہیں: "اس کیلئے کمال اخلاص یہی ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے" یعنی اس کیلئے حاصل ہونے والے کمالات، نقص کے صفات سلب کر کے اس کیلئے ثابت قرار دیئے جائیں۔ اور ایسا کرنا اس کی عین ذات احدیت ہے۔ اور اس کی ذات نہایت ہی اعلیٰ اور اشرف صورت میں کل کمالات ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ" سے یہ مراد لی جائے کہ تعریف کرنے والے خواہ اس کی کتنا ہی تعریف کیوں نہ کریں پھر بھی اس کی شان کے مطابق نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ جس قدر دقیق سے دقیق معانی میں اس کی تعریف کریں گے پھر بھی انہی کی طرح مخلوق ہی ہو گی۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے؛

عَجِزَ الْوَاصِفُوْنَ عَنْ صِفَتِكَ اِعْتِصَامُ الْوَرىٰ بِمَغْفِرَتِكَ
تُبْ عَلَيْنَا فَاِنَّنَا بَشَرٌ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ

تیری صفت بیان کرنے والے عاجز آ گئے، کائنات تیرے دامن عفو ومغفرت کو تھامے ہوئے ہے۔ ہماری توبہ کو قبول فرما کیونکہ ہم تو بہر حال بشر ہیں، جو تیری معرفت کا حق ہے اسی طرح ہم تجھے پہچان نہیں سکے۔

آخر کار نتیجہ یہ نکلے گا کہ معرفت کی آخری حد یہ ہے کہ اس کی معرفت سے عجز کا اقرار کرنا پڑا ہے اور یہی کہنا پڑا ہے کہ جس

طرح تو نے اپنی تعریف کی ہے بالکل اسی طرح ہے، ہم تیری تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

(لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوْفِ وَشَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوْفٍ اَنَّهٗ غَيْرُ صِفَةٍ) کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ یہاں شہادت سے مراد حال کی شہادت ہے اور یہی دلالت ہے۔ اس لئے کہ صفت کی حالت گواہی دے رہی ہوتی ہے کہ اسے موصوف کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر اس کا قیام ناممکن ہے۔ جبکہ موصوف کی حالت اس بات کی گواہی دے رہی ہوتی ہے کہ وہ اصل وجود میں تو صفت سے بے نیاز ہے اور صفت کے بغیر بالذات قائم ہے، ہاں البتہ اسے صفت کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے جب اسے کمال کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا عین نہیں ہے۔

پھر یہ کہ یہ جملہ ان صفات عارضہ کے برہان کی نفی ہے جنہیں قدیم فرض کر لیا گیا ہے اور اشاعرہ جس کے قائل ہیں۔ وہ یوں کہ صفت جب عارض ہوگی تو لامحالہ موصوف کا غیر ہوگی اور جو دو چیزیں وجود میں ایک دوسرے کا غیر ہوتی ہیں تو وہ ایک دوسرے سے جدا بھی ہوتی ہیں، اور کسی اور چیز کے ذریعہ آپس میں ایک دوسرے کا شریک ہوتی ہیں اور وہ ہے وجود کہ جس میں دونوں شریک ہیں۔ اور یہ بات محال ہے کہ اشتراک کی صورت ہی امتیاز اور جدائی کی صورت ہو۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں واحد بھی ہے اور کثیر بھی، بلکہ وحدت وہی کثرت ہے اور کثرت وہی وحدت ہے، اور یہ محال ہے۔ ایسی صورت میں ماننا پڑے گا کہ ان میں سے ہر ایک ایسے اجزا سے مرکب ہو جو دونوں کیلئے مشترک بھی ہوں اور جدا کنندہ بھی۔ تو پھر ذات واجب الوجود کو مرکب ماننا پڑے گا جو کہ محال ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرکب نہیں ہے۔ اور اسی بات کی طرف حضرت امیرؑ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے (فَمَنْ وَصَفَ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ) تو جس نے اس ذات الٰہی کے علاوہ صفات مانے اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا (وَمَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ) اور جس نے اس ذات کا کوئی اور ساتھی مان لیا اس نے دوئی پیدا کی۔ یعنی اس نے دو قدیم تسلیم کر لئے ۔(وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاَهٗ) جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس کیلئے جز بنا ڈالا، کیونکہ جو یہ سمجھتا ہے کہ خداؤں میں سے دوسرا ہے تو اس نے اسے دو اجزا والا مرکب مان لیا کہ ایک کے ساتھ وجود میں شریک ہے اور دوسرے کے اجزا میں مخالف ہے ...... (وَمَنْ جَزَّاَهٗ فَقَدْ جَهِلَهٗ) اور جو اس کیلئے اجزا کا قائل ہوا گویا کہ وہ اس سے بے خبر رہا۔ کیونکہ اس کا اعتقاد حقیقت وواقع کے خلاف ہے۔

چند عرفانی باتیں

عرفان کے سلسلے میں مذکور ہونے والی روایات اگرچہ بہت زیادہ ہیں لیکن ہم یہاں پر چند ایک کا تبرک کے طور پر ذکر کرتے ہیں:۔

شیخ صدوق علیہ الرحمہ اسناد کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ ایک رات میں باہر نکلا تو دیکھا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہیں اکیلے چلے جارہے ہیں اور دوسرا کوئی بھی شخص آپؐ کے ہمراہ نہیں ہے۔ میں نے سمجھا شاید آپؐ کسی کو اپنے ساتھ لے جانا گوارہ نہیں فرماتے۔ چنانچہ میں بھی چاندنی کے پرتو میں آپؐ کے پیچھے ہولیا۔ آپؐ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "کون ہو؟" میں نے کہا: "صدقے جاؤں! ابوذر ہوں!" فرمایا "ابوذر! ادھر آؤ!" چنانچہ میں آپؐ کے ساتھ چل دیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا "مال و تعداد کی کثرت پر اترانے والے لوگ قیامت کے دن بہت کمی میں ہوں گے۔ سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں خداوند عالم خیر عطا فرمائے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور خیر کے کام کرتے ہیں"۔

اس کے بعد ہم کچھ دیر کیلئے آگے چل دیئے، پھر آپؐ نے فرمایا: "تم یہیں پر بیٹھ جاؤ!" مجھے ہموار زمین پر بٹھادیا اور خود سیاہ پتھروں والی زمین کی طرف چل دیئے اور فرمایا: "میری واپسی تک یہیں پر بیٹھے رہنا"۔ آپؐ اتنی دور چلے گئے کہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے اور کافی دیر تک اوجھل رہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ "وَ اِنْ زَنٰی وَ سَرَقَ" (خواہ زنا کرے یا چوری) کہتے ہوئے آرہے ہیں۔ جب تشریف لے آئے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھ لیا: "اللہ کے رسولؐ! آپؐ کے قربان جاؤں آپ ادھر کس سے باتیں کررہے تھے؟" فرمایا: "جبرائیل امین تھے جو وہاں میرے پاس آئے اور کہا" اپنی امت کو اس بات کی خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شخص اس حالت میں مرے کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو وہ جنت میں جائے گا!" میں نے کہا "جبرائیل! خواہ وہ زنا اور چوری کرے یا شراب بھی پیئے؟" کہا: "خواہ شراب بھی پیئے!"

حضرت شیخ صدوق رحمتہ اللہ علیہ یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے توبہ کرنے کی توفیق ہوگی وہ توبہ کرکے مرے گا اس لئے جنت میں جائے گا اسی کتاب میں اسود بن ہلال سے وہ معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں معاذ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رفاقت میں تھا آپؐ نے مجھ سے تین مرتبہ پوچھا: "معاذ! آیا جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟" میں نے عرض کیا: "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں!" اس پر آپؐ نے فرمایا: "خدا کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں" پھر فرمایا "جانتے ہو کہ بندوں کا خدا پر کیا حق ہے جب وہ اس کا شریک نہ ٹھہرائیں؟" میں نے عرض کیا "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔ فرمایا: "خدا انہیں عذاب نہ دے" یا فرمایا "خدا انہیں جہنم میں نہ ڈالے"۔

اسی کتاب میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اس ذات کی قسم! جس نے مجھے برحق نبی بنا کر بھیجا ہے، خداوند عالم کسی توحید پرست کو جہنم کا عذاب ہرگز نہیں دے گا۔ اور یہ بھی ہے کہ موحدین، گناہگاروں کے حق میں شفاعت کریں گے جو کہ مان لی جائے گی"۔ پھر فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا تو خداوند عالم بدکار لوگوں کو جہنم جانے کا حکم دے گا، تو وہ کہیں گے: "خداوندا! تو ہمیں دوزخ کیوں بھیج رہا ہے جبکہ دنیا میں ہم تیری توحید کے قائل تھے۔ تو ہماری زبانوں کو کس لئے جہنم کی آگ سے جلائے گا جبکہ وہ لا الہ الا اللہ کا تذکرہ کرتی تھیں، ہمارے دلوں کو کیونکر آگ میں جلائے گا جبکہ وہ لا الہ الا اللہ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ ہمارے چہروں کو آگ سے کیوں جلائے گا جبکہ وہ تیری خاطر مٹی میں خاک آلود ہوتے رہے،

ہمارے ہاتھوں کو کس لئے جلائے گا جبکہ وہ تیری طرف دعا کیلئے اٹھتے رہے!" خداوند عالم فرمائے گا "میرے بندو! دنیا میں تمہارے اعمال خراب تھے جن کی سزا جہنم ہے!"۔ تو وہ کہیں گے: "خدایا! تیری عفو و بخشش عظیم ہے یا ہمارے گناہ؟" اللہ فرمائے گا: "میری بخشش!" پھر کہیں گے: "پروردگارا! تیری رحمت زیادہ وسیع ہے یا ہمارے گناہ؟" ارشاد ہو گا: "میری رحمت!" وہ کہیں گے: "ہمارا تیری توحید کا اقرار بڑا ہے یا ہمارے گناہ؟" خدا فرمائے گا: "تمہارا میری توحید کا اقرار کرنا!" پھر وہ سب مل کر کہیں گے: "پس تیری عفو بخشش اور رحمت ہی ہمارے شامل حال ہونی چاہئے جو سب کچھ پر حاوی ہے"۔ یہ سن کر خداوند عالم فرشتوں سے کہے گا: "اے فرشتو! مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میں نے جو مخلوق بھی پیدا کی ہے ان میں سے میری توحید کا اقرار کرنے والوں سے بڑھ کر مجھے کوئی اور زیادہ عزیز و محبوب نہیں ہے۔ اور مجھ پر حق بنتا ہے کہ میں اپنی توحید کا اقرار کرنے والوں کو جہنم میں نہ ڈالوں، لہذا میرے ان بندوں کو بہشت میں پہنچا دو"۔

عقیدہ ولایت ضروری ہے

یہ بات ضرور ذہن میں رہے کہ صرف توحید، نفی شرک اور اعتراف وحدانیت کا عقیدہ ثواب کے حصول اور عذاب کے دفعیہ کیلئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ولایت کا عقیدہ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ توحید اور معرفت کے ابواب میں بیان ہونے والی احادیث اگرچہ مطلق ہیں، لیکن علمائے امامیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ دوسری روایات کو جو عقیدہ توحید کیلئے عقیدہ ولایت کو شرط قرار دیتی ہیں ان احادیث کے ساتھ ملایا جائے گا اور یہ عقیدہ توحید کی صحت کیلئے اسی طرح شرط ہے جس طرح فروع دین اور ان کی قبولیت کیلئے۔ عقیدہ ولایت کے بغیر نہ تو عقیدہ توحید صحیح ہے اور نہ ہی کوئی عمل قابل قبول ہے، اور اسی طرح کی احادیث اس قدر کثیر ہیں کہ تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں، جن میں سے چند ایک کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے:۔

ا۔ جامع الاخبار میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے جو آپؑ اپنے آباء طاہرین سے بیان فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: 'اللہ تعالی نے میرے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام کیلئے اس قدر فضائل خلق کئے ہیں کہ جن کی تعداد کو خود خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ لہذا جو شخص اس کے فضائل میں سے صرف ایک فضیلت کو اس کا اقرار کرتے ہوئے بیان کرے تو اللہ تعالی اس کے تمام گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دیتا ہے خواہ وہ قیامت کے دن ثقلین (دونوں جہانوں) کے گناہ لے کر ہی کیوں نہ آئے۔ جو شخص علیؑ کے فضائل میں سے ایک فضیلت کو لکھے تو جب تک وہ تحریر موجود ہو گی اس وقت تک فرشتے اس کیلئے استغفار کرتے رہیں گے۔ جو شخص اس کی صرف ایک فضیلت کو سنے تو اللہ تعالی اس کے کانوں کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ جو شخص اس کی لکھی ہوئی ایک فضیلت کو پڑھے تو اللہ تعالی اس کی آنکھوں کی تمام گناہ معاف کر دے گا"۔

پھر فرمایا: "اَلنَّظَرُ اِلٰی عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عِبَادَةٌ وَ ذِکْرُهٗ عِبَادَةٌ وَ لَا یُقْبَلُ اِیْمَانُ عَبْدٍ اِلَّا بِوِلَایَتِهٖ وَ الْبَرَائَةِ مِنْ اَعْدَائِهٖ" علی بن ابی طالب کی طرف دیکھنا بھی عبادت اور اس کا ذکر بھی عبادت ہے۔ اور کسی بندے کا ایمان اس کی ولایت اور اس کے دشمن سے برائت کئے بغیر قابل قبول نہیں ہے۔

کافی میں اسناد کے ساتھ حضرت امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "صحیح معنوں میں خدا کی عبادت وہ شخص کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ اس کی ویسے ہی عبادت کئے جاتا ہے تو یہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے آپؑ سے پوچھا "قربان جاؤں! خدا کی معرفت کیا ہوتی ہے؟" ارشاد فرمایا: "اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق، علیؑ کی ولایت اور باقی ائمہ (اطہار) علیہم السلام کی امامت کا اقرار اور ان کے دشمنوں سے اظہار برائت تو یہ ہے خدا کی معرفت!"۔

وسائل الشیعہ اور تفسیر مجمع البیان میں جناب ابو حمزہ ثمالی روایت کرتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ہم سے پوچھا کہ: "روئے زمین کا کونسا ٹکڑا افضل ہے؟" ہم نے عرض کیا: "خدا، رسولؐ اور فرزند رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں"۔ آپؑ نے فرمایا "رکن (یمانی) اور مقام (ابراہیمؑ) کے درمیان کا حصہ تمام روئے زمین سے افضل ہے۔ اور اگر کسی شخص کو اس قدر عمر مل جائے جتنا حضرت نوحؑ کو ان کی قوم میں ملی یعنی ساڑھے نو سو سال اور وہ اسی مقام پر اس ساری عمر میں دن کو روزے رکھے اور رات کو نمازیں پڑھے لیکن ہماری ولایت کے بغیر اللہ کی بارگاہ میں جا پہنچے تو اسے کچھ بھی نہیں ملے گا"۔

وسائل الشیعہ ہی میں معلی بن خنیس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "اے معلی! اگر کوئی بندہ رکن و مقام کے درمیان سو سال تک عبادت کرتا رہے وہ یوں کہ دن کو روزے رکھے اور رات کو نمازیں پڑھے یہاں تک کہ اس کے ابرو اس کی آنکھوں پر آگریں اور بڑھاپے کی وجہ سے اس قدر سوکھ جائے کہ ہنسلی کی دونوں ہڈیاں ایک دوسرے سے مل جائیں لیکن اگر ہمارے حق سے جاہل ہو گا تو اسے کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا"۔

اسی کتاب میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء واجداد سے روایت کرتے ہیں کہ جبرائیل امینؑ سرکار رسالتؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے: "یا محمدؐ! (خداوند) سلام آپؐ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ: میں نے ساتوں آسمان اور ان میں رہنے والی مخلوق کو اور ساتوں زمینیں اور ان میں رہنے والوں کو پیدا کیا ہے لیکن رکن و مقام سے زیادہ باعظمت کوئی مقام نہیں بنایا۔ اور اگر کوئی بندہ اسی مقام پر کھڑے ہو کر اسی وقت سے مجھے پکارے جب سے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے لیکن وہ علیؑ کی ولایت کا منکر ہو گا تو اسے میں جہنم میں اوندھے منہ گراؤں گا"

علی بن ابراہیم قمی اسناد کے ساتھ زرارہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا، آپؑ فرمار ہے تھے کہ: "ہر امر کی بلندی، چوٹی، چابی اور ہر شئے کا دروازہ اور خداوند رحمان کی رضامندی، امامت کی معرفت اور اس کی اطاعت ہے۔ یاد رکھو! کہ اگر کوئی شخص راتوں کو عبادت کرتا رہے اور دنوں کو روزے رکھتا رہے، اپنا سارا مال راہ خدا میں صدقہ دے دے، ساری زندگی حج کرتا رہے لیکن ولی خدا کی ولایت کی معرفت حاصل کر کے اسے اختیار نہ کرے اور اس کی راہنمائی میں اپنے سارے اعمال نہ بجالائے تو خدا کے نزدیک اس کے ثواب کا ہرگز مستحق نہیں ہے اور نہ ہی اس کا شمار اہل ایمان میں ہو گا"۔

غرض کہ ان اور ان کے علاوہ دوسری بہت سی اخبار واحادیث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ائمہؑ کی معرفت اور ان کی اطاعت اصول و فروع کے صحیح ہونے کیلئے شرط ہے۔ جیسا کہ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ احکام فرعیہ اور مسائل دینیہ بھی انہی سے لینے ضروری ہیں، کیونکہ یہ ذوات قدسیہ وہی دروازہ ہیں جس کے متعلق خداوند عالم نے حکم دیا ہے کہ اس سے ہو کر آئیں۔ چنانچہ ارشاد

فرماتا ہے "وَلَيْسَ الْبِرُّبِاَنْ تَاتُوْاالْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّمَنِ اتَّقٰى وَاْتُوْاالْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" (سورہ بقرہ / ۱۸۹) اور یہ نیک کام نہیں کہ عقب مکانی سے اندر آؤبلکہ نیکی یہ ہے کہ تقوی اختیار کرو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ تفسیر صافی میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا۔ "ہم ہی وہ گھر ہیں اللہ نے جن کے دروازوں سے ہو کر آنے کا حکم دیا ہے، ہم ہی خدا کے دروازے اور گھر ہیں کہ جن میں آنے کا حکم دیا گیا ہے۔لہذا جو شخص ہماری اتباع کرے گا اور ہماری ولایت کا اقرار کرے گا، تو وہ یقیناً دروازوں کے ذریعہ گھر میں آئے گا۔اور جو ہماری مخالفت کرے گا اور ہم پر غیروں کو فضیلت دے گا، تو وہ گھروں میں پس پشت سے آنے کی کوشش کرے گا۔اگر خدا چاہتا تو اپنا تعارف کرا دیتا اور لوگ اس کے دروازے تک براہ راست پہنچ جاتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہمیں اپنے دروازے اپنا سیدھا راستہ قرار دیا اور ایسا دروازہ بنایا کہ وہاں سے اسی تک رسائی ہو سکتی ہے ،لہذا جو شخص ہماری ولایت سے منہ موڑ لے اور ہم پر ہمارے غیروں کو فضیلت دے تو وہ دروازے سے نہیں ،بلکہ دیواریں پھلانگ کر گھروں میں گھسنے کی کوشش کرے گا اور ایسے لوگ راہ راست سے ہٹے ہوتے ہیں"۔

کافی میں اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا "جو شخص خدا کو مان کر اس کی اس قدر عبادت کرے کہ خود کو ہلکان کر دے ، لیکن اس کا اس بارے میں خدا کی طرف سے مقرر کردہ کوئی امام نہ ہو' تو اس کی تمام محنت ضائع اور کوشش رائیگاں جائے گی۔ وہ خود گمراہ و سرگردان ہو کر رہ جائے گا، خدا اس کے اعمال کو سخت ناپسند کرے گا،اور اس کی مثال ایسی ہو گی جیسے کوئی بکری اپنے ریوڑ اور چرواہے سے جدا ہو جائے اور سارا دن ادھر اُدھر اچھلتی کودتی پھرے ،جب رات ہو جائے تو کسی اور کے ریوڑ کے ساتھ اس کے باڑے میں رات بسر کرے ، لیکن جب چرواہا دن کو اپنا ریوڑ باڑے سے باہر نکالے تو وہ اور ریوڑ دونوں اسے اجنبی سمجھ کر دھتکار دیں اور وہ اپنے اصلی مالک اور اصل ریوڑ کی تلاش میں ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہے۔اور دور سے ایک اور ریوڑ کو دیکھے تو ادھر دھوکے سے اس کے پاس جا پہنچے،اور اس ریوڑ کا چرواہا اسے کہے اپنے ریوڑ میں اور اپنے چرواہے کے پاس جاؤ، بھٹکی ہوئی ہو اصل ریوڑ کو تلاش کرو تو پھر وہ حیران و سرگردان ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں ماری ماری پھرتی رہی اتنے میں کوئی بھیڑیا اسے سرگردانی کی حالت میں دیکھ لے غنیمت سمجھ کر اسے شکار کر کے کھا جائے" آپ نے محمد بن مسلم سے فرمایا۔ "محمد! خدا کی قسم یہی حال ہے اس شخص کا جو اس امت میں تو ہے لیکن اس کے لئے خداوند عالم کی طرف سے کوئی واضح اور عادل امام نہیں ہے جس کی وجہ سے گمراہ اور سرگردان ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے۔اگر وہ اس حالت میں مر جائے تو وہ کفر اور نفاق کی موت مرے گا۔ محمد! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ائمہ جور اور ان کے پیروکار، خداوند عزوجل کے دین سے کٹے ہوئے ہیں۔جو خود بھی گمراہ ہیں اور بہت سے دوسروں کو بھی گمراہ کر چکے ہیں جو اعمال وہ بجالاتے ہیں ان کی مثال ایسے ہے جیسے "كَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَايَقْدِرُوْنَ مِمَّاكَسَبُوْاعَلٰى شَىْءٍ ذٰلِكَ هُوَالضَّلَالُ الْبَعِيْدُ" (سورہ ابراہیم / ۱۸) خاکستر کی مانند ہیں جسے ایک طوفانی دن میں تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے ،ان میں یہ طاقت نہیں کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا وہ اپنے ہاتھ میں لیں اور یہ دور کی گمراہی ہے"۔اس کے علاوہ اور بھی بڑی تعداد میں احادیث موجود ہیں جو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں جن میں سے بہت

سی احادیث اسی کتاب کے دوران میں بیان ہوں گی، انشاء اللہ۔

پانچویں فصل

"قل ہو اللہ احد" کی تحقیق

وَمَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ، وَمَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ، وَ مَنْ قَالَ فِيْمَ فَقَدْ ضَمَّنَهٗ، وَ مَنْ قَالَ عَلاَمَ فَقَدْ اَخْلٰى مِنْهُ.

اور جس نے اسے قابل اشارہ سمجھا اس نے اس کی حد بندی کر دی اور جس نے اسے محدود سمجھا وہ اسے دوسری چیزوں کی قطار میں لے آیا جس نے یہ کہا وہ کسی چیز میں ہے اس نے اسے کسی شئے کے ضمن میں فرض کر لیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں۔

تشریح

"فِيْمَ" اور "عَلٰى مَ" اصل میں "فِيْمَا" اور "عَلٰى مَا" ہیں یہ دونوں حرف "ما" استفھامیہ پر داخل ہیں۔ پہلے کا معنی ظرفیت کا ہے اور دوسرا استعلاء کے معنی میں ہے۔ ان میں سے "الف" اس لئے حذف کیا گیا ہے کہ "فی" اور "علیٰ" کے ساتھ متصل ہوتا ہے لہذا تخفیف کے طور پر اسے حذف کیا گیا ہے البتہ یہ اس وقت ہوگا جب ان سے استفہام کا معنی مراد لیا جائے اور یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ جب "ما استفھامیہ" مجرور ہو تو اس سے الف کو حذف کر دیا جاتا ہے اور فتحہ کو باقی رکھا جاتا ہے جو اس پر دلالت کر رہا ہوتا ہے، جیسے "فِيْمَ، عَلٰى مَ" اور "اِلٰى مَ" وغیرہ۔ چنانچہ شاعر کا قول ہے؛

فَتِلْكَ وُلاَةُ السُّوْءِ قَدْ طَالَ مُكْثُهُمْ فَحَتّٰى مَ حَتّٰى مَ الْعَنَاءُ الطَّوِيْلُ

برے حکمرانوں کا عرصہ حکمرانی بڑا طویل ہو گیا ہے اور کب تک اور کتنے عرصے تک یہ طولانی سختیاں جاری رہیں گی؟

یہ اس لئے ہوتا ہے تاکہ "ما استفھامیہ" اور "ما خبریہ" کے درمیان فرق قائم کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حذف کی مندرجہ ذیل مثالیں ہیں :۔

"فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا" (سورہ النازعات / ۴۳) تجھے اس کی یاد آوری سے کیا کام؟

"فَنَاظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ" (سورہ نمل / ۳۵) پھر دیکھو گی کہ میرے ایلچی کیا خبر لاتے ہیں۔

"لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ" (سورہ الصف / ۲) تم ایسی بات کیوں کرتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے؟

الف کے ثابت رکھنے کی مثالیں :۔

"لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" (سورہ نور / ۱۴) تو تمہارے اس خود کردہ گناہ پر تمہیں سخت عذاب پہنچتا۔

"يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ" (سورہ بقرہ / ۴) ایمان رکھتے ہیں جو آپؐ پر نازل ہوا۔

"وَ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" (سورہ ص / ۷۶) تجھے کس نے اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنی قدرت سے خلق کیا ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا فرمان (وَمَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ) اور جس نے اسے قابل اشارہ سمجھ لیا۔ یعنی اس کی طرف

کسی بھی قسم کا اشارہ کیا خواہ عقلی اشارہ کیا یا حسی (فَقَدْ حَدَّہ') تو اس نے اس کی حد بندی کر دی۔ یعنی اسے ایک خاص حد میں محدود کر دیا، کیونکہ جس چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اس کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص جہت میں ہو اور جو کسی خاص جہت میں ہو وہ محدود ہوتی ہے، اس کی حد و حدود ہوتی ہیں۔ اس کی اطراف ہوتی ہیں جن تک پہنچ کر وہ ختم ہو جاتی ہے۔ (وَمَنْ حَدَّہ' فَقَدْ عَدَّہ') اور جس نے اسے محدود سمجھا وہ اسے دوسری چیزوں کی قطار میں لے آیا۔ یعنی اسے محدود اور متناہی بنا دیا۔ اور اسے حادث چیزوں میں شمار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خدائے متعال کی ذاتی حقیقت یہ ہے کہ وہ حقیقی طور پر وجود ہی وجود ہے، جس کی شدت و قوت کسی حد اور انتہا پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اور وہ غیر متناہی سے بھی بالاتر ہے کیونکہ اس کی قوت اور قدرت کا دائرہ کہیں پر اختتام پذیر نہیں ہوتا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آپؑ کے اس قول "فَقَدْ عَدَّہ'" سے مراد یہ ہو کہ "اس نے اسے عدد والا بنا دیا" اور وہ یوں کہ جس چیز کا وجود متناہی اور محدود ہوتا ہے اس چیز کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خود سے اور بعض ایسی چیزوں سے مرکب ہو جو ایک مقررہ حد تک جا کر ختم ہو جانے کی متقاضی ہوں۔ اس لئے کہ خود کسی چیز کا وجود یا اس کی موجودیت اس کے متناہی ہونے کا تقاضا نہیں کرتی ورنہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی نہ، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہاں پر دو امور ہیں پس محدود، عدد والا ہو گیا۔ اس جملے کی مزید تفسیر ایک اور انداز سے خطبہ ۱۵۲ کی شرح کے آخر میں آئے گی۔

حضرتؑ کے اس فرمان "مَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ" سے مراد، خطاب و حضور کا حسی اشارہ ہے جو ذات پروردگار متعال کی شان کے خلاف ہے۔ البتہ غیب کا اشارہ اس کے لئے ہو سکتا ہے۔ اور کتاب عزیز و فرقان حمید میں بھی واقع ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے، اور اس کی تحقیق وہی جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے "حدیث توحید" میں بیان فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں "هُوَ" ایک ایسا کلمہ ہے جو ایک ایسے اسم سے کنایہ ہے جس کی طرف غیب کا اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس میں "ھا" تنبیہ کیلئے ہے اور "واو" حواس سے غیب کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح کہ "هٰذَا" شاہد و حاضر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار نے اپنے معبودوں کے بارے میں ایسے اشاروں سے کام لیا ہے جو شاہد و حاضر اور قابل درک چیزوں کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے کہا "هٰذِهِ اٰلِهَتُنَا الْمَحْسُوسَةُ الْمُدْرَكَةُ بِالْاَبْصَارِ" یہ ہیں ہمارے معبود جو آنکھوں سے دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ تو اے محمدؐ! آپؐ بھی اپنے اس معبود کی طرف اشارہ کریں جس کی طرف آپؐ ہمیں بلاتے ہیں تاکہ ہم بھی اسے دیکھ لیں اور ادراک کر کے اس کی عبادت کریں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی کہ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ...."
جس میں "هُوَ" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ذات ہر ایک چیز سے بلند و بالاتر ہے بلکہ خود نگاہوں کا ادراک کرتا ہے وہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے "اللّٰه" وہ معبود ہے جس کی ذات کے ادراک اور حقیقت تک رسائی سے مخلوق عاجز ہے۔ اور اس کا ایک اور معنی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا یکتا و یگانہ کہ جس کی کوئی نظیر نہیں"۔

سالکین کے تین مقامات

نیز یہاں پر ایک اور لطیف بات بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند عالم کے اس قول "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" میں تین الفاظ ہیں

(هُوَ. اللهُ. اَحَدٌ) ان میں سے ہر ایک لفظ سالکین کے مقامات میں سے ہر ایک مقام کیلئے اشارہ ہے۔

پہلا مقام: "مقام مقربین" ہے اور وہ سائرین الی اللہ کا اعلیٰ مقام ہے، یہ لوگ وہی ہیں جو اشیاء کی ماہیتوں اور حقیقتوں کو بعینہ ملاحظہ کرتے ہیں تو وہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں یقیناً وہ حقیقت ہوتی ہے، وہ سوائے خدا کے ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ خدا کو اس لئے نہیں دیکھ سکتے کہ وجود کا وجوب اسی میں منحصر ہے اور اس کے علاوہ باقی ہر شئے کا وجود ممکن ہے، اسی لئے "هُوَ" کا اشارہ اسی ذات وحدہ لا شریک کی طرف ہو سکتا ہے۔ اور اس اشارے میں ممیز کی بھی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ ممیز کی ضرورت وہاں پر ہوتی ہے کہ جہاں چیزیں دو ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنے عقول سے صرف ایک ہی ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں لہذا عرفان تام کے حصول کیلئے صرف لفظ "هُوَ" کا بولنا ہی کافی ہوتا ہے۔

دوسرا مقام: "مقام اصحاب الیمین" ہے۔ اور یہ پہلے مقام سے کمتر فضیلت کا حامل ہے، اس لئے کہ وہ لوگ موجود حق کا مشاہدہ کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ موجود خلق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ چونکہ موجودات میں کثرت ہوتی ہے لہذا صرف ایک لفظ "هُوَ" کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ساتھ لفظ "اللہ" کا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں اور "هُوَ اللهُ" کہتے ہیں تاکہ "هُوَ" کو "اللہ" سے ممتاز کیا جا سکے۔

تیسرا مقام: "مقام اصحاب الشمال" ہے، جو سب سے کمتر مقام ہے، جبکہ اصحاب شمال وہ لوگ ہیں جو ایک سے زیادہ "واجب الوجود" سمجھتے ہیں لہذا "ھو اللہ" کے ساتھ "اَحَدٌ" کو ملا دیا گیا ہے جو ان کے اس عقیدے کی تردید ہے، لہذا "قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ" کہا گیا ہے۔

(وَ مَنْ قَالَ فِيْمَ فَقَدْ ضَمَّنَهُ وَ مَنْ قَالَ عَلَامَ فَقَدْ اَخْلىٰ مِنْهُ) اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز میں ہے اس نے اسے کسی شئے کے ضمن میں فرض کر لیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے تو اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھیں۔ یہ دونوں جملے گویا شرطیہ متصلہ جملے ہیں جن سے مراد ذات باری کو اس قسم کے سوالات سے منزہ و مبرا سمجھنا ہے۔ اور دنیا کو یہ سبق دینا مقصود ہے کہ اس کی ذات کے بارے میں اس طرح کے الفاظ کے ساتھ سوالات نہ کئے جائیں۔

ان کے اس بیان سے مراد ان کی "تالی کی نقیض کی استثناء" ہے۔ یہاں پر استثناء کو حذف کیا گیا ہے جو کہ کبریٰ ہے، جیسا کہ "قیاس مضمر" میں ہوتی ہے۔ اسے بھی اسی پر قیاس کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے قضیہ (جملہ) کی تقدیر یوں ہو گی کہ، اگر خدا کے بارے میں "فِيْمَ" کے ساتھ سوال کرنا صحیح ہو تو پھر اس کیلئے ایک خاص جگہ مقرر کرنا پڑے گی کہ جس میں وہ موجود ہو، چاہے وہ کوئی جگہ ہو یا کوئی جسم ہو۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی خاص و محدود جگہ میں ہونا ناممکن ہے لہذا "فِيْمَ" کے ساتھ سوال کرنا بھی ناجائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے چونکہ "فی" ظرفیت اور محل کا فائدہ دیتا ہے لہذا "فی" کے ساتھ سوال کرنا اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی محل اور مکان میں ہو، اور پھر کسی شئے کو اس وقت تک محل نہیں کہتے جب تک کہ اس میں حال موجود نہ ہو، گویا خدا کسی جگہ یا مکان میں ہو اور اس کے بارے میں سوال کیا جائے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ محل کا محتاج ہے اور جو غیر کا محتاج ہوتا ہے وہ ممکن الوجود ہوتا ہے۔ اگر اس کا حلول اس میں واجب نہ ہو تو پھر اس سے وہ بے نیاز ہو گا اور جو اپنے وجود کیلئے کسی سے بے نیاز ہوتا ہے تو اس کیلئے محال ہوتا ہے کہ اسے

کوئی ایسی غرض لاحق ہو جائے جو اسے محل کا محتاج بنادے۔ کیونکہ محل میں ہونا محتاجی کا موجب ہوتا ہے، لیکن جب اس کا محل میں رہنا ہی محال ہے تو پھر "فِيْمَ" کے ساتھ سوال کرنا بھی غلط اور ناجائز ہے۔

دوسرے قضیہ متصلہ کی تقدیر یوں ہوگی کہ اگر اس کے بارے میں "عَلیٰ" کے ساتھ سوال کرنا صحیح مان لیا جائے تو پھر لازم آئے گا کہ بعض دوسری جہات و مقامات اس سے خالی ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے، لہذا "علیٰ مَ" کے ساتھ سوال کرنا غلط ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ لفظ "عَلیٰ" کا معنی ہے اوپر جو کہ بلندی اور فوقیت کے مفہوم کا حامل ہے۔ لہذا "علیٰ مَ" کے ساتھ سوال اس وقت صحیح ہوگا جب وہ کسی چیز کے اوپر ہو، اور اس طرح سے دو صورتیں پیدا ہوں گی ایک بالواسطہ اور ایک بلاواسطہ، جو بالواسطہ ہے وہ یہ ہے کہ باقی تمام جہات اور مقامات کو اس سے خالی فرض کر لیا جائے، اور جو بلاواسطہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاص معین جہت کو اس کے لئے ثابت کیا جائے یعنی جہت "جہت فوقانیہ" کیونکہ جب اسے معین اور مقررہ جہت کے ساتھ مختص کر دیا جائے گا لازماً یہی بات ثابت ہوگی کہ باقی تمام جہات اس کے وجود سے خالی ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس قضیہ متصلہ کے لئے جو چیز لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اس سے خالی قرار دیا ہے۔ تاکہ لازم کے بطلان سے ملزوم کا بطلان لازم آئے، یعنی نہ تو کوئی جگہ یا محل اس سے خالی ہے اور نہ ہی کوئی خاص معین اور مقرر جہت اس سے مختص ہے۔

یہ تو تھی مقدم کے بطلان کی بات، اب سنئے کہ تالی کیونکر باطل ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کہتا ہے "وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِي الاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ" (سورہ انعام / ۳) آسمانوں اور زمینوں میں خدا تو وہی ہے، جو تمہاری پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہری باتوں کو بھی۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے "وَهُوَمَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ" (سورہ الحدید / ۴) وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔

اعتراض:

یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جو لوگ جہت فوقانی کے قائل ہیں وہ بھی ان آیات سے بے خبر نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جہت کے ساتھ اختصاص اور ان آیات کے نتائج میں کوئی منافات نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کا زمینوں اور آسمانوں میں رہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ اس میں موجود ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ اسی طرح "هُوَ مَعَكُمْ" کی بات ہے۔ اس کے جہت فوقانی میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ وہاں پر بالذات موجود ہے۔ لہذا تالی کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

جواب:

حضرت نے "فَقَدْ اَخْلٰى مِنْهُ" کہہ کر بتایا ہے کہ یہ اس قضیہ کے لئے ضروری ہے کیونکہ اس لازم کی نفی ان آیات سے ظاہر ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کیونکہ جو فوقانی جہت کا اثبات کرتے ہیں وہ بعض ایسی آیات کے ظاہر کا سہارا لیتے ہیں جو ان کے مطالب کے لئے مفید ہوتی ہے، مثلاً ان میں سے ایک یہ آیت بھی ہے کہ "اَلرَّحْمٰنُ عَلَي الْعَرْشِ اسْتَوٰي" (سورہ طٰہ / ۵) وہ خدائے رحمٰن جو عرش پر مسلط ہے۔ اگر اس آیت کا ظاہر دیکھا جائے تو مذکورہ آیات کے مقتضا کے بالکل برعکس ہے اور یہی چیز ان لوگوں کے

لئے مقام خطابت میں مفید واقع ہوتی ہے اور عامۃ الناس کے ذہن میں برہان عقلی کی حیثیت سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اگر جہت کا اثبات کرنے والے تاویل سے کام لیں اور کہیں کہ اس سے مراد احاطہ علمی ہے تو ہم کہیں گے کہ نہیں بلکہ اس سے مراد غلبہ اور اقتدار ہے، اور اس کی تفصیل آگے بیان ہو گی۔

بہر صورت خداوند عالم کے بارے میں "فِيمَ "(کس چیز میں ؟) اور "عَلىٰ مَ "(کس چیز پر ؟) کہہ کر سوال نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ اس بارے میں یہ اعتقاد رکھنا صحیح نہیں کہ وہ کسی چیز میں ہے یا کسی چیز پر ہے۔ کافی کی روایت اس بات کی شاہد ہے۔ کافی میں اسناد کے ساتھ ہے کہ ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: "جو شخص یہ گمان کرے کہ 'اللہ تعالی کسی چیز سے ہے' یا 'کسی چیز میں ہے' یا کسی چیز پر ہے' تو وہ کافر ہے"۔ راوی نے کہا: "میں نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ ذرا اس کی تفسیر تو بیان فرمایئے!" امام علیہ السلام نے فرمایا: "میری مراد یہ ہے کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خدا کسی چیز میں ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس چیز نے خدا کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ کہ خداوند عالم کسی چیز پر ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کو اس چیز نے قابو میں رکھا ہوا ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ خدا کسی چیز سے ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز خدا سے پہلے ہے"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ "جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالی کسی چیز سے ہے تو وہ اسے حادث سمجھتا ہے، جو یہ گمان کرتا ہے کہ خدا کسی چیز میں ہے تو وہ اسے اس چیز میں محصور سمجھتا ہے اور جو یہ گمان کرتا ہے کہ خدا کسی چیز پر ہے تو وہ اسے محمول (اٹھایا ہوا) جانتا ہے"۔ اصول کافی کے بعض شارحین کے مطابق اس کی تشریح یوں کی گئی ہے "خداوند عالی کی ذات کیلئے ایسے الفاظ کا اطلاق جن کے معانی اہل لغت کے نزدیک متعارف ہیں، ذات ذوالجلال کے مجسم ہونے کا موجب بنتا ہے، اور ایسا عقیدہ کفر ہے۔ لہذا جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک معنی خداوند متعال کے حق میں صادق ہے تو وہ کافر ہے"۔

اسی لئے ایک اور روایت میں ہے کہ: "جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالی کسی شئے سے ہے اس نے اسے حادث بنا دیا، کیونکہ حادث وہ ہوتا ہے کہ جس کا وجود خود سے سابق چیز کے وجود کا مرہون منت ہو، جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خداوند کسی چیز میں ہے تو اس نے اسے محصور اور محدود بنا دیا اور اس کیلئے حدود متعین کر دیں۔ اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی چیز کے اوپر ہے تو اس نے اسے محمول بنا دیا کہ کوئی چیز ایسی ہے جو اس کی مالک ہے جو اسے اٹھائے ہوئے ہے"۔

ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ خداوند متعال نہ تو کسی چیز میں محصور ہے، نہ اس سے کوئی چیز خالی ہے، نہ تو وہ صرف زمین میں ہے اور نہ ہی صرف آسمان میں۔ اس لئے کہ نہ تو اس کے وجود مبارک سے زمین کا کوئی حصہ خالی ہے اور نہ ہی آسمان، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: "اگر تم ایک رسی زمین کی آخری تہہ تک پہنچادو تو وہ خدا تک جا پہنچے گی"۔ اسی لئے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: "جس شخص نے یہ کہا کہ وہ کس چیز میں ہے؟ تو اس نے کسی شئے کے ضمن میں فرض کر لیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے تو اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں"۔ خداوند عالم کے اس قول کی تصدیق ہے کہ: "هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا

كُنْتُمْ "(سورہ الحدید / ۴) وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ اور " مَا يَكُوْنُ مِنْ نَجْوىٰ ثَلَاثَةٍ اِلاَّ هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لاَ خَمْسَةٍ اِلاَّ هُوَ سَادِسُهُمْ "(سورہ مجادلہ / ۷) کسی جگہ تین اشخاص آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ اللہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور کہیں پانچ افراد سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ اللہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔ اور " نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ "(سورہ ق / ۱۶) ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

اسی طرح حضرت رسول خداؐ کا فرمان ہے : " وہ (اللہ) ہر شئے کے اوپر اور ہر شئے کے نیچے ہے۔ اس کی عظمت نے ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیا ہوا ہے۔ اس سے نہ تو زمین خالی ہے نہ آسمان، نہ بحر، نہ بر، نہ ہوا اور نہ فضا"۔

کتاب کافی میں ابو حمزہ ثمالی اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، آپؑ نے فرمایا : "غیر تحریف شدہ توریت میں مکتوب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا : اے پروردگار! آیا تو میرے قریب ہے کہ تجھ سے مناجات کروں ؟ یا دور ہے کہ تجھے آواز دے کر بلاؤں ؟ اللہ تعالی نے وحی فرمائی : موسیٰ میں تو اپنا ذکر کرنے والے کا ہم نشین ہوں"۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوىٰ کی تحقیق

سوال : آپ کی فرمایشات قبول، لیکن آپ " اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوىٰ " کے بارے میں کیا کہیں گے ؟ کیونکہ "استواء" کا ظاہری معنی استقرار اور جلوس (ٹک کر بیٹھ جانا) ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ : یہی وہ آیت ہے کہ جسے "مُشَبِّہہ" نے اپنے نظریے کی دلیل قرار دیا ہے کہ "ان کا معبود عرش پر بیٹھا ہوا ہے"۔ حالانکہ ذات باری سے مکان کی نفی پر اس قدر عقلی اور نقلی دلائل دیئے جا چکے ہیں کہ جن میں سے کچھ تو بیان ہو چکے ہیں اور کچھ آگے چل کر بیان ہوں گے۔ اور ان کو انشاء اللہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۷۷ میں بیان کیا جائے گا۔ بہر حال ان دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ خداوند عالم ہر طرح کے "حَیِّز" (مکان وغیرہ) سے جدا ہے، اور جب اس کی حیز اور مکان سے جدائی ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ یہی نسبت ہر جگہ ایک ہی ہوگی لہذا عرش پر استواء کے معنی کی تاویل کرنا پڑے گی۔ علاوہ ازیں اس بارے میں اور بھی بہت سی وجوہات اور اقوال پیش کئے گئے ہیں جن میں سے مقصد سے زیادہ قریب علماء معتزلہ میں سے "قفال" کا قول ہے وہ کہتے ہیں کہ : "اس کلام سے مقصود و مراد اللہ تعالی کی عظمت و کبریائی کی جھلک دکھانا ہے"۔ اس طرح سے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ : اللہ تعالی نے جب اپنے بندوں اپنی ذات اور صفات سے آگاہ کرنے کیلئے مخاطب کیا تو چونکہ اس وقت "خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر" اور ان کے دلوں میں بادشاہوں اور امراء و رؤسا کی عظمت اور جاہ و جلال کا تصور تھا۔ اس لئے اللہ تعالی نے خانہ کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا کہ لوگ اس کا ویسے ہی طواف کریں جیسے بادشاہوں کے گھروں کا کرتے ہیں، اس کی زیارت کا حکم دیا جیسا کہ وہ بادشاہوں کے گھروں کی زیارت کرتے ہیں۔ حجر اسود کے بارے میں بتایا کہ یہ "زمین پر خدا کی قسم ہے!" اور ساتھ ہی اسے چومنے کا حکم دیا جس طرح لوگ اپنے بادشاہوں کے ہاتھوں کو چومتے ہیں۔ قیامت کے دن بندوں کے حساب و کتاب کے سلسلے میں ملائکہ، انبیاء اور شہداء کا جمع ہونا

اور میزان عدل کا نصب ہونا وغیرہ سب کچھ بیان فرمایا ہے اور اپنی عظمت و کبریائی کو ثابت کرتے ہوئے کہیں پر ارشاد فرمایا: "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (سورہ طٰہٰ / ۵) وہ خدائے رحمٰن جو عرش پر مسلط ہے ۔ پھر فرمایا: "وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ" (سورہ زمر / ۷۵) تو فرشتوں کو دیکھئے کہ وہ عرش خدا کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ پر فرمایا: "وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ" (سورہ الحاقہ / ۱۷) اس دن تیرے پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھالیں گے۔ اسی طرح یہ بھی کہا: "اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ يُسَبِّحُوْنَ" (سورہ مؤمن / ۷) جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اپنے پروردگار کی تسبیح وحمد کر رہے ہیں۔ پھر اپنی ذات کیلئے "کرسی" کو ثابت کیا اور فرمایا: "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ" (سورہ بقرہ / ۲۵۵) اس کی حکومت کی کرسی آسمانوں اور زمینوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

جب آپ نے اس بات کو سمجھ لیا تو اب ہم کہتے ہیں کہ: تشبیہ کیلئے وہم پیدا کرنے والے الفاظ مثلاً عرش، کرسی وغیرہ کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ طاقتور الفاظ موجود ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں کسی قسم کا توقف نہیں ہوتا۔ مثلاً خانہ کعبہ کا طواف، حجر اسود کا بوسہ وغیرہ کے بارے میں اس لئے توقف نہیں ہوتا کہ اس سے خداوند جل شانہٗ کی عظمت و کبریائی کی تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ جبکہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ ذات کردگار خانہ کعبہ میں موجود نہیں ہوتی۔ یہی صورتحال عرش اور کرسی کی ہے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا کلام قفال معتزلی کا ہے اور علمائے اہل سنت میں سے جار اللہ زمخشری، فخر الدین رازی، حاکم نیشابوری اور قاضی بیضاوی جیسے جید علماء نے قفال کی اتباع کرتے ہوئے اسی موقف کو اپنایا ہے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہے کہ یہ آیت، آیات متشابہات میں سے ہے جس کی تاویل خدا اور راسخون فی العلم کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اور قفال نے جو تاویل پیش کی ہے اسے "تفسیر بالرائے اور تاویل بالباطل" سے تعبیر کیا جائے گا، کیونکہ آیات قرآنی کو محض خیال و مثال پر حمل کرنا اور کسی دینی حقیقت اور ٹھوس ایمانی بنیاد کے بغیر ان کی تاویل کرنا سفسطہ کے دروازے کو کھولنے اور ہدایت کے دروازے کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ اور پھر معاد جسمانی، عذاب قبر، حشر و نشر میزان اعمال، حساب و کتاب صراط اور جنت و جہنم کے بارے میں بھی تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ اس جیسی آیات کی تاویل اہل بیت عصمت و طہارتؑ کے سپرد کر دی جائے جو علم و حکمت کے سرچشمے ہیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس آیت کے بارے میں جو تصریحات ہم تک پہنچی ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔ مثلاً کافی میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا "ہر چیز پر اس طرح غالب ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی چیز دوسری چیز کے نسبت اس سے زیادہ قریب ہے"۔

اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق آپؑ نے ارشاد فرمایا: "ہر چیز میں اس طرح برابر کی حد تک پایا جاتا ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی نسبت اس سے زیادہ قریب نہیں اور نہ کوئی چیز دوسری چیز کی نسبت اس سے دور تر ہے۔ گویا کوئی قریب اس سے قریب تر نہیں اور کوئی بعید اس سے بعید تر نہیں۔ ہر چیز میں یکساں طور پر اس کا ظہور ہے"۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں اور آیہ مجیدہ کے بارے میں امام علیہ السلام کے کلام کی مزید تشریح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ "استواء" کے بارے میں محدث مجلسیؒ فرماتے

ہیں کہ اس کا اطلاق چند معانی پر ہوتا ہے :-

۱۔ کسی چیز پر قرار پکڑنا اور متمکن ہو جانا۔

۲۔ کسی چیز کا قصد کرنا اور اس کی طرف رخ کرنا۔

۳۔ کسی چیز پر قابو پانا۔ جیسے شاعر کہتا ہے :

قَدِ اسْتَوىٰ رَجُلٌ عَلَى الْعِرَاقِ ۔۔۔ بِغَيْرِ سَيْفٍ وَّ دَمٍ مُهْرَاقٍ

عراق پر ایک شخص نے تلوار اور خونریزی کئے بغیر قابو پالیا۔

۴۔ سیدھا ہونا، جیسے "سَوَّيْتُ الشَّيْءَ فَاسْتَوىٰ" میں نے چیز کو سیدھا کیا پس وہ سیدھی ہو گئی۔

۵۔ نسبت میں مساوات۔

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو پہلے معنی کا استعمال ذات خداوند ذوالجلال کیلئے محال ہے۔ دوسرے معنی کے سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض مفسرین نے آیت مذکورہ کو اسی معنی پر حمل کیا ہے اور بتایا ہے کہ "اِسْتَوىٰ" کے معنی ہیں کہ "اس نے مخلوق کی طرف قصد کیا"۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ ابوالعباس احمد بن یحییٰ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "استواء" کا معنی ہے شئے کی طرف توجہ کرنا۔ اسی طرح فراء اور زجاج مندرجہ ذیل آیت میں استواء کا معنی توجہ لینا کرتے ہیں "ثُمَّ اسْتَوىٰ اِلَى السَّمَآءِ" پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ جبکہ اکثر مفسرین اسے تیسرے معنی پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ عرش پر قابو رکھتا ہے، اس پر اس کی ملکیت ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے۔ اور ایک احتمال یہ بھی دیتے ہیں کہ اس سے چوتھا معنی مراد ہو اور ہر قسم کے نقص کی نفی سے کنایہ ہو اور "عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوىٰ" حال واقع ہو رہا ہو۔ اور پانچواں معنی اخبار واحادیث سے ظاہر ہے جو کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

اب رہی "عرش" کی بات کہ اس کا کیا معنی ہے ؟ تو اس بارے میں کئی اقوال ہیں کہ جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس کا اطلاق ایسے عظیم جسم پر ہوتا ہے جو تمام جسم وجسمانیات پر حاوی ہوتا ہے۔ اور کبھی "تمام مخلوقات" پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، کبھی "علم" پر بھی بولا جاتا ہے اور اس بارے میں بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔

خلاصۂ کلام : صحیح صورتحال یہ ہے کہ :

"عرش کی تفسیر "تمام اشیاء کے مجموعے سے کی جائے اور "استواء" کی ایسی تفسیر کی جائے جس میں "استیلاء" (غلبہ) جیسا معنی پایا جائے اور "عَلٰی" کے ساتھ متعدی ہو سکتا ہو۔ یعنی "اِسْتَوَتْ نِسْبَتُهٗ اِلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَالَ كَوْنِهٖ مُسْتَوْلِيًا عَلَيْهِ" اس کی نسبت کائنات کی ہر چیز کی طرف ایک جیسی ہے جبکہ وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ یا عرش کی تفسیر "علم" کے ساتھ کی جائے اور "استواء" کا متعلق مقدر مانا جائے، یعنی "تَسَاوَتْ نِسْبَتُهٗ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَالَ كَوْنِهٖ مُتَمَكِّنًا عَلٰى عَرْشِ الْعِلْمِ" اس کی نسبت ہر چیز سے مساوی ہے جبکہ وہ علم کے عرش پر جلوہ افروز ہے۔ یا پھر عرش کی تفسیر "عظمت، جلال اور قدرت"

سے کی جائے، جیسا کہ بعض روایات میں ایسا کیا گیا ہے، یعنی "اِسْتَوىٰ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَعَ كَوْنِهٖ فِيْ غَايَةِ الْعَظَمَةِ وَ مُتَمَكِّنًا عَلٰى عَرْشِ التَّقَدُّسِ وَ الْجَلَالِ" ہر چیز سے اس طرح سے ملا ہوا ہے کہ خود عظمت کے اعلیٰ ترین مقام پر اور تقدس و جلال کے عرش پر رونق افروز ہے۔

غرض کہ اس کی بلندی منزلت اس بات سے مانع نہیں کہ وہ حفظ، تربیت اور احاطہ کے لحاظ سے ہر ایک کے قریب ہو، یا احاطہ تربیت اور حفاظت کے لحاظ سے قریب ترین ہونے کے باوجود بلندی منزلت پر فائز ہو۔ اور تقدیر خواہ کوئی بھی ہو "استواء" کا جملہ خبریہ ہے اور "عَلَى الْعَرْشِ" کا جملہ حال ہے۔ تو یہ ہے میری وہ تحقیق کہ جہاں تک میری ناقص کوشش نے کام کیا ہے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے لیکن حقائق تو خدا کی ذات کو ہی معلوم ہیں۔

چھٹی فصل

وجود خدا

كَائِنٌ لَا عَنْ حَدَثٍ مَوْجُوْدٌ لَا عَنْ عَدَمٍ مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ فَاعِلٌ لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَ الْاٰلَةِ بَصِيْرٌ اِذْ لَا مَنْظُوْرَ اِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهٖ مُتَوَحِّدٌ اِذْ لَا سَكَنَ يَسْتَاْنِسُ بِهٖ وَ لَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهٖ.

وہ ہے، ہوا نہیں۔ موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ہر شئے کے ساتھ ہے، نہ جسمانی اتصال کی طرح۔ وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے، نہ جسمانی دوری کے طور پر۔ وہ فاعل ہے، لیکن حرکات و آلات کا محتاج نہیں۔ وہ اس وقت بھی دیکھنے والا تھا جبکہ مخلوقات میں کوئی چیز دکھائی دینے والی نہ تھی۔ وہ یگانہ ہے اس لئے کہ اس کا کوئی ساتھی ہی نہیں ہے کہ جس سے مانوس ہو اور اسے کھو کر پریشان ہو جائے۔

تشریح

"كَائِنٌ"، "كَانَ" ماضی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ فیومی کہتے ہیں "كَانَ زَيْدٌ قَائِمًا" کے معنی ہیں "زید سے قیام واقع ہوا اور پھر منقطع ہو گیا"۔ اس کے استعمال کے کئی طریقے ہیں :۔ ا۔ تامہ ہوتا ہے، تو اس وقت صرف مرفوع (اسم) پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ جیسے "كَانَ الْاَمْرُ" یعنی امر واقع ہو گیا۔ اسی طرح خداوند عالم کا قول ہے: "وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ" (سورہ بقرہ / ۲۸۰) اگر مقروض قرض ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ یعنی "كَانَ" بمعنی "حَصَلَ" ہے۔

۲۔ صَارَ کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: "مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" (سورہ مریم / ۲۹) اس بچہ کے ساتھ جو ابھی گہوارہ میں ہے (کیسے بات کریں ؟)۔

۳۔ زائدہ ہوتا ہے۔ جیسے: "كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا" (سورہ النساء / ۱۷۰) اللہ تعالیٰ دانا و حکیم ہے

صدرائے شیرازی کافی کی شرح میں فرماتے ہیں: "كَانَ" کا لفظ لغوی طور پر تین طرح سے استعمال ہوتا ہے :

ا۔ ایسے صیغے کے ساتھ آتا ہے جو وجود اور زمانے پر دلالت کرتا ہے۔ اسے نحویوں کے عرف میں " کان تامہ" کہتے ہیں، جیسا کہ شاعر کہتا ہے: اِذَا كَانَ الشِّتَاءُ فَادْفِئُوْنِيْ جب سردیوں کا موسم ہو تو مجھے گرمی پہنچاؤ۔ کیونکہ بڈھوں کو سردی

ہلاک کر دیتی ہے۔

۲۔ ایسے صیغے کے ساتھ ہو جو نسبت اور زمانے پر دلالت کرے، تو ایسی صورت میں اپنے وجود پر دلالت کرنے کیلئے خبر کا محتاج ہوتا ہے اور یہی کان "ناقصہ" کہلاتا ہے۔ اور عام طور پر استعمال بھی اسی کا زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ اہل منطق کے نزدیک "ادات" ہوتا ہے خواہ کلمہ اور فعل کے قالب میں بھی ہو۔ اس لئے کہ سمجھنے کیلئے اس کا معنی مستقل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً" (سورہ بقرہ / ۲۱۳) ابتدا میں لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا یا "مَاكَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا" (سورہ آل عمران / ۶۷) ابراہیمؑ یہودی نہیں تھے۔

۳۔ ایسے صیغے کے ساتھ آتا ہے جو کسی وجود اور زمانے پر دلالت کرنے سے عاری ہوتا ہے اسے "زائدہ" کہتے ہیں، جیسے شاعر کہتا ہے: عَلىٰ كَانَ مُسَوَّمَةِ الْعِرَابِ، نشان زدہ عربی گھوڑوں پر۔

مذکورہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہاں پر استعمال ہونے والا لفظ "كَائِنٌ" تامہ ہے۔ یعنی ازل سے موجود چلا آرہا ہے۔

خطبہ کے اس حصہ میں استعمال ہونے والا حرف "لا" ہر جگہ پر نفی کے معنی میں ہے۔ پہلے پانچ مقامات پر "لَيْسَ" کے معنی میں اور "لاَ مَنْظُوْرَ" اور "لاَ سَكَنَ" میں نفی جنس کیلئے ہے۔ اور دونوں جملوں میں استعمال ہونے والا "عَنْ"، "مِنْ" کے معنی میں ہے۔ اور یہی چیز قرآن مجید میں بھی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَ يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّئَاتِ" (سورہ شوریٰ / ۲۵) وہ وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے جملے میں استعمال ہونے والا "عَنْ"، "بَعْدُ" کے معنی میں ہو۔ اس کی مثال بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِيْنَ" (سورہ المؤمنون / ۴۰) بہت جلد وہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔

"اِذْ لاَ مَنْظُوْرَ" میں "اِذْ" ظرف زمان کے معنی میں ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے "فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (سورہ توبہ / ۴۰) تو اللہ اس کی مدد کرے گا جس طرح کہ اس نے مشکل ترین لحات میں بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا اس وقت جب کفار نے اسے مکہ سے نکال دیا۔ اسی طرح "اِذْ لاَ سَكَنَ" میں بھی ظرف زمان کے معنی میں ہے۔ اور شارح معتزلی نے بھی اسی چیز کو پیش کیا ہے۔ لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ اسے "تعلیلیہ" لیا جائے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے۔ "لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَلَمْتُمْ" (سورہ زخرف / ۳۹) آج ہرگز اس قسم کی گفتگو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی کیونکہ تم ظلم کر چکے ہو۔

(لاَ يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهِ) کا جملہ، مستانفہ ہے اور قطب راوندیؒ نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے لیکن ابن ابی الحدید نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ "مستانفہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ 'فَقْدِهِ' میں موجود ضمیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہے"۔

شارح معتزلی کا اعتراض بے جا ہے، اس لئے کہ کسی جملے میں ضمیر کا وجود اس کے استیناف کے منافی نہیں ہوتا، جیسا کہ ولاء منافی نہیں ہوتی بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ "اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا كَيْفَ يَبْدَءُ اللّٰهُ الْخَلْقَ" (سورہ عنکبوت / ۱۹) کیا انہوں (منکرین معاد) نے نہیں دیکھا کہ اللہ مخلوق کو کس طرح پیدا کرتا ہے۔

اس کے بعد ہے "ثُمَّ یُعِیْدُہٗ" (سورہ یونس / ۴) اس کے بعد انہیں پلٹائے گا۔ کیونکہ علماء کے بقول یہ جملہ مستانفہ ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر سے جملہ مستانفہ قرار دیا جائے تو اسے معطوف بنایا جائے گا اور اس کا عطف یا تو صفت کے جملہ یعنی "یستانس" پر ہوگا، موصوف اور صفت دونوں پر، تو یہ دونوں صورتیں ناممکن ہیں، جیسا کہ واضح ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ جملہ استینافیہ ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ یہ کہا جائے کہ: یہ جملہ صفت پر عطف ہے اور "لاَ" زائدہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ "مَامَنَعَكَ أَنْ لاَتَسْجُدَ" (سورہ اعراف / ۱۲) تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا؟ جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے یہ احتمال دیا ہے کہ "یہ جملہ حال ہے" لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

خدا ہر چیز کے ساتھ ہے

(کَائِنٌ) وہ ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہاں پر "کان" تامہ ہے۔ اور کان تامہ وہ ہوتا ہے کہ جس کا وجود زمانہ ماضی سے ملا ہوا ہو۔ اور ذات ذوالجلال زمان و مکان کی قید سے منزہ و مبرا ہے اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اوصاف کو زمانے کے ساتھ متعلق کر دیا جائے جس میں حدوث پایا جاتا ہے۔ اور جب ایسا کرنا محال ہے تو پھر اس کی دلالت ایسے وجود پر ہوگی جو اس قید سے خالی ہو اسی لئے حضرتؑ نے ساتھ میں یہ فرمایا ہے کہ (لاَعَنْ حَدَثٍ) ہوا نہیں۔ یہ جملہ اس بات کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ وجود پروردگار حادث نہیں ہے بلکہ وہ ہے لیکن کسی قسم کے حدوث کے بغیر۔ اور آپؑ کا یہ فرمانا (مَوْجُوْدٌ لاَعَنْ عَدَمٍ) موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود باری تعالیٰ دوسری اشیاء کے وجود کی مانند نہیں ہے کیونکہ اُن کے وجود پہلے نہیں تھے بعد میں وجودی صورت اختیار کی۔ پہلے کتم عدم میں تھے بعد میں منصۂ شہود پر آئے۔

اگر ان جملوں کو آپس میں ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلا جملہ حدوث زمانی کی نفی کر رہا ہے اور دوسرا حدوث ذاتی کی۔ اور دوسرا جملہ پہلے کی نسبت زیادہ بلیغ ہے اس کا انداز خطبہ ۱۸۵ کے انداز کے ساتھ زیادہ ملتا ہے۔

(مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لاَبِمُقَارَنَةٍ) وہ ہر شئے کے ساتھ ہے نہ جسمانی اتصال کی طرح، یہ جملہ بھی اپنے دو سابقہ جملوں اور دو بعد میں آنے والوں کی طرح دو قضیوں سے مرکب ہے۔ ایک ایجابی دوسرا سلبی۔ ایجابی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے ساتھ ہے، ہر ایک شئے کو جانتا ہے، ان پر گواہ ہے ان کا ساتھی ہے، ان سے کبھی غائب نہیں ہوا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے "وَهُوَمَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ" (سورہ الحدید / ۴) وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ اسی طرح فرماتا ہے: "مَايَكُونُ مِنْ نَجْوٰي ثَلٰثَةٍ اِلاَّ هُوَ رَابِعُهُم وَلاَخَمْسَةٍ اِلاَّهُوَسَادِسُهُمْ" (سورہ مجادلہ / ۷) کسی جگہ تین اشخاص آپس میں گفتگو نہیں کرتے مگر یہ کہ اللہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور کہیں پانچ افراد سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ اللہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔

قضیہ سلبی وہی ہے جس کی طرف حضرتؑ نے "لاَ بِمُقَارَنَةٍ" کہہ کر اشارہ کیا ہے اور یہ اس بات کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ خداوند عالم کا کسی کے ساتھ ہونے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ کسی کے ساتھ متصل ہے، جیسا کہ عام طور پر قاصر ذہنوں میں تبادر ہوتا ہے اور ناقص اوہام میں تصور ابھرتا ہے بلکہ بہت سے لوگ اس مغالطے کا شکار ہو بھی گئے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے "معیت"

اور "حضور" کا معنی یہ سمجھا ہے کہ جس طرح حال کے محل کے ساتھ یا محل کی حال کے ساتھ معیت ہوتی ہے، یا ایک جسم کسی دوسرے جسم کے پاس موجود ہوتا ہے یا کسی مکان میں ہوتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے خدا کی ہر جگہ اور ہر چیز کے ساتھ موجود ہونے کو اس بنا پر بعید سمجھا ہے کہ ان کے زعم باطل کے مطابق اگر وہ کسی چیز کے ساتھ یا کسی جگہ پر ہے تو لازم آئے گا کہ دوسری چیزیں اور دوسری جگہیں اس کے وجود سے خالی اور اس کی ذات کی فاقد ہوں، حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جس بات کا وہ گمان کرتے ہیں اور وہم میں لاتے ہیں وہ عام اجسام کا اپنے جیسے جسموں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے لیکن خداوند عظیم و قیوم جو قوت قاہرہ اور قدرت غیر متناہی کا مالک ہے اس کی طرف تمام کون و مکان بلکہ اس کون و مکان سے بھی ہزار گنا زیادہ کی نسبت اس کی ذات کے لئے ایسی ہے جیسے ایک قطرے کی نسبت بحر او قیانوس سے ہوتی ہے اسی طرح تمام زمانوں کی نسبت اس کی ازلی ولبدی ذات کی طرف ایسی ہوتی ہے جیسے ایک مختصر سی آن کی نسبت ایک غیر فانی زمانے سے ہوتی ہے۔ اسے کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام اپنی طرف مشغول نہیں کر سکتا کہ دوسرے تمام کاموں سے بے خبر ہو جائے۔ اس لئے کہ خداوند سبحانہ وتعالیٰ چونکہ تمام مخلوق کا فاعل، خالق، موجد اور غایت ہے.........۔

لہٰذا وہ اپنی مخلوق کے ساتھ ہے ان پر شاہد ہے ان سے ان کی شہ رگ حیات سے بھی زیادہ نزدیک ہے جیسا کہ خود ارشاد فرماتا ہے: "وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (سورہ ق / ۱۶) اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ شہ رگ حیات انسان کے بدن کا جزو ہے، اور خداوند عالم انسان کے اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح سے وہ انہیں دیکھتا ہے، ان کی باتوں کو بھی سنتا ہے اور ان کے دلی رازوں کو بھی جانتا ہے۔

کافی میں اسناد کے ساتھ عیسیٰ بن یونس سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابن ابی العوجاء نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دوران گفتگو کہا جبکہ امام علیہ السلام نے خداوند عالم کا ذکر فرمایا اور آپؑ نے خدا کا ذکر تو کیا لیکن اس کا غیب کے عنوان سے تعارف کرایا، امامؑ نے فرمایا: "افسوس ہے وہ غیب کیونکر ہو سکتا ہے جو اپنی مخلوق کے ساتھ عیاں ہے اور اس کی شہ رگ حیات سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس کی باتوں کو سنتا ہے، اس کی شخصیت کو دیکھتا ہے، اس کے دلوں کے رازوں کو جانتا ہے"۔ ابن ابی العوجاء نے کہا: "آیا وہ ہر جگہ پر ہے؟ جب وہ آسمانوں میں ہوتا ہے تو زمین پر کیسے ہوتا ہے؟ اور جب زمین پر ہوتا ہے تو آسمانوں میں کیونکر ہوتا ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "تم نے یہ صفت تو مخلوق کی بیان کی ہے کہ جب کسی جگہ کو چھوڑتی ہے تو وہ جگہ خالی ہو جاتی ہے البتہ پہلے سے خالی جگہ اس کے وجود سے پُر ہو جاتی ہے، جبکہ خداوند عظیم الشان، ملک دیان ایسا نہیں۔ اس سے نہ تو کوئی مکان خالی ہوتا ہے، نہ ہی کوئی خالی جگہ بھر دی جاتی ہے اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مکان کی نسبت دوسرے مکان کے زیادہ قریب ہو"۔ اسے شیخ صدوقؒ نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کے باب حج میں بھی ذکر کیا ہے۔

(وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ) اور وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے، نہ جسمانی دوری کے طور پر۔ یعنی خداوند سبحان ہر چیز سے ذاتی لحاظ سے علیحدہ ہے وہ یوں کہ رب اور مربوب، صانع اور مصنوع، حاد اور محدود کے درمیان کسی قسم کی نسبت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی ذات موجودات عالم میں سے نہ تو کسی کی ذات کی مثل ہے اور نہ ہی ممکنات میں سے کسی کی صفات کے مشابہ ہے جس سے

معلوم ہوا کہ وہ سب سے علیحدہ ہے لیکن اس طرح نہیں جیسے دو مختلف اجسام ایک دوسرے سے عناد و تضاد کی صورت میں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں کہ اگر کہیں پر ایک کا وجود ہے تو وہ جگہ دوسرے کے وجود سے خالی ہے۔ اسی لئے کہ پروردگار عالم نہ تو کوئی چیز ہے اور نہ ہی کوئی معاند ہے۔ کیونکہ وہ ضدوں اور باہم معاندین کا بھی خالق ہے۔ پس اگر کوئی چیز اس کی معاند اور ضد ہے تو لازم آئے گا کہ وہ کسی محل و مکان میں ہو جو کہ اس کے واجب الوجود ہونے کے منافی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ خداوند عالم مخلوق سے جدائی اس کی مقدس ذات کی وجہ سے ہے جو انتہائی کمال کی مالک ہے۔ جبکہ اس کے علاوہ جو بھی ہے اسی کا محتاج ہے اور ناقص ہے ~جو تیرے سوا ہے وہ تیر اہندہ ہے۔ انشاء اللہ اس کی مزید تفصیل کلام ۲۰۸ میں آئے گی۔

(فَاعِلٌ) وہ اشیاء کا فاعل اور اپنی قدرت کاملہ اور ارادہ تامہ و جامعہ کے ساتھ ہر مخلوق کا خالق اور مصنوع کا صانع ہے۔ (لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَ الْآلَةِ) لیکن حرکات و آلات کا محتاج نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے خلق اور فعل میں نہ تو ذہنی حرکات کا محتاج ہے اور نہ ہی جسمانی حرکت کا، جیسا کہ لوگ اپنے افعال و مصنوعات میں اس طرح کی حرکت کے محتاج ہوتے ہیں۔ چونکہ حرکت کا تعلق جسم اور جسمانیات کے ساتھ ہوتا ہے اور خداوند عالم ان چیزوں سے منزہ و مبرا ہے اسی طرح اسے کسی آلے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اجمالی طور پر تو یہ ہے کہ وہ آلے کا اس لئے محتاج نہیں کہ یہ ممکن کی صفت ہے کہ کسی کام کی بجا آوری کیلئے آلے سے کام لے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی کام آلے کی وجہ سے منظر عام پر آئے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ آلہ بھی اسی کے فعل کے نتیجہ میں معرض وجود میں آیا ہے یا نہ ؟ اگر تو اس کے فعل کے نتیجہ میں ظاہر ہوا ہے تو آیا وہ وہ فعل آلے کے ساتھ انجام پایا یا بغیر آلہ کے ؟ اگر آلے کے بغیر انجام پایا ہے تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ فاعل بالذات ہے اسے آلے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کسی آلے کے ساتھ انجام پایا تو پھر اسے وجود میں لانے کیلئے ایک اور آلے کی ضرورت ہو گی اور اسی طرح سلسلہ طویل ہو تا جائے گا اور تسلسل لازم آئے گا جو کہ باطل ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ آلے کے بغیر عمل میں نہیں آیا تو لازم آئے گا کہ باری تعالیٰ جل شانہٗ اپنی فاعلیت کے اثبات اور قدرت کے اظہار کیلئے غیر کا محتاج ہے، جو غیر کا محتاج ہوتا ہے وہ واجب نہیں بلکہ ممکن بالذات ہوتا ہے اور یہ "خلف" ہے۔ کیونکہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ خداوند جل شانہٗ واجب بالذات ہے۔

(بَصِيْرٌ إِذْ لَا مَنْظُوْرَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهِ) وہ اس وقت بھی دیکھنے والا تھا جبکہ مخلوقات میں کوئی چیز دکھائی دینے والی نہ تھی۔ یعنی خداوند سبحانہ و تعالیٰ ازل سے بصیر ہے جبکہ کوئی دیکھے جانے والی مخلوق نہیں تھی، جیسا کہ اس وقت سے سمیع (سننے والا) بھی ہے جب کوئی مسموع (سنی جانے والی) مخلوق نہیں تھی۔ اس بارے میں کہ آیا سمع و بصر ذات خداوند عالم کیلئے عین علم ہیں یا کوئی اور صفت؟ علماء کے درمیان کافی حد تک اختلاف ہے اور تفصیلی بحث ہے جس میں ہر ایک نے تفصیل کے ساتھ دلائل دیئے ہیں.......

جبکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ خداوند متعال مسموعات اور مبصرات کا ازل سے مدرک ہے اور ابد تک رہے گا خواہ مسموعات و مبصرات بالفعل موجود ہوں یا نہ ہوں۔ اور اس بات پر کافی میں ابو بصیر سے مذکورہ حدیث شاہد ہے جو انہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بیان کی ہے۔ ابو بصیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ فرماتے ہوئے سنا:

"ہمارے پروردگار خداوند عزوجل کا "علم" ازل سے ذاتی ہے جبکہ کوئی معلوم نہیں تھا، "سمع" ذاتی ہے جبکہ کوئی مسموع نہیں تھا، "بصر" ذاتی ہے جبکہ کوئی دیکھی جانے والی چیز موجود نہیں تھی اور "قدرت" ازل سے ذاتی ہے جبکہ "مقدور" نہیں تھا۔ پس جب اس نے اشیاء کو پیدا کیا اور معلوم وجود میں آگیا تو علم، معلوم پر واقع ہو گیا۔ سمع، مسموع پر۔ بصر، مبصر پر اور قدرت مقدور پر...... " تا آخر حدیث۔ اس بارے میں مزید تحقیق آئندہ فصل میں بیان ہو گی۔

خدا کیلئے اُنس وو حشت محال ہے

(مُتَوَحِّدٌ) وہ اپنے ملک، حکومت اور سلطنت میں یکتا و یگانہ ہے (اِذْ لاَ سَكَنَ) اس لئے کہ اس کا کوئی ساتھی نہیں (يَسْتَانِسُ بِهِ) وہ جس سے مانوس ہو (وَ لاَ) اور نہ ہی کوئی ایسا انیس ہے (يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهِ) جسے کھو کر پریشان ہو۔ بلکہ وہ حمد کے ساتھ یگانہ اور منفرد ہے اور مجد کے ساتھ مخصوص ہے، اولاد کی اسے ضرورت نہیں بیوی کی اسے خواہش نہیں شریک کے جوار سے بلند و بالاتر ہے۔

خدا کیلئے انس وو حشت محال ہے۔ اس لئے کہ بطور اجمال اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ انس وو حشت کا تعلق مزاج سے ہوتا ہے اور مزاج کا تعلق ذی روح چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو اپنے جیسی چیزوں کے ساتھ مانوس رہتی ہیں اور ان کی جدائی سے وحشت محسوس کرتی ہیں۔ جبکہ ذات ذوالجلال ان چیزوں سے منزہ و مبرا ہے۔

اس کی تفصیل یوں ہے کہ: خداوند متعال خیر و کمال کی تمام صفات کا جامع ہے۔ اس سے کوئی چیز مفقود نہیں ہے کیونکہ وہ بذات خود وجود کل ہے اور ہر موجود کا مبدا ہے، اسی لئے اسے نہ تو کسی کو اولاد بنانے کی ضرورت ہے اور نہ بیوی اختیار کرنے کی۔ اور پھر شریک کی بھی اس کو کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اولاد، بیوی، شریک یا ساتھی کی اسے ضرورت ہوتی ہے جس کا وجود نامکمل ہو اور وہ اس نقص کی تلافی ایسے افراد کے ذریعہ کرتا ہے۔ اگر یہ موجود ہوں تو مانوس رہتا ہے، اگر موجود نہ ہوں تو وحشت محسوس کرتا ہے۔ جبکہ ذات پروردگار تمام اچھائیوں اور صفات کمال کی جامع ہے۔ موجودات عالم کو اس سے سکون اور انس ملتا ہے اسی سے لطف و سرور و فیض ملتا ہے، بلکہ درحقیقت وہ ہی ہر وحشت زدہ کی وحشت کو دور کرنے والا اور غم زدہ اور دکھی کے دکھوں کا مداوا کرنے والا ہے۔

اس سے زیادہ واضح اور لطیف الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسان کو وحشت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ اپنے جیسے افراد سے جدا ہوتا ہے اور ان کی کمی محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کا اپنا جوہر ناقص اور وجود کمال کے عنصر سے قاصر ہوتا ہے۔ اس کی ذات میں فضیلت تامہ نہیں ہوتی، کمال کے نور کی بجائے نقص کی تاریکیاں اور فضیلت کی تکمیل کی جائے اس کا فقدان ہوتا ہے اور اس کمی کو وہ اپنے جیسے افراد کے ساتھ مانوس رہ کر پورا کرتا ہے اور اگر وہ نہ ملیں یا اس سے جدا ہو جائیں تو وحشت محسوس کرتا ہے۔ لیکن ذات پروردگار متعال ان تمام باتوں سے منزہ اور مبرا ہے کیونکہ اشیاء اسی سے صادر ہوتی ہیں اس کے بحر وجود کے عطا سے کائنات بہرہ مند ہے اور اس کے شمس حقیقت کی نورانیت سے کائنات روشن ہے۔ جس طرح سمندر کو چند قطروں کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس کے وجود میں اضافہ کریں اور سورج کو دیئے کی روشنی کی حاجت نہیں ہوتی کہ اس سے اس کی روشنی میں اضافہ ہو۔ اسی طرح فیاض ازل اور منبع فیض و

عطا کو بھی کسی سے مانوسیت یا وحشت حاصل نہیں ہوتی۔

ساتویں فصل

انشاء اور ابتدا میں فرق؟

اَنْشَاَالْخَلْقَ اِنْشَآءً وَ ابْتَدَاَهُمْ ابْتِدَآءً بِلاَ رَوِيَّةٍ اَجَالَهَا وَ لاَ تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا وَ لاَ حَرَكَةٍ اَحْدَثَهَا وَ لاَ هَمَامَةِ نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِيْهَا اَجَالَ الاَشْيَاءَ لِاَوْقَاتِهَا وَ لاَئَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا وَ غَرَّزَ غَرَائِزَهَا وَ اَلْزَمَهَا اَشْبَاحَهَا عَالِمًا بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا مُحِيْطًا بِحُدُوْدِهَا وَ انْتِهَائِهَا عَارِفًا بِقَرَائِنِهَا وَ اَحْنَائِهَا

اس نے پہلے خلق کو ایجاد کیا بغیر کسی فکر کی جولانی کے، اور بغیر کسی تجربے کے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کی اسے ضرورت پڑی ہو۔ اور بغیر کسی حرکت کے جسے اس نے پیدا کیا ہو۔ بغیر کسی ولولہ اور جوش کے جس سے وہ بیتاب ہوا ہو۔ ہر چیز کو اس کے وقت کے حوالے کیا۔ بے جوڑ چیزوں میں توازن و ہم آہنگی پیدا کی۔ ہر چیز کو جداگانہ طبیعت و مزاج کا حامل بنایا اور ان طبیعتوں کیلئے مناسب صورتیں ضروری قرار دیں۔ وہ ان چیزوں کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے جانتا تھا۔ ان کی حد و نہایت پر احاطہ کئے ہوئے تھا اور ان کے نفوس و اعضاء کو پہچانتا تھا۔

تشریح لغوی طور پر ”انشاء“ اور ”ابتدا“ کا ایک ہی معنی ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے ”هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ“ (سورہ انعام / ۹۸) وہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ یعنی تمہاری ابتدا کی اور تمہیں خلق کیا۔ چنانچہ جو کسی چیز کی ابتدا کرتا ہے وہ اسے انشاء کرتا ہے، فیومی بھی یہی کہتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں علیحدہ بھی کر دیا جاتا ہے جب ایک جگہ پر آجائیں تاکہ کلام میں تکرار واقع نہ ہونے پائے بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کی تعریف جداگانہ ہے کیونکہ ؛

”انشاء“ مادہ کے بغیر ایجاد کو کہتے ہیں ___ اور ___ ”ابتدا“ علت کے بغیر ایجاد کا نام ہے۔ تو گویا ”انشاء“ میں خالق کائنات کے کاموں میں علت مادّیہ کی نفی اور ”ابتدا“ میں علت غائیہ کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔ ان کلمات میں ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ ”انشاء“ ایسی ایجاد کو کہتے ہیں جس کی مانند اس سے پہلے کسی اور موجد نے کوئی چیز ایجاد نہ کی ہو۔ اور ”ابتدا“ ایسی ایجاد کو کہتے ہیں کہ جس کے موجد کی مانند اس سے پہلے کوئی اور موجد نہ گزرا ہو۔ ان کا ایک اور فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ ”انشاء“ ایسی ایجاد ہوتی ہے جو کسی سابقہ مثال کی مانند نہ ہو اور ”ابتدا“ ایسی ایجاد ہے کہ جس کے موجد نے اس سے پہلے اس جیسی صورت کا سوچا بھی نہ ہو۔ ”رَوِيَّة“ غور و فکر کو کہتے ہیں۔ ”اِجَالَة“ جولان یعنی آنے جانے کو کہتے ہیں جبکہ نہج البلاغہ کے بعض نسخوں میں ”اِجَالَة“ کی بجائے ”اِحَالَة“ حائے حطی کے ساتھ ہے، جس کا معنی متکلمین کے نزدیک یہ ہے کہ : ”کسی جسم کا ایک مکان میں حاصل ہونے کے بعد دوسرے مکان میں حاصل ہونا“۔ گویا ”دو حصول“ کے مجموعے کا نام حرکت ہے۔ جبکہ حکماء کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے : ”تدریجی طور پر قوت سے نکل کر فعل میں داخل ہونا“۔

"هَمَامَة" کا لفظ لغت کی کتب میں جمع "ھمام" کی صورت میں تو ملتا ہے لیکن مفرد کی صورت میں نہیں اور "هَمَامَة" کا معنی ہے "شک وتردد" شارح کافی فاضل مازندرانی کہتے ہیں :امام علیہ السلام کا یہ فرمانا" خداوند عالم مرید ہے لیکن هَمَامَة کے ساتھ نہیں" تو اس کا مقصد یہ ہے کہ خداوند متعال اشیاء کا مرید ہے لیکن وہ اس بات کو اہمیت نہیں دیتا کہ اس کو کسی چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور یہ لفظ "ہممہ" یعنی غم کی وجہ سے آرزو کو آہستہ آہستہ سینے میں پھرانا، سے ماخوذ ہے، اور ذات خداوند متعال اس سے منزہ ہے۔

اس بارے میں اور بھی بہت سے اقوال ہیں۔ جن میں سے ایک شارح معتزلی کا قول بھی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ امام علیہ السلام نے جو یہ فرمایا ہے کہ : "وَلاَ هَمَامَةِ نَفسٍ" یہ مجوس اور دوگانہ پرستوں کی رد ہے جو "ھمامہ" کے قائل ہیں۔اس بارے میں ان کا مشہور کلام بھی ہے۔اور "ہمامہ" کی اصطلاح بھی انہی کی وضع کردہ ہے ، کیونکہ لغت عربیہ میں "ہمامہ" بمعنی "ہمت" کا استعمال ہمیں کہیں نہیں ملا۔بلکہ یہ ایک ایسا اصطلاحی لفظ ہے جو انہی کے نزدیک مشہور ہے "اجال" کا لفظ اگر "جیم" کے ساتھ ہو تو "جولان" سے ماخوذ ہوگا۔اور اگر "حائے حطی" کے ساتھ ہو جیسا کی بعض نسخوں میں ہے تو اس کے کئی معنی بنتے ہیں۔

ا:۔احالہ بمعنی تبدیلی۔ ۲ :۔کود کر جانوروں کی پیٹھ پر سوار ہو جانا یا کسی کو سوار کرنا۔اسی معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے شارح معتزلی فرماتے ہیں کہ :جب اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو اپنے اوقات میں مقرر کردیا تو گویا انہیں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کرادیا"۔

بعض نسخوں میں "اجل" (جیم کے ساتھ) ہے جس کا معنی ہے وقت۔ جبکہ بعض دوسرے نسخوں میں "احل" (حائے حطی کے ساتھ) ہے جو حلول سے مشتق ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کو کسی جگہ پر اتارنا۔ غریزہ، فطری طبیعت کو کہتے ہیں "احاطہ" کسی شئے کو ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لینا، جیسے کہا جاتا ہے "اَحَاطَ الْقَوْمُ بِالْبَلَدِ "جب لوگ کسی شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں تو اس وقت یہی جملہ بولا جاتا ہے۔ پھر اس کا استعمال "حفاظت کرنے "اور "علم حاصل کرنے "اور "قبضہ قدرت میں لینے" کے لئے ہونے لگا" قرائن" "قرینہ" کی جمع ہے اور یہاں پر اس سے مراد "نفس ناطقہ" ہے البتہ اس کے کئی اور معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

"احناء"، "حنو" کی جمع ہے جس کا معنی ہے کنارہ، پہلو۔ البتہ کتاب "اوقیانوس" میں اس کا معنی "ٹیڑھا عضو ہے" جیسے ابرو وغیرہ اور اس کا استعمال ہر ٹیڑھی چیز پر بھی ہوتا ہے جیسے درخت وغیرہ ہیں۔اور اس مقام پر دونوں معانی مراد لینا صحیح ہے۔

"بِلاَرَوِيَّةٍ" میں 'لا' نافیہ ہے جو جار اور مجرور کے درمیان ایک لفظ معترضہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "جِئْتُ بِلاَزَادٍ" یا" غَضَبَ مِنْ لاَشَیْءٍ" علمائے ادب کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ "لا" اسم ہے یا حرف ہے ؟ چنانچہ کوفی کہتے ہیں کہ اسم ہے اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ حرف زائدہ ہے۔اگر کلام امیر المؤمنینؑ میں "اجال" جیم کے ساتھ پڑھا جائے تو "لِاَوْقَاتِهَا" پر لام، الیٰ کے معنی میں ہوگی جیسا کہ خداوند تعالیٰ بھی فرماتا ہے "اَوْحیٰ لَهَا" یعنی "اَوْحیٰ اِلَيْهَا" (زمین کی طرف وحی کی) اگر "احال" حا کے ساتھ پڑھا جائے تو بھی لام بمعنی الیٰ کے ہوگی اور اگر "احال"، "اِيْثَاب" (کود کر چڑھ جانا) کے معنی میں ہو تو لام بمعنی "علیٰ" ہوگا جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ہے کہ "تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ" یعنی "عَلىٰ الْجَبِيْنِ" لیکن اگر 'اَجَلَ' جیم کے ساتھ ہو تو پھر 'لام' تعلیل کے معنی میں ہوگی، اگر 'اَحَلَّ' 'حا' کے ساتھ ہو تو 'لام' بمعنی 'فی' ہوگا جیسے قرآن مجید میں ہے کہ "وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ" (سورہ انبیاء / ۴۷) قیامت کے دن ہم عدل کے ترازو نصب کریں گے۔

"اَلْزَمَهَا" اور "اَشْبَاحَهَا" میں "هَا" کی ضمیر "غَرَائِز" کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ "اَشْیَاء" کی طرف لوٹ رہی ہو۔ "عَالِمًا"، "مُحِیْطًا" اور "عَارِفًا" فاعل کا حال ہونے کی وجہ سے "منصوب" ہیں اور ان کا عامل "اَلْزَمَ" ہے۔

گزشتہ فصل میں بتایا گیا ہے کہ امام علیہ السلام نے خداوند متعال کی جلال و جمال کی صفتوں کو بیان فرمایا ہے، اور اس فصل میں یہ بتایا جائے گا کہ خالق کائنات نے اشیاء کو کس طرح تخلیق کیا۔ یعنی اس کی چند فعل و کمال کی صفات بتائی جائیں گی۔ اسی لئے حضرت امامؑ نے ارشاد فرمایا ہے: (اَنْشَاَالْخَلْقَ اِنْشَاءً) اس نے پہلے خلق کو ایجاد کیا۔ یعنی مخلوق کو بغیر مادہ کے پیدا کیا یا باری تعالیٰ سے پہلے کوئی موجد نہیں تھا کہ جس کی تخلیق جیسی مخلوق پیدا کی یا ایسی مخلوق پیدا کی کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی (وَ ابْتَدَاَهُ ابْتِدَاءً) مخلوق کو کسی علت غائیہ کیلئے ایجاد نہیں کیا کہ وہ ذات اکیلی تھی لہذا تنہائی کو دور کرنے یا ان سے انس پیدا کرنے کیلئے مخلوق کو پیدا کیا ہو، ایسا نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں جملوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدائی صنعت اور بشری صنعت میں مشابہت نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ بشری صنعت کو وجود میں لانے کیلئے پہلے مصنوع کی صورت خیالوں میں مرتب کی جاتی ہے اور اس کیلئے یا تو خارج میں کوئی نمونہ موجود ہوتا ہے اور کاریگر اسے دیکھ کر اسی طرح کی چیز ایجاد کرتا ہے۔ یا پھر خیالوں میں اختراعی نوعیت کا نقشہ تیار کر کے اسے جامۂ عمل پہناتا ہے۔ لیکن خداوند عالم کی صنعت مذکورہ دونوں کیفیتوں میں سے کسی کی مانند بھی نہیں اور وہ ذات اقدس ہر لحاظ سے منزہ و مبرا ہے۔ اس لئے کہ خداوند سبحانہٗ قدیم و ازلی ہے اور ہر قبل سے بھی پہلے ہے، اس وقت سے ہے کہ جب وقت بھی نہیں تھا، جب اس کے ساتھ کوئی اور چیز تھی ہی نہیں تو کس کے نمونے کو سامنے رکھ کر کوئی چیز ایجاد کی؟ اور اگر دوسری نوعیت کو دیکھا جائے تو بھی ظاہر ہے کہ خیالوں میں اختراع کی نوعیت کا نقشہ ذہن میں کوئی ڈالنے والا ہوتا ہے جس کی طرف سے الہام ہوتا ہے کہ اس طرح کی چیز تیار کی جائے۔ جبکہ ذات پروردگار کو کسی الہام کرنے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح وہ ذات، مقدس اور والاتر ہے کہ مخلوق کی مانند پہلے سوچ وچار سے کام لے پھر کسی کام کو شروع کرے۔ اسی لئے مولائے کائنات فرماتے ہیں: (بِلاَ رَوِیَّةٍ اَجَالَهَا) بغیر کسی فکر کی جولانی کے ایجاد کیا (وَ لاَ تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا) اور بغیر کسی تجربہ کے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پڑی ہو۔ یعنی پہلے کوئی ایسی چیز خلق کی ہو کہ اس پر تجربہ اور آزمائش کی ہو پھر اس کے بعد اس جیسی اور چیز بنائی ہو۔ اس کی مزید تفصیل خطبہ اشباح کی تیسری فصل کی شرح میں بیان ہوگی، انشاء اللہ۔

یزدان اور اہر یمن:

(وَ لاَحَرَکَةٍ اَحْدَثَهَا) اور بغیر کسی حرکت کے جسے اس نے پیدا کیا ہو جیسا کہ ہم جب کسی اختیاری کام کیلئے ارادہ، تصور اور خواہش پیدا کرتے ہیں تو اس سے پہلے تو ہمارے عضلات حرکت میں آتے ہیں پھر اعضاء و جوارح میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور کام سرانجام پاتا ہے۔ مگر ذات رب ذوالجلال کی شان اس سے بلند و بالاتر ہے، اس لئے کہ حرکت کرنا جسم کا خاصہ ہے اور خداوند متعال جسم و جسمانیات سے پاک و منزہ ہے۔ (وَ لاَ هَمَامَةِ نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِیْهَا) اور بغیر کسی ولولہ اور جوش کے کہ جس سے وہ بیتاب ہوا ہو

یعنی اس میں کوئی ایسا تردد پیدا نہیں ہوا جو اس کے اضطراب کا موجب ہو جس طرح کسی کام کو سر انجام دینے کے وقت ہماری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: ؎ ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں۔ شارح معتزلی ابن ابی الحدید اس کی ایک اور نوعیت بھی بتاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ھَمَامَۃ" مجوسیوں اور دوگانہ پرستوں کی ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل داستان کو بیان کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ذرقان نے اپنی کتاب "المقالات" میں ابو عیسیٰ وراق اور حسن بن موسیٰ نے بیان کیا ہے اور شیخ ابوالقاسم بلخی نے اپنی کتاب "المقالات" میں ثنویہ (دوگانہ پرستوں) سے یہ بات ذکر کی ہے کہ: "نور اعظم کے عزائم و ارادے "ظلمت" کے ساتھ لڑنے اور اسے غارت کرنے کیلئے مچلنے لگے، چنانچہ نور اعظم کے ارادے کے تحت اس کے اندر سے ایک ٹکڑا باہر آیا جسے "ہمامہ" کہتے ہیں۔ اس ہمامہ کے اندر یہ جوش وولولہ پیدا ہوا کہ ظلمت سے جا ٹکرائے، چنانچہ جب اس سے جا ٹکرایا تو ظلمت نے اسے نور اعظم سے جدا کر دیا اور خود ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ اسی طرح ظلمت کے اندر سے ایک ٹکڑا باہر آیا جسے "ہمامہ" کہتے ہیں۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ نور اعظم سے دو دو ہاتھ کر کے اس پر قابو پائے۔ لیکن نور اعظم اس پر غالب آگیا اور اسے ظلمت سے جدا کر کے اپنے اجزا کے ساتھ ملا لیا۔ اور نور کی "ہمامہ" ظلمت کے اجزا کے ساتھ جا ملی اور ان دونوں "ہمامہ" کے درمیان آویزش شروع ہو گئی، کبھی وہ غالب کبھی یہ، اس طرح سے دار و گیر کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجہ میں یہ عالم محسوس وجود میں آگیا"۔

شارح فرماتے ہیں: ثنویہ یا دوگانہ پرست دو قدیمی اصولوں (خداؤں) کے قائل ہیں جو اس کائنات کا نظام چلا رہے ہیں جو خیر و شر، نفع و ضرر، اور صلاح و فساد کو تقسیم کرتے ہیں۔ ایک کا نام "نور" ہے جو خیر، نفع اور صلاح کا کام کرتا ہے اور ایک کا نام "ظلمت" ہے جو شر، ضرر اور فساد کی کارستانیاں سر انجام دیتی ہے۔ فارسی میں پہلے کا نام "یزدان" اور دوسری کا نام "اہر یمن" ہے۔ البتہ اس بارے میں ان کی مذہبی معلومات کیلئے تفصیل کی ضرورت ہے جو انشاء اللہ اپنے موقع کے مطابق بیان ہو گی۔ سر دست ان "مجوسیوں" کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کی جاتی ہے جو ان دوگانہ پرستوں کی ایک قسم ہے، البتہ وہ ظلمت کے قدیم نہیں بلکہ حادث ہونے کے قائل ہیں، اس بارے میں ان کے دو عمدہ اور اہم اصول ہیں:-

ا۔ نور اور ظلمت کا باہمی امتزاج کیسے ہوا؟ اس بارے میں انہوں نے بہت سی وجوہات ذکر کی ہیں جن کو بیان کرنے سے بات بہت بڑھ جائے گی۔ صرف ایک وجہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ "یزدان" نے دل میں سوچا "اگر میرا مد مقابل ہوتا تو کیا ہوتا؟" اس گھٹیا قسم کی سوچ سے جو نور اعظم کی شایان شان نہیں تھی ایک ظلمت (اندھیاری) پیدا ہوئی جس کا نام "اہر یمن" ہے رکھا گیا جس کا کام شر، ضرر اور فتنہ و فساد ہے۔

۲۔ نور اور ظلمت کی جدائی کیونکر واقع ہوئی؟ اس بارے میں انہوں نے کئی وجوہات کو ذکر کیا ہے جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱)۔ نور اور ظلمت کی فوجوں میں ہزاروں سال سے جنگ کا سلسلہ جاری چلا آرہا ہے اور یہ معرکہ نور و ظلمت ابھی تک جاری و ساری ہے۔ آخر کار فتح یزدان اور اس کے لشکر کو ہو گی۔ جب یزدان کا لشکر فاتح اور اہر یمن اور اس کی فوجیں مغلوب و مفتوح ہو جائیں گی تو اس وقت قیامت برپا ہو جائے گی، یزدان اور اس کا لشکر نورانی اور سماوی عالم کی طرف سدھار جائیں گے اور

اہر یمن اور اس کی فوجیں جہنم کی تاریکیوں میں دھکیل دی جائیں گی۔

س ۔ یزدان واہر یمن کی جنگ میں فرشتوں نے بڑا اچھا کردار ادا کیا۔ وہ یوں کہ عالم سفلی (پست کائنات) اہر یمن کو اور عالم علوی (عالم بالا) خصوصیت کے ساتھ یزدان اور اس کے لشکر کو دے دیا۔

یہ اور اس قسم کی اور خرافات جو ان لوگوں نے بیان کی ہیں، خدا انہیں رسوا کرے اور قیامت تک زندان لعنت میں گرفتار رکھے۔ بہر کیف مولائے کائنات فرماتے ہیں :(اَجَالَ الْاَشْيَاءَ لِاَوْقَاتِهَا) ہر چیز کو اس کو وقت کے حوالے کیا۔ یا۔ ہر چیز کو اس طرف منتقل کیا جو لازمی قضا اور حتمی قدر کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہاں پر "اَجَال" جیم کے ساتھ اور "اَحَال" حاء کے ساتھ کا معنی کیا گیا ہے اور "اَحَال" کو "اِحَالہ" یعنی تبدیلی اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یا پھر یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے حکمت و مصلحت کے تحت ان اشیاء کو اوقات کی سواریوں پر سوار کر دیا۔ لیکن اگر "اَجَال" یا "اَحَال" کی بجائے "اَجَّلَ" جیم کی تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہو گا ان اشیاء کیلئے وقت مقرر فرمایا ہے کہ نہ تو اس سے آگے بڑھ سکتی ہیں اور نہ ہی پیچھے ہٹ سکتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے "اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ" (سورہ اعراف / ۳۴) جب بھی ان کی مدت ختم ہو جائے گی تو وہ لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ایک اور روایت کے مطابق اگر اسے "اَحَلَّ" حائے حطی اور لام مشدد کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہو گا کہ ان اشیاء کو اپنے اوقات کے دائرے میں اتار دیا۔ بہر حال لفظ جو بھی پڑھا جائے مقصود سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ "خداوند سبحانہ نے ہر شئے کیلئے ایک معین وقت اور ایک زمانہ مخصوص کر رکھا ہے جو اس کے نظام اکمل اور اعلی ترین بندوبست کی وجہ سے نہ تو اس کے آگے ہو سکتا ہے اور نہ ہی پیچھے رہ سکتا ہے"۔ (وَلَاَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا) اور بے جوڑ چیزوں مین توازن اور ہم آہنگی پیدا کی۔ جیسا کہ عقل وغیب کو کہ جن کا تعلق عالم امر سے ہے، جسم و بدن کے ساتھ کہ جس کا تعلق عالم خلق و شہادہ سے ہے آپس میں جوڑ دیا ہے۔ یا جس طرح باہمی متضاد اور مختلف بلکہ معاند عناصر کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا، جیسا کہ بعض فرشتوں میں آگ اور برف کو یکجا کر دیا۔ اسی طرح (وَغَرَّزَ غَرَائِزَهَا) ہر چیز کو جداگانہ طبیعت کا حامل بنا دیا۔ یعنی ہر ایک شئے کیلئے علیحدہ طبیعت بنائی۔ جیسے کہا جاتا ہے "سُبْحَانَ مَنْ ضَوَّءَ الْاَضْوَاءَ" پاک ہے وہ ذات جس نے روشنیوں کو روشنی عطا کی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جو چیز کسی طبیعت کیلئے تھی اسی کی سرشت میں داخل کر دی۔ مثلاً انسان میں ذہانت اور فطانت اور گدھے میں کند ذہنی اور بلادت۔ (وَ اَلْزَمَهَا اَشْبَاحَهَا) اور ان طبیعتوں کیلئے مناسب صورتیں ضروری قرار دیں، یعنی ہر شئے غریزے اور اس کی طبیعت کے لئے مناسب صورتیں اور شخصیتیں قرار دیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً کچھ اشخاص کیلئے شجاعت، کچھ کیلئے بزدلی، کسی کیلئے سخاوت اور کسی کے واسطے بخل مقرر کر دیا۔ یا مثلاً عسل (شہد) میں حرارت اور کافور میں برودت قرار دی۔ یہ معنی اس وقت کیا جائے گا جب "اَلْزَمَهَا" اور "اَشْبَاحَهَا" کی ضمیروں کا مرجع "غرائز" کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن اگر اس کا مرجع "اشیاء" کو قرار دیا جائے، جیسا کہ کلام کا سیاق یہی بتا رہا ہے تو اس کا معنی ہو گا کہ :اللہ تعالی نے اشیاء کو اشخاص کیلئے لازم قرار دیدیا ہے یعنی اللہ تعالی کے عمومی اور کلی علم اور اس کی قضا میں یہ چیز آگئی تھی کہ اشیاء کیلئے تشخیص لازمی اور ضروری ہے لہذا اس کے علم و مصلحت کے تحت ہر شئے اپنے موقع

محل کے مطابق تشخص کے جامہ سے مزین اور وجود کے زیور سے آراستہ ہو رہی ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے: "وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلاَّ عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَ مَا نُنَزِّلُهُ اِلاَّ بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" (سورہ الحجر / ۲۱) تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم معین اندازہ کے سوا انہیں نازل نہیں کرتے۔ جبکہ بعض نسخوں میں "اشباح" کا معنی "اصول" کیا گیا ہے۔

اشیاء کے وجود سے پہلے خدا کو ان کا علم ہے

(عَالِمًابِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا) وہ ان چیزوں کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے جانتا تھا۔ جس طرح کہ وہ ایجاد و ابتدا کے بعد بھی جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس کیلئے ان دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے (مُحِيطًا بِحُدُوْدِهَا وَ انْتِهَائِهَا) اس لئے کہ وہ ان کی حدود و نہایت پر احاطہ کئے ہوئے تھا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اَلاَ اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ" (سورہ حم سجدہ / ۵۴) یاد رکھو اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جبکہ بعض نے محیط سے مراد محافظ بھی لیا ہے اور بعض نے علمی احاطہ میں لینے والا لیا ہے یعنی وہ ان کے ظاہر و باطن، جملہ اور تفصیل کو جانتا ہے اور علم و اقتدار کے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے "اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا" (سورہ طلاق / ۱۲) اور اس کا علم ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے۔

احاطہ علمی سے یہ بھی مراد ہے کہ وہ ہر شئے کے وجود، جنس، مقدار، کیفیت، مقصد تخلیق وغیرہ سب کو جانتا ہے (عَارِفًا بِقَرَائِنِهَا وَ اَحْنَائِهَا) وہ ان کے نفوس و اعضاء کو پہچانتا تھا۔ یا ان کے نفوس و اطراف کو پہچانتا تھا۔ اور یہاں پر مجازی طور پر "عالماً" کی جگہ "عارفاً" کہا گیا ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عارف کا اطلاق ذات باری کیلئے نہیں ہوتا بلکہ عالم کا اطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ کلام امامؑ میں واقع ہوا ہے لہذا اس کا مجازی معنی یعنی عارف لے کر عالم مراد لیا جائے گا۔

علم الٰہی کے بارے میں ایک تحقیقی گفتگو

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ: "عَالِمًا بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا" خدا ان چیزوں کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے پہچانتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خلاق عالم کو تمام چیزوں کا کلی اور جزئی علم ہے۔ چیزوں کے وجود میں آنے سے پہلے بھی انہیں جانتا ہے آپؑ کا یہ فرمان ان لوگوں کے نظریئے کی مکمل طور پر تردید کرتا ہے جو علم الٰہی کی سرے سے نفی کرتے ہیں اور وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے نظریئے کی بھی تردید کرتا ہے جو خدا کے کلی علم کے تو قائل ہیں لیکن جزئیات کے علم کی نفی کرتے ہیں اور خسران مبین کے حقدار بنتے ہیں، اس سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے موجودات عالم کی ایجاد سے پہلے اور انہیں تکوینی صورت دینے سے قبل بھی جانتا ہے چنانچہ آپؑ کے اس فرمان پر آیات مجیدہ، اخبار متواترہ اور براہین عقلیہ شاہد ہیں، اس کی وضاحت اور تشریح کے لئے چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے۔

امر اول: ادلہ نقلیہ

ان نقلی دلائل کا تعلق کتاب اور سنت سے ہے، چنانچہ کتاب اللہ میں سے بے شمار آیات اس کی شاہد ہیں لیکن ہم صرف تین آیات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے کہ "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" (آیت ۲۹) وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ سورۂ نساء

میں ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيماً حَكِيمًا" (آیت ۲۴) یقیناً اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے، سورۂ نساء ہی میں ہے کہ "وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيماً حَكِيمًا" (آیت ۱۷) اور اللہ علیم اور حکیم ہے۔

سنت میں سے اس قدر کثیر تعداد میں احادیث و روایات موجود ہیں کہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ کتاب "التوحید" میں اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو فرماتے سنا کہ: "خدا اس وقت سے ہے کہ جب سے اس کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی وہ اپنے وجود کے ساتھ ہی عالم ہے۔ جب کہ کوئی معلوم نہیں تھا اور اس کا علم معلوم کے بارے میں اس کے وجود سے پہلے بھی اسی طرح ہے جس طرح اس کے وجود کے بعد ہے"۔ ایوب بن نوح نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں ایک سوال تحریر کیا کہ: "آیا خداوند عالم اشیاء کو خلق کرنے اور تکوین کی صورت عطا کرنے سے پہلے بھی انہیں جانتا تھا یا نہیں؟ بلکہ جب انہیں خلق کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تو اس وقت انہیں جانا؟" اس پر حضرتؑ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے تحریر فرمایا کہ: "خداوند عالم تخلیق اشیاء سے پہلے بھی ان سے اسی طرح واقف تھا جس طرح ان کی تخلیق کے بعد ہے"۔

منصور بن حازم کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ: "آپؑ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ ماکان و مایکون تا روز قیامت کو خدا جانتا ہے؟" فرمایا: "ضرور جانتا ہے! تخلیق کائنات سے پہلے بھی جانتا ہے"۔ منصور بن حازم ہی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے سوال کیا کہ: "آج رونما ہونے والی کوئی ایسی چیز ہے جسے خدا پہلے سے نہ جانتا ہو؟" امامؑ نے فرمایا "نہیں! بلکہ وہ سب کچھ کو آسمانوں اور زمین (کائنات) کی تخلیق سے بھی پہلے جانتا ہے"۔

حماد بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا: "آیا خداوند عالم ازل سے عالم ہے؟" اسی پر آپؑ نے (تعریض کے طور پر) فرمایا: "جب کوئی معلوم ہی نہیں تھا تو جانتا کسے؟" میں نے پوچھا "آیا خدا ازل سے سمیع (سننے والا) ہے؟" (اسی طرح بطور تعریض) فرمایا "جب کوئی سنائی دینے والا تھا ہی نہیں سنتا کسے؟" میں نے پوچھا "آیا وہ ازل سے بصیر (دیکھنے والا) ہے؟" فرمایا "جب کوئی دکھائی دینے والا ہی نہیں تھا تو پھر دیکھتا کسے؟" آپؑ نے آخر میں فرمایا: "یقیناً اللہ ازل سے علیم، سمیع اور بصیر ہے"۔

شارح کہتے ہیں کہ: اگر امام علیہ السلام کے جواب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امامؑ سائل کے دل و دماغ میں موجود نظریئے پر تعریض کرتے ہوئے اس کے سوالوں کا جواب دیتے رہے کیونکہ سائل کے نظریئے کو جان گئے تھے کہ خدا کا علم سمع و بصر بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہے اور اس کی صفات زائد بر ذات ہیں لیکن آخر میں صاف طور پر ارشاد فرمایا کہ: "خداوند عزوجل ازل سے علیم و سمیع و بصیر ہے، یعنی علم، سمع اور بصر اس کی عین ذات ہیں"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حسین بن بشار نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے سوال کیا کہ: "آیا جو چیز ابھی تک خلق نہیں ہوئی اسے بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کیسی ہوگی؟ یا نہ، صرف انہی چیزوں کو جانتا ہے جو خلق ہو چکی ہیں؟" امام علیہ السلام نے فرمایا: "خداوند متعال اشیاء کے معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی انہیں جانتا ہے!" جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے "اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" (سورہ الجاثیہ / ۲۹) جو کچھ تم کرتے تھے ہم لکھتے جاتے تھے۔ اور جہنمیوں کے بارے میں فرماتا ہے "وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ" (سورہ انعام / ۲۸) اگر وہ

پلٹ جائیں تو پھر انہی اعمال کی طرف لوٹ جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا اور یہ تو ہیں ہی جھوٹے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ابھی سے علم ہے کہ اگر جہنمیوں کو واپس لوٹا دیا جائے تو وہ ممنوعہ کاموں کو پھر سے انجام دینے لگیں گے۔ اور جب ملائکہ نے خدا سے کہا تھا کہ "أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ "(سورہ بقرہ / ۳۰) پروردگار! کیا ایسے شخص کو زمین پر مقرر کرے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا حالانکہ ہمارا زیادہ حق بنتا ہے ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ تو "قَالَ إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُوْنَ "(بقرہ / ۳۰) خدا نے (ان کے جواب میں) فرمایا: جن حقائق کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ تو خدا کا علم ازل سے ہے اور تخلیق اشیاء سے پہلے ہے، پس ہمارا ربّ بابرکت اور بڑے مرتبے والا ہے اس نے اشیاء کو خلق فرمایا اور ان کا علم ان کی تخلیق پر مقدم ہے۔ اسی طرح ہمارا ربّ ازل سے علیم، سمیع اور بصیر ہے"۔

عبداللہ بن مسکان نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ: "آیا اللہ تعالیٰ کون و مکان کو خلق کرنے سے پہلے بھی جانتا تھا یا صرف تخلیق کے وقت یا اس کے بعد سے انہیں جاننے لگا؟" امامؑ نے فرمایا: "کون و مکان کو ان کی تکوین و تخلیق سے پہلے اسی طرح جانتا تھا جس طرح ان کی تخلیق کے بعد جانتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام اشیاء کو بھی کون و مکان کی مانند جانتا تھا"۔

حسین بن خالد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے سنا کہ آپؑ فرما رہے تھے: "اللہ تعالیٰ ازل سے علیم، قادر، حی، قدیم، سمیع اور بصیر ہے" میں نے عرض کیا: "فرزند رسولؐ! ایک قوم ایسی بھی ہے جو کہتی ہے: خدا علم کی وجہ سے عالم، قدرت کی وجہ سے قادر، حیات کی وجہ سے حی، قدم کی وجہ سے قدیم، سمع کی وجہ سے سمیع اور بصر کی وجہ سے بصیر ہے!" اس پر امام علیہ السلام نے فرمایا: "جو شخص ایسا عقیدہ رکھے گا اور ایسا دین اختیار کرے گا تو اسے خداوند جل شانہٗ کے علاوہ اور بھی کئی معبود ماننے پڑیں گے اور اس کا ہماری ولایت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ خداوند عالم تو ازل سے ہی بالذات علیم، قادر، حی، قدیم، سمیع اور بصیر ہے۔ وہ مشرکین اور مشبہین کے عقیدہ سے بلند و بالاتر ہے"۔ کتاب کافی میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: "اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے خدا کا علم انہیں محیط ہے، ان کی تخلیق کے بعد اس کے علم میں اضافہ نہیں ہوا۔ جس طرح اشیاء کی تخلیق و تکوین کے بعد انہیں جانتا ہے، ان کی تخلیق سے پہلے بھی اسی طرح انہیں جانتا تھا"۔ کتاب "التوحید" میں ابوبصیر سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا، فرما رہے تھے: "ہمارا ربّ خداوند عزوجل ازل سے ذاتی طور پر عالم ہے جبکہ کوئی معلوم بھی نہ تھا۔ ذاتی طور پر سمیع ہے جبکہ کوئی سنائی دینے والا نہیں تھا۔ ذاتی طور پر بصیر ہے جبکہ کوئی دکھائی دینے والا نہیں تھا۔ ذاتی طور پر قادر ہے جبکہ کوئی ایسا نہیں تھا کہ جس پر قدرت نمائی کی جاسکے"۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امامؑ سے پوچھا: "ازل سے متکلم بھی ہے؟" فرمایا: "کلام صفت حادث ہے ازلی نہیں ہے، خدا ازل سے ہے کلام ازلی نہیں"۔ اس باب میں اور بھی بہت سی اخبار و احادیث ایک محقق کو مل سکتی ہیں، تلاش شرط ہے۔

امر دوم: عقلی دلائل

اب تک تو نقلی دلائل پیش کی جاتی رہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں کچھ عقلی دلائل بھی پیش کردی

جائیں، چنانچہ گزشتہ اخبار واحادیث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خداوند عالم تمام اشیاء کو کلی اور جزئی طور پر جانتا ہے۔ اسی بات پر جمہور عقلاء کا اتفاق ہے اور متکلمین و حکماء نے بھی اس پر براہین ساطعہ اور ادلۂ قاطعہ قائم کی ہیں، اسی طرح انہوں نے اس بات پر بھی دلائل قائم کی ہیں کہ خداوند متعال کا علم ذاتی ہے، زائد بر ذات نہیں ہے البتہ اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے اس نظریے کی مخالفت کی ہے لیکن یہ ناقابل اعتناء تعداد ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر پیش کئے جانے والے کچھ عقلی دلائل ذکر کردیئے جائیں تاکہ علمائے اعلام کی پیروی کا شرف بھی حاصل ہو جائے اور امامؑ کے کلام کی توضیح بھی ہو جائے۔ چنانچہ :

صاحب "تجرید" فرماتے ہیں : "اِحکام، تجرد اور ہر چیز کا اس کی طرف استناد، یہ اس کے علم کی دلیلیں ہیں..........."۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ، خداوند عالم کا اشیائے محکم کا فاعل ہونا، فی ذاتہٖ مادّہ سے خالی ہونا اور تمام اشیاء کا اس کی ذات پاک کی طرف مستند ہونا، اس بات کی دلیل ہیں کہ باری تعالیٰ عالم ہے۔ ہاں البتہ اس کا فاعل اشیاء ہونا دوسروں کے علم کیلئے مفید ہے، اس کا فی ذاتہٖ مادہ سے خالی ہونا اپنی ذات کے علم کیلئے مفید ہے اور تمام اشیاء کا اس کی ذات پاک کی طرف مستند ہونا اس کی اپنی ذات کے علم اور دوسروں کے علم کیلئے مفید ہے۔ پہلی صورت یعنی اللہ تعالیٰ فعل محکم و متقن کا فاعل ہے۔ اور جو محکم و متقن کا فاعل ہوتا ہے وہ اس سے عالم بھی ہوتا ہے۔ گویا صغریٰ اور کبریٰ کی نوعیت پیدا ہو گئی۔ اور کبریٰ تو صاف ظاہر ہے۔ جیسے کوئی شخص فصیح الفاظ اور دقیق نکات اور مخفی اسرار پر مشتمل زیبا تحریر دیکھتا ہے تو اسے قطعی طور پر اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اسے معرض وجود میں لانے والا یقیناً عالم ہے۔ اسی طرح صغریٰ ہے کہ جب یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ خداوند عالم افلاک و عناصر، اعراض و جواہر، انہار و اشجار، ازہار و اثمار اور حیوان و انسان کا احسن نظام اور محکم انتظام کی بنیاد پر خالق ہے۔ اس کی تعریف کیلئے دفاتر اور اقلام ناکافی ہیں اور اس کے بارے میں عقول و افہام حیران و سرگردان ہیں۔ اور انسانی صنعت پر اس کی اپنی گواہی ہی کافی ہے جبکہ اس نے انسان کو : "گیلی مٹی سے پیدا کیا پھر اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا کر رکھا، پھر نطفہ کو علقہ بنایا، پھر علقہ سے مضغہ پیدا کیا، پھر مضغہ سے ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ تو کس قدر بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے"۔ (سورہ مؤمنون کی آیت ۱۲ تا ۱۴ سے اقتباس)

دوسری دلیل کی تحقیق کیلئے چند ایک مقدمات کی ضرورت ہے :۔

۱۔ واجب الوجود آخری حد تک مجرد ہے، یعنی قائم بالذات ہے، نہ تو اس کی ذات اور نہ ہی وجود کسی مادے یا موضوع سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر اس کا مادہ کے ساتھ تعلق ہو تو تو اجزاء میں تقسیم ہو جائے گا اور ان کا ہمیشہ کیلئے محتاج رہے گا۔

۲۔ جو قائم بالذات ہوتا ہے وہ اپنی حقیقت اور حقانیت میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا، موجود بالذات ہوتا ہے، اپنی ذات کیلئے موجود ہوتا ہے، اپنی ذات کے پاس حاضر ہوتا ہے، اپنی ذات سے نہ کبھی غائب ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے جدا ہوتا ہے۔

۳۔ علم، نام ہے معلوم کے حضور کا۔ خواہ وہ بعینہٖ ہو یا اپنی صورت کے ساتھ ہو، اور اس کا حضور اس مجرد کے پاس ہو جو موجود بالفعل اور قائم بالذات ہو۔ اس کے سامنے واضح ہو، اور اس کے آگے ثابت و برقرار ہو، اور یہ بات بھی ظاہر ہے۔ جب آپ ان تمام مقدمات کو پیش نظر رکھیں گے تو آپ پر یہ چیز واضح ہو جائے گی کہ واجب الوجود آخری حد تک مجرد ہونے، قائم

بالذات ہونے، اپنی ذات کیلئے موجود ہونے، اپنی ذات کے پاس حاضر ہونے، اپنی ذات سے غیر حاضر نہ ہونے، اپنی ذات کیلئے منکشف ہونے اور چھپا ہوا نہ ہونے کی وجہ سے اپنی ذات کیلئے بالذات عالم ہے۔ کسی اور غیر ذاتی امر کی وجہ سے نہیں۔ پس اسی کی ذات عقل بھی ہے، عاقل بھی ہے اور معقول بھی ہے تو صرف ایک تعبیر کا فرق ہے۔

اب رہی تیسری صورت، تو وہ یہ ہے کہ تمام موجودات کا وجود اس کی ذات سے مستند ہے اور وہ کسی شئے سے مستند نہیں ہے۔ وہ چونکہ کسی بھی شئے سے متعلق نہیں لہذا اپنی ذات کیلئے موجود ہے۔ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اپنی ذات کے پاس حاضر و موجود ہے۔ اور چونکہ تمام اشیاء اس کی معلول ہیں لہذا اس کے پاس حاضر ہیں، کوئی بھی اس سے غائب نہیں ہے اس لئے کہ علت، معلول کے ساتھ ہوتی ہے اور علت کیلئے معلول کا حاصل ہونا اشد ضروری ہوتا ہے جس طرح کہ محقق طوسیؒ نے شرح اشارات میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس کا علم اپنی ذات اور دوسروں کے ساتھ ہے۔ محقق شیرازی ملا صدرا نے اسفار میں کیا خوب ارشاد فرمایا ہے: ''کوئی بھی عقلمند یہ نہیں سمجھتا کہ کسی کو کوئی کمال بخشنے والا خود اس سے محروم ہوتا ہے ورنہ کمال حاصل کرنے والا کمال بخشنے والے سے افضل ہو گا اور استفادہ کرنے والا فائدہ پہنچانے والے سے بہتر ہو گا۔ اور جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام ممکنات اسی ذات پروردگار سے مستند ہیں جو وجود ہی وجود اور فعلیت مطلقہ ہے۔ ان ممکنات میں عالم ذاتیں اور علمی صورتیں بھی ہیں جو اس سے فیض حاصل کرتی ہیں، اور فیض پہنچانے والا ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہو، اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو تاکہ کمال کی عطا کے وقت اس سے قاصر نہ ہونے پائے۔ لہذا اس ذات کو واجب الوجود اور اس کے علم کو عین ذات ہونا چاہئے نہ یہ کہ اس کا علم زائد بر ذات ہو''۔

اشیاء کی تکوین، تخلیق اور ایجاد سے پہلے ان کا خدا کو علم ہونے کی کیفیت بہت پیچیدہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر علما کے قدم پھسل گئے اور حکما کے افہام سر گردان ہو گئے۔ اور یہ چونکہ ایک نہایت ہی گہرا اور مشکل مسئلہ ہے لہذا اس بارے میں شدید حد تک اختلاف کا شکار ہو گئے..

پاک ہے وہ ذات جس کو سمجھنے کیلئے بڑے بڑے عقلمندوں کے اذہان و افہام عاجز آ گئے ہیں اور عالم انسانیت کی عقلیں اس کی صفات تک رسائی کے بارے میں حیران و سر گردان ہیں۔

آٹھویں فصل

اشیاء کی تخلیق کی تفصیل

ثُمَّ اَنْشَاَ سُبْحَانَهٗ فَتْقَ الْاَجْوَآءِ وَ شَقَّ الْاَرْجَآءِ وَسَكَآئِكَ الْهَوَآءِ فَاَجْرٰى فِيْهَامَآءً مُتَلَاطِمًا تَيَّارُهٗ مُتَرَاكِمًا زَخَّارُهٗ حَمَلَهٗ عَلٰى مَتْنِ الرِّيْحِ

پھر یہ کہ اس نے کشادہ فضاء، وسیع اطراف و اکناف اور خلاء کی وسعتیں خلق کیں اور ان میں ایسا پانی بہایا جس کے دریائے مواج کی لہریں طوفانی اور بحر زخار کی موجیں تہ بہ تہ تھیں، اسے تیز ہوا

الْعَاصِفَةِ وَ الزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ فَأَمَرَهَا بِرَدِّهٖ وَ سَلَّطَهَا عَلٰى شَدِّهٖ وَقَرَنَهَا اِلٰى حَدِّهٖ اَلْهَوَآءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيْقٌ وَ الْمَآءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيْقٌ ثُمَّ اَنْشَاَ سُبْحَانَهٗ رِيْحًا اَعْقَمَ مَهَبَّهَا وَ اَدَامَ مُرَبَّهَا وَ اَعْصَفَ مَجْرٰيهَاوَاَبْعَدَ مَنْشَأَهَا اَمَرَهَا بِتَصْفِيْقِ الْمَآءِ الزَّخَّارِ وَ اِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَآءِ وَعَصَفَتْ بِهٖ عَصْفَهَابِالْفَضَاءِ تَرُدُّاَوَّلَهٗ عَلٰى آخِرِهٖ وَسَاجِيَهٗ عَلٰى مَائِرِهٖ حَتّٰى عَبَّ عُبَابُهٗ وَ رَمٰى بِالزَّبَدِ رُكَامُهٗ فَرَفَعَهٗ فِيْ هَوَآءٍ مُنْفَتِقٍ وَجَوٍّ مُنْفَهِقٍ فَسَوّٰى مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا مَكْفُوْفًا وَ عُلْيَاهُنَّ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَ سَمْكًا مَرْفُوْعًا بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا وَلاَ دِسَارٍيَنْتَظِمُهَاثُمَّ زَيَّنَهَابِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ وَ ضِيَآءِ الثَّوَاقِبِ وَاَجْرٰى فِيْهَا سِرَاجًامُّسْتَطِيْرًا وَ قَمَرًا مُّنِيْرًا فِيْ فَلَكٍ دَائِرٍ وَ سَقْفٍ سَائِرٍ وَ رَقِيْمٍ مَائِرٍ.

اور تند آندھی کی پشت پر لادا، پھر اسے پانی کے پلٹانے کا حکم دیا اور اسے اس کے پابند رکھنے پر قابو دیا اور اسے پانی کی سرحد سے ملا دیا۔ اس کے نیچے ہوا دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اوپر پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پھر اللہ سبحانہٗ نے پانی کے اندر ایک ہوا خلق کی جس کے چلنے کو بانجھ (بے ثمر) کر دیا تھا اور اسے اس کے مرکز پر برقرار رکھا اس کے جھونکے تیز کر دیئے اور اس کے چلنے کی جگہ دور تک پھیلا دی، پھر ہوا کو مامور کیا کہ وہ پانی کے ذخیرے کو تھپیڑے دے اور بحر بے کراں کی موجوں کو اچھالے، اس ہوا نے پانی کو یوں متھ دیا جس طرح دہی کے مشکیزے کو متھا جاتا ہے اور اسے دھکیلتی ہوئی تیزی سے لے چلی جس طرح خالی فضا میں چلتی ہے۔ اور پانی کے ابتدائی حصے کو آخری حصے پر اور ٹھہرے ہوئے کو چلتے ہوئے پانی پر پلٹانے لگی۔ یہاں تک کہ اس متلاطم پانی کی سطح بلند ہو گئی اور وہ پانی تہ بہ تہ جھاگ دینے لگا۔ اللہ نے وہ جھاگ کھلی ہوا اور کشادہ فضا میں اٹھائی، اس سے ساتوں آسمان پیدا کیے۔ نیچے والے آسمان کو رکی ہوئی موج کی طرح بنایا اور اوپر والے آسمان کو محفوظ چھت، اور بلند عمارت کی صورت میں اس طرح قائم کیا کہ نہ ستونوں کے سہارے کی حاجت تھی، نہ بندھنوں سے جوڑنے کی ضرورت۔ پھر ان کو ستاروں کی سج دھج اور روشن تاروں کی چمک دمک سے آراستہ کیا اور ان میں ضوء پاش چراغ اور جگمگاتا چاند رواں کیا جو گھومنے والے فلک، چلتی پھرتی چھت اور جنبش کھانے والی لوح میں ہے۔

تشریح

"قَمَرًا مُنِيْرًا" روشن چاند، "مُنِيْرًا" باب افعال کا اسم فاعل ہے۔ "نور" اور "ضیاء" میں فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ "نور"، "ضیاء" سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ" (سورہ نور / ۳۵) اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ جبکہ بعض اوقات ذاتی روشنی کو "ضیاء" اور عرضی روشنی کو "نور" کہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد پروردگار ہے "هُوَالَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا" (سورہ یونس / ۵) وہ وہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور قرار دیا ہے۔ "اَلرَّقِيْمُ الْمَائِرُ" کے معنی متحرک تختی ہے اور کنایہ کے طور پر فلک کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی تختی کی مانند مسطح ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ "رقیم" فلک کا ایک نام ہے کیونکہ اسے رقم (تحریر) سے لیا گیا ہے گویا اس پر

ستاروں کی تحریر نقش ہے جس طرح کپڑے پر نقش و نگار ہوتے ہیں۔

سابقہ فصل میں بیان ہو چکا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اجمالی طور پر تخلیق کائنات کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اب اس کی تفصیل :

فرماتے ہیں :(ثُمَّ اَنشأَ سُبُحَانَه' فَتَقَ الاَجوَآءِ وَ شَقَّ الاَرجاَءِ وَسكَآئِكَ الْهَوَآءِ) پھر یہ کہ اس نے کشادہ فضا ،وسیع اطراف واکناف اور خلأ کی وسعتیں خلق کیں۔ یہ تین جملے ایسے ہیں کہ ان کا مفہوم ایک جیسا ہے۔اجواء ،ارجاء اور سکائک کو فضا کے متعدد طبقات کی وجہ سے جمع کی صورت میں بیان فرمایا ہے ،جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ :

ا۔"اجواء" سے مراد وہ ظاہری فضا ہے جو زمین کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے۔

۲۔"ارجاء" سے مراد وہ فضا ہے جو اطراف زمین میں اجواء کے ساتھ متصل ہے (مثلاً اوزون کی تہہ)۔

۳۔"سکائک" سے مراد وہ فضا ہے جو زمین کے اوپر ہے، جسے خلا کہتے ہیں۔

بہر حال مراد خواہ جو بھی ہو اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فضا بھی مخلوق اور ایک وجودی امر ہے۔ کیونکہ مخلوق ،عدم محض نہیں ہوا کرتی۔ شارح معتزلی کہتے ہیں کہ فضا کا مخلوق اور وجودی امر ہونا بعید نہیں ہے لیکن کچھ اہل نظر ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ ایک جسم لطیف ہے اور ان اجسام کی مشابہت سے خارج ہے۔اور کچھ اہل نظر اسے جسم مجرد سمجھتے ہیں ،علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں کہ "فَتَقَ الاَجوَاءَ" سے مراد خالی جگہوں میں اجسام کا پیدا کرنا ہے۔یا جوّ سے مراد بُعد موہوم ہے یا عناصر میں سے کوئی ایک عنصر ہے۔اور "شَقَّ الأَرجَاءَ" کی تفسیر بھی "فَتَقَ الأَجوَاءَ" کی مانند ہے یا پھر "ارجاء" سے مراد فضائیں اور اماکن ہیں ،اور "اجواء" سے مراد ہوا کا عنصر ہے ،"سكَائِكَ الْهَوَاءِ" منصوب ہے جیسا کہ بہت سے نسخوں میں ہے اور "فَتَقَ الأَجوَاءَ" پر اس کا عطف ہے اور بعض نسخوں کے مطابق اسے مجرور پڑھتے ہیں اور "اجواء" پر عطف کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ سبحانہ' نے حیز اور اماکن خالی پیدا کئے۔(فَاجرَىٰ فِيهَا مَآءً مُتَلاطِمًا تَيَّارُه') اور ان میں ایسا پانی بہایا جس کے دریائے مواج کی لہریں طوفانی تھیں (مُتَرَاكِمًا زَخَّارُه') اور بحر زخار کی موجیں تہ بہ تہ تھیں۔ تو جب اس نے پانی کو پیدا کیا تو (حَمَلَه' عَلىٰ مَتْنِ الرِّيحِ العَاصِفَةِ وَ الزَّعزَعِ القَاصِفَةِ) اسے تیز ہوا اور تند آندھی کی پشت پر لادا۔ایسی تیز و تند آندھی کہ جس سے خوفناک صدائیں نکل رہی تھیں۔ پس پانی کو اس کے اوپر ڈال دیا تو وہ سکون میں آگئی اور پانی کا گھر بن گئی اور اس ریح سے مراد یا تو وہی متحرک ہوا ہے جس کا ذکر امامؑ نے پہلے پہل فرمایا ہے۔یا پھر کوئی اور ہوا ہے ،جیسا کہ احتجاج طبرسیؒ میں ہشام بن حکم سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک زندیق کے جواب میں ارشاد فرمایا :"اور ریح ہوا کے دوش پر سوار ہے اور ہوا کو خدا کی قدرت نے روکا ہوا ہے"۔اس صورت حال کے پیش نظر ممکن ہے کہ تخلیق کی رو سے ریح ،ہوا پر مقدم ہو یا اس سے متاخر بھی ہو سکتی ہے اور یا پھر باہم ساتھ ہی ساتھ خلق ہوئی ہوں۔ پھر جب پانی ہوا کے دوش پر سوار ہو گیا اور اپنی فطرت کے مطابق فضاؤں میں چلنے پھرنے لگا (فَأَمَرَهَا بِرَدِّهٖ وَ سَلَّطَهَا عَلىٰ شَدِّهٖ وَ قَرَنَهَا اِلىٰ حَدِّهٖ) پھر اللہ تعالیٰ نے اسے پانی کے پلٹانے کا حکم دیا اور اسے اس کے پابند رکھنے پر قابو دیا۔ اور اسے پانی کی سرحد سے ملا دیا

۔ کیدری کہتے ہیں کہ یہاں پر "امر" مجازی طور پر ہے کیونکہ خداوند حکیم جمادات کو "امر" نہیں کرتا۔ لیکن عارمیں ہے کہ یہاں پرامر سے مراد شاید امر تکوینی ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کُنْ" تووہ چیز ہو جاتی ہے، یااس کا فرمان ہے "کُوْنُوْا قِرَدَةً" (بندر بن جاؤ)۔

اس کے بعد آپؑ نے خداوند سبحان کی قدرت کاملہ کی طرف ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے (اَلْهَوَآءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيْقٌ) اس کے نیچے ہوادور تک پھیلی ہوئی تھی (وَ الْمَآءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيْقٌ) اوپر پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد خداوند سبحانہ' کی قدرت بتانا ہے کہ اس نے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کو نیچے سے چلنے والی ہوا کے ذریعہ روکا ہوا ہے جس طرح کہ دور دور تک پھیلی ہوئی ہوا کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ذریعہ قبضے میں کیا ہوا ہے! یہی چیز تو باعث تعجب ہے۔

(ثُمَّ اَنْشَأَ سُبْحَانَه' رِيْحًا اَعْقَمَ مَهَبَّهَا) پھر اللہ سبحانہ' نے پانی کے اوپر ایک اور ہوا خلق کی جس کے چلنے کو بانجھ (بے ثمر) کر دیا تھا۔ جبکہ نہج البلاغہ کے کئی دوسرے نسخوں میں "اِعْتَقَمَ مَهَبَّهَا" باب افتعال سے درج ہے۔ یہ فعل لازم ہوگا جس کا معنی ہوگا اس کا چلنا بانجھ (بے ثمر) تھا۔ یا جس کے چلنے میں تنگی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ "اِعْتِقَام" کا ایک معنی کنواں کھودنا بھی ہے، اور کنواں جوں جوں پانی کے نزدیک ہوتا جاتا ہے تنگ ہوتا جاتا ہے جس حد تک پانی کا ذائقہ معلوم کیا جاسکے۔ اگر پانی میٹھا ہو تو اسی تنگ حد تک رہنے دیا جاتا ہے ورنہ بند کر دیا جاتا ہے۔ تو یہاں پر ہوا کیلئے تنگی کا لفظ استعمال ہوا ہے (وَ اَدَامَ مَرَبَّهَا) اور اسے اس کے مرکز پر برقرار رکھا۔ جبکہ بعض نسخوں میں "دال" کے ساتھ "مَدَبَّهَا" ہے جس کے معنی ہیں: اس کی حرکت پر برقرار رکھا (وَاَعْصَفَ مَجْرٰهَا) اور اس کے جھونکے تیز کر دیئے (وَاَبْعَدَ مَنْشَأَهَا) اور اس کے چلنے کی جگہ اس حد تک دور تک پھیلادی کہ کسی کو معلوم نہیں ہوتی۔ پھر اسے پانی پر مسلط کر کے (فَاَمَرَهَا بِتَصْفِيْقِ الْمَآءِ الزَّخَّارِ وَ اِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ) اسے حکم دیا کہ وہ پانی کے ذخیرہ کو تھپیڑے دے اور بحر بیکراں کی موجوں کو اچھالے (فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَآءِ) پس ہوا نے پانی کو یوں متھ دیا جس طرح دہی کے مشکیزے کو متھا جاتا ہے اور اس زور سے ہلایا جاتا ہے کہ اس سے مکھن نکل آتا ہے۔ اور یہ تشبیہ شدت کے ساتھ حرکت دینے کی طرف اشارہ ہے۔ (وَعَصَفَتْ بِهٖ عَصْفَهَا بِالْفَضَآءِ) اور اسے اس شدت کے ساتھ دھکیلتی ہوئی تیزی سے چلی جس طرح خالی فضا چلتی ہے کہ اس کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ (تَرُدُّ اَوَّلَه' عَلٰى آخِرِهٖ وَسَاجِيَه' عَلٰى مَائِرِهٖ) اور پانی کے ابتدائی حصہ کو آخری حصے پر اور ٹھہرے ہوئے کو چلتے ہوئے پانی پر پلٹانے لگی (حَتّٰى عَبَّ عُبَابُه' وَرَمٰى بِالزَّبَدِ رُكَامُه') یہاں تک کہ اس متلاطم پانی کی سطح بلند ہوگئی اور وہ پانی تہ بہ تہ جھاگ دینے لگا (فَرَفَعَه' فِيْ هَوَآءٍ مُنْفَتِقٍ وَجَوٍّ مُنْفَهِقٍ) تو اللہ نے وہ جھاگ کھلی ہوئی اور کشادہ فضا کی طرف اٹھائی۔ (فَسَوّٰى مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ) پس اس سے ساتوں آسمان پیدا کئے اور انہیں ایسا برابر بنایا کہ ذرہ برابر کجی نہیں ہے۔ سات کا عدد، نو (۹) کی تعداد کے منافی نہیں جنہیں صاحبان رصد نے ثابت کیا ہے کیونکہ آٹھویں اور نویں آسمان کو شریعت کی زبان میں "عرش اور کرسی" کہتے ہیں۔ اس بارے میں تحقیقی گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ (جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا مَكْفُوْفًا) نیچے والے آسمان کو رکی ہوئی موج کی طرح بنادیا تو اسے اپنی قدرت کاملہ سے روک دیا اور چلنے سے منع کر دیا یا اس کے اطراف میں اور اس کے نیچے ایک ایسا جامد جسم بنادیا جو اسے چلنے اور منتشر ہونے سے روکے ہوئے ہے، یا اسے سیال ہونے کے بعد جامد کر دیا۔

نیچے والے آسمان کا رکی ہوئی موج ہونایا تو حقیقت کے طور پر ہے جیسا کہ کچھ افراد نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے اس میں اڑتے پھرتے سر گردان ستاروں کی حرکت کو دیکھ کر دلیل قائم کی ہے۔

ابن ابی الحدید کی شرح میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ "آسمانوں میں متحرک سر گردان اڑتے پھرتے ستارے جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان شفاف افلاک ہیں، ہم انہیں اپنی ان حسی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ افلاک میں یوں دوڑ پھر رہے ہیں جس طرح پانی میں اجسام تیرتے ہیں، جس سے ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دنیاوی آسمان موجیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے اور ستارے اس میں تیرتے پھر رہے ہیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ :"ثوابت ستاروں کو ہم اسی طرح نہیں دیکھتے کیونکہ وہ متحرک نہیں ہیں، چاند اگرچہ دنیا میں ہے لیکن اسے گھمانے والا فلک "اجرام فوقانیہ" کی جنس سے ہے۔ مذکورہ تحتانی فلک کی مانند موجیں مارتا ہوا پانی نہیں ہے۔ اسی طرح سورج کا معاملہ ہے"۔ شارح کہتے ہیں :"چاند اور سورج کے بارے میں ان کا قول اشکال اور خرابی سے خالی نہیں ہے۔ بات صاف ظاہر ہے، سمجھنے کی کوشش کیجئے"۔

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے کہ نچلے آسمان کو یا تو حقیقی طور پر موج مانا گیا ہے اور اس کی تفصیل ابھی گزر چکی ہے یا پھر تشبیہ کے طور پر موج قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی بات زیادہ بہتر ہے، کیدری کہتے ہیں کہ :"آسمان دنیا کو اس کی صفاتی اور بلندی کی وجہ سے موج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یا پھر مراد یہ ہے کہ پہلے موج تھا بعد میں اس صورت میں بنا دیا گیا ہے"۔ شارح بحرانی فرماتے ہیں کہ :"آسمان کیلئے موج کا لفظ استعارہ کے طور پر ہے کیونکہ ان دونوں میں بلندی میں اور رنگ میں مشابہت پائی جاتی ہے"۔ اس بارے میں علامہ مجلسیؒ کا قول بھی بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

(وَ عُلْیَاهُنَّ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا) اور اوپر والے آسمان کو محفوظ چھت بنایا کہ اس کے حکم کے بغیر نہ تو گرے نہ ٹوٹے اور نہ ہی اس میں کوئی سوراخ ہو۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں کہ :"اس چھت کو شیطانوں سے محفوظ بنایا"۔ پھر انہوں نے ابن عباس سے شیاطین کے آسمانوں میں داخلے پر پابندی کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ "شیاطین آسمانوں میں آیا جایا کرتے تھے اور وہاں سے خبریں بھی لے آیا کرتے تھے لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو ان پر تین آسمانوں میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی لیکن جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی تو انہیں تمام آسمانوں سے روک دیا گیا،.......... "روایت کے آخر تک۔

علامہ مجلسیؒ اکثر شارحین کے قول کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ :"اس روایت میں شیاطین سے جس آسمان کی حفاظت کی گئی وہ آسمان علیا (اوپر والا آسمان) نہیں بلکہ نیچے والا ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا" (سورہ انبیا / ۳۲) اور آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا، سے اوپر والا آسمان مراد لیا جائے۔ شارح کہتے ہیں کہ :"واضح سی بات ہے کہ نیچے والے آسمان کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بعد شیاطین کے داخلے سے محفوظ کر دیا گیا، ابن عباس کی روایت بھی یہی کہتی ہے اور اس بارے میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ رہی آسمان علیا (اوپر والے آسمان) کی حفاظت کی بات، وہ تو پہلے ہی سے محفوظ ہے اور شیاطین کا داخلہ تو آنحضرتؐ کی ولادت سے پہلے بھی بند تھا۔ جیسا کہ

اخبار وروایات بھی اس بات کی شاہد ہیں"۔

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: "میرے ذہن میں جو بات پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالی نے ہر آسمان کی نچلی جہت کو واقعاً یا دکھائی دیتی ہوئی مواج اور متحرک بنایا ہے اور بالائی جہت کو محفوظ چھت قرار دیا ہے جس پر ملائکہ مستقر ہیں اور شیاطین کی بھی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ تو ایسی صورت میں "زَيَّنَهَا" کی ضمیر اور باقی دوسری ضمیریں تمام آسمانوں کی طرف لوٹ رہی ہیں اور گذشتہ آیت سے مناسبت رکھتی ہیں اور "وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ" (صافات / ۷) اور اس کی ہر سرکش شیطان خبیث سے حفاظت کی۔ اس سے مناسبت رکھتی ہے۔

(وَ سَمْكًا مَرْفُوعًا بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا وَ لَا دِسَارٍ يَنْتَظِمُهَا) اور بلند عمارت کی صورت میں اس طرح قائم کیا کہ نہ ستونوں کے سہارے کی حاجت تھی اور نہ بندھنوں سے جوڑنے کی ضرورت۔ "يَدْعَمُهَا" اور "يَنْتَظِمُهَا" میں موجود ضمیریں، اسی طرح اگلے جملہ "وَ زَيَّنَهَا" کی ضمیر کا مرجع "سَمٰوَات" ہے اور یہی سب سے بہتر اور مناسب قول ہے، اور اس کلام الٰہی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے جس میں کہا گیا ہے "اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" (سورہ رعد / ۲) اللہ وہی تو ہے جس نے آسمان کو قابل مشاہدہ ستون کے بغیر پیدا کیا۔ اس آیت کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ:

ا۔ آیا آسمانوں کیلئے ستون ہیں لیکن ہمیں نظر نہیں آتے؟۔ یا۔

ب۔ بالکل ہی ستون نہیں ہیں۔

چنانچہ ابن عباس، حسن، قتادہ، جبائی اور ابو مسلم دوسرے نظریئے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ: "اللہ نے آسمانوں کو کہ جنہیں تم دیکھتے ہو ستونوں کے بغیر بلند کیا ہے"۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ نہ تو ان کے ستون ہیں کہ جن کے سہارے پر یہ کھڑے ہوں اور نہ ہی ان کو اوپر سے کوئی چیز اٹھائے ہوئے ہے۔

طبرسیؒ مرحوم پہلے نظریئے کے قائل ہیں اور یہی نظریہ زیادہ صحیح ہے اور مجاہد نے بھی ابن عباس کی طرف اسی کی نسبت دی ہے اور کہتے ہیں کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ "اللہ نے آسمانوں کو بلند کیا ہے ایسے ستونوں کے ساتھ جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے"۔ شارح کہتے ہیں کہ: قمی اور عیاشی نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے بھی ایک قول نقل کیا ہے کہ آپؑ نے "قَالَ فَثَمَّ عَمَدٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَرَوْنَهَا" فرمایا ستون ہیں لیکن تم نہیں دیکھ پاتے"۔

امام رازی کہتے ہیں: "ستون وہ ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کو سہارا دیا جاتا ہے، اور ہم بتا چکے ہیں کہ یہ آسمانی اجسام فضائے عالی میں قدرت الٰہی سے لٹکے ہوئے ہیں تو یہی قدرت خداوندی ان کیلئے ستون ہوگی اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "ستون ہیں جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے" کیونکہ قدرت خداوندی ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی"۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں (ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ) پھر ان کو ستاروں کی سج دھج سے آراستہ کیا۔ لیکن اگر اس سے نیچے والا آسمان مراد لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اس لئے کہ خداوند متعال فرماتا ہے "اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ"

بتایا جا چکا ہے۔ اس لئے کہ اگر ستاروں سے نیچے والا آسمان مزین ہے تو چونکہ یہ آسمانوں کا ایک حصہ ہے، ایک حصہ کی زینت تمام کی زینت ہو گی۔

تفسیر کشاف میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ: سماءِ دنیا سے مراد ہے تمہارا نزدیک ترین آسمان، زینت مصدر ہے۔

ستارے کیونکر زینت ہیں؟

۱۔ ستارے اپنی روشنی کی وجہ سے آسمان کی زینت ہیں۔ (قول ابن عباس)

۲۔ مختلف پیاری بناوٹ اور شکل وصورت کی وجہ سے جیسے ثریا، بنات النعش، جوزا کی پیاری اور خوبصورت شکل وصورت کی وجہ سے۔

۳۔ اپنی مختلف حرکات کی وجہ سے۔

۴۔ تاریک رات میں اپنی ضوء پاشی کی وجہ سے کہ جنہیں دنیا پیار کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر "مصابیح" کے لفظ کے ساتھ بھی کی ہے۔

بہر حال یہ تو تھی ستاروں کی روشنی کی بات، رہی ان کی چال کے بارے میں گفتگو تو انشاءاللہ آگے چل کر ہو گی۔

ثاقب کیا ہے؟

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (وَضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ) اور روشن تاروں کی چمک دمک سے آراستہ کیا۔ اس سے مراد یا تو خود ستارے ہیں جو اس سے پہلے جملہ میں بیان ہوئے ہیں، تو پھر ایسی صورت میں یہ جملہ "زِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ" کی گویا تفسیر واقع ہو رہا ہے۔ اور کواکب ثواقب یعنی روشن ستارے مراد ہوں گے۔ "ثواقب"، "ثقب" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سوراخ کرنا، اور کواکب ثواقب سے مراد ایسے روشن ستارے ہیں جو گویا اپنی روشنی سے تاریکی میں سوراخ کر رہے ہوتے ہیں۔ یا پھر ان سے ایسے "شہابے" مراد ہیں جن کے ذریعہ شیطانوں کو مار مار کر بھگایا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ" (الطارق / ۳) وہی درخشاں ستارہ تاریکیوں کو چیرنے والا۔ چنانچہ اس مقام پر "النجم" کی توصیف "ثاقب" کے ساتھ کی گئی ہے، اس کی چند وجوہ ہیں:

۱۔ یہ جہاں بھی داخل ہوتا ہے تاریکی میں اپنی روشنی سے سوراخ کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

۲۔ جب مشرق سے طلوع کرتا ہے تو فضا میں اس کی روشنی یوں معلوم ہوتی ہے گویا کوئی چیز کسی چیز کو سوراخ کر کے آگے نکل رہی ہو۔

۳۔ یہی وہ ستارہ ہے جو شیطان کو مارا جاتا ہے، پس وہ اس میں سوراخ کر کے داخل ہو جاتا ہے اور اسے جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔

۴۔ فراء کہتے ہیں کہ یہ وہ ستارہ ہے جو دوسرے تمام ستاروں پر فائق اور بلند تر ہے اور جب کوئی پرندہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے تو اس وقت عرب کہتے ہیں "فَقَدْ ثَقَبَ"۔

شارح کہتے ہیں کہ ایک وجہ اور بھی ہے :

۵۔ اس میں اس قدر درخشندگی ہوتی ہے گویا وہ افلاک کو اپنی روشنی سے سوراخ کر رہا ہو۔

اس بات کی شاہد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی وہ حدیث ہے جو خصال شیخ صدوقؒ میں موجود ہے، امام علیہ السلام نے ایک یمنی شخص سے سوال کیا : "زحل ستارے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے ؟" کہا : "وہ تو نحس ستارہ ہے۔" فرمایا : "ایسانہ کہو! کیونکہ یہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ستارہ ہے وہی نجم الاوصیا ہے، وہی نجم ثاقب ہے جس کا اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے !" یمنی نے کہا : "ثاقب سے کیا مراد ہے ؟" فرمایا : "چونکہ اس کا مقام طلوع ساتویں آسمان پر ہے اور اس کی روشنی تمام آسمانوں کو چیرتی ہوئی آسمان دنیا تک آپہنچتی ہے اور اسے ضیابار کر رہی ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے اس کا نام "النجم الثاقب" رکھا ہے"۔

آفتاب وماہتاب

(فَاَجْرىٰ) بعض نسخوں میں واؤ کے ساتھ ہے (وَاَجْرىٰ فِيْهَا سِرَاجًا مُّسْتَطِيْرًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا) اور ان میں ضوپاش چراغ اور جگمگاتا چاند رواں کیا۔ اس جملے میں "سراج" سے مراد سورج ہے کیونکہ بزم عالم اسی سے روشن ہے، جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے "تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا" (سورہ فرقان / ٦١) بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں برج بنائے ہیں اور ان کے درمیان روشن چراغ اور ضیاپاش چاند بنایا ہے۔ اور فرماتا ہے "اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا" (نوح / ١٥۔ ١٦) کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالی نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر کس طرح خلق فرمایا، چاند کو آسمانوں کے درمیان روشنی کا باعث اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا۔

"سورج" کو "چراغ" کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح چراغ اپنے تاریک ماحول کو روشن کرتا ہے اسی طرح سورج رات کی تاریکی کو روئے زمین سے کافور کر دیتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ رات چونکہ زمین کا سایہ ہوتی ہے اور سورج اس کے زوال کا سبب بنتا ہے اسی لئے اسے چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ (فِيْ فَلَكٍ دَائِرٍ وَّ سَقْفٍ سَائِرٍ وَّ رَقِيْمٍ مَّائِرٍ) جو گھومنے والے فلک، چلتی پھرتی چھت اور جنبش کھانے والی لوح میں ہے۔ ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان حرکت میں ہے، جبکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ستارے حرکت میں ہیں، تو دونوں کی حرکت ایک دوسرے کے منافی نہیں ہے۔

چند ضروری امور کی تشریح

ا۔ سب سے پہلی مخلوق کون ہے ؟

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا کی سب سے پہلی مخلوق کون یا کیا ہے ؟ چنانچہ اس بارے میں جتنی روایات اتنی باتیں ہیں، اسی لئے علما کا اس میں اختلاف ہے۔

حکما کا نظریہ: حکما (فلاسفہ) کہتے ہیں کہ اول مخلوق عقل اول ہے۔ عقل اول نے عقل ثانی اور فلک اول کو پیدا کیا ہے، اسی طرح سلسلہ عقل عاشر تک چلا جاتا ہے کہ عقل عاشر نے نویں فلک اور عناصر کے ہیولیٰ (خاکہ) کو پیدا کیا ،جبکہ ان فلاسفہ میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ وجود میں مؤثر تو صرف ذات خداوند ذوالجلال ہے، یہ عقول صرف اس کی ایجاد کے واسطے اور وسیلے ہیں۔

اگر اس نظریہ کو کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کے سراسر خلاف ہے۔

دیگر نظریات: فلاسفہ کے علاوہ دوسرے حضرات میں کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے "پانی" کو پیدا کیا، اس پر روضۃ الکافی میں موجود ایک روایت دلالت کر رہی ہے جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بیان کی گئی ہے جو آپؑ نے ایک شامی کے سوال کے جواب میں فرمائی تھی۔

تالیس ملطی (یا تالیس اسکندری) جس کا شمار مشاہیر فلاسفہ میں ہوتا ہے سے منقول ہے کہ اس نے عالم کیلئے صانع اول کی توحید کا اقرار کرنے اور اسے منزہ ماننے کے بعد کہا ہے "لیکن عالم کے صانع اول نے ایک عنصر ایجاد کیا جس نے تمام موجودات اور معلومات کو صورت سے نوازا، صانع اول نے اس کا نام "مبدع اول" رکھا، اور وہ عنصر ہے "پانی"۔ عالم کا ہر ایک جوہر اسی کے دم قدم سے معرض وجود میں آیا ہے، چاہے وہ آسمان و زمین ہوں یا ان کے مابین کی چیزیں اور وہ ہر "مبدع" کی علت ہے، ہر جسمانی عنصر سے مرکب کی علت ہے۔ اس لئے کہ پانی کے جمود سے زمین، اس کے حل ہو جانے سے ہوا، اس کی شفافیت سے آگ اور اس کے دھوئیں اور حرارت سے آسمان کا وجود عمل میں آیا"۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں: "اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ نظریہ اس نے توریت سے لیا ہے"۔ ایک قول یہ ہے کہ "سب سے پہلی مخلوق 'ہوا' ہے"۔ اور اسے علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں بھی روایت کیا ہے۔ اس کے بارے میں علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: "بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ انہوں نے کسی روایت سے لیا ہے لیکن وہ روایت ایسی ہے جو مستند کثیر روایات کی برابری نہیں کر سکتی اور اگر اس کی صحت کو بھی تسلیم کر لیا جائے، پھر بھی اسے 'پانی' کے تقدم اضافی پر محمول کیا جائے گا۔ اور چونکہ پانی سے اجسام محسوسہ وجود میں آئے ہیں کہ جنہیں ساری دنیا محسوس کرتی ہے اور ہوا ان قابل ادراک اجسام میں شامل نہیں لہذا اس کے وجود کو ایک جماعت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے"۔ ایک قول یہ ہے کہ "اولین مخلوق، آگ ہے"۔

نورِ محمدؐ سب سے پہلی مخلوق ہے!

بعض روایات میں ہے "اللہ نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ "نور" ہے"۔ جیسا کہ عیون الاخبار اور علل الشرائع میں ایک روایت ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: "حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے کسی شامی نے چند سوالات پوچھے ،ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟ تو آپؑ نے فرمایا: "نور کو"۔

بعض روایات میں ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت محمدؐ مصطفیٰ کے نور کو خلق فرمایا"۔ بعض اور روایات میں ہے

کہ : "اللہ تعالی نے آنحضرتؐ کے نور کے ساتھ ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کے نور کو خلق فرمایا"۔ جیسا کہ جابر (بن عبد اللہ) انصاری روایت کرتے ہیں، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالی نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق فرمایا، پھر اسی سے علیؑ کے نور کو جدا کیا، پھر عرش، لوح، سورج، دن کی روشنی، ابصار، عقل اور معرفت کے نور خلق فرمائے"۔ عامہ کی بعض روایات میں ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا "اللہ تعالی نے سب سے پہلے میری روح کو پیدا کیا"۔ اسی طرح انہی کی بعض روایات میں رسول خداؐ سے منقول ہے کہ: "خدا نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا"۔ بعض میں ہے کہ: "اللہ نے سب سے پہلے اولین مخلوق قلم کو بنایا"۔

شارحؒ فرماتے ہیں کہ: ان سب کو جمع کرنا ممکن ہے، اس لئے کہ عناصر و افلاک کی نسبت "پانی" کو اولین مخلوق مانا جائے "قلم" کو اس کی جنس یعنی ملائکہ کی نسبت پہلی مخلوق تسلیم جائے اور پیغمبر اکرمؐ کے نور اور آپؐ کی روح اولیہ حقیقیہ کو سب سے پہلی مخلوق تسلیم کیا جائے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ روایات میں مذکور عقل، نور اور قلم سے مراد بھی آپؐ ہی کا نور اقدس ہے۔

بعض عارفین (صدرائے شیرازی) اصول کافی کی پہلی حدیث جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ "جب اللہ تعالی نے عقل کو خلق فرمایا تو اسے قوت گویائی عطا کی پھر اسے فرمایا: "ادھر آ" وہ آگئی اور فرمایا "چلی جا" وہ واپس ہو گئی"۔ کے بارے میں فرماتے ہیں: "اے عرفانی قدموں کے ساتھ خدا کی راہوں کو طے کرنے والے بھائیو! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ عقل سب سے پہلی مخلوق ہے، اور خدا کی بنائی ہوئی مخلوق میں سے اس کے قریب ترین، پہلی، عظیم ترین اور مکمل ترین مخلوق ہے اور موجودیت کے لحاظ سے دوسری ہے۔ اس لئے کہ اول موجود تو ذات خداوند ذوالجلال ہے، البتہ اس کی نسبت اس کی مخلوق کے ساتھ نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے کہ اس کی وحدت، عددی نہیں ہے۔ تو بہر حال سب سے پہلی مخلوق عقل ہے، اسی بارے میں حضرت رسول خداؐ فرماتے ہیں: "سب سے پہلے اللہ نے عقل کو پیدا کیا"۔ ایک اور روایت کے مطابق: "سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا"۔ ایک اور روایت کے تحت سب سے پہلے اللہ نے میری روح کو پیدا کیا"۔ ایک اور روایت میں ہے: "اللہ نے سب سے پہلے قلم کو خلق فرمایا"۔ ایک اور روایت کے مطابق: "اللہ نے سب سے پہلے ملک کروبی کو خلق فرمایا"۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ایک ہی چیز کے مختلف اوصاف و صفات ہیں، ہر صفت کو بیان کر کے اس کیلئے علیحدہ موصوف بتایا گیا ہے۔ حالانکہ نام مختلف ہیں اور مسمیٰ ذات اور وجود کے لحاظ سے صرف ایک ہے اور وہ ہے ایک موجود حقیقی جس کا نام "روح اعظم" ہے جس کی طرف اللہ تعالی نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے: "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" (سورہ بنی اسرائیل / ۸۵) کہہ دے روح میرے رب کے امر میں سے ہے۔ اور فرمایا ہے: "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ" (سورہ اعراف / ۵۴) آگاہ ہو جاؤ کہ جہان کا پیدا کرنا اور اس کا انتظام کرنا اللہ کیلئے اور اس کے حکم سے ہے۔ اس کا نام "قلم" اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ قضا و قدر کے نفسانی الواح پر علوم و حقائق کی تصویر کشی کیلئے حق کی طرف سے ایک واسطہ ہے اور چونکہ یہ ایک ایسا وجود ہے جو تجسم و حجاب کی ظلمت سے پاک اور نقص و عدم کی تاریکیوں سے مبرا ہے اسی لئے اسے نور بھی کہتے ہیں، کیونکہ نور وجود ہے اور ظلمت عدم۔ اور وہ اپنی ذات کے لحاظ سے ظاہر اور دوسروں کو ظاہر کرنے والا ہے۔

چونکہ یہ علویہ اور سفلیہ نفوس کی اصل حیات و زندگی ہے لہذا اسے "روح" کہتے ہیں۔ اور بزرگ و محقق صوفیائے کرام کے

نزدیک یہ نام ہے "حقیقت محمدیہؐ" کا کیونکہ یہ ایک ایسا کامل وجود ہے کہ سب کی ابتداء اور انتہاء کا تعلق اسی کے ساتھ ہے......"۔

صدرا مرحوم کی تحقیق سے بھی اور ہماری مذکورہ تصریحات سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ کائنات کی سب سے پہلی مخلوق "نور محمدؐ" ہی ہے۔ اور اس بارے میں حضرات محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام کی طرف سے بیان ہونے والی احادیث بہت زیادہ ہیں، جن میں سے چند ایک کو ہم یہاں ذکر کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

محمدؐ و آل محمدؐ کے بارے میں نورانی احادیث

۱۔ بحار الانوار میں کافی سے نقل کیا گیا ہے کہ اسناد کے ساتھ محمد بن سنان روایت کرتے ہیں کہ: میں حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ اس دوران شیعوں کے درمیان (عقیدے کے) اختلاف کی بات چل نکلی، تو امامؑ نے فرمایا:

"محمد! خداوند عالم ازل ہی سے وحدہٗ لاشریک ہے۔ پھر اس نے محمدؐ، علیؑ اور فاطمہؑ کو خلق فرمایا! پس وہ ایک ہزار زمانے (غیر معینہ عرصے) تک رہے، پھر تمام مخلوق کو خلق فرمایا اور انہیں مخلوق کے پیدا ہونے کا منظر دکھایا، اس پر انکی اطاعت لازم قرار دی، اس کے امور ان کے سپرد کئے اور وہ خداوند عالم کی منشاء و مراد کے تحت جو چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام کر دیں۔

اے محمد! یہی وہ دین کا حصہ ہے کہ جو اس سے آگے بڑھے گا وہ برباد ہو جائے گا، جو پیچھے رہ جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اور جو اس سے ملا رہے گا وہ حق کو جا ملے گا۔ محمد! اسی عقیدے پر قائم رہو!"۔

۲۔ بحار الانوار ہی میں کتاب "مصباح الانوار" سے منقول ہے کہ اسناد کے ساتھ حضرت انسؓ جناب رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ: آنحضرتؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ (علیہم السلام) کو تخلیق آدمؑ سے بھی پہلے خلق فرمایا۔ اس وقت جبکہ نہ تو آسمان کی چھت تھی اور نہ زمین کا فرش تھا، نہ تاریکی تھی نہ روشنی، نہ سورج تھا نہ چاند، نہ دوزخ تھی نہ بہشت"۔ اس پر حضرت عباسؓ نے پوچھ لیا: "یارسول اللہؐ! آپؐ کی ابتدائی تخلیق کیونکر ہوئی؟" فرمایا: "عم بزرگوار! جب اللہ تعالیٰ نے ہماری تخلیق کا ارادہ کیا تو ایک کلمہ کے ساتھ تکلم فرمایا جس سے "نور" کی تخلیق ہو گئی، پھر ایک اور کلمہ ارشاد فرمایا جس سے "روح" خلق ہو گئی، پھر نور اور روح کو آپس میں ملا دیا جس سے میری، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کی تخلیق ہو گئی۔ پس ہم نے اس کی اس وقت تسبیح کی جبکہ تسبیح کا وجود نہیں تھا، اور ہم نے تقدیس کی جبکہ تقدیس کا نام و نشان نہ تھا۔ پس جب اللہ جل شانہٗ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو میرے نور کو شگافتہ کیا جس سے عرش کو پیدا کیا، پس عرش میرے نور سے ہے، میں خدا کے نور سے ہوں۔ میرا نور عرش کے نور سے افضل ہے۔

پھر میرے بھائی علیؑ کے نور کو شگافتہ کیا جس سے ملائکہ کو خلق فرمایا، پس ملائکہ علیؑ کے نور سے ہیں، علیؑ کا نور خدا کے نور سے ہے اور علیؑ ملائکہ سے افضل ہیں۔

پھر میری دختر زہراؑ کے نور کو شگافتہ کیا اور اس سے آسمان اور زمین پیدا کئے، پس زمین و آسمان فاطمہؑ زہرا کے نور سے ہیں۔ میری بیٹی فاطمہؑ کا نور خدا کے نور سے ہے اور فاطمہؑ زمین و آسمان سے افضل ہیں۔

پھر میرے بیٹے حسنؑ کے نور کو شگافتہ کیا، جس سے شمس و قمر پیدا کئے، اور شمس و قمر حسنؑ کے نور سے ہیں، حسنؑ کا نور خدا کے نور سے ہے اور حسنؑ شمس و قمر سے افضل ہیں۔

اور اس کے بعد میرے فرزند حسینؑ کے نور کو شگافتہ کیا جس سے جنت اور حور العین کو خلق فرمایا، پس جنت اور حور العین میرے بیٹے حسینؑ کے نور سے ہیں، حسینؑ کا نور اللہ کے نور سے ہے اور میرا بیٹا حسینؑ جنت اور حور العین سے افضل ہے۔"

۳۔ بحار الانوار ہی میں کتاب "الانوار" سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی دوسری چیز نہیں تھی، تو اس نے سب سے پہلے اپنے حبیب محمدؐ کے نور کو خلق فرمایا۔ پانی، عرش، کرسی، آسمان، زمین، لوح، قلم، جنت، جہنم، ملائکہ، آدمؑ اور حواؑ کی تخلیق سے ایک ہزار چار سو چوبیس سال قبل"۔ آپؑ سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں: "جب اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کے نور کو خلق فرمالیا تو وہ نور ایک ہزار سال تک خدا کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تسبیح و تقدیس کرتا رہا، اور حق تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت سے دیکھتا رہا اور کہتا تھا "اے میرے بندے! تو ہی مراد ہے اور تو ہی مرید ہے، تو میری مخلوق سے برگزیدہ ہستی ہے۔ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! اگر تم نہ ہوتے تو میں افلاک (کائنات) کو پیدا ہی نہ کرتا، جو تجھ سے محبت کرے گا اس سے میں محبت کروں گا، جو تجھ سے دشمنی کرے گا میری اس سے دشمنی ہوگی"۔ اس سے اس نور میں چمک پیدا ہوئی اور اس سے شعاعیں بلند ہوئیں تو اللہ نے ان شعاعوں سے یہ بارہ حجاب خلق فرمائے:

۱۔ حجاب قدرت	۲۔ حجاب عظمت
۳۔ حجاب عزت	۴۔ حجاب ہیبت
۵۔ حجاب جبروت	۶۔ حجاب رحمت
۷۔ حجاب نبوت	۸۔ حجاب کبریا (یا حجاب کرامت)
۹۔ حجاب منزلت	۱۰۔ حجاب رفعت
۱۱۔ حجاب سعادت	۱۲۔ حجاب شفاعت

پھر اللہ نے نورِ محمدؐ کو حکم دیا کہ حجاب قدرت میں چلا جائے، چنانچہ وہ اس کے اندر چلا گیا اور وہاں پر بارہ ہزار سال تک "سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْاَعْلىٰ" کہتا رہا پھر حکم ہوا کہ حجاب عظمت میں چلے جاؤ، وہاں چلا گیا اور وہاں گیارہ ہزار برس تک "سُبْحَانَ عَالِمِ السِّرِّ وَاَخْفىٰ" کہتا رہا پھر حجاب عزت میں جا کر دس ہزار سال تک "سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْمَنَّانِ" کہتا رہا۔ پھر حجاب ہیبت میں جا کر نو ہزار سال تک "سُبْحَانَ مَنْ هُوَ غَنِيٌّ لَا يَفْتَقِرُ" کہتا رہا۔

پھر حجاب جبروت میں جا کر آٹھ ہزار سال تک "سُبْحَانَ الْكَرِيْمِ الْاَكْرَمِ" کہتا رہا۔ پھر حجاب رحمت میں جا کر سات ہزار سال تک "سُبْحَانَ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ" کہتا رہا۔ پھر حجاب نبوت میں چھ ہزار برس تک "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ" کہتا رہا۔ پھر حجاب کبریاء میں پانچ ہزار سال تک "سُبْحَانَ الْعَظِيْمِ الْاَعْظَمِ" کہتا رہا۔

اس کے بعد حجاب منزلت میں چار ہزار سال تک "سُبْحَانَ الْعَلِیْمِ الْکَرِیْمِ" کہتا رہا۔ پھر حجاب رفعت میں جاکر تین ہزار سال تک "سُبْحَانَ ذِي الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوْتِ" کہتا رہا۔ پھر حجاب سعادت میں جاکر دو ہزار برس تک "سُبْحَانَ مَنْ یُزِیْلُ الْأَشْیَاءَ وَ لَا یَزَالُ" کہتا رہا۔ اس کے بعد حجاب شفاعت میں ایک ہزار سال تک "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ" کہتا رہا۔"

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "اللہ تعالی نے پھر محمدؐ کے نور سے نور کے بیس دریا پیدا کئے اور ہر دریا میں اس قدر علوم تھے جن کی تعداد کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر اللہ نے اس نور کو حکم دیا ان دریاؤں میں بالترتیب اترتے جاؤ، چنانچہ وہ مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ اترتا گیا؛

۱۔ بحر عزت ۲۔ بحر خشوع ۳۔ بحر تواضع ۴۔ بحر رضا ۵۔ بحر وفا ۶۔ بحر حلم ۷۔ بحر تقویٰ ۸۔ بحر خشیت ۹۔ بحر امانت ۱۰۔ بحر عمل ۱۱۔ بحر مزید ۱۲۔ بحر ہدیٰ ۱۳۔ بحر صیام ۱۴۔ بحر حیا.......... اسی طرح بیسویں دریا تک۔

جب ان دریاؤں سے باہر آیا تو خالق نے ارشاد فرمایا: 'اے میرے حبیب! اور اے میرے رسولوں کے سردار! اے میری اولین مخلوق! اے میرے آخری رسولؐ! تم ہی شافع روز محشر ہو!!' یہ سن کر وہ نور سجدے میں گر گیا، پیشانی پر پسینہ آیا جس کے قطروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی، تو اللہ نے ہر قطرے سے ایک نبی خلق فرمایا۔ اور جب انوار انبیاء کی تکمیل ہو گئی تو وہ نور محمدؐ کے اطراف طواف کرنے لگ گئے، جیسے حجاج کرام خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں، طواف کے دوران وہ خدا کی حمد و تسبیح یوں بیان کرتے تھے "سُبْحَانَ مَنْ هُوَ عَالِمٌ لَّا یَجْهَلُ سُبْحَانَ مَنْ هُوَ حَلِیْمٌ لَّا یَعْجَلُ سُبْحَانَ مَنْ هُوَ غَنِيٌّ لَا یَفْقَرُ" یعنی پاک ہے وہ عالم کہ جہالت جس کے نزدیک نہیں پھٹکتی، پاکیزہ ہے وہ حلیم جو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، منزہ ہے وہ بے نیاز جو محتاج نہیں ہوتا۔

اس پر اللہ تعالی نے انہیں پکارا اور فرمایا: "جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟" نور محمدؐ نے سب سے آگے بڑھ کر عرض کیا: 'أَنْتَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ رَبُّ الْأَرْبَابِ وَ مَلِكُ الْمُلُوْكِ' "تو ہی معبود برحق ہے، تیرے علاوہ کوئی بھی لائق عبادت نہیں تو واحد و لاشریک ہے، تمام ارباب کا رب ہے اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اتنے میں بارگاہ رب العزت سے آواز آئی: 'أَنْتَ صَفِیِّيْ وَ أَنْتَ حَبِیْبِيْ وَ خَیْرُ خَلْقِيْ أُمَّتُكَ خَیْرُ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ' "تو ہی میرا برگزیدہ ہے، تو ہی میرا حبیب اور مخلوق میں سب سے بہتر ہے۔ تیری امت، تمام امتوں سے بہتر ہے جو لوگوں کی ہدایت کیلئے پیدا کی گئی ہے۔

پھر اس کے بعد محمدؐ کے نور سے ایک جوہر خلق کیا گیا، جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے ایک حصے کی طرف خدا نے ہیبت کی نگاہ سے جو دیکھا تو وہ پگھل کر پانی ہو گیا اور دوسرے حصے کی طرف شفقت کی نگاہ سے جو دیکھا تو اس سے عرش کو خلق فرمایا جو پانی پر ٹھہر گیا، پھر عرش کے نور سے کرسی کو خلق فرمایا، کرسی کے نور سے لوح کو اور لوح کے نور سے قلم کو خلق کیا اور اس سے کہا: "میری توحید کو لکھ!" ۔ یہ سن کر قلم بے ہوش ہو گیا اور اس پر ایک ہزار سال تک غشی طاری رہی، جب غش سے افاقہ ہوا تو پروردگار عالم نے فرمایا: "لکھ!" اس نے کہا: "کیا لکھوں؟" فرمایا: "لکھ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ جب قلم نے اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ ابی و امی) سنا تو سجدے میں جا گرا اور کہا: "سُبْحَانَ اللّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ سُبْحَانَ الْعَظِیْمِ الْأَعْظَمِ"

پاک ہے واحد قہار خدا، منزہ ہے عظیم و عظیم ترین (خالق)۔ پھر اس نے اپنا سر سجدے سے اٹھایا اور لکھا "لَآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" قلم نے تحریر کرنے کے بعد عرض کیا: "پروردگار! یہ محمدؐ کون ہیں جن کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ اور جن کا ذکر اپنے ذکر کے ساتھ ملایا ہوا ہے؟" فرمایا: "قلم! اگر یہ نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا، میں نے تمام کائنات خلق ہی اسی کیلئے کی ہے، یہی تو بشیر و نذیر، سراج منیر اور شفیع و حبیب ہیں"۔ محمدؐ کے شیریں ذکر کو سن کر قلم شگافتہ ہو گیا اور کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ" (اللہ کے رسولؐ! آپؐ پر سلام) اللہ تعالی نے فرمایا (رسول اللہؐ نے فرمایا ہونا چاہئے تھا یا پھر رسولؐ کی طرف سے خدا نے جواب دیا ہوگا: از مترجم) "وَ عَلَيْكَ السَّلَامُ مِنِّيْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ" اسی وجہ سے سلام کرنا سنت اور جواب دینا فرض قرار پایا۔

پھر اللہ نے فرمایا: "قیامت تک کیلئے میری قضاو قدر اور جو میں خلق کروں گا لکھ دے"۔

اس کے بعد اللہ نے ملائکہ کو خلق فرمایا جو قیامت تک محمدؐ و آل محمدؐ پر صلوات اور امت محمدیہؐ کیلئے استغفار کرتے رہیں گے۔

پھر اللہ نے محمدؐ کے نور سے بہشت کو خلق فرمایا اور اسے چار چیزوں سے زینت بخشی تعظیم، جلالت، سخاوت اور امانت سے۔ اور اسے اپنے اولیاء و اطاعت گزاروں کیلئے مقرر فرمایا۔ پھر اللہ نے باقی جوہر کی طرف ہیبت کی نظر فرمائی تو وہ پگھل گیا جس کے دھوئیں سے اس نے آسمانوں کو اور جھاگ سے زمینوں کو خلق فرمایا جب اللہ تعالی نے زمین کو خلق فرمالیا تو وہ کشتی کی مانند ہچکولے کھانے لگی تو اللہ جل شانہٗ نے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں"۔

علی علیہ السلام سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "پھر اللہ تعالی نے ایک عظیم ترین طاقتور فرشتہ خلق فرمایا جو زمین کے اندر چلا گیا، لیکن اس کے پاؤں میں ٹھہراؤ نہیں تھا، اس لئے اس کے پاؤں کے نیچے ایک بہت بڑی چٹان خلق کی لیکن چٹان کیلئے سکون نہیں تھا اس لئے اس نے ایک بہت بڑا بیل خلق فرمایا جس کی عظیم جسامت اور آنکھوں کی چمک دمک کی وجہ سے کسی کو اس کی طرف دیکھنے کا یارا نہیں تھا۔ حتی کہ اگر روئے زمین کے سارے سمندر اس کے ایک نتھنے میں ڈال دیئے جائیں تو اس کیلئے ایسے ہوں جیسے کسی لق و دق صحرا میں پڑا ہوا رائی کا ایک دانہ چنانچہ وہ بیل اس چٹان کے اندر چلا گیا اور اسے اپنی پشت اور سینگوں پر اٹھالیا۔ اس بیل کا نام "لہوتا" ہے۔ چونکہ بیل کے پاؤں بھی ٹکنے میں نہیں آرہے تھے لہذا اس کیلئے اللہ تعالی نے ایک مچھلی پیدا کی جس کا نام "بہوت" ہے۔ مچھلی بیل کے پاؤں کے نیچے چلی گئی اور بیل کو اپنی پیٹھ پر اٹھالیا۔

گویا ساری زمین فرشتے کی پشت پر ہے، فرشتہ چٹان پر ہے، چٹان بیل پر ہے، بیل مچھلی پر ہے، مچھلی پانی پر ہے پانی ہوا پر ہے اور ہوا ظلمت (تاریکی) پر ہے۔ اب تاریکی کے بعد کیا ہے؟ اسے کوئی مخلوق بھی نہیں جانتی۔ پھر خداوند عالم نے عرش کو دو طرح کی ضیاؤں سے خلق فرمایا ایک کا نام "فضل" اور ایک کا نام "عدل" ہے۔ پھر ان دونوں دریاؤں کو حکم دیا کہ دو دو حصے ہو جائیں، چنانچہ ایسا ہوا جن سے چار چیزیں خلق فرمائیں ا۔ عقل ۲۔ حلم ۳۔ علم ۴۔ سخاوت۔ پھر اس نے عقل سے خوف کو، علم سے رضا کو، حلم سے مودت کو اور سخاوت سے محبت کو پیدا کیا۔ پھر ان تمام اشیاء کو حضرت محمدؐ مصطفی کی طینت میں گوندھا، پھر ان کے بعد امت محمدیہ کے مؤمنین کی ارواح کو خلق فرمایا اس کے بعد آفتاب، مہتاب، ستارے، رات، دن، روشنی اور تاریکی کو اور محمدؐ کے نور سے دیگر ملائکہ کو پیدا کیا۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "جب تمام انوار کی تکمیل ہو گئی تو محمدؐ کا نور عرش کے نیچے تہتر ہزار سال تک موجود رہا،

پھر اسے بہشت میں منتقل کر دیا جہاں پر وہ ستر ہزار برس تک موجود رہا، پھر اسے سدرۃ المنتہیٰ پر لے جایا گیا وہاں پر بھی وہ ستر ہزار سال تک موجود رہا، پھر وہاں سے اسے ساتویں آسمان کی طرف، پھر چھٹے آسمان، پھر پانچویں، پھر چوتھے، پھر تیسرے، پھر دوسرے اور پھر اسے آخری اور آسمان دنیا کی طرف منتقل کر دیا جہاں پر وہ اس وقت تک موجود رہا جب تک اللہ نے اسے آدمؑ میں منتقل نہیں کیا"۔

شارح کہتے ہیں: "اس حدیث میں اس بات پر تو واضح دلیل ہے کہ سب سے پہلی مخلوق حضرت محمد مصطفیؐ کا نور ہے، جبکہ اس میں موجود اکثر جملے متشابہات سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تاویل کو ائمہؑ ہی جانتے ہیں"۔

۴۔ ریاض الجنان میں ہے جابر جعفی کہتے ہیں، مجھ سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا" جابر! اللہ تھا اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، معلوم نہ ہی مجہول، تو سب سے پہلے اس نے اپنے نور عظمت سے حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھ ہم اہل بیتؑ کو خلق فرمایا، اور ہمیں اپنے سامنے سبز قسم کے سایہ میں ٹھہرائے رکھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نہ تو آسمان تھا نہ ہی زمین اور نہ مکان، نہ رات، نہ دن، نہ سورج اور نہ چاند ہمارا نور رب کے نور سے ایسے جدا کیا گیا جیسے سورج سے اس کی شعاعیں جدا ہوتی ہیں، ہم خدا کی تسبیح وتقدیس وحمد اور عبادت ایسے کرتے ہیں جیسے اس کی عبادت کا حق ہے"۔ امام محمد باقر علیہ السلام سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں! "پھر اللہ نے کون ومکان کو بنانا شروع کیا اسے خلق فرمانے کے بعد اس پر یہ تحریر کیا "لَآاِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ وَصِيُّهٗ بِهٖ اَيَّدْتُهٗ وَ نَصَرْتُهٗ" (یعنی لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ علیؑ مؤمنوں کے امیر اور پیغمبر کے وصی ہیں، میں نے پیغمبر کی تائید ونصرت علیؑ کے ذریعہ کی ہے)

پھر اللہ نے عرش کو خلق فرمایا اور اس کے سراپردوں پر بھی یہی لکھا، پھر آسمانوں کو پیدا کیا تو ان کے اطراف میں بھی یہی تحریر کیا، پھر جنت و جہنم کی تخلیق کی تو ان پر بھی یہی لکھا۔ پھر اس نے ملائکہ کو خلق فرمایا اور انہیں آسمانوں میں ٹھہرایا، پھر ہوا کی تخلیق کی تو اس پر بھی یہی لکھا۔ پھر جنوں کو پیدا کیا اور انہیں ہوا میں ٹھہرایا، پھر زمین کو پیدا کیا اور اس کے اطراف پر یہی تحریر کیا۔ تو اے جابر! اسی تحریر کی وجہ سے آسمان بغیر ستونوں کے قائم ہیں اور زمین اپنی جگہ پر برقرار ہے، پھر اللہ نے زمین کی کھال سے آدمؑ کو خلق فرمایا............ "۔ پھر فرمایا کہ: "ہم ہی اللہ کی اولین مخلوق ہیں، ہم ہی نے سب سے پہلے خدا کی عبادت اور تسبیح بیان کی، ہم ہی تخلیق کائنات کا سبب ہیں، ہماری ہی وجہ سے انسانوں اور ملائکہ نے تسبیح اور عبادت کی"۔

۵۔ جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ: "اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟" تو فرمایا: "جابر! وہ تمہارے نبی کا نور ہی تھا جسے اس نے خلق فرمایا، پھر اس کے بعد ہر نیکی اور خیر کو خلق فرمایا" تا آخر حدیث۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اخبار وروایات ہیں جو ایک محقق کو تلاش کرنے پر مل سکتی ہیں اور اس کتاب میں بھی مناسب مقام پر انہیں بیان کیا جائے گا۔

۲۔ ملکوت سماوی

حضرت امیر علیہ السلام نے اس خطبے میں زمین کی تخلیقی کیفیت کو بیان نہیں فرمایا اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ آیا اس کی تخلیق

آسمان کی پیدائش سے پہلے عمل میں آئی یا بعد میں ؟ اور ان کا اس چیز کو ذکر نہ کرنے کا سبب شاید یہ ہو کہ آپؑ کا مقصد و مدعا در اصل ذات رب ذوالجلال کی عظمت، قدرت اور کمال کو بیان کرنا تھا۔

چونکہ عالم امر و ملکوت کا معاملہ اس مقصد پر دلالت کیلئے زیادہ واضح اور نمایاں ہے اور عالم عناصر و ناسوت کی نسبت زیادہ روشن ہے اس لئے اسے ذکر کیا ہے۔ اگرچہ عالم عناصر و شواہد میں بھی فی نفسہٖ شواہد ربوبیت و دلائل قدرت اس قدر کثرت سے پائے جاتے ہیں جو حد و احصا سے خارج ہیں، بلکہ اس عالم میں اسرار الٰہیہ کے ایسے اجزا ہیں جن کے ادراک سے بشری طاقتیں عاجز ہیں، جیسا کہ خداوند متعال ارشاد فرماتا ہے "اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۤءِ مِنْ مَّاۤءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۤبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۤءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ" (بقرہ / ۱۶۴) آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، رات دن کے آنے جانے میں، انسانوں کے فائدے کیلئے دریا میں چلنے والی کشتیوں میں، خدا کی طرف سے آسمان سے نازل ہونے والے پانی میں جس کے ذریعہ خدا نے زمین کو موت کے بعد زندگی دی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان معلق ہیں، ان سب چیزوں میں (خدا کی ذات اور یکتائی) کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر رکھتے ہیں۔

البتہ نہج البلاغہ کے ۹۰ویں خطبے میں جسے "خطبہ اشباح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں تفصیل سے بتایا جائے گا کہ عالم عناصر یعنی زمین وغیرہ میں کس قدر آیات قدرت اور حکمت کے آثار تدبیر پائے جاتے ہیں۔

بہر صورت جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ملکوت سماوی کی عظمت اور ان کا خدا کی عظیم ترین آیات کا ہونا ہمارے مدعا کی واضح دلیل ہے اور زمین، سمندر، پہاڑ، اور عالم شہود کا ہر جسم سماوات الٰہی کے سامنے ایسے ہیں جیسے سمندر کے سامنے ایک قطرہ۔ صرف تعداد اور رقبے کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ کیفیات کے لحاظ سے بھی۔ یعنی شرافت وجود اور قوت فعلیہ کے لحاظ سے بھی۔ اسی لئے امامؑ نے اپنی آئندہ کی گفتگو میں بیشتر مقامات پر آسمانوں کے تذکرے کئے ہیں اور خداوند عالم نے آیات قرآنیہ میں سماوات و نجوم کے تذکرے کو بڑی عظمت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس بارے میں کس قدر آیات ہیں ؟ بس اتنا ہی سن لیں کہ سُوَرِ طِوال (بڑی سورتوں) میں کوئی ایسی سورت نہیں جو اس تذکرے سے خالی ہو اور سُوَرِ قِصار (چھوٹی سورتوں) میں سے اکثر اس ذکر سے مزین ہیں اور کتنے مقامات ایسے ہیں جہاں پر ان کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً فرماتا ہے :

"وَالسَّمَاۤءِ وَ الطَّارِقِ وَ مَا اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ" (سورہ طارق / ۱ تا ۳) قسم ہے آسمان اور رات کو کھٹکھٹانے والے کی اور تو نہیں جانتا کہ رات کو کھٹکھٹانے والا کیا ہے ؟ وہی درخشاں ستارہ۔

یا "وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا" (سورہ شمس / ۱ تا ۲) سورج اور اس کی روشنی پھیلنے کی قسم اور چاند کی قسم جبکہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔

یا "فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ" (سورہ تکویر / ۱۶) قسم ہے ان ستاروں کی جو پلٹ آتے ہیں، چلتے

ہیں اور نگاہوں سے چھپ جاتے ہیں۔

یا "وَالنَّجمِ اِذَاهَوىٰ" (سورہ النجم /۱) قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ غروب کرے۔

یا "فَلاَ اُقسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوم وَ اِنَّه لَقَسَمٌ لَوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیمٌ" (واقعہ / ۷۵، ۷۶) قسم ہے ستاروں کی جگہ اور ان کے محل طلوع و غروب کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ کہیں تو خدا آسمان کی قسم کھا رہا ہے اور کہیں پر اس کے اندر رزق اور اور دیگر موعودہ چیزوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَاتُوْعَدُوْنَ" (سورہ الذاریات / ۲۲) تمہاری روزی آسمان میں ہے اور وہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ جو لوگ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں ان کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے "وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ" (سورہ آل عمران / ۱۹۲) اور زمین و آسمان کی پیدائش کے اسرار میں غور و فکر کرتے ہیں۔ بہت سی آیات میں آسمانی امور میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اس سے روگردانی کرنے والوں کی نکوہش کرتا ہے: "وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ آيَاتِهَامُعْرِضُوْنَ" (سورہ انبیاء / ۳۲) اور آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا لیکن وہ اس وسیع آسمان میں موجود توحید کی نشانیوں سے روگرداں ہیں۔

تمام دریاؤں، زمینوں اور ہواؤں کو بھی ملا کر آسمان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، جبکہ ان میں بہت جلد تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن آسمان میں وقت مقررہ تک کیلئے صلابت، شدت اور حفاظت پائی جاتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالی نے اسے محفوظ چھت قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا" (سورہ انبیاء / ۳۲) اور آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا۔ نیز فرماتا ہے: "وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيْمٍ" (سورہ الحجر / ۱۷) اور اس کی ہر شیطان مردود سے حفاظت کی۔ اسی طرح فرماتا ہے: "وَبَنَيْنَافَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا" (سورہ انبیاء / ۱۲) تم پر ہم نے سات مستحکم آسمان بنائے۔ نیز فرماتا ہے: "ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّخَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ" (سورہ النازعات / ۲۷) کیا (موت کے بعد) تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی تخلیق؟

اللہ تعالی نے اسے چراغوں سے مزین فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ" (سورہ حمٓ سجدہ / ۱۲) اور ہم نے نچلے آسمان کو (ستاروں کے) چراغوں سے مزین کیا۔

اسے چاند سے زینت بخشی ہے، ملاحظہ فرمایئے: "وَ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا" (سورہ نوح / ۱۶) اور چاند کو آسمان کے درمیان روشنی کا باعث بنایا۔

اسے سورج کے ساتھ زینت دی ہے، فرمایا: "وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا" (سورہ نوح / ۱۶) اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا ہے۔

اسے عرش کے ساتھ زینت عطا کی ہے، جیسے: "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ" (سورہ توبہ / ۱۲۹) وہ عرش عظیم کا پروردگار اور مالک ہے۔

کرسی کے ساتھ مزین کیا ہے، جیسے: "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَ الأَرْضَ" (سورہ بقرہ / ۲۵۵) اس کی حکومت

کی کرسی آسمانوں اور زمینوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

لوح کے ساتھ زینت دی ہے مثلاً "فِي لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" (سورہ بروج / ۲۲) جو لوح محفوظ میں موجود ہے۔

قلم کے ساتھ جیسے: "نٓ وَ الْقَلَمِ" (سورہ قلم / ۱) (ن) قسم ہے قلم کی۔

وقت کے ساتھ، جیسے: "فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ" (سورہ حٰمٓ سجدہ / ۱۲) اس وقت انہیں سات آسمانوں کی صورت میں بنایا۔

قدر کے ساتھ، مثلاً: "فَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ" (سورہ یونس / ۵) اس کیلئے منزلیں مقرر کی ہیں۔

وحی اور امر کے ساتھ، جیسے: "وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا" (سورہ حٰمٓ سجدہ / ۱۲) اور وہ اللہ جو کچھ چاہتا تھا ہر امر آسمان میں بنایا۔

حکمت کے ساتھ، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے کہ اس کی تخلیق صحیح اور عظیم اغراض و مقاصد کے تحت عمل میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (سورہ آل عمران / ۱۹۱) اے خدا! تو نے اسے فضول پیدا نہیں کیا۔ "وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (سورہ ص / ۲۷) اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کیا، یہ تو کافروں کا گمان ہے۔

آسمان کو اعمال کے صعود کا اور انوار کے نزول کا مقام بنایا ہے، یہ دعاؤں کا قبلہ ہے، چمک دمک اور روشنیوں کا مرکز ہے۔ اس کے رنگ حسین ترین ہیں، جبکہ وہ نورانیت سے معمور ہے، اس کی حسین ترین شکلیں ہیں جبکہ خود گول ہے، اس کے ستارے شیاطین کیلئے تیر کی حیثیت رکھتے اور بحر و بر کی تاریکیوں میں رہروان منزل کیلئے رہنما کا کام دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: "وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ" (سورہ نحل / ۱۶) اور بوقت شب وہ لوگ ستاروں کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں۔ آفتاب عالم تاب کیلئے طلوع کا وقت مقرر کیا ہے تاکہ اس میں ضروریات زندگی کو تلاش کیا جائے۔ اور غروب کا وقت مقرر کیا ہے تاکہ دن بھر کی تھکاوٹ کو دور کیا جائے، آرام و سکون کے لحات میں آرام و استراحت کی جائے۔ قوت و طاقت کو بحال کیا جائے اور غذا کو اعضاء تک بہم پہنچایا جائے۔ اگر طلوع شمس کا عمل نہ ہو تو روئے زمین پر موجود تمام پانی برف بن جائے، برودت غالب آجائے، دنیا جہان کا نظام ٹھپ ہو کر رہ جائے اور اگر غروب آفتاب کا عمل واقع نہ ہو تو زمین تانبے کی بن جائے اور اس پر موجود ہر چیز جل کر بھسم ہو جائے، اور حیوان و انسان کا نام و نشان تک نہ رہے۔ یہ ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جسے ہر گھر کیلئے بقدر ضرورت روشن کیا جاتا ہے پھر اسے وہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے تاکہ اہل خانہ آرام و استراحت کریں۔ گویا نور اور ظلمت اپنے فطری تضاد کے باوجود روئے زمین کیلئے مفید ہونے میں ایک دوسرے کے ہمکار اور مددگار ہیں۔ سورج کے عروج و زوال کو خداوند تعالیٰ نے چاروں موسم (سرما، گرما، بہار، خزاں) کے وجود کا سبب بنایا ہے۔

چاند کی صورت حال یہ ہے کہ وہ سورج کا پیروکار اور اس کا خلیفہ و جانشین ہے، اسی کے ذریعہ سال اور حساب کے اعداد معلوم کئے جاتے ہیں، شرعی اوقات کو منظم کیا جاتا ہے۔ کھیتیاں اور نباتات اس سے پروان چڑھتے ہیں، اللہ نے اس کے طلوع و غروب میں بھی مصلحت قرار دی ہے۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل سے آپ اس کے مناسب موقع پر آگاہ ہو سکیں گے۔

زمین کی تخلیقی کیفیت : ہم دراصل بات کر رہے تھے کہ زمین کی تخلیقی کیفیت کیا ہے ؟ کیسے اور کس چیز سے اس کی تخلیق عمل میں آئی ؟ آیا اس کی ایجاد آسمانوں سے پہلے ہوئی ہے یا بعد میں ؟ تو ہم ان سب سوالوں کا ہم تفصیل سے جواب دیں گے۔

چنانچہ جہاں تک اخبار و روایات کا تعلق ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل پانی کی وہ جھاگ ہے جسے اللہ نے فضا میں خلق فرمایا اور جس جھاگ کی طرف حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے خطبے میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ فرمایا (فَرَمٰی بِالزَّبَدِ رُکَامَهٗ) اس بارے میں احادیث اس کثرت سے موجود ہیں جو حد تواتر تک جا پہنچتی ہیں۔ ہم یہاں پر ان میں سے چند ایک کو بیان کرتے ہیں :۔

ا۔ تفسیر امام علیہ السلام میں حضرت امیرؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ حضرت رسول خداؐ نے اللہ تعالی کے اس قول "اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا" (سورہ بقرہ / ۲۲) وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا۔ کے بارے میں ارشاد فرمایا : "جب اللہ تعالی نے پانی کو خلق فرمایا تو زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے اس کا عرش پانی پر قرار دیا، اسی بارے میں ہی خداوند عزوجل کا ارشاد گرامی ہے : "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ "(سورہ ہود / ۷) وہ ایسی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں خلق فرمایا اور اس کا عرش قدرت پانی پر تھا۔ یعنی آسمان و زمین کو پیدا کرنے سے پہلے پانی کا عرش اسی پر ہی تھا، پھر اس نے ہواؤں کو بھیجا جو پانی پر چلتی رہیں اور پانی میں تھپیڑے پیدا ہوئے، ان سے بخارات اٹھے، پھر ان بخارات سے دھواں بنا اور جھاگ پر غالب آگیا، چنانچہ دھوئیں سے ساتوں آسمان بنائے گئے اور جھاگ سے ساتوں زمینوں کا وجود عمل میں آیا اور زمین پانی پر پھیل گئی، پانی کو صفا پر رکھا گیا، صفا کو مچھلی پر، مچھلی کو بیل پر اور بیل کو اس چٹان پر کھڑا کیا گیا جس چٹان کے بارے میں لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کے موقعہ بیان فرماتے ہوئے کہا "يٰبُنَيَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ "(سورہ لقمان / ۱۶) اے بیٹا! اگر رائی کے دانے کے برابر نیک یا بد عمل ہو اور وہ پتھر کے دل میں یا آسمان و زمین کے گوشہ میں قرار پائے تو اللہ قیامت میں انصاف کیلئے لائے گا۔ چٹان کو "ثریٰ" پر قرار دیا اور تحت الثریٰ کے بارے میں خدا کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ اور جب اللہ نے زمین کو بنایا تو اسے خانہ کعبہ کے نیچے سے بچھانا شروع کیا اور پانی پر بچھا دیا پھر اس نے ہر چیز کو اپنے دائرے میں لے لیا۔

یہ کیفیت اپنے اندر پا کر زمین فخر کرنے لگی اور کہنے لگی میں نے ہر چیز کو گھیرا ہوا ہے، مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟ اور مچھلی کے ہر ایک کان میں سونے کی زنجیر تھی جس کا ایک حصہ عرش کے ساتھ ملا ہوا تھا، اللہ نے مچھلی کو حکم دیا، اس نے انگڑائی لی تو زمین اپنے تمام متعلقین کے ساتھ یوں لرزنے لگی جیسے کشتی سمندر کی طوفانی لہروں میں لرزنے لگتی ہے، اس پر مچھلی فخر کرنے لگی اور کہنے لگی میں اس زمین پر غالب آئی ہوں جو ہر چیز پر غلبہ کئے ہوئے ہے۔ اب مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟ اس پر خداوند عالم نے پہاڑ پیدا کر کے اس میں گاڑ دیئے جس سے زمین بوجھل ہو گئی اور مچھلی ہلنے جلنے سے رک گئی۔

یہ صورت حال دیکھ کر پہاڑ کے اندر غرور پیدا ہو گیا کہ میں تو اس مچھلی پر غالب آیا ہوں جو زمین پر قابو پا چکی تھی۔ مجھ پر

کون غلبہ پا سکتا ہے ؟اس پر اللہ تعالیٰ نے لوہے کو خلق فرمایا جس نے پہاڑ کو کاٹ ڈالا، نہ تو پہاڑ اسے روک سکا اور نہ ہی اپنا بچاؤ کر سکا۔ جس پر لوہے میں غرور پیدا ہو گیا کہ میں تو اس پہاڑ پر غالب آیا ہوں جو مچھلی پر حاوی ہو چکا تھا، مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟اس پر خداوند متعال نے آگ کو پیدا کر دیا جس نے لوہے کو نرم کر کے اس کے حصے بخرے کر دیئے، لوہے میں نہ تو بچاؤ کی قدرت تھی اور نہ اسے روک سکا یہ صورت دیکھ کر آگ نے فخر کرنا شروع کر دیا کہ میں تو اس لوہے کو موم کر چکی ہوں جس نے پہاڑ کو قابو میں لے لیا تھا، مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟ جس پر خالق عزوجل نے پانی کو خلق فرمایا جس نے آگ کو بجھا دیا اور وہ نہ تو اسے روک سکی اور نہ ہی اپنا دفاع کر سکی۔ اس کیفیت پر پانی میں غرور و مستی پیدا ہو گئی اور کہنے لگا میں تو آگ جیسی ظالم چیز پر غالب آیا ہوں جس نے لوہے کو پگھلا دیا تھا، مجھ پر کون غلبہ پا سکتا ہے ؟اس کی غرور آمیز کیفیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا کیا جس نے اسے خشک کر کے رکھ دیا، اس پر ہوا میں غرور ہو گیا کہ میں پانی پر غالب آئی ہوں جس نے آگ کو بھی بجھا دیا مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟اس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق فرمایا، جس نے ہواؤں کے رخ موڑ دیئے، اب انسان کے دل میں غرور پیدا ہو گیا کہ میں تو ہوا پر بھی غالب آ گیا جو پانی پر غالب آچکی تھی مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟اس پر اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو پیدا کیا جو انسانوں کی روح قبض کرنے لگا، اب ملک الموت کے دل میں غرور پیدا ہوا کہ میں تو انسانوں پر غالب آ گیا ہوں جو ہر شئے پر غالب تھے، اب مجھ پر کون غالب آسکتا ہے ؟اس پر اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا "میں ہی ہوں سب پر قاہر و غالب اور وہاب میں تجھ پر بھی غالب ہوں اور کائنات کی ہر چیز پر غالب ہوں" یہی مقصد ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کہ "اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ" (سورۂ ہود / ۱۲۳) تمام امور کی بازگشت اس کی طرف ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب : یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ روایت اور بعد میں آنے والی دوسری روایات جو زمین کی تخلیق کا آغاز جھاگ سے ظاہر کرتی ہیں، کافی کی اس روایت کے منافی ہیں جو محمد بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے امام محمد باقر علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ : "ہر چیز پانی پر تھی اور اس کا عرش پانی پر ہی تھا، پھر خداوند عزوجل نے پانی کو حکم دیا اور وہ آگ بن کر بھڑک اٹھا، پھر اللہ نے آگ کو حکم دیا تو وہ بجھ گئی، اس کے بجھتے ہی دھواں سا اٹھا جس سے خداوند عزوجل نے آسمان پیدا کئے اور اس راکھ سے اللہ نے زمین بنادی، پھر آگ، ہوا اور پانی میں خصومت شروع ہو گئی، پانی نے کہا "میں خدا کا بہت بڑا لشکر ہوں" آگ نے کہا "میں...... ہوں" اور ہوا نے کہا "میں...... ہوں"۔ اس پر اللہ نے ہوا کی طرف وحی کی کہ "تو ہی میرا بڑا لشکر ہے!"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق "راکھ" سے ہوئی ہے! تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کو مجلسی مرحوم کی بیان کردہ روایات کے ساتھ جمع کرنا ممکن ہے اور وہ یہ کہ راکھ بھی اس زمین کا حصہ بن گئی تھی جو زمین جھاگ سے ملا کر وجود میں آئی۔ اور راکھ سے ملی ہوئی جھاگ کو جا کر ٹھوس کر دیا گیا جس سے زمین معرض وجود میں آئی۔ یا راکھ سے بنی ہوئی زمین سے وہ زمین مراد ہے جو بچھائے جانے کے بعد بچ رہی۔ واللہ اعلم۔

آیا زمین پہلے خلق ہوئی یا آسمان ؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا زمین کی تخلیق پہلے عمل میں آئی یا آسمان کی ؟ تو جو بات زیادہ مشہور اور واضح ہے وہ یہ کہ

زمین کو آسمان سے پہلے خلق کیا گیا۔ جبکہ بعض لوگوں کا کمزور سا نظریہ یہ ہے کہ آسمان کی تخلیق پہلے عمل میں آئی، مگر یہ کوئی زیادہ اہم نظریہ نہیں ہے، کیونکہ ظاہری آیات اور بڑی حد تک روایات بھی اس نظریہ کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں چند ایک آیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

ا۔ "هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ "(سورہ بقرہ / ۲۹) وہ خدا جس نے زمین کی تمام نعمتوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

۲۔ "قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ "(سورہ حم سجدہ / ۸ تا ۱۲) کہہ دے کہ کیا تم اس ذات کا کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں خلق فرمایا اور اس کیلئے نظیر و مثل بناتے ہو؟ وہ تو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس نے زمین میں پہاڑ بنائے، اس میں برکت عطا فرمائی اور اس میں غذائی مواد رکھا یہ سب کچھ چار دنوں میں ہوا، یہ غذائی مواد ضرورت مندوں کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ پھر آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا جبکہ وہ دھوئیں کی صورت میں تھا، پس آسمان و زمین کو حکم دیا کہ وجود میں آئیں اور صورت اختیار کریں، خواہ ازروئے اطاعت، خواہ مجبور ہو کر تو انہوں نے کہا: ہم اطاعت کرتے ہیں (وجود میں آتے ہیں) تو اس وقت انہیں سات آسمانوں کی صورت میں بنایا۔

علامہ جار اللہ زمخشری "ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "اس کا معنی یہ ہے کہ زمین کے خلق کرنے کے بعد اس کی حکمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ دھوئیں سے آسمان کو پیدا کیا جائے، چنانچہ کہا یہ جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا، پھر پانی سے دھواں پیدا کیا گیا جو پانی کے اوپر چھا گیا اور اس پر بلند ہو گیا پھر پانی کو خشک کر دیا اور اس سے ایک زمین کو بنایا۔ پھر اسے شگافتہ کیا تو اس سے کئی زمینیں بنائیں، پھر اوپر تنے ہوئے دھوئیں سے آسمان کو خلق فرمایا"۔

تفسیر مجمع البیان میں عکرمہ کے ذریعہ حضرت عبداللہ بن عباس رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں، آنحضرتؐ فرماتے ہیں: "خداوند متعال نے زمین کو اتوار اور پیر کے دن پیدا کیا، پہاڑوں کو منگل کے روز اور بدھ کے دن درخت، پانی، آبادی اور بربادی کو خلق فرمایا، یہ چار دن تو ایسے ہوئے۔ پھر (پانچویں دن) جمعرات کے روز آسمان کو بنایا، سورج، چاند، ستارے، ملائکہ اور آدمؑ کو خلق فرمایا"

یہ آیت جو سورہ نازعات میں ہے کہ "ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا "(سورہ النازعات / ۲۷ تا ۳۰) کیا (موت کے بعد) تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی تخلیق جس کی اللہ نے بچادر کھی؟ اس کی چھت کو بلند کیا پھر اسے منظم کیا۔ اس کی رات کو تاریک اور دن کو آشکار کیا، اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ زمین کو، آسمانوں کی تخلیق کے بعد پیدا کیا گیا، جیسا کہ بعض ملحدین کو اس بارے میں شکوک و

شبہات پیدا ہوتے ہیں اور اس سے وہ یہ باور کراتے ہیں کہ یہ آیت سابقہ آیات کے منافی ہے۔ لیکن اگر آیت میں غور کیا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ اس میں آسمان کے بعد زمین کے بچھانے کا تذکرہ ہے نہ یہ کہ اسے آسمانوں کے بعد خلق کیا گیا ہے۔ البتہ زمین کا آسمان کی تخلیق کے بعد بچھایا جانا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اسے آسمانوں سے پہلے پیدا کیا گیا ہے۔ اس بارے میں ایک اور روایت پر توجہ فرمایئے :۔

علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ :"اللہ تعالیٰ نے آسمان کے بعد زمین کو بچھایا، حالانکہ وہ اس سے پہلے خلق ہو چکی تھی۔ اور اس وقت وہ خانہ کعبہ کے نیچے ایک عظیم ٹیلے کی مانند اکٹھا تھی، جسے بعد میں سطح آب پر بچھا دیا گیا"۔

اس کا ایک اور جواب بھی دیا جاتا ہے کہ لفظ "بعد" تاخّر زمانی کیلئے نہیں آتا اور اس آیت میں تخلیق کائنات کی زمانی ترتیب نہیں بتائی جارہی بلکہ خدا کی نعمتوں کو بتایا اور یاد دلایا جارہا ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ "میں نے تمہیں فلاں فلاں چیز دی، فلاں فلاں بھلائی کی،...... پھر کہے ...... اس کے بعد میں نے تمہارے ساتھ محبت کی"۔ بعض اوقات الفاظ میں زمانی لحاظ سے تقدم و تاخر ہوتا ہے لیکن اس سے مراد زمان اور مکان کی تاخیر یا تقدیم نہیں ہوتی، بلکہ مراد صرف نعمتوں کا بیان کرنا اور ان کی طرف توجہ دلانا ہوتی ہے۔ اور بعض صورتوں میں حال کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ کلام کو اسی انداز میں بیان کیا جائے۔

اب رہی بات روایات کی، تو اس سلسلے میں بہت بڑی تعداد میں یہ روایات موجود ہیں :۔

۱۔ بحار الانوار میں کافی سے سلام بن مستنیر کے اسناد کے ساتھ روایت کو نقل کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا :"اللہ تعالیٰ نے جہنم کو پیدا کرنے سے پہلے بہشت کو، معصیت سے پہلے طاعت کو، غضب سے پہلے رحمت کو، شر سے پہلے خیر کو، آسمان سے پہلے زمین کو، موت سے پہلے حیات کو، چاند سے پہلے سورج کو اور تاریکی سے پہلے روشنی کو خلق فرمایا"۔

علامہ مجلسیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ شاید طاعت کو خلق کرنے سے مراد اس کی تقدیر ہے، یعنی اسے مقدر کر دیا۔ بلکہ اس حدیث میں اکثر مقامات پر بظاہر خلق سے مراد مقدر کرنا ہے، اور عام طور پر ایسا ہوتا ہی ہے اور شر کے خلق کرنے سے مراد شر کے وہ ظاہری اثرات ہیں جو اس کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں اگرچہ کہ اس کی طرف سے خیر ہی ہوتی ہے۔ اور اس کا وجود بہتری ہی ہے۔

۲۔ تفسیر صافی میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابرش نے سوال کیا کہ خداوند عالم فرماتا ہے :"أَوَلَمْ يَرَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا "(سورہ انبیاء / ۳۰) کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین ملے ہوئے تھے ہم نے انہیں جدا کر دیا۔ اس آیت میں "فتق" اور "رتق" سے کیا مراد ہے ؟ تو امامؑ نے فرمایا :"خداوند عالم جیسا کہ خود اپنے متعلق فرماتا ہے کہ اس کا عرش پانی پر تھا، اور پانی ہوا کے دوش پر سوار تھا۔ اور ہوا غیر محدود تھی، ان کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی، پانی بہت شیریں اور خوشگوار تھا۔ جب اللہ نے زمین کو خلق کرنا چاہا تو ہوا کو حکم دیا کہ پانی کو اپنی ضربیں مارے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا جس سے موجیں اٹھنے لگیں، موجوں کے آپس میں ٹکرانے سے اس قدر جھاگ پیدا ہوئی کہ سب ایک جگہ بیت اللہ کے مقام پر جمع کر دی گئی۔ پھر اللہ نے اسے جھاگ کا ایک پہاڑ بنا دیا پھر اس بیت اللہ کے نیچے سے زمین کو سطح آب پر پھیلا دیا،

اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اِنَّ اَوَّلَ بَیتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِی بِبَکَّۃَ مُبٰارَکاً" (سورہ آلِ عمران / ۹۶) پہلا گھر جو لوگوں (اور خدا سے تضرع و خضوع) کیلئے مقرر کیا گیا وہ سر زمینِ مکہ میں ہے، جو بابرکت ہے۔

پھر جب تک خدا نے چاہا، معاملہ رکا رہا، اس کے بعد آسمان کی تخلیق کا ارادہ کیا تو ہوا کو حکم دیا کہ پانی کو اپنی ضربیں مارے تو اس نے اسے ضربیں مارنا شروع کر دیں حتیٰ کہ اس میں جھاگ پیدا ہو گئی اور اس جھاگ اور موجوں کے درمیان سے اک ایسا دھواں اٹھا جو آگ کے بغیر تھا۔ اسی دھویں سے خداوندِ تعالیٰ نے آسمان کو خلق فرمایا اور اس میں برج، ستارے، سورج اور چاند کی منزلیں قرار دیں اور انہیں فلک میں چلانا شروع کر دیا، اور پانی کے رنگ پر آسمان کا رنگ بھی سبز تھا اور شیریں پانی کے رنگ پر زمین کا رنگ بھی نیلا تھا زمین و آسمان دونوں اپنی اپنی جگہ پر جڑے ہوئے تھے۔ ان میں کسی جگہ پر کوئی دروازہ نہیں تھا۔ یعنی نہ تو آسمان کیلئے دروازہ تھا کہ اس سے بارش برسے اور نہ ہی زمین کیلئے دروازہ تھا کہ اس سے کوئی نباتات اگے۔ پھر اس نے آسمان سے بارش نازل کر کے اس میں دروازہ کھول دیا اور زمین سے نباتات اگا کر اس میں دروازہ قائم کر دیا۔ اسی بنا پر خدا فرماتا ہے: "اَوَلَمْ یَرَالَّذِینَ .... "

اس روایت کو شارح بحرانیؒ نے حضرت امام محمد باقرؑ کی طرف منسوب کیا ہے شاید انہیں کوئی سند ملی ہو گی جس کی بنا پر انہوں نے امامؑ کی طرف نسبت دی جو ہمیں نہیں مل سکی۔

۳۔ ایک روایت روضۃ الکافی میں ہے جو آگے چل کر بیان ہو گی۔

۳۔ آسمان کی تخلیق جھاگ سے ہے یا دھوئیں سے ؟

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے فرمان سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ آسمان کو کف آب (جھاگ) سے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ آپؑ اسی خطبہ میں فرما چکے ہیں (وَرَمیٰ بِالزَّبَدِرُکَامُہٗ فَسَوّیٰ مِنْہُ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ) لیکن سابقہ آیت اور پیغمبر خداؐ کی حدیث جو حضرت علیؑ کے ذریعہ مروی ہے اور محمد بن مسلم کے ذریعہ روایت کی جانے والی حدیث اور دیگر روایات سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ "آسمان کو دھوئیں سے پیدا کیا گیا ہے"۔

شارح بحرانیؒ نے ان دونوں کو ان الفاظ کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی ہے "امامؑ کے اس کلام اور قرآن مجید کے الفاظ کو آپس میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے اس فرمان کے ذریعہ جمع کریں گے جو آپؑ نے فرمایا کہ: "اس موج اور جھاگ سے آگ کے بغیر دھواں اٹھا، جس سے اللہ تعالیٰ نے آسمان کو خلق فرمایا" اور اس بات میں بھی شک نہیں کہ قرآن مجید نے "دخان" یعنی دھوئیں کے لفظ سے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا۔ کیونکہ حقیقی معنی میں دھواں وہ ہوتا ہے جو آگ سے اٹھے، جبکہ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ دھواں آگ سے نہیں تھا۔ بلکہ پانی کے سانس لینے اور اس کی موجوں میں تغیر پیدا ہونے کی وجہ سے اٹھا، جو در حقیقت استعارہ ہے پانی سے اٹھنے والے بخارات سے، اور جب بات یہاں تک ثابت ہو جاتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "امامؑ کا کلام قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔ وہ یوں کہ جھاگ دراصل وہ بخارات ہوتے ہیں جو پانی کی حرکت کی وجہ سے سطح آب پر جھاگ کی صورت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور جب تک ان پر کثافت غالب رہتی ہے تو وہ سطح آب سے جدا نہیں ہو پاتے اور جھاگ کی صورت میں اس پر تیرتے

رہتے ہیں لیکن جو بخارات لطیف ہوتے ہیں اور ان پر اجزائے ہوائی غالب رہتے ہیں تو وہ پانی سے جدا ہو کر بخارات کے نام سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ اب جبکہ جھاگ بھی بخارات ہیں اور قرآن کریم کی مراد بھی بخارات ہیں، تو آپؑ کا اور قرآن پاک کا مقصد ایک ہو گیا۔ جو بخارات پانی سے جدا ہو گئے تو ان سے آسمان بنا اور جو بخارات پانی سے جدا نہیں ہوئے ان سے زمین بنی۔ بخارات اور دخان (دھوئیں) میں کونسی وجہ مشابہت ہے جس کے ذریعہ بخارات کو دھواں کہا جا سکتا ہے؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو حسی ہے جو دیکھنے والے کو بظاہر نظر آتی ہے کہ دھواں اور بخارات ایک جیسے ہوتے ہیں، دوسری معنوی، یعنی بخارات پانی کے ایسے اجزا ہیں جو حرکت کی حرارت کی وجہ سے اپنے لطیف ہونے کی بنا پر ہوا میں مل جاتے ہیں، جبکہ دھواں بھی اسی طرح ہوتا ہے لیکن وہ آگ کی حرارت سے پیدا ہوتا ہے البتہ دھوئیں میں بھی پانی کے اجزا ہوتے ہیں جو جلنے والی چیز سے جلتے وقت جدا ہوتے ہیں۔ اب ان دونوں (بخارات اور دھوئیں) میں اختلاف صرف اور صرف سبب کا ہے اور کسی چیز کا نہیں، لہذا ایک کے اوپر دوسرے کے نام کا اطلاق صحیح ہے"۔

شارحؒ کہتے ہیں کہ: یہ توجیہ نہایت ہی وجیہ اور لائق توجہ ہے البتہ یہ کلینیؒ کی اس روایت کے منافی ہے جو انہوں نے روضہ الکافی میں ذکر فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں: محمد بن عطیہ اسناد کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ: "شام سے ایک شخص حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا: اے ابو جعفرؑ! میں آپؑ کے پاس ایک مسئلہ کے حل کیلئے حاضر ہوا ہوں جس نے مجھے بڑی حد تک عاجز کر دیا ہے، مجھے کوئی ایسا شخص نہیں مل پایا جس نے اس کی صحیح تفسیر کی ہو۔ میں نے اس بارے میں تین طرح کے لوگوں سے سوال کیا، ہر ایک نے اپنی اپنی بات کی۔ امامؑ نے فرمایا: "پوچھنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے کہا: مجھے یہ بتایئے کہ اللہ نے سب سے پہلے کونسی مخلوق پیدا کی؟ میں نے جب یہ سوال ان سے کیا تو کسی نے کہا: قدر ہے، کسی نے کہا: قلم ہے اور کسی نے کہا: روح ہے"۔ امامؑ نے فرمایا: "انہوں نے تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں بتاتا ہوں، لو سنو! یقیناً اللہ تھا اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا وہ عزیز (عزت والا) تھا اس سے پہلے کوئی بھی صاحب عزت نہیں تھا۔ اس کے بارے میں خداوند عزوجل فرماتا ہے: "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ" (سورہ الصافات / ۱۸۰) تیرا پروردگار ان کی توصیفوں سے جو وہ کرتے ہیں پاک و منزہ ہے۔ وہ خالق، مخلوق سے پہلے تھا اور اگر اس کی مخلوق میں سے کوئی چیز اس سے پہلے ہوتی تو وہ چیز بھی اور جس سے وہ عمل میں آئی ہے وہ بھی ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوتیں اور ان کے ہوتے ہوئے خدا ان سے مقدم نہ ہو سکتا۔ لیکن وہ تو اس وقت سے ہے جب کوئی بھی شئے نہیں تھی اور اس نے ایک ایسی چیز پیدا کی کہ باقی تمام اشیاء کا وجود اس کا مرہون منت ہے اور وہ ہے پانی جس سے روئے زمین کی دوسری چیزیں پیدا کی ہیں اور ہر چیز کی نسبت اسی کی طرف دی گئی ہے جبکہ پانی کی نسبت کسی چیز کی طرف نہیں دی گئی۔ ہوا کو بھی پانی سے پیدا کیا، پھر اسے پانی ہی پر مسلط کر دیا جس نے پانی کے متن کو چیر کر رکھ دیا، اور پانی سے جھاگ ابھر کر اس کی سطح پر آ گیا اور جتنا خدا نے چاہا اتنا ہی اوپر آیا، جس سے اللہ نے یہ سفید زمین خلق فرمائی۔ صاف ستھری ایسی کہ نہ تو اس میں کوئی شگاف تھا نہ ہی سوراخ، نہ بلندی نہ پستی اور نہ ہی کوئی درخت۔ پھر اسے لپیٹ کر سطح آب پر رکھ دیا، پھر پانی سے آگ کو خلق فرمایا، اور آگ نے پانی کو چیرنا شروع کر دیا حتی کہ اس سے دھواں اٹھا اور اس قدر اٹھا جتنا خدا چاہتا تھا۔ اللہ نے اس دھوئیں سے صاف ستھرا اور شفاف آسمان خلق فرمایا، جس میں نہ کوئی شگاف تھا نہ ہی کوئی سوراخ۔ اس سلسلے میں خدا فرماتا ہے: "السَّمَاءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا

اَخْرَجَ ضُحٰیھَا" (النازعات / ۲۷ تا ۲۹) آسمان کی تخلیق، جس کی اللہ نے بنیاد رکھی۔ اس کی چھت کو بلند کیا پھر اسے منظم کیا۔ اس کی رات کو تاریک اور دن کو آشکار کیا"۔

امامؑ نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: "اس میں سورج، چاند اور نہ ہی ستارے تھے نہ سحاب۔ پھر ان کو لپیٹ کر سطح آب پر رکھ دیا پھر اس دونوں قسم کی مخلوق (زمین و آسمان کی) تخلیق کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی، اور پھر زمین سے پہلے آسمان کو اوپر اٹھایا، جیسا کہ اس بارے میں فرماتا ہے: "وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰیھَا" (سورہ النازعات / ۳۰) اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ "دَحٰیھَا" کے معنی ہیں پھیلا دیا۔ شامی نے یہ سن کر کہا: "اے ابو جعفرؑ! خداوند عالم کے اس قول کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ "اَوَلَمْ یَرَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا" (انبیاء / ۳۰) کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین ملے ہوئے تھے ہم نے انہیں جدا کر دیا۔ امامؑ نے فرمایا: "شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ دونوں آپس میں جکڑے اور چپکے ہوئے تھے کہ بعد میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے؟ ایسا ہی ہے نا؟" اس نے کہا: "جی ایسا ہی ہے"۔ فرمایا: "ایسے عقیدے سے توبہ اور رب سے استغفار کرو، کیونکہ خداوند عالم کا یہ فرمانا کہ "کَانَتَا رَتْقًا" یعنی ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایسی صورت میں تھا کہ نہ تو آسمان سے بارش کا کوئی قطرہ برستا تھا اور نہ ہی زمین سے کسی قسم کی کھیتی اگتی تھی۔ جب خداوند عالم نے زمین پر چلنے پھرنے والی مخلوق کو پیدا کیا تو آسمان کے دروازے بارش کے ذریعہ اور زمین کے دروازے نباتات کے ذریعہ کھول دیئے" یہ سن کر شامی نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ فرزند رسول ہیں اور آپؑ کا علم انبیاء کا علم ہے"۔

۴۔ زمین و آسمان کی تعداد

امام علیہ السلام نے اپنے اسی خطبے کے دوران ارشاد فرمایا کہ (فَسَوّٰی مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ) جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد سات ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس میں نہ تو کسی کو شک ہے اور نہ کسی کو اختلاف اور قرآنی آیات سے بھی یہ قول مطابقت رکھتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ" (سورہ بقرہ / ۲۹) انہیں سات آسمانوں کی صورت میں مرتب کیا۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ" (سورہ حمٓ سجدہ / ۱۲) اس وقت انہیں سات آسمانوں کی صورت میں بنایا۔ سورہ نباء میں فرماتا ہے: "وَبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا" (سورہ نباء / ۱۲) تم پر ہم نے سات مستحکم آسمان بنائے۔

البتہ اس مقام پر کچھ لوگوں نے زمین کی تعداد کے بارے میں اختلاف کیا ہے، اگرچہ ان کے اس اختلاف کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے اور وہ اس قدر شاذ اور ضعیف ہیں کہ اس طرف توجہ بھی نہیں کی جانی چاہئے۔ کیونکہ جس طرح آسمانوں کی تعداد ہے زمینوں کی تعداد بھی اسی طرح سات ہی ہے، لیکن کچھ لوگ اس تعداد کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن مجید کی سورۂ طلاق میں ارشاد ہوتا ہے کہ: "اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ" (سورہ طلاق / ۱۲) اللہ وہ ہے جس نے ساتوں آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور اتنی ہی زمینیں پیدا فرمائی ہیں۔ جبکہ بعض لوگ اس کی تاویل "سات اقلیموں" (براعظموں) سے کرتے ہیں، حالانکہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ طبرسی مرحوم اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "آیت میں "وَّ مِنَ

الاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" ہے جس کے معنی ہیں "وَّ فِي الاَرْضِ خَلَقَ مِثْلَهُنَّ" "یعنی "زمین میں بھی اتنی تعداد کو خلق فرمایا ہے" نہ یہ کہ ان میں آسمانوں کی کیفیت خلق فرمائی ہے۔ کیونکہ آسمانوں کی کیفیت زمین کی کیفیت سے مختلف ہوتی ہے۔ اور پورے قرآن میں صرف یہی آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ آسمانوں کی تعداد کے مطابق زمین کی تعداد بھی سات ہے اور اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔

اب رہا زمینوں کا معاملہ تو اس بارے میں کچھ لوگوں کا موقف یہ ہے کہ یہ بھی آسمانوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ہیں اور اگر ایک ہی زمین پر اس کے سات حصے ہوتے تو اسے ایک ہی زمین شمار کیا جاتا۔ اور ہر ایک زمین میں مخلوق موجود ہے جسے اللہ نے اپنی مرضی اور مشیت کے مطابق خلق فرمایا ہے۔ جبکہ ابو صالح، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں انہوں فرمایا" زمینیں تو سات ہیں لیکن ایک دوسرے کے اوپر نہیں بلکہ ان کے درمیان میں سمندروں کے فاصلے حائل ہیں اور ان سب پر ایک ہی آسمان سایہ فگن ہے۔ لیکن حقیقت حال کو خداوند عالم ہی بہتر جانتا ہے"۔

روایات میں یہ بھی بتایا گیا ہے ہر آسمان کا علاقہ ایک حصے سے دوسرے حصے تک یا نیچے سے اوپر تک کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کے چلنے کی مسافت ہے۔ اور پھر ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا درمیانی فاصلہ بھی اتنا ہی ہے۔ اور اس دنیا سے آسمان اول تک کا بھی اتنا ہی فاصلہ ہے۔

اس سے فلاسفہ کے اس قول کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ جس میں وہ خلاء کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہر فلک کا خط" مقعر "(دھنسا ہوا خط) دوسرے فلک کے خط" محدب "(ابھرے ہوئے خط) سے متصل ہے کیونکہ جب دو افلاک کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہو تو ان کے خطوط آپس میں کس طرح متصل ہو سکتے ہیں؟ نیز ان کے عقلی دلائل بھی قطعاً نا قابل توجہ ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ روضۃ الکافی کی روایت کے مطابق امام باقر علیہ السلام نے شامی سے کہا کہ اپنے اس عقیدے سے توبہ کرے اور خدا سے استغفار کرے، کیونکہ اس قسم کا عقیدہ رکھنا ناجائز ہے۔

۵۔ ستاروں کا ٹھکانہ

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے اس خطبہ کے دوران فرمایا: "ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ" جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس جملہ میں "ھا" کی ضمیر کا مرجع یا نچلا آسمان ہے یا پھر "سمٰوٰت" ہیں۔ اس لئے کہ بعض کی زینت، تمام کی زینت شمار ہوتی ہے۔ یہاں پر اب دیکھنا یہ ہے کہ "ستاروں کا ٹھکانہ کہاں ہے؟" چنانچہ اس بارے میں ہیئت دان یہ کہتے ہیں، بلکہ اس پر اتفاق کا دعویٰ کرتے ہیں کہ "ثوابت" سارے کے سارے آٹھویں فلک پر ہیں جبکہ "سیارات" کے بارے میں کہتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ:

۱۔ قمر، اس فلک میں ہے جو ہم سے نزدیک تر ہے، پھر بعد والے فلک میں

۲۔ عطارد ہے۔ پھر اس کے بعد والے فلک میں

۳۔ زہرہ ہے۔ پھر اس کے بعد والے فلک میں

۴۔ شمس ہے۔ پھر اس کے بعد والے فلک میں

۵۔ مریخ ہے۔ پھر اس کے بعد والے فلک میں

۶۔ مشتری ہے۔ پھر اس کے بعد والے فلک میں

۷۔ زحل ہے۔ ان کے اوپر "فلک ثوابت" ہے جو ثوابت کا مقام ہے جسے شریعت کی زبان میں کرسی کہا جاتا ہے اور اس کے بعد "فلک اطلس" ہے جس میں نہ کوئی ثابت ہے اور نہ کوئی سیار، اور شریعت مطہرہ کی زبان میں اسے "عرش" کہتے ہیں۔ مرحوم شارح بحرانی کا موقف بھی یہی ہے جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان سب کا ٹھکانہ آسمان اول ہے جسے سماء الدنیا کہا جاتا ہے۔ سید جزائری، شارح معتزلی، شیخ بہائی بلکہ فخر رازی کا نظریہ بھی یہی ہے اور یہ بہتر ہے۔

ہم قرآن مجید کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے یہی کہیں گے کہ خداوند عالم فرماتا ہے :

۱۔ "اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَابِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ وَحِفْظًامِّنْ کُلِّ شَیْطَانٍ مَّارِدٍ" (سورہ الصافات / ۶ تا ۷) ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت بخشی اور اس کی ہر سرکش شیطان خبیث سے حفاظت کی۔

۲۔ "وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَّ حِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ" (سورہ حٰم سجدہ / ۱۲) اور ہم نے نچلے آسمان کو (ستاروں کے) چراغوں سے مزین کیا اور (شہابوں کے ذریعہ شیطانوں باتیں پھرانے سے) روک کر انہیں محفوظ فرمایا یہ ہے زبردست صاحب علم، اللہ کی تقدیر۔

۳۔ "وَلَقَدْزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ جَعَلْنَاهَا رُجُوْمًا لِلشَّیَاطِیْنَ" (سورہ الملک / ۵) اور ہم نے نچلے آسمان کو (ستاروں کے) چراغوں سے مزین کیا، انہیں شیاطین کیلئے شہب تیر قرار دیا ہے۔

۶۔ کچھ آفتاب وماہتاب کے بارے میں

حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے خطبہ میں (فَاَجْرٰی فِیْهَا سِرَاجًا مُّسْتَطِیْرًا وَ قَمَرًا مُّنِیْرًا) کہہ کر آفتاب وماہتاب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان سے بہت سے امور تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ان کا قطر، حرکت، تیز روی اور سست روی، ان کو لگنے والا گہن، چاند کے چہرے پر موجود داغ، چاند کی نسبت سورج کے اندر موجود زیادہ روشنی، سورج میں حدت اور چاند میں برودت کا ہونا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امور کہ جن کے بارے میں علماء ہیئت نے اپنے مقدور بھر علم اور معلومات کے مطابق سیر حاصل بحث کی ہے اور جہاں تک ان کے قاصر ذہن کی رسائی ہو سکتی تھی کافی حد تک گفتگو کی ہے۔ جبکہ اس بارے میں ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ ان کے متعلق آیات واخبار کیا کہتے ہیں۔

آفتاب ومہتاب کی یہ دو قندیلیں جنہیں اللہ تعالی نے اپنی عظیم مخلوقات میں شمار فرمایا ہے اور ان سے کائنات کے بہت سے امور وابستہ کر دیئے ہیں، انہی پر کھیتی باڑی کا انحصار اور پھل میووں کے ثمر آور ہونے کا دارومدار ہے۔ انہی کے ذریعہ ماہ وسال کا حساب عمل میں آتا ہے، انہی کی وجہ سے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ عناصر فطرت میں تصرف کا بڑی حد تک ان کا عمل دخل ہے۔ اسی لئے اللہ

تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں میں کئی مرتبہ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ میرے خیال میں بیس سے زیادہ مقامات پر ان کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ہم بھی کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

۱۔ "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ" (سورہ بقرہ / ۱۸۹) لوگ آپؐ سے مہینے میں چاند کی مختلف صورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہئے کہ یہ تقسیم اوقات کا مظہر ہیں نیز یہ لوگوں کے نظام زندگی اور حج کے وقت کے تعین کیلئے ہے۔ اس آیت میں چاند کے ذریعہ حاصل ہونے والے بعض منافع اور فوائد کی طرف اشارہ ہے جب چاند گھٹتا، بڑھتا یا طلوع اور غروب کرتا ہے۔ اور اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ لوگ اپنے امور کو منظم و مرتب کرتے ہیں اپنی عبادات کے اوقات کا تقرر کرتے ہیں، اپنے کاموں کو صحیح اوقات میں بجالاتے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے :

۲۔ "هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ" (یونس / ۵) وہ وہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور قرار دیا ہے اور اس کیلئے منزلیں مقرر کی ہیں۔ تاکہ تم برسوں کی تعداد اور کاموں کا حساب جان لو اللہ نے سوائے حق کے انہیں پیدا نہیں کیا وہ اپنی آیات صاحبان علم کیلئے تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان فرماتا ہے۔

یعنی ہر ایک کے رستے کیلئے منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ اس میں ضمیر خصوصی طور پر چاند کی طرف لوٹتی ہے اور اس کو خصوصی طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اس کی رفتار تیز ہے، اس کی منزلیں مقرر ہیں، بہت سے شرعی احکام کا اسی سے تعلق ہے، اسی لئے اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ : "لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ" یعنی تم لین دین میں، کاروبار میں، فرائض کی بجا آوری میں گھڑیوں، مہینوں اور سالوں کا تعین کر سکو۔ کہتے ہیں کہ : حساب و کتاب کے چار بنیادی مراتب ہیں :۔ ۱۔ گھنٹے ۲۔ دن ۳۔ مہینے ۴۔ سال۔ اور اس آیت میں مذکورہ عدد، سالوں کیلئے ہے۔ اور "حساب" اس سے کم عرصہ کیلئے یعنی مہینوں، ایام اور گھنٹوں کیلئے ہے، اور سے اوپر کیلئے۔ پھر ان کا تکرار کیا جائے گا جیسے اعداد کیلئے۔ اکائی، دہائی، سینکڑہ اور ہزار ہوتے ہیں۔ اس سے اوپر کیلئے پھر ان کا تکرار کرنا پڑتا ہے۔ خداوند عالم آگے فرماتا ہے "مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ" اللہ نے اسے سوائے حق کے پیدا نہیں کیا۔ یعنی خدا کی حکمت بالغہ کے تحت حق کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ آگے ارشاد فرماتا ہے : "يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ" وہ اپنی آیات صاحبان علم کیلئے تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان فرماتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور آیت بھی ہے "وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا" (سورہ بنی اسرائیل / ۱۲) اور ہم نے رات اور دن کو (توحید اور اپنی عظمت کی) دو نشانیاں قرار دیا ہے، پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور دن کی نشانی کو ضیاء بخش بنا دیا تاکہ اس روشنی میں تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور سالوں کی گنتی اور حساب جان لو اور ہم نے ہر چیز کو مشخص کر کے واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ یعنی ہم نے رات اور دن کو دو دلالتیں قرار دیا ہے جو قادر حکیم پر دلالت کرتی ہیں۔ پس ہم رات کی نشانی کو مٹا دیتے ہیں جو کہ خود رات ہی ہے اور اسے تاریک بنا دیتے ہیں اور دن کی آیت کو روشن اور لوگوں کیلئے باعث بصیرت قرار دیتے ہیں تاکہ

تم اپنے رب کے فضل کو دن کی روشنی میں تلاش کرو اور اپنے کاروبار میں لگ جاؤ۔

ایک قول یہ بھی ہے: "دو نشانیوں سے مراد سورج اور چاند ہیں"۔ اور یہی زیادہ مناسب تفسیر ہے اور اس پر کافی روایات دلالت کرتی ہیں۔ ان روایات میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

ا۔ بحار الانوار میں عیون اخبار الرضا سے منقول ہے، یزید بن سلام نے حضرت رسول خداؐ سے دریافت کیا "کس وجہ سے سورج اور چاند کی روشنی برابر نہیں ہے؟" فرمایا: "اس لئے کہ جب خداوند عالم نے انہیں خلق فرمایا تو انہوں نے بے چون وچرا اس کی اطاعت کی، اللہ تعالی نے جبرائیل کو حکم دیا کہ چاند کی روشنی کو مٹادیا جائے، چنانچہ اس کی روشنی کو مٹادیا۔ آج تک سیاہ نشان موجود ہیں۔ اگر اس کی روشنی کو مٹایا نہ جاتا اور سورج کی مانند اسے ویسے ہی رہنے دیا جاتا تو دن اور رات کی پہچان نہ ہو پاتی۔ روزے رکھنے والے کو معلوم نہ ہو پاتا کہ کتنے اور کب روزے رکھے۔ نہ ہی کسی کو سال، مہینے اور دنوں کا پتہ چل سکتا اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ...." یہ سن کر اس نے کہا: "یا محمدؐ! آپؐ نے سچ فرمایا، اب مجھے یہ بتایئے کہ "لیل" (رات) کو "لیل" کیوں کہتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا: "اس لئے چونکہ اس میں شوہر اپنی بیوی سے اظہار الفت ومحبت کرتا ہے، اللہ نے اسے الفت اور لباس قرار دیا ہے" اس بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے "وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" (سورہ النباء / ۱۰۔۱۱) رات کو تمہارے لئے لباس بنایا اور دن کو معاش کا ذریعہ قرار دیا۔ اس نے کہا: "یا محمدؐ! آپؐ نے سچ فرمایا"۔

۲۔ بحار الانوار ہی میں ابن طاؤس کی کتاب "النجوم" سے ابن ابی جمہور اسناد کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ: حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: "مجھ سے پوچھو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ!" تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا کہ: "چاند پر سیاہ دھبے کیسے ہیں؟" امامؑ نے فرمایا: "اندھے (شخص) نے اندھیرے (مسئلے) کے بارے میں سوال کیا! کیا تو نے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں سنی کہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ "فَمَحَوْنَا اٰیَةَ الَّیْلِ وَجَعَلْنَا اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً" (سورہ بنی اسرائیل / ۱۲) پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور دن کی نشانی کو ضیاء بخش دیا۔ اور تم چاند میں جو سیاہ دھبے دیکھتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے عرش کے نور سے سورج اور چاند کو خلق فرمایا تو جبرائیل کو حکم دیا، اور اس نے اپنے پر کو اس کے اوپر چلایا اور منشائے پروردگار کا اجراء ہوا یعنی رات اور دن، سورج اور چاند کا باہمی فرق پیدا ہوا۔ ساعات، ایام، مہینے، سال اور صدیوں کی تعداد معلوم ہوئی۔ کون کب آیا، کب گیا، کیا ہوا اور کیا نہ ہوا، حج، عمرہ، قرضے کی مدت، مزدور کی مزدوری کا عرصہ، حمل کی مدت، متوفی سے اس کی بیوہ کی عدت وغیرہ کا تعین ہوا......................"۔

۳۔ عیاشی، ابوبصیر سے وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "فَمَحَوْنَا اٰیَةَ الَّیْلِ....." کا مقصد ہے وہ سیاہی جو چاند کے اندر موجود ہے.............."۔

اس سے پہلی روایت میں چاند کی سیاہی کا سبب تو معلوم ہو گیا کہ باری تعالی کے حکم سے جبرائیل امین نے چاند کی روشنی کو مدھم کیا، لیکن فلاسفہ اور ارباب ہیئت نے اس بارے میں اپنے اپنے توہمات کا اظہار کیا ہے اور تقریباً سات مفروضے پیش کئے ہیں جبکہ اخبار وروایات ان سب کی نفی کرتی ہیں۔ دراصل یہ فعل قادر مختار کا ہے جس کے قبضہ قدرت میں سورج اور چاند، دن اور رات ہیں۔

ایک اہم حدیث

تفسیر صافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ: "جب خداوند عالم نے چاند کو خلق فرمایا تو اس پر لکھ دیا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ" یہ جو تم چاند میں سیاہ دھبے دیکھتے ہو یہ دراصل وہی تحریر ہے"۔

حضرت کا یہ فرمان گزشتہ روایات کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ مذکورہ احادیث میں جس سیاہی کا ذکر ہے وہ اس تحریر کے ثبت ہونے سے محو ہو گئی۔ مکمل حدیث، طبرسیؒ نے احتجاج میں اور محدث جزائریؒ نے انوار نعمانیہ میں درج کی ہے اور وہ یوں کہ قاسم بن معاویہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب حضرت رسول خداؐ کو معراج کیلئے لے جایا گیا تو حضورؐ نے دیکھا کہ عرش پر لکھا ہوا تھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ" حضرت صادقؑ نے فرمایا: "سبحان اللہ! ان لوگوں نے تو سب کچھ بدل ڈالا، حتیٰ کہ یہ بھی؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں!" امامؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے

جب عرش کو خلق فرمایا تو اس پر لکھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب پانی کو خلق فرمایا تو اس کی گزرگاہ پر لکھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب کرسی کو خلق فرمایا تو اس پر لکھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب لوح کو خلق فرمایا تو اس پر لکھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب اسرافیل کو خلق فرمایا تو اس کی پیشانی پر لکھا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب آسمانوں کو خلق فرمایا تو ان کے اطراف میں لکھا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب زمینوں کو خلق فرمایا تو ہر ایک طبق پر لکھا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب پہاڑوں کو خلق فرمایا تو ان کی چوٹیوں پر لکھا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب سورج کو خلق فرمایا تو اس پر لکھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

جب چاند کو خلق فرمایا تو اس پر لکھا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

اور یہ وہی سیاہ رنگت ہے جو تم چاند کی پیشانی پر دیکھتے ہو، لہٰذا تم میں سے کوئی بھی شخص جب یہ کہے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" تو اسے "عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ" بھی کہنا چاہیے۔

(میرے آقا و مولا امام معصوم ارواحنا فداہ کے فرمان کی تصدیق چودہ صدیاں گزرنے کے بعد انگریزوں نے بھی اپنی تحقیقات سے کر دی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب غور سے چاند کو دیکھا جائے تو اس میں اسم شریف "علی" واضح الفاظ میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس میں کسی دست بشر کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے بلکہ یہ واضح، زندہ اور ابد تک رہنے والا

معجزۂ خداوندی ہے: عرض مترجم)

سورج کی حرارت اور چاند کی برودت

سورج کی گرمی اور چاند کی خنکی کے بارے میں جو توجیہ امام محمد باقر علیہ السلام نے بیان کی ہے وہ کافی کی روایت کے مطابق کچھ اس طرح ہے، اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "آپؑ کے قربان جاؤں! سورج چاند سے گرم تر کیوں ہے؟" تو امامؑ نے فرمایا: "اللہ تعالی نے سورج کو آگ کے نور اور صاف وشفاف پانی سے خلق فرمایا ہے، ایک طبق اس سے اور ایک طبق اس سے لیا۔ جب سات طبق پورے ہو گئے تو اسے آگ کا لباس پہنایا اس لئے وہ چاند سے زیادہ گرم ہے" میں نے عرض کیا: "قربان جاؤں! تو چاند؟" امام علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ تعالی نے چاند کو آگ کے نور کی روشنی اور صاف وشفاف پانی سے خلق فرمایا۔ ایک طبق اس سے اور ایک طبق اس سے لیا۔ جب سات طبق مکمل ہو گئے تو اسے آگ کا لباس پہنایا جس سے سورج سے خنک تر ہو گیا"۔ اس حدیث کو بحار الانوار میں بھی علل الشرائع اور خصال صدوقؒ سے نقل کیا گیا ہے۔

سورج اور چاند کی حرکات

سورج اور چاند کی حرکات کے بارے میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جو ان کی حرکات کی تعیین کرتی ہو۔ ہاں البتہ بعض روایات ایسی ملتی ہیں جو حرکت کی تیزی پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے جبرائیل سے پوچھا: "زوال ہو گیا ہے؟" کہا "نہیں! ہاں" فرمایا! کیا کہہ رہے ہو! نہیں اور پھر ہاں؟" عرض کیا "جب میں نے نہیں کہا تھا اس وقت زوال نہیں ہوا تھا اور جب ہاں کہا تھا اس وقت زوال ہو گیا تھا اور اتنی دیر میں سورج پانچ سو سال کی مسافت طے کر چکا تھا"۔

علامہ مجلسیؒ، قطب راوندیؒ سے اسناد کے ساتھ شیخ صدوقؒ سے وہ اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے اور وہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں، امام فرماتے ہیں:

۲۔ "موسیٰؑ" نے رب کی بارگاہ میں عرض کیا کہ "زوالِ شمس" کے بارے میں آگاہ فرمایئے!! تو اللہ تعالی نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے آتے ہی کہا: "موسیٰؑ! سورج ڈھل گیا!" موسیٰؑ نے پوچھا "کب؟" کہا "ابھی جب میں نے آپ کو بتایا اور اب تو وہ پانچ سو سال کی مسافت بھی طے کر چکا ہے۔"

۳۔ اسناد کے ساتھ اصبغ نباتہ کہتے ہیں کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا: "سورج کے تین سو ساٹھ برج ہیں اور ہر برج جزائر عرب میں سے ایک ایک جزیرے کے برابر ہے۔ اور سورج ہر روز ایک برج میں اترتا ہے اور جب غروب کرتا ہے تو عرش کے وسط تک چلا جاتا ہے، اور وہیں پر دوسرے دن کی صبح تک سجدے میں پڑا رہتا ہے۔ پھر اسے اس کے مقام طلوع پر لے جایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی کمان کر رہے ہوتے ہیں اس کا رخ آسمان والوں کی طرف اور پچھلا حصہ زمین کی طرف

ہوتا ہے، اگر اس کا چہرہ زمین کی طرف ہوتا تو شدت گرما سے زمین اور اہل زمین جل کر راکھ ہو چکے ہوتے"۔اور سجدے کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے :"اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ "(سورہ حج /۱۸) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان وزمین میں رہنے والے سب اللہ کیلئے سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جاندار اور بہت سے انسان۔

علامہ مجلسیؒ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد وضاحت کے طور پر فرماتے ہیں کہ :"روایت میں تین سو ساٹھ برجوں کی بات ہوئی ہے۔ تو اس سے مراد شاید وہ درجات ہیں جن کی طرف سورج اپنی خاص حرکت کے ساتھ منتقل ہوتا ہے، یا پھر اس کے وہ مدار ہیں جن میں روزانہ منتقل ہوتا رہتا ہے تو اس لحاظ سے یہ وہی عدد ہوگا جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر سال کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر جزیرہ عرب کی جو تشبیہ دی گئی ہے اس سے مراد عظمت کو ظاہر کرنا مقصود ہے نہ کہ خصوصی مقدار کو۔اور پھر اس کی حرکت کی تیزی بتانا بھی مقصود ہے۔

فیروز آبادی کہتے ہیں، جزیرۃ العرب کا علاقہ بحر ہند سے لے کر بحر شام تک اور دجلہ دفرات کی وادی سے لے کر عدن کی آخری حدود تک اور وہاں سے شام تک طول کے لحاظ سے اور جدہ سے لے کر عراق کے سبزہ زار تک عرض کے لحاظ سے ہے۔ سورج کے غیب ہو جانے سے مراد، اس کی روزانہ کی حرکت جب عرش کے وسط تک پہنچ جاتی ہے، شاید اس سے مراد یہ ہو کہ جب زمین کے نیچے سے دائرہ نصف النہار تک پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہی مقام وسط عرش کے مقابل میں ہے، اور احادیث میں وارد ہوا ہے کہ عرش خانہ کعبہ کے مقابل میں واقع ہے، سجدے میں چلے جانے سے مراد ہے اس کا مطیع، فرمانبردار اور تابع امر ہونا۔اور سورج اسی حالت میں چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے مقام طلوع تک جا پہنچتا ہے۔ مقام طلوع سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سے اسے اس دن ابھرنا ہے، یا جہاں سے پچھلے سال اسی دن کو اس نے طلوع کیا تھا........................"۔

یہ ساری باتیں تو تھیں سورج کے بارے میں اب آتے ہیں چاند کی حرکت کی طرف، تو معلوم ہونا چاہئے کہ چاند کی رفتار سورج سے زیادہ تیز ہے اس لئے کہ خداوند متعال فرماتا ہے "لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ"(سورہ یس /۴۰) سورج چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی اس کی تیز رفتاری تک سورج کو رسائی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ سورج، فلک کے بروج کو تین سو پینسٹھ دنوں اور کچھ گھنٹوں میں عبور کرتا ہے جبکہ چاند انہی بروج کو اٹھائیس دنوں میں طے کر لیتا ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی ایک دعا صحیفہ سجادیہ میں ہے جو آپؑ ہلال کو دیکھ کر پڑھا کرتے تھے؛ دعا کے الفاظ یہ ہیں "اَيُّهَا الْخَلْقُ الْمُطِيْعُ الدَّائِبُ السَّرِيْعُ الْمُتَرَدِّدُ فِي مَنَازِلِ التَّقْدِيْرِ الْمُتَصَرِّفُ فِي فَلَكِ التَّدْبِيْرِ "اے اللہ کی فرمانبردار مخلوق! جو تیز رفتاری کے ساتھ اس کی مقرر کردہ منزلوں سے گزرتی اور اس کے فلک تدبیر کے دائرہ میں چکر لگاتی رہتی ہے"

اس جملے کی تشریح میں صدر الدین علی حسینی شارح صحیفہ فرماتے ہیں کہ :"امامؑ نے اس دعا میں چاند کی سرعت رفتاری کی ساتھ تعریف فرمائی ہے، جو اس کی عرضی حرکت کی سرعت کی طرف اشارہ ہے، جو فلک میں چکر لگاتے وقت پیدا ہوتی ہے اور چاند

تمام کواکب (ستاروں) سے زیادہ تیز رفتار ہے، خواہ ثوابت ہوں یا سیار۔ ثوابت سے زیادہ تیز رفتار اس لئے ہے کیونکہ وہ تو ہیں ہی رکے ہوئے یا اگر متحرک ہیں بھی تو ست ترین رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں حتیٰ کہ قدماء تو اس کی حرکت کو درک بھی نہیں کر پائے۔ بھولے ان کا ایک دورہ تیس ہزار سال میں اور بقول دیگر چھتیس ہزار سال میں مکمل ہوتا ہے۔

رہی سیاروں کی بات تو ان میں سے "زحل" کا دورہ تیس سال میں مکمل ہوتا ہے، "مشتری" کا بارہ سال میں۔ "مریخ" کا ایک سال دس مہینے اور پندرہ دن میں، "شمس، زہرہ اور عطارد" کا تقریباً ایک سال میں، جبکہ چاند اپنا ایک دورہ اندازاً اٹھائیس دن میں مکمل کر لیتا ہے۔ لہذا سب سے زیادہ تیز رفتار یہی سیارہ ہے۔

رہی بات اس کی ذاتی حرکت کی تو اس بارے میں عظیم حکماء و فلاسفہ کی ایک بہت بڑی تعداد اگرچہ اس بات کی قائل ہے کہ تمام کواکب کی اپنی ذاتی حرکت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں اور ان کی یہ حرکت غیر محسوس اور غیر معروف طریقے سے ہوتی ہے، لہذا چاند کی تیز رفتاری کو اس حرکت پر محمول کرنا بعید ہے۔ البتہ اسے حرکت محسوسہ پر حمل کرنا صحیح ہے جیسا کہ بعض دوسرے سیاروں کی افلاک میں حرکت ہوتی ہے اور حرکت بھی ایسی ہے جس طرح سمندر میں تیر رہے ہوں، اسی چیز کو خداوند عالم یوں بیان فرماتا ہے کہ: "وَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ" (سورہ یس / ۴۰) سورج اور چاند ہر ایک اپنے مدار پر تیر رہا ہے۔

تو یہ تھی اجمالی گفتگو جس کا اجسام علویہ اور عالم ملکوت سے تعلق ہے۔ اور ہم نے اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق گفتگو کی ہے جو بشری تقاضوں کے مطابق تھی۔ حقیقی علم تو خدا، اس کے رسولؐ اور حضرت رسول خداؐ کے حقیقی جانشینوں اور آپؐ کے اوصیاء کرام علیہم السلام کے پاس ہے۔

یہاں پر منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے۔ اور دوسری جلد کا آغاز "نویں فصل" سے ہوگا۔ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَّ آخِرًا۔

رب ذوالجلال کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے اس حقیر و ناچیز بندے کو کائنات کی عظیم ترین شخصیت کے کلام پر مشتمل کتاب کے ترجمہ و تشریح کی توفیق عنایت فرمائی اور منہاج البراعہ جلد اول کا ترجمہ آج ہنگام سحر بوقت تہجد تقریباً پونے پانچ بجے صبح بتاریخ ۲۰ رجب المرجب ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۹۷ء بروز جمعۃ المبارک بمقام کراچی اختتام پذیر ہوا۔ وَ لِلّٰہِ الۡحَمۡدُ اَوَّلاً وَّ آخِرًا۔

الاحقر: **محمد علی فاضل** مدیر مسئول

جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام راجن پور پنجاب

استبصار

کتب اربعہ میں سے

احادیث کی ایک کتاب

الاستبصار

مؤلف **شیخ طوسیؒ**

کی جلد اوّل کا اُردو ترجمہ

عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔

ناشر

حق برادرز

8۔ مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

فہرست کتب

نمبر شمار	نام کتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتب	قیمت
1-	قرآن مجید (قاری محمد علی)	200/-	30-	ریاض النضرہ (حافظ حدیث ابو جعفر طبری شافعی)	75/-
2-	نہج البلاغہ (ذیشان حیدر جوادی)	275/-	31-	برکات عزاداری	50/-
3-	منہاج البرعہ شرح نہج البلاغہ (ترجمہ محمد علی فاضل)	450/-	32-	شہداء کربلا (اظہر حسن زیدی)	40/-
4-	جعفری تحفۃ العوام مترجم (بوعلی شاہ زیدی)	225/-	33-	جلاء العینین سیرت امام زین العابدین (سلمان پوری)	80/-
5-	اُسوۃ الرسول اوّل (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	350/-	34-	مجالس اجتہادی (نصیر الجہادی)	60/-
6-	اُسوۃ الرسول دوم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	300/-	35-	بحر المصائب	150/-
7-	اُسوۃ الرسول سوم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	275/-	36-	مجالس ترابی (علامہ رشید ترابی)	60/-
8-	اُسوۃ الرسول چہارم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	100/-	37-	ابوتراب (علامہ جزائری)	35/-
9-	سراج المبین فی تاریخ امیر المومنین (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	225/-	38-	آیۃ اللہ (سلطان المشائخ)	50/-
10-	ذبح عظیم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	225/-	39-	یزید نامہ (خواجہ حسن نظامی)	50/-
11-	الزاہراء (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	80/-	40-	طمانچہ بر رخسار یزید (خواجہ حسن نظامی)	35/-
12-	ذر مقصود (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	90/-	41-	فلسفہ فکر (ڈاکٹر علی شریعتی)	20/-
13-	چودہ ستارے (نجم الحسن کراروی)	200/-	42-	انتظار مذہب انتظار (ڈاکٹر علی شریعتی)	20/-
14-	تاریخ اسلام (نجم الحسن کراروی)	180/-	43-	جہاں بینی (ڈاکٹر علی شریعتی)	20/-
15-	ذکر العباس (نجم الحسن کراروی)	150/-	44-	مجالس حیدریہ	60/-
16-	صحیح الجعفری (نجم الحسن کراروی)		45-	مجالس الغروی (علامہ عقیل الغروی)	125/-
17-	نجم المجالس (نجم الحسن کراروی)	60/-	46-	آثار جعفریہ (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	75/-
18-	ارجح المطالب (عبید اللہ امرتسری)	400/-	47-	ایلیا (حکیم سید محمود گیلانی)	15/-
19-	تاریخ اعثم کوفی (اعثم کوفی)	225/-	48-	خطابت مجالس سیکھنے اور نامور خطیب بننے کے طریقے (سید اعجاز احمد)	
20-	تاریخ یعقوبی (ابن یعقوبی)		49-	شہادت رسول الثقلین مع سر شہادتین	60/-
21-	تذکرۃ الخواص (علامہ سبط جوزی)	150/-	50-	تلاش حق (بشیر انصاری)	
22-	تاریخ ابو الفداء (علامہ اسماعیل بن علی والی حمات)	90/-	51-	ذکر محمد و آل محمد (ابو الحکیم ابو ترابی)	55/-
23-	تاریخ احمد ﷺ (نواب احمد حسین پریاواں)	225/-	52-	عظمت شیعہ (سید علی رضا نقوی)	50/-
24-	جوہر قرآن (علی حیدر نقوی)	180/-	53-	قرآن نہج البلاغہ کے آئینے میں	120/-
25-	تصویر عزا (علی حیدر نقوی)	135/-	54-	اقبال در مدح محمدؐ و آل محمدؐ (احسن مرانی)	100/-
26-	حضرت حمزہ (علی حیدر نقوی)	75/-	55-	نماز جعفریہ	24/-
27-	خلافت اور امامت (ہرنام سنگھ)	200/-	56-	چودہ معجزے	20/-
28-	سیرت فاطمۃ الزاہراء (آغا سلطان مرزا)	150/-	57-	بحور الغم	300/-
29-	البلاغ المبین (آغا سلطان مرزا)		58-	السیرۃ العلویہ بذکر المآثر مرتضویہ (حصہ اول و دوم)	

عالم بشریت کے عروج وزوال کی کہانی جس روایت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی

عالم اسلام کے نامور مورخ احمد بن ابی یعقوب ابن واضح یعقوبی کی

تاریخ یعقوبی

تاریخ اسلامی کی راہ کشا دستاویز

اسلامی تاریخ کا قدیم ترین اور مربوط ماخذ

ایک مورخ، ایک جغرافیہ دان، ایک ماہر ہیئت کے قلم سے

تاریخ طبری سے مقدم دور عباسی کی چشم دید گواہی

جس کا ترجمہ ملک کے نامور اور ممتاز محقق، دانشور اور مترجم

ثاقب اکبر

نے رواں اور رسا زبان میں کیا ہے

علمی و تکنیکی معاونت: البصیرہ ۲۹۹، سٹریٹ ۷۶، جی نائن تھری، اسلام آباد، ۰۵۱-۲۸۵۱۴۰۹

اسٹاکسٹ

حق برادرز

8 مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

ارجح المطالب

از عبید اللہ امرتسری

"سیرت حضرت علیؑ پر ایک جامع کتاب"

سیرت جناب علیؑ پر یوں تو بہت سی کتب لکھی گئیں اور آئندہ بھی لکھی جاتی رہے گی مگر جناب علیؑ کی سیرت پر لکھی جانے والے کتابوں میں "ارجح المطالب" کو بعض حوالوں سے ممتازیت حاصل ہے اس طرح یہ کتاب جداگانہ اور منفرد حیثیت اختیار کر جاتی ہے، آپ اندازہ کریں کہ ارجح المطالب ایک اہلسنت عالم کی برسوں کی کوشش، مخلصانہ کاوش اور تعصب سے پاک نگارش کا مرقع ہے اس سے علاوہ جتنی بھی کتابیں آپ کی سیرت سے متعلق لکھی گئیں ان کے لکھنے والے مسلک کے اعتبار سے شیعہ اثنا عشری تھے پھر بھی ہر سیرت کی کتاب ہمہ جہتی صفات کی حامل نہیں ہے۔ جبکہ ارجح المطالب کے مصنف عبید اللہ امرتسری نے جناب امیر علیہ السلام کی زندگی و سیرت کے ہر ہر پہلو پر خامہ فرسائی کی اور بعض وہ صفات جلیلہ حضرت علیؑ کی کہ جو دفینے کی طرح پوشیدہ تھیں انہیں تاریخ کے سینے سے نکال کر منظر عام پر لاکرامت مسلمہ پر بالعموم اور ملت شیعہ پر بالخصوص احسان عظیم کیا ہے اس کتاب کو پاک و ہند میں قبول عام کا درجہ حاصل ہے اور سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سنی وشیعہ کے بھی علماء اس کتاب کے ہزاروں حوالہ جات کو اپنی تحریر اور تقاریر میں بطور سند پیش کرتے ہیں ارجح المطالب ایسی کتاب ہے کہ جس کی ایک ہی جلد سیرت جناب امیرؑ کے جملہ پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور جس کے مطالعہ کے بعد دوسری کسی کتاب کی عموماً ضرورت باقی نہ رہ جائے ایسی کتاب کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے جبکہ ملت شیعہ پر توکہیں لازم ہے کہ اس کتاب کی ایک ایک کاپی سے اپنے گھر کو زینت بخشیں اس سے خود بھی استفادہ کریں اور بچوں کو بھی مستفید کریں بہرحال یہ طے ہے کہ ایسی نادر و نابغہ روزگار تصنیف سے اغماض برتنا کفران نعمت ہوگا کیونکہ اس کتاب میں فضائل کے ایسے ایسے باب رقم ہیں کہ لکھنے والے پہ نصیری ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے جبکہ حقیقت میں لکھنے والا سنی مسلک سے متعلق ہے نیز یہ کہ فضائل کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے اور مصنف نے جو جو قطرہ بھی قلم بند کیا ساتھ میں مستند حوالہ بھی پیش کیا ہے ایسے میں اس کتاب کی قدر و قیمت کہیں بڑھ جاتی ہے کیونکہ بعض غیر شیعہ جو آپ کے فضائل سے آنکھیں چراتے ہیں ان کے اپنے مسلکوں کے بہت بڑے عالم کی لکھی اس کتاب کا ہر حوالے ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے